سہ ماہی

معاصر

انٹرنیشنل

مدیر:
عطاء الحق قاسمی

معاونین:
اسلم کولسری
عمر قاسمی

حالانکہ معاشرہ تو ہم خود ہیں!

ابھی قومی ترانے کے بول پورے نہیں ہوتے اور ہم جلدی سے اپنی سیٹوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔

ابھی ٹریفک سگنل سُرخ سے سبز نہیں ہوتا اور ہم کھسکتے کھسکتے زیبرا کراسنگ کر جاتے ہیں۔

ہم سینما کا ٹکٹ لینے کے لئے یا بسوں اور ٹرینوں میں سوار ہونے کے لئے دھکم پیل کرتے ہیں۔ قطار نہیں بناتے، بہت کھاتے پیتے لوگ بھی کسی ضیافت میں ''کھانا کھلنے'' کا اعلان سنتے ہیں تو ان کے سارے جسم پر دانت اگ آتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے کھانے کی طرف لپکتے ہیں۔

ہم سارا دن ایک دوسرے سے ٹائم پوچھتے ہیں اور کہیں بھی ٹائم پر نہیں پہنچتے!

ہم کرپشن سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں اور کرپشن کا موقع ملنے پر خود بھی کسی سے پیچھے نہیں رہتے۔

مظلوم عورتوں سے ہونے والی زیادتی کی خبریں چسکے لے لے کر پڑھتے ہیں اور اظہارِ افسوس کرتے جاتے ہیں!

ہم سارا دن معاشرے کو کوستے ہیں، حالانکہ معاشرہ تو ہم خود ہیں!

روشنی کے مینار

الحمد للہ! کپاس کی کاشت کے علاقوں میں ایک ترقی پسند کاشتکار کی حیثیت سے ہماری ایک شناخت ہے۔ یہ اعزاز یقیناً کاشت وتحفظ نباتات کے درست اور بروقت فیصلوں کی بدولت زیادہ فی ایکڑ پیداوار لینے کی وجہ سے ہی ہمیں ملا ہے۔ بلاشبہ ویلی اے جی اور وارنل کی معیاری زرعی ادویات اور ان کے انتہائی تجربہ پر مبنی مشوروں کی ہمیں اس مشکل سال میں بھی مکمل معاونت رہی ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ ہماری فی ایکڑ پیداوار پھر شاندار ہے۔

میاں محمد ہارون موسیٰ جہنگیر (ایم پی اے)، سربراہ

زرعی ادویات کا اعلیٰ ترین معیار اور ان کی بروقت فراہمی وہ بڑی وجوہات ہیں جن کی بناء پر میں پچھلے تین سالوں سے وارنل پر مکمل اعتماد کیے ہوئے ہوں۔ ان کے ماہرانہ مشوروں اور زرعی ادویات کی بدولت میری فصل کو ہمیشہ بھرپور تحفظ ملا ہے اور شاندار پیداوار بھی۔ اس سال 2003ء میں میری کپاس کی فی ایکڑ پیداوار 30 من ہے۔

خالد کھوکھر، رحیم یار خان

سال 2002ء میں پہلی بار میں نے اپنی کپاس کی فصل پر وارنل کے دو اسپرے کیے۔ شاندار نتائج دیکھ کر اب سال 2003ء میں میں نے وارنل کا مکمل اسپرے پروگرام اپنایا۔ آپ سب جانتے ہیں اس سال فصل کو دشمن کیڑوں سے بچانا بہت مشکل تھا مگر وارنل کی معیاری ادویات نے مجھے مالا مال کر دیا۔ جی ہاں علاقہ میں میری اوسط پیداوار سب سے زیادہ آئی اور پھٹی کی قیمت تو تھی ہی اچھی۔

حاجی محمد اقبال اعوان، چک 385/WB (بورے والا)

ویلکان کیمیکلز کے ساتھ رابطے کا یہ میرا دوسرا سال مکمل ہوا ہے۔ یہاں میں نے دو چیزوں کو دیکھا اور سیکھا ہے کہ معیاری ادویات فصل دشمن کیڑوں کو کنٹرول کرنے کے ساتھ ساتھ فصل کو قدرتی حالت میں بھی رکھتی ہیں کیونکہ قدرتی حالت میں رہنے والی فصل ہی ہمیشہ زیادہ پیداوار دیتی ہے۔ اس دفعہ میرا مکمل اسپرے پروگرام ویلکان کا تھا اور اوسط پیداوار 30 من فی ایکڑ رہی ہے۔

ظہور حسین تھراج، ہاشم بہادر، ملتان

میں نے اپنے حلقہ احباب میں ہمیشہ ویلکان کیمیکلز کے اعلیٰ معیار کو سراہا ہے اور سال 2003ء نے میرے اس تجزیہ کو اس طرح سے ثابت کیا ہے کہ اس سال میری اوسط پیداوار اپنے علاقہ میں سب سے زیادہ ہے جبکہ لشکری اور امریکن سنڈی کے کنٹرول یا ادویات کی عدم دستیابی جیسے کسی مسئلہ کا مجھے سامنا نہیں کرنا پڑا۔

ڈاکٹر سید طاہر عباس گردیزی، ملتان

ویلکان ۔ کسان کی شان

وارنل ۔ تحفظ اور اعتماد

خوشحال کسان ۔ ہمارا ایمان

فردوسِ گوش ہوگئی آوازِ اہلِ دل کی
زینت ہماری بزم کی اردو زباں سے ہے

نواں عالمی فروغِ اردو ادب ایوارڈ ۲۰۰۴

بہ اعزاز:

عبداللہ حسین (پاکستان)

نثار احمد فاروقی (بھارت)

ساتواں سلیم جعفری انٹرنیشنل ایوارڈ ۲۰۰۴

بہ اعزاز:

ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز (برطانیہ)

منجانب: مجلسِ فروغ اردو ادب دوحہ قطر
پوسٹ باکس ۴۰۶۸۹

سہ ماہی انٹرنیشنل

معاصر

جلد 4 شمارہ 2،3،4 اپریل 2004ء تا دسمبر 2004ء

ادارہ معاصر: 6/13 سی گلیمر ہائٹس وارث روڈ لاہور

فون : 7521122

غیر مطبوعہ تحریروں پر مشتمل

مدیر انتظامیہ

علی عثمان قاسمی

O

معاونین اعزازی

ابرار ندیم۔ عذیر احمد

O

قانونی مشیر

شگفتہ جبیں ایڈووکیٹ

سرورق : محمد اویس آرٹ اینڈ کمیونیکیشن

کمپوزنگ : کلائمیکس کمپوزرز، لاہور

لے آؤٹ : محمد طارق جاوید

زرسالانہ : (چاروں شماروں کے پیکج کے لیے)

پاکستان میں : -/600 روپے

امریکہ، افریقہ اور کینیڈا کے لیے : 70 امریکی ڈالر یا اس کے مساوی

باقی ممالک کے لیے : 45 ڈالر یا اس کے مساوی

قیمت : 300 روپے

ناشر علی عثمان قاسمی نے شرکت پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر

6/13 سی گلبرگ ہائٹس وارث روڈ لاہور سے شائع کیا

معاصر دوست

محمد عتیق ۔ دوحہ، قطر

ملک معیب الرحمن ۔ دوحہ، قطر

جناب عبدالحمید المفتاح ۔ دوحہ، قطر

افضل بٹ ۔ برمنگھم، انگلینڈ

کے ۔ ایم اشرس ۔ برکلے

مستقبل کا ادبی منظر نامہ !

ماضی قریب میں اردو کے تخلیقی ادب کے حوالے سے ایسے بہت سے نام سامنے آتے ہیں جن کا ادبی مقام مسلّم سمجھا جاتا تھا، ان میں سے کچھ عوام میں مقبول تھے، کچھ خواص میں اور کچھ کا دائرہ اثر ان دونوں طبقوں تک وسیع تھا، قطع نظر اس سے کہ ادبی مورخ مستقبل میں ان کا کیا مقام متعین کرتا ہے یا ان کی وفات کے بعد ان کے ادبی قد میں اضافہ ہوا ہے یا کمی واقع ہوئی، یہ حقیقت ہے کہ یہ اپنے وقت کے اور کئی حوالوں سے آج کے بھی اہم نام ہیں۔ نثر میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، پطرس بخاری، عصمت چغتائی، غلام عباس، شفیق الرحمان، محمد خالد اختر، رشید احمد صدیقی، خدیجہ مستور، راجندر سنگھ بیدی، ممتاز مفتی، بلونت سنگھ، رام لعل، قدرت اللہ شہاب، غیاث احمد گدی، جمیلہ ہاشمی، سریندر پرکاش، خواجہ احمد عباس اور شاعری میں جوش، حفیظ، فیض، راشد، مجید امجد، میرا جی، اختر الایمان، جاں نثار اختر، اختر شیرانی، صوفی تبسم، احسان دانش، سید ضمیر جعفری، ناصر کاظمی، شکیب جلالی، ساحر لدھیانوی، اختر حسین جعفری، قتیل شفائی، سلیم احمد، قمر جمیل، مخدوم محی الدین، پروین شاکر اور دوسرے بہت سے نام سامنے آتے ہیں جن کی ادبی شخصیت کا ایک امیج ذہنوں میں راسخ تھا اور ہے۔ ان کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں، شورش کاشمیری، حبیب جالب اور نعیم صدیقی اپنے مخصوص حوالے سے قومی اور ملی منظر نامے میں نمایاں تھے۔

جیسا کہ ہم نے شروع میں عرض کیا کہ یہ سب نام اپنے وقت کے اور کئی حوالوں سے آج کے بھی اہم نام ہیں، بلکہ ان میں سے کچھ نے تو مستقبل کے نقشے میں بھی ایسے رنگ بھرے ہیں جو انمٹ ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ تخلیقی ادب میں "بڑے نام" آنا کیوں بند ہو گئے ہیں، اس وقت ہمارے پاس قراۃ العین حیدر، احمد ندیم قاسمی، مشتاق احمد یوسفی، انتظار حسین، ادا جعفری، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، منیر نیازی، احمد فراز، ظفر اقبال، انور سجاد، اسد محمد خاں، انیس ناگی، صلاح الدین پرویز، یوسف ناظم، جمیل الدین عالی، مجتبیٰ حسین، شہزاد احمد، محمد منشایاد اور کئی دوسرے اہم نام موجود ہیں۔ اسی طرح تنقید اور تحقیق کے شعبے میں بھی قحط الرجال کا عالم نہیں مگر سوال وہی پرانا، کہ ان کے بعد ان کی جگہ لینے والا کون ہے؟ یہی فضا برصغیر کے باہر بھی نظر آتی ہے، اب

وہاں بھی کوئی برٹنڈ رسل، کوئی سارتر، کوئی ٹی ایس ایلیٹ نہیں ہے چنانچہ کسی نئی فکری لہر کے روزن بند ہو چکے ہیں۔ ہمارے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ ہم اس کی وجوہ تلاش کریں اور سوچیں کہ آج ہمارے درمیان کسی بھی حوالے سے ادب کے جو اہم نام نظر آتے ہیں، ان کے بعد ہمارے ادبی منظر نامے کی بے رونقی کا مداوا کیا ہوگا؟

احمد ندیم قاسمی کا استعفیٰ

گذشتہ دنوں وزیر اعلیٰ پنجاب نے مجلس ترقی ادب کو درپیش مشکلات کے ازالہ کے لیے فوری اقدامات کا حکم دیا مگر افسر شاہی نے ان احکامات کو پس پشت ڈال کر اپنی روایتی خودسری کا مظاہرہ کیا جس پر ندیم صاحب نے مجلس کی نظامت سے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا اور افسر شاہی نے اسے قبول بھی کر لیا۔ سیکرٹری اطلاعات کے عملے کے کچھ افراد اور پگڑی اچھال ''ادیبوں'' نے اس ضمن میں کلیدی کردار ادا کیا جس کے خلاف پورے پاکستان کے ادیبوں کا ردعمل سامنے آ رہا ہے۔ کراچی اور سندھ کے ادیبوں کی طرف سے جمیل الدین عالی اور اسلام آباد اور صوبہ سرحد کے ادیبوں کی طرف سے احمد فراز کے علاوہ لاہور میں ''معاصر'' کے زیر اہتمام ندیم صاحب کو دیے گئے عصرانے میں اردو اور پنجابی کے نامور ادیبوں اور دانشوروں نے اس صورت حال کی مذمت کی اور پنجاب حکومت سے اپیل کی کہ وہ اصلاح احوال کے لیے فوری اقدام کرے۔ امید ہے وزیر اعلیٰ پنجاب اس طرف توجہ فرمائیں گے۔ انتظار حسین کی زیر صدارت منعقد ہونے والے، احتجاجی اجلاس میں اردو اور پنجابی کے جن نامور ادیبوں، دانشوروں اور صحافیوں نے اظہار خیال کیا ان میں انتظار حسین، حمید اختر، مجیب الرحمان شامی، مسعود اشعر، فخر زمان، شفقت تنویر مرزا، حسن نثار اور دوسری نامور شخصیات شامل تھیں۔ اجلاس میں افسر شاہی کے رویے کے خلاف ایک قرارداد مذمت بھی پاس کی گئی اور حکومت پنجاب سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے احکام پر عمل درآمد کو یقینی بنائے اور ندیم صاحب سے استعفیٰ واپس لینے کی درخواست کی جائے۔ اجلاس میں تجویز پیش کی گئی کہ ادب اور فنون لطیفہ سے وابستہ اداروں پر نوکر شاہی کے تسلط کے خلاف پورے ملک کے ادیبوں کی ایک کانفرنس عنقریب منعقد کی جائے۔ امید ہے حکومت معاملے کو مزید بگڑنے سے بچانے اور ادیبوں اور دانشوروں کا اضطراب دور کرنے کے لیے فوری اقدامات کرے گی۔

فہرست

حمد و نعت

اعجاز بٹالوی کی یاد میں

انتخاب کلام

تحقیق و تنقید

انتخاب کلام

یادِ رفتگاں / حفیظ تائب

افسانے

ایک شاعر کا کلام

فن و شخصیت

نظمیں

گوشۂ فیض احمد فیض

آپ بیتی

غزلیں

شہاب صاحب

ایک شاعر کا کلام

لاہور لاہور ہے

ایک شاعر کا کلام

وے صورتیں الٰہی

حمد و نعت

حمد

O

تو روبرو ہے' تو بات سنتا ہے

دیکھتا ہے

تو لفظ و معنی کے پردے پردے سے جھانکتا ہے

ہم ایک مدت سے

اپنا مقسوم ڈھونڈتے ہیں

جو لوحِ ہستی پہ لکھ رکھا ہے

ہم اس کا مفہوم ڈھونڈتے ہیں!

ہمارا ہر لفظ تیری جانب ہمارا خط ہے' جو

ان کہی خواہشوں نے لکھا ہے!

ان کہے لفظ......

ان کہی خواہشوں کو تیرے سوا کوئی ہے'

جو پڑھ سکا ہے!

اگر تو مکتوب دیکھ پائے' تو خوش نصیبی'

اگر ترا لطف بر نہ آئے......

تو اپنی قسمت!

جیلانی کامران

الحمدللہ

O

(حمد بصورت عزم)

بات کریں دوٹوک
نکلے دھوپ
سامنے آئے طرح طرح کا روپ
شخصیت دوراں کے اجالے
چھم چھم برسیں
جم جم برسیں
بات کریں دوٹوک
کلفت وقت ہو دور
بادِ نسیم چلے
لطف عمیم کی کلیاں چٹکیں
باغ جہاں میں آئے بہار
دلوں پہ اترے
مصحف اطمینان۔ وحیِ قرار
بات کریں دوٹوک
ہم اور آپ ہیں فطرت کے شہکار
الحمدللہ

سید مشکور حسین یادؔ

حمد

کرم تیرا کہ بے حرف و بیاں رکھا نہیں تو نے
عنایت ہے کہ محروم نشاں رکھا نہیں تو نے

مرے شوقِ مسافت کو یقیں کی روشنی دے کر
مرے ہونے سے مجھ کو بدگماں رکھا نہیں تو نے

تری رحمت کہ توفیق صدا بخشی ہے ہر رُت میں
مجھے مفلس تو رکھا' بے زباں رکھا نہیں تو نے

کڑی دھوپوں میں سر پر آسماں کو تان لیتا ہوں
عطا تیری! مجھے بے سائباں رکھا نہیں تو نے

یقیں رکھتا ہوں اس میں بھی کوئی ہے منفعت میری
مرا فردا اگر مجھ پر عیاں رکھا نہیں تو نے

مجھے تسلیم ہے گر اک سمندر کا سفر دے کر
ہوا کے رخ پہ میرا بادباں رکھا نہیں تو نے

میرا یہ شعلۂ احساس' ورنہ بے تپش ہوتا
تری بخشش کہ ساتھ اس کے دھواں رکھا نہیں تو نے

خسارہ کب سمجھتا ہوں اسے میں بھی' مرے خالق
اگر دنیا کو مجھ پر مہرباں رکھا نہیں تو نے

تری شفقت کہ تا حد نظر وشت مسافت میں
بجز اک آس کچھ بھی درمیاں رکھا نہیں تو نے

یہ کیا کم ہے کہ میں شامل ہوں تیری لامکانی میں
کسی بستی میں گر میرا مکاں رکھا نہیں تو نے

مجھے بھی اس کہانی میں کوئی کردار بخشا ہے
فقط خود ہی کو زیب داستاں رکھا نہیں تو نے

فقط زیبا مجھے یہ مصلحت ہے' گر مرے حق میں
بجز اک خواب' کچھ کارِ جہاں رکھا نہیں تو نے

ادا کرنا سپاس و شکر کا ہے فرض رزمی پر
بجز غربت کوئی اور امتحاں رکھا نہیں تو نے

خادم رزمی

حمدیہ

O

چھت ہے نہ دیوار و در ہے
یہ تو اپنا ہی گھر ہے

رشک آئے بینائی پر
آنکھ میں ایسا منظر ہے

کل میں گھر کے اندر تھا
اب گھر میرے اندر ہے

اک قطرے کے سواگت کو
کتنا بڑا سمندر ہے

پھر دل کی بن آئی ہے
پھر جلووں کی زد پر ہے

بند آنکھوں جا سکتا ہوں
اب تو رستہ ازبر ہے

بے کھٹکے چلتے رہنا!
درد جہاں تک رہبر ہے

اپنے آپ کو بیچ دیا
دل کیسا سوداگر ہے

مٹی پر کیا بیت گئی
ہر چہرہ ، جادوگر ہے

سجدے سے کیسے اٹھوں
اب تو سر ہی شہ پر ہے

چشمے خشک نہیں ہوں گے
دریا میرے اندر ہے

خاموشی کے پردے میں
آوازوں کا محشر ہے

اشکوں کے پیچھے پیچھے
آہوں کا اک لشکر ہے

جب اشکوں میں باتیں ہوں
چپ رہنا ہی بہتر ہے

ہوں بھی اور نہیں بھی ہوں
یہ بھی کیسا چکر ہے

دنیا کیوں ٹھوکر پہ تھی
دنیا کیوں ٹھوکر پر ہے

جس میں سب منظر کھو جائیں
ایسا بھی اک منظر ہے

کل مر جاتا بہتر تھا
آج تو حالت بدتر ہے

اس پر غزلیں لکھتا ہوں
وہ جو حمد سراسر ہے

منیر سیفی

حمد

کیے ہیں خلق بہر رنگ شاہکار اس نے — فضائے جاں کو دیا موسم بہار اس نے
لکھی ہے گردش پیہم لہو کی قسمت میں — دھڑکنا دل کو سکھایا ہے بار بار اس نے
رہے توازن ہستی بھی روز و شب قائم — نظام شمسی کو یوں دے دیے مدار اس نے
بھلا میں ڈوبتا کیسے گماں کی دلدل میں — خود اپنی ذات پہ بخشا ہے اعتبار اس نے
گئے جہاں سے وہی لوگ سرخرو ہو کر — جنہیں قرار دیا کر کے بے قرار اس نے
جسے گزارا کبھی ایک آزمائش سے — نگاہ لطف و کرم اس پہ کی ہزار اس نے
دیا اسی نے سہارا ہر ایک بے کس کو — سنی ہے ٹوٹے ہوئے دل کی ہر پکار اس نے

منصور ملتانی

حمد

سورجوں سے چھپے ہوئے دن میں — جس نے اک رات کو زیادہ کیا
بست کا سوت کات کر جس نے — خاک کو خاک کا لبادہ کیا!
جس نے مٹی کو روشنی بخشی! — جس نے آتش کو بے ارادہ کیا
جس نے ان آندھیوں میں لو رکھی — جس نے ان بارشوں کو سادہ کیا!
خواب گاہوں سے متصل جاڑا — دھوپ میں جس نے ایستادہ کیا!
جس کو اک خواب نے کیا محفوظ! — جس سے اک دل نے استفادہ کیا!

عامر سہیل

نعتؐ

O

کیا حسیں گنبد و محراب ہیں، لیکن مرا دل
ڈھونڈتا ہے وہی مٹی کے مکاں
چھت پہ وہی عودِ نخیل
اور دروازوں پہ حجروں کے سیہ اون کے موٹے پردے
ڈالنا چاہتا ہوں سر پہ وہی خاکِ ریاضِ جنت
پے بہ پے جس میں وہ تابندہ قدم آتے تھے
ہائے وہ سادہ سا منبر ہے کہاں
رشک ہے جس کے ہوئی گریہ کناں حنانہ
میرا دل صورتِ غربال ہے، یادوں سے فگار
چھاننا چاہتا ہے خاکِ بقیع
جس میں ہیں اتنے ستارے کہ فلک پر بھی نہیں
اے احد تجھ سے محبت ہے مجھے
اے احد تجھ سے محبت تھی مرے مولاؐ کو
اے احد تجھ کو محبت تھی مرے مولاؐ سے
اے احد آج بھی دامن میں ترے
ہے وہی ہیبتِ حمزہ کا جلالِ نفسِ بازپسیں
جیسے اک شیر کی آنکھ
کسی روبہ پہ ٹھہر جائے حقارت لے کر
شاہراہیں وہ حسیں تاگ جو نکلے ہوئے ہیں
کتنے نشیب اور فراز
جن سے وابستہ مرا کھویا ہوا حافظہ ہے

خوں رلاتی ہے مجھے چشم تصور کی بھی نابینائی
کچھ بجھائی نہیں دیتا کہ کہاں کیا کیا تھا
تف ہے اے چشم تصور تجھ پر
اشک بہتے ہیں تو بہنے دے کہ ان آنسوؤں میں
شاید اس گزرے ہوئے وقت کی تصویریں ہوں
جو مرے دل سے گزرتا ہی نہیں

ڈاکٹر خورشید رضوی

نعتؐ

زمیں سے آسماں تک اور کیا اس کے سوا دیکھا
جہاں دیکھا، جدھر دیکھا، جہان مصطفےٰ دیکھا

کچھ ایسے آئی تھی اس بار مجھ کو یاد اُس گھر کی
نہ پھر زادِ سفر دیکھا نہ میں نے فاصلہ دیکھا

کبھی اُس در پہ دستک دینے کی نوبت نہیں آئی
وہ دروازہ ہی ایسا ہے جسے پیہم کھلا دیکھا

مبادا لب کشائی سے کوئی نقصان کر بیٹھوں
درِ اقدس پہ چپ رہنے ہی میں ہے فائدہ دیکھا

اُٹھا کر دیکھ لی تاریخ میں نے نوعِ انساں کی
نہ خادم بوقحافہؓ سا نہ مالک آپؐ سا دیکھا

دکھائی جھلکیاں دیتی ہیں جس میں کنزِ مخفی کی
حبیبؐ کبریا کی شکل میں وہ آئینہ دیکھا!

فلک نے کب کوئی دیکھا مدرس اُنؐ کے قامت کا
زمیں نے کب کوئی ارقمؓ کے گھر سا مدرسہ دیکھا

کلامِ پاک کی صورت، رسولؐ حق کی سیرت کو
ہے جب بھی غور سے دیکھا، کوئی پہلو نیا دیکھا

دعائے خیر کرنا دشمنوں کے واسطے سیفیؔ
رسولؐ پاک جیسا اور کس میں حوصلہ دیکھا

منیر سیفی

گلہائے نعتؐ

کوئی سب سے ہو کے رخصت سوئے طیبہ جا رہا ہے
کوئی بے قرار حسرت کو گلے لگا رہا ہے

سرِ حشر ان کا سایہ جو ملا تو کہہ اٹھوں گا
کوئی ایک حرف مدحت مرے کام آ رہا ہے

ملا سب کو انؐ کی نسبت سے یہ روشنی کا لہجہ
جو بھی نعت پڑھ رہا ہے وہ دیے جلا رہا ہے

مجھے اُنؐ کے ہی وسیلے سے ملا مقام ایسا
مرے رب میں اور مجھ میں کہاں فاصلہ رہا ہے

اے ستم شعار دنیا مرے راستے سے ہٹ جا
تیرے بس میں کچھ نہیں ہے تجھے وہ بلا رہا ہے

ملی ہے نوید جب سے کہ بلا رہے ہیں آقاؐ
مجھے ہر کوئی محبت سے گلے لگا رہا ہے

مری کشت جاں پہ رحمت کی گھٹا رہی ہمیشہ
مجھے انؐ کے ہی کرم کا سدا آسرا رہا ہے

○

میں اُنؐ کے ہجر میں نعتیں پڑھوں آہستہ آہستہ
بجے' لیکن بہے آنکھوں سے خوں آہستہ آہستہ

نہ ہو اونچی صدا میری مبادا بے ادب ٹھہروں
یونہی صلِّ علیٰ کہتا رہوں آہستہ آہستہ

مجھے مل جائے شاید اور کچھ مہلت حضوری کی
یہی بہتر ہے اب تو سانس لوں آہستہ آہستہ

میں اک ذرہ تو ہوں' بادِ صبا مجھ کو اڑا لے چل
مدینے کا سفر ہے' کیوں چلوں آہستہ آہستہ

گروں بے اختیار اُنؐ کے درِ اقدس پہ میں جا کر
مشیت ہو اگر اٹھنا' اٹھوں آہستہ آہستہ

میں روضے کی سنہری جالیوں سے گر لپٹ پاؤں
کہوں آہستہ آہستہ' سنوں آہستہ آہستہ

جہاں بے اختیاری پر مصر ہوتی ہے دانائی
وہاں تلقین کرتا ہے جنوں آہستہ آہستہ

نعت

یہ کس نے شب گزیدہ رُت بدل دی
سحر کی روشنی چہروں پہ مل دی

مقام سدرہ گرد راہ ٹھہرا
عجب رفعت خدائے لم یزل دی

یہ کس نے خوف سے دی آشنائی
کہ پھیلی کفر کے چہرے پہ ہلدی

یہ لوح وقت پر لکھا عمل سے
ہو کار خیر تو لازم ہے جلدی

ہر اک نقش قدم ٹھہرا ہے شاید
برائی پاؤں کے نیچے کچل دی

لہو بہتا رہا گو ایڑیوں تک
مگر اک دعوت خیر العمل دی

عذابوں سے بچے گی نوع انساں
اگر اٹھی اور انؐ کی سمت چل دی

کہا اقرا تو پھر امی لقب نے
جہالت کو نہ مہلت ایک پل دی

جلا منصور کس نے ظلمتوں میں
صدائے حق سر دشت و جبل دی

منصور ملتانی

نعتؐ

نعت نبیؐ کے جھومتے اشعار ڈھونڈنا
شہرِ ادب میں گرمیٔ بازار ڈھونڈنا

صد حیف، انؐ کے سایۂ رحمت کے باوجود
طیبہ میں جا کے سایۂ دیوار ڈھونڈنا

طائر مرے خیال کا جائے گا بھی کہاں
روضے کے پاس نور کے اشجار ڈھونڈنا

محشر کے روز بادِ صبا سے، حضورؐ کی
رحمت کہے گی، کوئی طلب گار ڈھونڈنا

چوموں گا بار بار میں آقاؐ کے نام کو
جس میں چھپی ہے نعت، وہ اخبار ڈھونڈنا

اب کے برس بھی سوکھی زباں نے یہی کہا
دستِ عطائے احمدِ مختار ڈھونڈنا

اللہ کے انتخاب کی توہین ہے ریاضؔ
دنیا میں کوئی آپؐ سا کردار ڈھونڈنا

ریاض حسین چودھری

نعتؐ

ازل سے تا ابد قائم رہے گی وہ قیادت ہے
نبیؐ ہیں مقتدی جس کے، تمہاری وہ امامت ہے

مجھے ہے فخر اس پر، جو ملی مجھ کو سعادت ہے
کہ میرے اب قلم کی نوک پہ حرفِ محبت ہے

وہ کس درجہ حسیں لمحات ہیں تخلیق کے گویا
وفورِ نعت سے دل میں لطافت ہی لطافت ہے

مرے سینے میں قندیلیں ہی قندیلیں تو روشن ہیں
شبِ ظلمت میں تجھ کو یاد کرنے کی جو عادت ہے

بھٹکتے جا رہے ہیں لوگ حق کی راہ سے اکثر
ترےؐ اسوۂ حسنہ کی ضرورت تھی، ضرورت ہے

ترےؐ اسمِ مبارک کے حوالے سے جو چلتا ہوں
غمِ دوراں کی کتنی پھر سکوں پرور مسافت ہے

وہاں غالب نہیں ہوتا! کبھی مظلوم پہ ظالم
جہاں انصاف ملتا ہے وہ تیری ہی عدالت ہے

مرے آقاؐ نے گرویدہ کیا اس طرح دشمن کو
محبت نذر کی جس دل میں دیکھا کچھ کدورت ہے

رسولِ پاکؐ کی تعلیم کے گفتار کیا کہیے
انہیؐ کا فیض ہے جو ختم صدیوں کی جہالت ہے

گفتارؔ خیالی

اعجاز بٹالوی کی یاد میں

خوبصورت اعجاز بٹالوی مرحوم
سارک کانفرنس کو سلام-ایک نئی عالمگیریت پر سوچنا ہوگا

جمیل الدین عالی

برادر اعجاز بٹالوی کی وفات پر ذاتی صدمہ تو ہونا ہی تھا۔ یہ رنج مستزاد کہ میں ان کی تدفین میں شریک ہونے لاہور نہ جا سکا۔ ابھی ڈاکٹروں نے فضائی سفر دو تین مزید ہفتوں کے لئے ممنوع قرار دے رکھا ہے۔ آج ان کا تھوڑا سا دکھ ہی سہی کہ ادب اور ادیبوں پر ان کا حق مصدقہ ہے۔ ساٹھ سال کا ساتھ کم نہیں ہوتا۔

بھائی اعجاز بٹالوی ایک بڑے ہی کامیاب وکیل ثابت ہوئے مگر طالب علمی کے زمانے میں وہ ایک تیز زبان' مخالفوں اور پریشان کن سے پریشان کن سامعین (طالب علموں) پر چھا جانے والے مقرر بھی تھے۔ ہمارے اینگلو عربک کالج (اب دہلی کالج) میں اختر الایمان صاحب سال سوم میں تھے کہ میں سال اول میں داخل ہوا۔ وہ اس وقت پورے ہندوستان میں اردو کے بہترین طالب علم تسلیم کئے جا چکے تھے۔ انہوں نے چند بار مجھے بھی اپنی ٹیم میں شامل کیا۔ ہمارا مقابلہ زیادہ تر گورنمنٹ کالج لاہور کی اس ٹیم سے آ کر پڑتا تھا جو الطاف گوہر مرحوم اور اعجاز بٹالوی مرحوم پر مشتمل ہوتی تھی۔ الطاف گوہر صاحب انگریزی' اردو دونوں کے بہترین مقرروں میں شمار ہوتے تھے (بعد کی عملی زندگی میں ایک دور ایسا ہوا جب مجھے اپنی دانست میں ان سے سخت رنج اور نقصان پہنچے جن پر میں نے آج تک اس لئے نہیں لکھا کہ ایک تو میں ایسے موضوعات پر لکھتا نہیں دوم وہ میرے آج بھی بچے اور محبوب ترین احباب تجمل حسین کے بڑے بھائی تھے سوم مجھے یہ اشتباہ بھی رہتا ہے کہ جو مجھ پر گزری وہ اپنی سچائی میں اسے اپنی نہایت سنجیدہ سرکاری ڈیوٹی کا ایک ناگزیر حصہ سمجھتے ہوں گے) بہرحال وہ سب ایک علیحدہ کہانی ہے جب کی یہ بات ہے اختر الایمان کبھی کبھی مجھے اپنا جونیئر شریک بنا کر کل ہند بین الادارہ اردو تقریری مقابلوں میں لے جاتے اور جب دوسری طرف سے الطاف گوہر اور اعجاز بٹالوی بولیں ہماری ٹیم صرف میری وجہ سے ٹرافی ہار جاتی تھی ورنہ اول انعام ہمیشہ اختر الایمان کو ہی ملتا۔ نتائج پر اعجاز بھائی مجھے بہت چھیڑتے۔ ''او بھائی تو اختر صاحب کے ساتھ نہ آیا کر اپنے کالج کو ٹرافی سے محروم کرا دیتا ہے۔'' صرف ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ وجہ سفر کی تھکن تھی

یا کوئی تازہ بہت ہی سخت چوٹ کھائی تھی کہ بولتے بولتے چپ ہو گئے۔ پھر بیٹھ گئے اور تقریر پوری نہ کر سکے۔ ایسے مقابلے ساڑھے تین چار منٹ فی مقرر سے زیادہ وقت کی اجازت نہیں دیتے۔ مجھے تیسرا انعام بھی ملا اور میرے کالج کو ٹرافی بھی۔ ورنہ اس سے پہلے یا بعد میں نہ کبھی میں پہلا انعام حاصل کر سکا (خواہ دوسری ٹیم کسی کالج کی ہو) نہ اپنے سینئر کی اتنی مدد کر سکا کہ ٹرافی مل جاتی۔ اس شام اعلان نتائج کے بعد اعجاز بھائی پھر کسی قدر خوشگوار موڈ میں آ گئے تھے۔ بولے دیکھو میاں میرے اس زخم دل کو دعائیں دو جو مجھے آج لگا تھا اور آئندہ کم از کم اس وقت تک کے لئے جب تک میں بولوں اپنی کسی ٹیم میں شامل ہونے کی کوشش نہ کرنا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔

پھر وہ لاہور اور میں کراچی۔ وہ بیرسٹری کرنے لندن بھی چلے گئے ہماری دوستی تو پہلے بھی نہ تھی ملاقاتیں بھی پروان نہ چڑھ سکیں۔ اس زمانے میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس کے بہت سے گواہ بشمول رفیعہ تجمل حسین آج بھی زندہ ہیں۔ ہوا یہ کہ اعجاز بھائی بیرسٹری کر کے آئے تو بڑے عزائم کے ساتھ مگر پاکستان کے نہایت سخت سیاسی انتشار سے بہت دل برداشتہ ہو گئے (اب بھی یہی ہو رہا ہے کہ ہمارے بعض بہترین دماغ بڑی بڑی ڈگریاں اور بڑے بڑے عزائم لے کر ملک کی خدمت کرنے آتے ہیں اور گھبرا کر بھاگ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اعلیٰ ترین طبی ڈگری اور مہارت سے فیض یاب ڈاکٹر بھی جو لاکھوں روپے ماہانہ کما سکتے ہیں سیاسی اور مسلکی وجوہ سے بھی جمائی پریکٹس چھوڑ کر پاکستان سے واپس جانے کی باتیں کرنے لگے ہیں۔ (بعض جنہیں میں خود جانتا ہوں چلے بھی گئے ہیں) بہرحال اعجاز بھائی نے طے کر لیا کہ ملک چھوڑ دیں گے (اس وقت صدر ایوب کا مارشل لا بھی نہیں لگا تھا) کراچی آئے۔ دوستوں کو اطلاع دی۔ دوستوں نے' مجھ جونیئر سمیت' بڑھ چڑھ کلفٹن پر فواکہات و مشروبات کا انتظام کیا۔ لوگ بار بار گلے لگتے اور روتے۔ طرح طرح کے شعر پڑھتے۔ یکا یک (بعد میں اعجاز بھائی کے پارٹنر) جناب رحمن ایڈووکیٹ نے بڑے بلند آہنگ ترنم سے کسی کا ایک شعر پڑھ دیا۔ ساتھ ہی کچھ یہ فقرہ کہ 'بھائی جی ساڈا مسلک تو اے وے''

جانے کیوں اک در و دیوار کا پابند ہوا
میں کہ منسوب کئے جاتے تھے صحرا مجھ سے

دوسرے لوگوں نے پروا کی ہو نہ ہو' اعجاز بھائی سن ہو کر رہ گئے۔ پھر پڑھوایا' تیسری مرتبہ بھی پڑھوایا۔ ''یار واب میں اس در و دیوار کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا'' سامان کسی ملازم کے ہاتھ فضائی اڈے بھیج دیا گیا تھا۔ ایک دم سب نے کاریں دوڑائیں۔ جہاز سے سامان نکلوایا (شاید کتابوں کا ایک پلندہ چلا بھی گیا جو ہفتوں بعد واپس آیا) لوگوں نے کراچی میں پریکٹس کا مشورہ دیا کہ ماشاء اللہ یہاں تیز تر معاشرتی و صنعتی ترقی کے ساتھ معاشی و صنعتی جرائم بھی ترقی پا رہے تھے۔ بیرسٹر لوگ کم تھے پریکٹس چمکنے کا امکان زیادہ تھا مگر انہوں نے کہا جب بات در و دیوار کی ہے تو یارو لاہور کے در و دیوار کا حق زیادہ ہے۔ ہم نے گلڈ بنایا تو اعجاز بھائی اپنے نیم انقلابی خیالات کے ساتھ اس کی بنیاد اور جملہ مباحث میں شریک رہے۔ (ملاحظہ ہو ''ہم قلم'' اگست ۱۹۶۱ء) بعد میں انتخابات میں

حصہ لیتے رہے اس کی گلڈ ہاؤس لاہور کے معاملات میں مفت وکالت کی۔ ادب اور ادیبوں سے تعلق رکھا' اس سے پہلے شاید تقسیم سے بھی پہلے' ایک افسانہ لکھا تھا۔ عنوان غالباً "پرانا کوٹ" ایک بہت مشہور ہوتے ہوئی نوجوان شاعر کی کہانی جسے مبینہ طور پر کسی ناشر نے کچھ معاوضہ نہ دے کر بھوکا تو مارنے میں کسر نہ چھوڑی مگر سخت سردی میں لنڈا بازار سے دس یا بیس روپے میں ایک پرانا اوورکوٹ خرید کر دے دیا تھا اور اس احسان کو بار بار جتاتا تھا۔ اللہ علیم ہے کہ گلڈ جیسا ادارہ بنانے کی اہم ترین وجوہ میں اس واقعے کا الم ناک تاثر تھا۔ میرے ذہن سے محو ہو کر نہیں دیتا تھا۔ اب بھی ناشرین مصنفوں سے پورا پورا انصاف نہیں کرتے۔ اعجاز بٹالوی نے تو بڑا نام پیدا کیا۔ بابر بھائی بیگم سکندر بابر بھی ایک بڑی سماجی کارکن ثابت ہوئیں۔ ایک بھائی ذوالقرنین بٹالوی تھے جو پولیس میں اعلیٰ عہدیدار رہے۔ پانچویں بھائی بھی پولیس میں گئے مگر مجھے ان کا نام یاد نہیں آ رہا۔ عاشق بھائی کو قائداعظم سے قربت حاصل رہی۔ بابر بھائی افسانہ نگار پنڈی میں حلقہ ارباب ذوق قائم کیا۔ وہ بٹالے کا ایک علمی گھرانہ تھا۔ بابر بٹالوی' عاشق بٹالوی اور پتہ نہیں اعجاز بھائی اتنی طویل مدت میں جو ہم نے علیحدہ علیحدہ گزاری کیسے آدمی ثابت ہوئے۔ لاہور جاتا تو انہیں مصروف پاتا یہاں آتے تو عموماً بات فون سے زیادہ نہ بڑھتی۔ عموماً لوگوں کو ان سے شاکی نہ پایا ہاں ان کی بے مثال پیشہ ورانہ ترقی کے سبب ہماری ادیب برادری کے وہ لوگ جو ان کے ہم پیشہ بھی نہ تھے اس کے خلاف اپنے رشک وحسد کا غبار نکال ہی لیا کرتے تھے۔ اس میں شکایت مجھے بھی ان سے ہوئی۔ اس مقدمے کے حسن وقبح سے قطع نظر انہیں اس مقدمے میں سرکار کی طرفدارانہ وکالت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مگر یہ مسئلہ اخلاقیات وکالت پر ان گنت مباحث کی طرف لے جاتا ہے۔

یقیناً برادرم اعجاز بٹالوی ایک غیر معمولی طالب علم' ایک کامیاب قانون دان اور ایک مسلسل ادب دوست اور (میری ذاتی معلومات کے مطابق) ضرورت مندوں کی مفت مدد کرنے والے انسان تھے۔ جو آدمی کسی ضرورت مند پر بھی ذرا سا بھی احسان کر دے یعنی اس کا معاوضہ نہ لے آج کے پاکستان میں وہ ایک بڑا آدمی بھی کہلا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق جنت کرے۔ آمین۔ میں خود کو ان کے لئے خوبصورت کا لفظ استعمال کرنے پر مجبور محسوس کر رہا ہوں۔

بھائیوں سے بڑھ کر

داؤد رہبر

میرے مہربان دوست جناب عبدالوہاب خاں سلیم صاحب کی زبانی جناب عطاء الحق قاسمی صاحب کی فرمائش موصول ہوئی کہ میں ''معاصر'' کے لئے اعجاز مرحوم کی یاد میں چند سطور لکھ بھیجوں۔ میں نے وہاب صاحب سے کہا کہ میں نے ''تین بٹالوی بھائی'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا' وہ ''معاصر'' میں چھپ چکا ہے' اب میں منتظر ہوں کہ مکتبۂ سنگ میل سے اعجاز مرحوم کی تحریروں کے مجموعے شائع ہو کر سامنے آئیں تو انہیں پڑھ کر ایک مضمون اور لکھوں' یہ سوچ کر کہ قاسمی صاحب میرے اس التوا سے خوش نہ ہوں گے میں نے یہ مختصر مضمون لکھنے کو قلم ہاتھ میں لیا۔

اعجاز مرحوم کا اور اپنا ایک فوٹو اس نگارش کے ساتھ بھیج رہا ہوں' یہ ۱۹۴۷ء میں کھینچا گیا' مضمون کے ساتھ یہ بھی چھپ جانا چاہیے۔

داؤد رہبر

فلوریڈا' ۹ جون ۲۰۰۴ء

اعجاز حسین بٹالوی مرحوم مجھ سے عمر میں تین سال بڑے تھے' ان سے جب میری دوستی ہوئی تو میں ''آپ'' کہہ کر نہیں ''تم'' کہہ کر ان سے مخاطب ہوا' یہ فیصلہ بڑا دور رس ہوتا ہے۔ ''آپ'' سے بات شروع کریں تو عمر بھر پوری بے تکلفی کا دروازہ بند رہتا ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد کے فرزند وجیہہ الدین احمد بھی مجھ سے تین سال بڑے ہیں' یہ موڈل ٹاؤن میں ہمارے بچپن کے ہمجولی تھے' ان سے میری دوستی بھی ''تم'' والی دوستی ہے ''آپ'' والی نہیں۔ ضیاء جالندھری گورنمنٹ کالج میں مجھ سے ایک درجہ آگے تھے' یہ رسالہ راوی کے اردو سیکشن کے ایڈیٹر تھے اور میں ان کے ساتھ مدیر معاون' ضیاء جالندھری سے بھی میری دوستی ''تم تم'' والی دوستی تھی۔

یہ سب یار لوگ کافی ہاؤس میں جمع ہوا کرتے تھے' وہیں میرا تعارف اعجاز بٹالوی سے ہوا تو انہیں ''تم'' کہنے میں مجھے ذرا بھی باک نہ ہوا۔

ان دوستوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے مجھے خبر ملی کہ ہر اتوار کو چار بجے وائی-ایم-سی-اے کی عمارت میں ایک ادبی انجمن کا جلسہ ہوتا ہے' اس انجمن کا نام حلقۂ ارباب ذوق ہے' اس ہفتہ وار جلسے میں میں بھی شریک ہونے لگا۔ جلد ہی مجھے معلوم ہوا کہ اعجاز صاحب ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کے چھوٹے بھائی ہیں' عاشق صاحب سے میری سلام دعا ادبی دنیا کے دفتر میں ہوا کرتی تھی۔ (سلام میری طرف سے ہوتا تھا دعا ان کی طرف سے ہوتی تھی)۔

اعجاز کی طبیعت چلبلی طبیعت تھی' چلبلے بچوں کی سی چوکس دماغی' چلبلے بچوں کا ذہن نارسا نہیں ہوتا' انگریزی کے ایک میگزین میں ایک لطیفہ نظر سے گزرا' ایک بچی کاغذ پر رنگین پنسلوں سے کچھ نقاشی میں مشغول تھی' ماں نے پوچھا کیا کر رہی ہو' بچی نے کہا خدا کی تصویر بنا رہی ہوں' ماں بولی تجھے کیسے معلوم ہوا خدا کی صورت کیسی ہے' بچی نے جواب دیا میں تصویر بنا چکوں گی تو تمہیں معلوم ہو جائے گا۔

اکثر بالغوں کے ہاں طبع کی ایسی رسائی نہیں ہوتی' کنڈرگارٹن کے بچوں کے سامنے کوئی فلسفی اپنا فلسفہ چھانٹے اور بچوں سے فلسفیانہ سوال کرے تو چلبلے بچے ہار نہیں مانتے' برجستگی سے پھڑکتے ہوئے جواب دیتے ہیں۔ اعجاز کے ہاں سوچ کی یہ برجستگی اور طراری بلوغت کے بعد بھی برقرار رہی۔ وکالت کے پیشے میں یہ کارآمد ثابت ہوئی۔

فلسفے اور تنقید فنون کے بیسیوں جلسوں میں حاضر ہونے کا مجھے موقع ملا۔ مقرر کی تقریر کے بعد جب سامعین کو موقع دیا جاتا ہے کہ کچھ پوچھنا ہو تو پوچھ لیں' تو بعض اوقات مقرر کو ایک دو منٹ سوال کا منتظر رہنا پڑتا ہے۔ سو ڈیڑھ سو کے مجمع میں تین چار حاضرین ذہن پر زور ڈال کر سوال کرتے ہیں' باقی حاضرین اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ جلسہ ختم ہو تو باہر جا کر سگریٹ سلگائیں۔

ذہن کی ایسی سستی اور آرام طلبی اعجاز کے ہاں نہیں تھی' ان کا دماغ جامد نہیں تھا' چست اور چوکس تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی یاد میں دوستوں نے جو کچھ لکھا اس میں سب نے تسلیم کیا کہ اعجاز صاحب بڑے خوش گفتار آدمی تھے۔

اپنے انتقال سے ایک سال پہلے یہ امریکہ آئے تو ان سے ملاقات ہوئی' انہوں نے ایک قصہ سنایا ''لاہور کی ایک صحبت میں تین چار ججوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ وکیلوں میں فصاحت کی لیاقت کمیاب ہوتی جا رہی ہے' میں نے ججوں کی بات سن کر اکبر الہ آبادی کا یہ شعر پڑھ دیا۔

ایسا سنیے کہ کہنے والا ابھرے
ایسا کہیے کہ جا کے دل کو لگے

آپ جج صاحبان افسوس کر رہے ہیں کہ کہنے والے نہیں رہے' سچی بات تو یہ ہے کہ سننے والے بھی نہیں رہے۔

کوئی دقیق موضوع چھیڑا جائے تو کئی سننے والے کہیں گے یہ موضوع ہمارے میدان کا نہیں' ہم اس پر اپنی زبان کیوں کھولیں؟ اعجاز صاحب نے ایسا کبھی نہ کہا' موضوع کیسا ہی غیر معمولی یا مغلق یا دور از کار ہوتا' ان کے ذہن کو اکساتا اور پھر جو کچھ اظہار ان کی زبان پر آتا' ان کی چوکس طبیعت کا پتہ دیتا۔

امریکی مصور وسلر (Whistler) نے انگلستان کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ بڑا بزم آرا اور خوش گفتار آدمی تھا' آسکر وائلڈ لندن کی محفلوں میں نووارد تھا' وسلر کی طرار گفتگو سن کر انگشت بدنداں رہتا تھا۔ ایک روز وسلر کی زبان سے پھڑکتی ہوئی کوئی بات نکلی تو آسکر وائلڈ بول اٹھا

I wish I had said that

وسلر نے کہا

You will, my dear Oscar, you will.

اعجاز نے مجھے اپنا ایک لطیفہ سنایا' "لاہور کے ایک ریستوراں میں چند دوست جمع تھے' گھڑ دوڑ کی باتیں ہونے لگیں' ایک گھوڑے کا ذکر آیا تو کسی نے کہا "نمبر ون جا رہا ہے۔" اس پر ایک دوست نے کہا یہ محاورہ آج تک اردو کے کسی شعر میں نہیں لایا گیا' میں نے کہا کیوں نہیں لایا گیا' بالکل لایا گیا ہے۔ دوستوں نے بیتابی سے پوچھا کہاں لایا گیا ہے' میں نے کہا سنو۔

گر آج کی رات وہ من جائیں
ہم عشق میں نمبر ون جائیں"

۱۹۳۶ء میں پٹنہ یونیورسٹی جوبلی منائی گئی۔ جوبلی کے پروگرام میں طلبہ کی تقریروں کا ایک انعامی مقابلہ بھی تھا۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایک ٹیم اردو کی تقریروں کے مقابلے کے لئے بھیجی گئی۔ یہ ٹیم اعجاز اور خاکسار پر مشتمل تھی' اعجاز نے حسب معمول نہایت شستہ اور منجھی ہوئی تقریر کی اور اول انعام پایا' میری تقریر بھی آراستہ تھی اور انعام مجھے بھی ملنا چاہیے تھا لیکن دوم انعام لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک مقرر کو دے دیا گیا' غالباً اس خیال سے کہ دونوں انعام پنجاب یونیورسٹی کی ٹیم کو دے دیئے گئے تو سیاست ٹھیک نہ رہے گی۔

اس سے پہلے اعجاز صاحب طلبہ کے تقریری مقابلوں میں دو تین برس حصہ لیتے رہے۔ ان دنوں ان کا جوڑ مجھ سے نہیں الطاف گوہر سے رہا۔ ان کی تقریر کی مشق اس سرگرمی سے خوب ہوتی رہی۔ اچھی گفتگو کا ملکہ ان کو ورثے میں ملا تھا۔ ان کے والد بزرگوار غلام اکبر خاں بھی خوش گفتار آدمی تھے۔ جب اعجاز صاحب آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام پروڈیوسر ہوئے تو پطرس بخاری اور ذوالفقار بخاری سے بھی انہوں نے بہت کچھ سیکھا اور ان کی تقریر کی استعداد نے جلا پائی۔

پٹنہ یونیورسٹی جوبلی میں شرکت کے لئے ہم لاہور سے ریل گاڑی پر سوار ہوئے تو ہمارے ساتھ تین دوست اور بھی تھے۔ انگریزی ٹیم کے دوممبر لوکمار اور ممتاز حسین' اور پنجاب یونیورسٹی یونین کے صدر راجا افتخار۔

اعجاز کی ایک صلاحیت یہ تھی کہ یہ اجنبی سے چھیڑ چھاڑ سے باز نہیں آتے تھے۔ ریل کے ڈبے میں ہمارے ساتھ مراد آباد کے ایک وکیل بھی تھے۔ اعجاز کو اپنی لچھے دار اردو پر بجا ناز تھا۔ انہوں نے وکیل صاحب کو نیچا دکھانے کی نیت سے چھیڑا کہ دیکھیں اردو کی فقرہ بازی میں نمبر ون کون جاتا ہے۔ وکیل صاحب سے فقرہ بازی کی بینڈمنٹن شروع ہوئی تو وکیل صاحب اس فن میں اعجاز کے باپ نکلے۔ انہوں نے جواب میں ایسی چناخ پناخ فقرہ بازی کی کہ اعجاز کے پسینے چھوٹ گئے۔ لاہور کی مجلسوں میں ہم نے اعجاز کو ہمیشہ فتح یاب پایا تھا۔ ریل گاڑی کی اس مجلس میں جیت ان کی نہ ہوئی۔ انہوں نے ہار مان کر وکیل صاحب کو استاد مانا اور ان کی طرار طبیعت کی داد دی۔ دو تین گھنٹوں کے بعد ایک سٹیشن پر وکیل صاحب ہمارے ڈبے میں اپنی چرب زبانی کی گونج چھوڑ کر گاڑی سے اتر گئے۔

اسی ڈبے میں ایک اور بزرگ تھے۔ یہ گھر سے اپنے طعام کا نعمت خانہ ساتھ لے کر چلے تھے۔ چار کٹوروں والا ایک ٹفن کیریئر انہوں نے کھولا اور ایک کندوری میں سے پراٹھے نکالے۔ سنت کا تقاضا تھا کہ وہ خوان یغما کے تناول میں از راہ تواضع ہمیں شریک کر لیتے' کم سے کم ''صلح مارتے'' (یہ پنجابی محاورہ ہے' یعنی صلا کرتے' شرکت تناول کی دعوت دینے کو پنجابی میں صلح مارنا کہتے ہیں)۔ جب انہوں نے ایسا نہ کیا تو ہم سب نے بیک آواز کہا مولانا! اکیلے ہی اکیلے؟ چار کٹوروں اور تین پراٹھوں کی پانچ نوجوانوں کی اشتہا کے سامنے حقیقت ہی کیا تھی! آن کی آن میں سارا کھانا ہڑپ ہو گیا۔

پٹنہ یونیورسٹی جوبلی منانے کو سارے ملک سے طلبہ آئے ہوئے تھے۔ سب کے قیام کا انتظام یونیورسٹی کے ہوسٹلوں میں تھا۔ علی گڑھ سے اردو کی ٹیم راز مراد آبادی اور احسان رشید پر مشتمل تھی۔ پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے انگریزی مقرروں کی ٹیم لوکمار اور ممتاز حسین پر۔ ممتاز نے ہوسٹل میں اپنے کمرے سے اعجاز کو آواز دی تو اعجاز کی ''ز ے'' پر سکون کی بجائے فتحہ سے کام لیا' یعنی اعجاز کہہ کر اعجاز کو بلایا۔ (پنجابی میں یہ بات سنسکرت سے آئی ہے)۔ اس کا مضحکہ احسان رشید اور راز مراد آبادی نے اڑایا اور علی گڑھ والوں اور لاہور والوں کے درمیان نوک جھونک کا تانتا بندھ گیا۔ راز مراد آبادی نے پنجابیوں کی اردو کی مٹی اڑائی اور جتایا کہ علامہ اقبال کے شین قاف بھی درست نہ تھے۔ ''حقیقت'' ان کی زبان سے ''ہکیکت'' ہو کر نکلتا تھا۔

تقریروں کے مقابلے میں اعجاز نے تقریر کی تو اس میں جہاں کہیں قاف والا کوئی لفظ آیا اسے بول کر اعجاز نے مائیکروفون ہی پر راز مراد آبادی کو آواز دے کر کہا

''راز مراد آبادی صاحب! مقدر کا قاف ملاحظہ فرمایا آپ نے؟''

''راز مراد آبادی صاحب! مقام کا قاف ملاحظہ فرمایا آپ نے؟''

''راز مراد آبادی صاحب! منافقت کا قاف ملاحظہ فرمایا آپ نے؟''

جوبلی پروگراموں میں سنگیت کا ایک جلسہ بھی ہوا۔ اس میں ہم نے پنڈت اومکار ناتھ ٹھاکر اور پنڈت پلسکر کے گانے اور استاد حافظ علی خاں کی سرودنوازی سے لطف اٹھایا۔ چھپے ہوئے پروگرام میں استاد فیاض خاں کا نام بھی درج تھا۔ جلسے کے دوران افسوس کے ساتھ اعلان کیا گیا کہ خاں صاحب پٹنے پہنچ تو گئے ہیں لیکن ملیریا کے بخار کے باعث جلسے میں رونق افروز نہ ہو سکیں گے۔

میں نے اعجاز سے کہا' جب ہم لاہور پہنچیں گے تو میں (اپنے بڑے بھائی) یعقوب کی موجودگی میں تم سے کہوں گا استاد فیاض خاں نے جوبلی کے جلسے میں بھاگ کا خیال گایا تو کیسا سماں بندھا تھا' تم مجھ سے متفق ہو کر کہنا' سبحان اللہ تلک کامود کی ٹھمری بھی وہ خوب گائے۔

لاہور پہنچ کر برادرم یعقوب کی موجودگی میں یہ ناٹک کھیلا گیا۔ میرا مقصد اس ناٹک سے یہ تھا کہ یعقوب میاں کو رشک میں مبتلا کیا جائے۔

بات یہ ہے کہ یعقوب بھائی جو مجھ سے عمر میں تین برس بڑے تھے اور قامت میں آٹھ انچ' مجھے دھونس دیا کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ میں ہمیشہ ان سے دب کر رہوں۔ ان کی دھونس سے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اعجاز سے میری دوستی ہوئی تو اس دھونس سے مجھے نجات ملی۔ وجیہہ الدین احمد اور اعجاز کے ساتھ میں حلقہ ارباب ذوق کے ہفتہ وار اجلاسوں میں شریک ہونے لگا۔ قیوم نظر' یوسف ظفر' مختار صدیقی' خلیل الرحمٰن' ریاض قادر' ان سب سے میرا میل جول قائم ہوا۔ یعقوب میاں فزکس کے طالب علم تھے' میرے حلقۂ یاراں میں جگہ نہ پا سکے۔ سچ کہتا ہوں ان دنوں میں نے اعجاز کو اپنا نگہبان سمجھا۔

بابائے اردو اور ہمارے والد مرحوم کے درمیان رشتہ بڑی محبت کا تھا۔ وہ ۱۹۴۷ء میں ہمارے ہاں مہمان ہو کر تشریف لائے تو ان کے اعزاز میں والد صاحب نے چند احباب کو شام کے کھانے کی دعوت دی۔ اس میں میاں بشیر احمد' ڈاکٹر برکت علی قریشی اور دو تین اور بزرگ شریک ہوئے۔ میں نے اعجاز سے اس دعوت کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا میں بھی آنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ضرور' والد صاحب سے پوچھے بغیر کہہ دیا' ضرور۔

ڈنر ٹیبل کے گرد مہمان بیٹھ چکے تھے کہ اعجاز صاحب آن پہنچے۔ میں نے کہا آ جاؤ۔ ایک کرسی اور لاتا ہوں۔ تمہارے لئے جگہ نکل آئے گی۔ کیا بتاؤں یعقوب میاں کس طرح جز بز ہوئے' لیکن بے بس ہی رہے۔ ان کی طرف سے احتجاج سب کے سامنے ممکن ہی نہ تھا۔

والد صاحب کو اعجاز کی شرکت ناگوار نہ ہوئی۔ اس دعوت سے چند مہینے پہلے ایک روز اعجاز نے حاضر ہو کر والد صاحب سے آدھ گھنٹہ نہایت مؤدبانہ گفتگو کی تھی اور والد صاحب نے اعجاز کے رخصت ہونے کے بعد مجھ سے کہا تھا تمہارا یہ دوست بہت شائستہ گفتگو کرتا ہے۔

لیجئے پٹنے کی ایک اور حکایت سنیے۔ جب وہاں یونیورسٹی جوبلی کا پروگرام ہو چکا تو واپسی کے سفر کے

شروع ہونے سے پہلے ہمارے پاس ایک روز فراغت کا تھا۔ اعجاز نے کہا اس شہر میں حسن امام اور حسین امام رہتے ہیں' چلو ان کو سلام کریں۔

ان بزرگوں کی اقامت گاہ شہر میں معروف تھی۔ پتہ پوچھ کر ہم وہاں پہنچے۔ گھنٹی کا بٹن دبایا۔ اندر سے ایک ملازم نکلا۔ ہم نے کہا ہم حسین امام صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ بولا وہ تو یہاں نہیں ہیں۔ ہم نے پوچھا کہاں گئے ہیں۔ اس نے جواب دیا' قبرستان۔

لڑکپن میں اعجاز کے ساتھ مل کر لاہور میں دو بار میں نے بن بلائے شادی کی ضیافت کا کھانا کھایا۔ اعجاز نے مجھ سے کہا شریفانہ وضع کے ساتھ ایسی ضیافت میں کوئی جا پہنچے تو وہاں میزبانوں میں سے کسی میں ایسی بے مروتی نہیں ہوتی کہ پوچھے آپ کو کس نے دعوت دی۔ دولہا والے سمجھتے ہیں کہ تم دلہن والوں کی طرف سے مدعو ہو اور دلہن والے سمجھتے ہیں کہ تم دولہا والوں کی طرف سے مدعو ہو۔

موڈل ٹاؤن میں جب یہ منتقل ہو چکے تو میں ان سے ملنے تقریباً روز ہی جا پہنچتا تھا۔ ایک روز دوپہر سے پہلے تین لڑکیاں ان سے ملنے آئیں۔ اعجاز نے ان سے میرا تعارف کرایا' یہ سحاب قزلباش ہے' یہ ثمین گل اور یہ اختر۔ ثمین گل کے جمال کا ان دنوں لاہور میں شہرہ تھا۔ اختر کا پورا نام مجھے معلوم نہیں۔ یہ ریاض الدین احمد کی بیوی نیر مرحومہ کی چھوٹی بہن ہے۔ ریاض صاحب نے نیر کی وفات کے بعد اس چھوٹی بہن سے شادی کر لی تھی۔ سحاب قزلباش کے تعارف کی ضرورت نہیں۔ ان کو اردو کے ادیب اچھی طرح جانتے ہیں۔

یہ تین لڑکیاں اعجاز کے درشن کے لئے آئی تھیں اور تینوں اعجاز پر مجھی جاتی تھیں۔

میں تعلیم کے لئے ۱۹۴۹ء کے اپریل میں کیمبرج پہنچا۔ اعجاز صاحب اسی سال ستمبر میں لندن پہنچے۔ انگلستان میں ان کی آمد سے میری تنہائی دور ہوئی۔ تین برس میں اکثر ان سے ملنے لندن جاتا رہا۔

انگلستان میں پہلی بار مجھ سے ملنے یہ کیمبرج آئے تو میری گرٹن والے گھر کے بیت الخلا میں فلش کی سہولت نہ تھی۔ رفع حاجت کے بعد یہ بیت الخلا سے یہ کہتے ہوئے نکلے "ولیس کا پورا مزہ تمہارے گھر آ کر ملا۔"

امریکہ میں میرا قیام ۱۹۵۹ء میں شروع ہوا۔ ۱۹۶۰ء اور ۲۰۰۳ء کے درمیان مراسم تازہ رکھنے کو میں مسلسل انہیں خط لکھتا رہا۔ پچھلے دس برسوں میں ہر مہینے ٹیلی فون پر ان سے کم سے کم ایک سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ میں نے اپنے مشاغل سے انہیں باخبر رکھا۔ کاش کہ فون کی ساری گفتگوؤں کے ٹیپ ریکارڈ بنا لیے جاتے۔ دوستی کی ساری کہانی تو ان گفتگوؤں میں تھی۔

اعجاز کے سننے کا انداز ایسا تھا کہ اس سے میری طبیعت میں جولانی آتی تھی۔ مرحوم بڑا بیدار مغز اور رواداری آدمی تھا۔

میں نے بوسٹن یونیورسٹی میں ادیان عالم پر اکیس برس لیکچر دیے۔ کلاسوں میں مسیحی' یہودی' مسلمان' ہندو' بدھ مت کے پیرو' دہریے' سبھی ملتوں کے طالب علم ہوتے تھے۔ میرے لیکچروں سے کبھی کسی طالب علم کی دل

آزاری نہ ہوئی۔ یہ ممکن اس لئے ہوا کہ تعصب سے آزاد رہ کر لیکچر دینے کی سہولت مجھے یونیورسٹی کے قواعد کی رو سے میسر تھی۔ مخلوط کلاس کے سامنے لیکچر دیتے ہوئے دلآزاری سے احتراز کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ کسی ملت کی متعصبانہ طرفداری نہ کی جائے۔ اعجاز کے ساتھ میری گفتگوئیں اسی سطح پر ہوتی رہیں۔

اب اگر کوئی کہے ایک کام کرو۔ اعجاز سے اپنی گفتگوؤں کا خلاصہ تو لکھ دو تو گزارش ہے کہ بے تعصب اظہار کی برداشت ہمارے ہاں بہت کم لوگوں کو ہے۔

کچھ ایسی بے بسی ہے آہ میں بھرتا ہی رہتا ہوں
جو دل میں ہے وہ کہہ دینے سے میں ڈرتا ہی رہتا ہوں

اعجاز حسین بٹالوی کے ساتھ لاہور سے ڈھاکے کا ایک سفر

حمید اختر

ہم سے سینئر ہی نہیں' ہمارے ہم عصر بھی ایک ایک کر کے ساتھ چھوڑتے جا رہے ہیں۔ گزشتہ چار پانچ برس کے دوران آسمان ادب کے کئی درخشاں ستارے ڈوب گئے اور گزشتہ صدی میں برصغیر پاک و ہند میں شعر و ادب کے افق پر جلوہ افروز کہکشاں دیکھتے دیکھتے بکھر گئی۔ ابھی اگلے روز ماڈل ٹاؤن لاہور کے قبرستان میں دفن ہونے والے اعجاز حسین بٹالوی اسی کہکشاں کا حصہ تھے۔

اعجاز حسین بٹالوی نے اگرچہ شہرت ایک بڑے اور اچھے قانون دان ہونے کی حیثیت میں پائی مگر ان کا اصل میدان ادب تھا۔ انہوں نے افسانے لکھنے کے علاوہ تنقید کے میدان میں بھی خاصا تخلیقی کام کیا۔ وہ حلقہ ارباب ذوق کے بانیوں میں سے تھے۔ میرا جی' ن م راشد' قیوم نظر اور یوسف ظفر کے تخلیقی سفر کے دوران وہ حلقے کی سرگرمیوں میں خاصے فعال رہے۔ بعد کے زمانے میں بہت سے دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی طرح وہ روٹی روزگار کے لئے وکالت کے پیشے کو زیادہ وقت دینے پر مجبور ہوئے تاہم ہماری طرح سال میں دو چار بار حلقے کے ہفتہ وار اجلاسوں میں ضرور شریک ہوتے۔ گزشتہ دو تین برس سے بیماری کی وجہ سے وہ اپنا یہ معمول بھی ترک کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اعجاز حسین بٹالوی قانون ہی کے ماہر نہیں تھے بلکہ گفتگو کرنے اور محفل آرائی میں بھی ان کا جواب نہیں تھا۔ ان کے انداز گفتگو کو چرب زبانی کے قریب شمار کیا جا سکتا تھا۔ ہماری ان سے دوستی تو کبھی نہیں رہی البتہ گزشتہ ۵۵ برسوں میں اکثر ادبی محفلوں میں ان سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کے مواقع ضرور میسر آتے رہے۔ البتہ اب سے کوئی ۴۲ برس قبل ایک سفر کے دوران ان سے دس بارہ روز کا ساتھ رہا جس کا آغاز بڑے دلچسپ انداز میں ہوا اور جس کے دوران جناب اعجاز حسین بٹالوی کی افتاد طبع' مزاج اور شخصیت کو پرکھنے کا موقع بھی ملا۔

یہ جنوری فروری ۱۹۶۲ء کی بات ہے' جب مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان کے لئے ادیبوں' شاعروں اور صحافیوں کا ایک وفد خیر سگالی کے مشن پر وہاں بھیجا جا رہا تھا۔ اس میں اتفاق سے ہمارا نام بھی شامل تھا۔ عام طور پر ہمیں ایسے سرکاری وفود سے ہمیشہ دور ہی رکھا جاتا رہا ہے کیونکہ ایسے کاموں کے لئے ہم نے خود

سے کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ مگر غالباً کسی مہربان نے اس فہرست میں ہمارا نام شامل کر دیا تھا اور ہمیں چونکہ مشرقی پاکستان کو دیکھنے کا شوق تھا اس لئے ہم نے وفد میں شمولیت کی منظوری بھی دے دی۔ اعجاز حسین بٹالوی بھی اس میں شامل تھے۔ دوسرے جو تین نام ہمیں یاد آ رہے ہیں ان میں کراچی سے علی نواز وفائی' لاہور سے زاہد چودھری اور احسان بی اے شامل تھے۔ یہ تینوں اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ دو تین اور اصحاب بھی تھے مگر ان کے نام ذہن سے نکل گئے۔ معلوم نہیں وہ اب کہاں ہیں۔ زندہ ہیں یا عدم آباد کو سدھار چکے ہیں۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ اعجاز حسین بٹالوی کی رحلت کے بعد آٹھ دس افراد کے اس گروہ میں سے صرف ہمیں باقی ہیں۔ ع رہے نام اللہ کا۔

لاہور سے ڈھاکے کا یہ سفر خاصا دلچسپ تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہمارا جہاز ایک بجے کے قریب لاہور سے روانہ ہوگا۔ ہم لوگ بارہ بجے لاہور کے ہوائی اڈے پر پہنچے۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد اعلان ہوا کہ جہاز کی کسی فنی خرابی کی وجہ سے فلائٹ دو گھنٹے کی تاخیر سے روانہ ہوگی۔ ڈھائی بجے اعلان ہوا کہ فلائٹ ۵ بجے شام جائے گی۔ ہم اس زمانے میں مالی طور سے خاصے پریشان تھے۔ دو ہفتے قبل ہماری فلم "سکھ کا سپنا" بری طرح فلاپ ہوگئی تھی۔ قرض خواہ ہمارے پیچھے تھے اور ان سے بچنے کے لئے بھی ہم نے دس بارہ روز گھر سے دور رہنے کے لئے اس وفد میں شمولیت کی منظوری دے دی تھی۔ جہاز کی حالت کے بارے میں پریشان کن خبریں سن کر ہمیں فوراً یہ خیال ہوا کہ اگر اس سفر میں کوئی حادثہ ہوگیا تو ہمارے اہل خاندان کا کیا ہوگا؟ چنانچہ ہم نے ہوائی اڈے پر موجود انشورنس کمپنی کے کاؤنٹر پر جا کر مبلغ دس روپے کے عوض ایک لاکھ روپے کی انشورنس کے کاغذات وصول کئے اور اپنی ناگہانی موت کی صورت میں اس رقم کے لئے اپنی بیگم کے نام کا اندراج کر کے یہ کاغذات گھر کے پتے پر پوسٹ کر دیئے۔ ابھی ہم اس کام سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ سامنے سے اعجاز بٹالوی آتے ہوئے نظر آئے۔ انہوں نے بھی اس جہاز کی 'صحت' کے بارے میں شک و شبے کا اظہار کیا تو ہم نے انہیں انشورنس کرانے کے سلسلے میں اپنی دانشمندی کے واقعہ سے آگاہ کیا۔ انہوں نے بھی فوراً ہی یہ تحفظ حاصل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور ہمیں ساتھ لے کر انشورنس کمپنی کے کاؤنٹر پر پہنچے۔ وہاں موجود کمپنی کے کارکن نے ان کی انشورنس کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ پانچ مسافروں کی انشورنس کر چکے ہیں اور جس جہاز میں ہم سفر کر رہے ہیں اس کی حالت اتنی خراب ہے کہ کمپنی اس سے زیادہ کا رسک نہیں لے سکتی۔ بڑے افسر یا اہل کار کا نام بتاؤ۔ ہم اس سے بات کرتے ہیں مگر وہ نابکار کمپنی کے مزید رسک نہ لینے پر برابر اصرار کرتا رہا۔ اعجاز آخر تک اس سے بحث میں مصروف رہے۔

بہرحال جہاز کوئی چھ بجے کے قریب روانہ ہوا۔ اس زمانے میں سپر کانسٹی لیشن جہاز بھی پی آئی اے کے بیڑے میں شامل تھے۔ چھ گھنٹے کے اس سفر میں جب جہاز ہچکولے کھاتا یا اس کے پروں سے شعلے نکلتے دکھائی دیتے جو پرواز کے دوران معمول کی بات تھی تو اعجاز بٹالوی ہم سے مخاطب ہو کر پوچھتے حمید اختر یہ کیا ہو رہا ہے! ہم اطمینان سے جواب دیتے۔ ہمیں تو اس کی فکر نہیں! اگر کریش ہوگیا تو ہمارے اہل خاندان کو ایک لاکھ روپے کی رقم

مل جائیگی۔ اس زمانے میں ایک لاکھ روپے بہت ہوتے تھے۔ بہرحال سارا راستہ ہمارے اور مرحوم اعجاز حسین کے درمیان یہ بحث چلتی رہی' ہم اس پورے سفر میں بظاہر اطمینان سے بیٹھے اور اعجاز کی بے چینی اور پریشانی کا لطف اٹھاتے رہے۔ بارہ بجے کے قریب جب یہ جہاز بالآخر ڈھاکہ ایئرپورٹ پر اترا اور ایک جگہ جا کر رکا تو اعجاز چھلانگ لگا کر اپنی سیٹ سے اٹھے اور ہمارے سامنے آ کر اپنا انگوٹھا لہراتے ہوئے بولے "حمید اختر! تمہارے دس روپے گئے کھوہ کھاتے میں میرے دس روپے بچ گئے۔"

ٹ

اعجاز حسین بٹالوی کی یاد میں

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

صد حیف وصد افسوس کہ لاہور میں ہوتے ہوئے بھی، خوش بیاں اعجاز بٹالوی کے انتقال کی اطلاع دیر سے پائی۔ یہ اندوہناک اطلاع ملی تو ساکت وصامت اور گنگ ہو کر رہ گیا۔ معاً میرے ذہن میں یہ مصرعہ گونجا:

''کہاں سے لائیے اعجاز اس بیان کے لیے''

یہ فرشتہ سیرت حالی کے ایک نعتیہ قصیدے کا مصرعہ ہے۔۔۔ بے سان و گمان اس مصرعے کی طرف ذہن منتقل ہونے کو میں نے رب غفور الرحیم کی جانب سے اعجاز حسین بٹالوی کی مغفرت کا اشارہ جانا۔ خدا انھیں اپنی رحمت بے پایاں کے حصار میں لے اور ان سے محرومی کے غم کو ان کے سب متعلقین اور قریب و دور کے بے حد و بے حساب متاثرین کے لئے آسان بنائے:

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے!

اعجاز حسین بٹالوی ''ڈاکٹر'' نہیں تھے لیکن میں مدت العمر انہیں ''ڈاکٹر'' سمجھا کیا، اور کہتا بھی رہا۔۔۔ ایک بار اصغر ندیم سید نے مجھ سے اس کی تصدیق چاہی۔ میں نے انہیں وہی کہا جو میں ہمیشہ سے سمجھتا چلا آ رہا تھا۔ اعجاز صاحب نے میری موجودگی میں اصغر ندیم سید کی تصحیح کی۔ میں نے استفسار کیا کہ وہ ازرو انکسار یا فی زمانہ ''ڈاکٹر'' کی ''مریض نسل اور مجہول فصل'' سے بیزار ہو کر تو اپنے ''ڈاکٹر'' ہونے سے دستبرداری یا لاتعلقی کا اظہار نہیں کر رہے!؟۔ انہوں نے کہا کہ ایسا ہرگز نہیں۔ میں واقعی کسی معنی میں کسی نوع کا ''ڈاکٹر'' نہیں ہوں۔''

اس امر کی جانب میر اوصیان افتخار مجاز کی بات سے گیا، جنہوں نے لکھا ہے:

''معلوم نہیں کیوں، میرے ذہن کے کسی گوشے میں ان کے لئے ''ڈاکٹر'' کا سابقہ فٹ ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ انہوں نے ڈاکٹریٹ (پی ایچ ڈی) کر رکھا ہے۔ چنانچہ مخاطب کرتے ہوئے میں انہیں ہمیشہ ڈاکٹر صاحب کہہ جاتا۔ عجیب بات تھی کہ وہ مجھے ہمیشہ ڈاکٹر صاحب کہنے سے منع کرتے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے انہیں اس لفظ سے چڑ ہو۔ کئی مرتبہ تو ایسا ہوا کہ میں نے انہیں ڈاکٹر صاحب کہا تو

انہوں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا گردن جھکائی اور کہا ''قبلہ! میں ڈاکٹر نہیں، مریض ہوں۔ میں ایک بونا فائیڈ (Bonafide) مریض ہوں اور دل کا بائی پاس کرا چکا ہوں.....''

افتخار مجاز نے مزید لکھا ہے کہ میرے ایک صحافی دوست مرحوم وسیم گوہر کو جو روزنامہ ''خبریں'' کے کار کن تھے ہارٹ اٹیک ہوا، پھر بائی پاس کے مرحلے سے گزرے۔ میں نے اعجاز بٹالوی صاحب کو اطلاع دی تو کہنے لگے: یار! آئندہ یہ مت کہنا کہ کسی کو ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔ ایسی اطلاع دینا مقصود ہو تو کہا کرو کہ فلاں بھی ہارٹ کلب کا رکن بن گیا ہے۔ ہارٹ اٹیک کے تذکرے سے تو لوگ خواہ مخواہ ڈر جاتے اور وحشت زدہ ہو جاتے ہیں۔''

اس خوش مزاجی یا احتیاط کا زندگی میں ایک مقام ہے لیکن یہ خود کو مطمئن کرنے یا اپنے خوف کو کم کرنے یا اس پر قابو پانے کی باتیں ہیں۔ ہونی ہو کر رہتی ہے، ۷۔ مارچ ۲۰۰۴ء کو ہارٹ کلب کے دیرینہ رکن اعجاز حسین بٹالوی کا ہارٹ اٹیک ہی سے انتقال ہوا۔ ان کا سال ولادت ۱۹۲۳ء بتایا گیا ہے۔

ہم فانی، سادہ لوح، ہونی کو تقدیر کا لکھا یا ناگہاں سانحہ کہہ دیتے اور مانتے تو ہیں ہی۔ لیکن وقوعے کے صورت پذیر ہونے کے اسباب وعلل زمانے کی گود میں کیا برسوں پرورش نہیں پاتے؟ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ انسان اور حساس انسان شائد ہر روز بار بار مرتا ہے، ذرہ ذرہ مرتا ہے اور قطرہ قطرہ جان دیتا ہے۔ اس عمل قدیمہ میں اردگرد کے پست قامتوں کے رویوں کی بدصورتی کو کیوں کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے:

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا!

اعجاز بٹالوی کا اس جہان سے اٹھ جانا، ایک حادثۂ عظیم سے کم نہیں۔ یہ ذوی العدل کے کمزور پڑ جانے اور خاکدانِ ارضی کے کم عیار اور سنسان ہو جانے کے مترادف ہے۔

میں انگریزی میں خطاب کی بات نہیں کرتا۔ اعجاز بٹالوی اردو کے جیتے خوش فکر اور خوش اظہار مقرر تھے۔ اپنے میدان اور سطح میں اس کی کوئی مثال تلاش کرنا مشکل ہے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ اور توانائیاں بیرسٹری کی نذر ہوئیں، ہونا بھی چاہئیں تھیں کہ یہ ان کا پیشہ تھا جس سے وہ ہمیشہ بہت مخلص اور متعلق رہے۔ انگریزی اور اردو میں ان کی تقریری صلاحیتوں کا تحسین آمیز اعتراف ان کی طالب علمی ہی کے زمانے سے ہونا شروع ہو گیا تھا جب ایک نوآموز اور ہونہار نوجوان مقرر کے طور پر انہوں نے بندتا سند، گورنمنٹ کالج لاہور کی ڈیبیٹنگ ٹیم کے ایک رکن کے طور پر اپنی دھاک منوائی۔

گورنمنٹ کالج لاہور (اب یونیورسٹی) کے ادبی ترجمان ''راوی'' میں ان کی اردو نگارشات نظم ونثر نے جگہ پائی۔ ایک موقع پر انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ: سیکھی نہیں میرے دل کافر نے بندگی! بعد کے زمانے میں انہوں نے شعر کم کم کہے لیکن نثر نگاری ضرور ان کا کسی قدر گریز رہا۔ مضمون نویسی کے علاوہ فکشن اور ڈرامے

سے بھی انہیں دلچسپی تھی۔ حلقہ ارباب ذوق کے تو وہ اب سینیئر ترین رکن تھے اور ان کے دم قدم سے حلقے کی مان دان اور اس کی دھوم دھام بھی خوب خوب رہی۔ چند برس ہوئے ان کی ادبی خدمات پر پنجاب یونیورسٹی، شعبہ اردو کے ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر نے ایک ذی استعداد بچی سے ایم اے (اردو) کی سطح کا ایک تھیسس بھی کرایا، جو یاد آتا ہے لاہور کے کسی ادبی ماہنامے میں قسط وار چھپتا بھی رہا۔

وہ ایک طرح سے "پرفیکشنزم" میں یقین رکھتے تھے۔ نتیجتاً وہ لکھنے لکھانے میں، خواہ وہ خط ہی کیوں نہ ہوں، بخست کی حد تک کم قلم تھے۔ خواص کا علم نہیں، عام آدمی کے خط کا تحریری جواب دینا شاید ان کے مسلک ہی کے خلاف تھا۔ فون پر وہ ضرور خبر گیری کر لیتے تھے اور تالیف قلب بھی، لیکن خط لکھنے کا کھڑاگ انہوں نے کم ہی پالا۔ "پرفیکشنسٹ" ہونے کے علاوہ ان کی کوتاہ قلمی کا سبب ان کی پیشہ ورانہ مصروفیات بھی رہی ہوں گی۔ یہ اس لیے کہتا ہوں کہ وہ خط کا جواب نہ پانے کے "درد" سے یکسر بے خبر نہیں تھے۔ قرۃ العین حیدر کے نام میں نے ان کے خط دیکھے ہیں جن میں اعجاز بٹالوی بعض صورتوں میں بیٹی پی سے شاکی دکھائی دیتے ہیں کہ وہ ان کے خطوں کا جواب کیوں نہیں دیتیں!؟ بٹالوی صاحب کے لفظ ہیں کہ: "خط تو لکھو۔۔۔" "چلو خط نہ لکھو تو خط کا جواب تو دو!"

میرے اور اعجاز بٹالوی صاحب کے درمیان "یک طرفہ" مراسلت کا خاموش معاہدہ تھا۔ وہ ڈاک سے خط پاتے، یا ذاتی کوئی کتاب، رسالہ یا مضمون وغیرہ پاتے تو فون کرتے، خواہ اس کی نوبت رات کے کسی پچھلے پہر ہی کیوں نہ آتی! اپنے سر بوجھ یا اپنے کورٹ میں بال رکھنا ان کے مزاج کو میل نہ کھاتا تھا۔ وہ حساب فوری کا بے باق کرنے میں یقین رکھتے اور اس میں آسودگی پاتے تھے۔

اور آخر دسمبر ۱۹۹۸ء سے وسط ستمبر ۱۹۹۹ء تک ہمارے درمیان ایک "نوماہی" مراسلت رہی۔ یہاں اس کی پیوندکاری بے محل نہ ہوگی۔ میرے ابتدائی مراسلات یہ تھے:

بخدمت اعجاز حسین بٹالوی صاحب محترم: غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر لاہور رسالہ "نقوش" نے "بیاضِ غالب بخطِ غالب" کو شائع کرنے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ اس زمانے میں آپ نے اپنے ایک نشریے میں بجا طور پر دیوان غالب کی اس اشاعت کو ایک تاریخ ساز واقعے اور غالبیات کے سلسلے میں ایک نئے باب کا آغاز قرار دیا تھا۔

تاریخ پہلے کیا اپنے آپ کو دہراتی ہے!؟۔ اب غالب کی ولادت کے دو صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر "دیوان غالب" "نسخۂ خواجہ" آپ کی نذر ہے۔ یہ نادر قلمی نسخہ غالب کا نظر یافتہ اصلاحی نسخہ ہے۔ اس کے بارے میں مجھے جو کچھ کہنا تھا، وہ اس نسخے کے "حرفے چند، تعارف، تعلیقات و اضافات" کے تحت کہہ دیا ہے، یہاں کیا دہراؤں۔ "دیوان غالب نسخۂ خواجہ" کے بارے میں آپ سے اظہار خیال کی درخواست ہے۔ آپ کا مختصر تاثر بھی میرے لیے بہ قیمت گراں تر ہوگا۔ آپ اس بارے میں مجھے کچھ لکھ بھیجیے تو بڑا کرم ہوگا۔ ہم اسے تحقیق نامہ کی زیر ترتیب اشاعت میں شامل کریں گے۔

نیاز مند

۱۰ دسمبر ۱۹۹۸ء ڈاکٹر سید معین الرحمن

○

محب گرامی اعجاز بٹالوی صاحب ،تسلیم: امید ہے ''دیوان غالب نسخۂ خواجہ'' پر آپ ایک نظر ڈال چکے ہوں گے۔ مرزا شوق کی مثنوی کا ایک مصرعہ ہے۔

عشق میں ہم نے یہ کمائی کی!

اس کمائی میں جو جان کھپتی ،اس کی داد اہل نظر سے پانے کا آرزو مند ہونا، کوئی چھچھوری بات، یقین ہے کہ نہ کبھی (نہ کبھی) جانی چاہیے۔۔۔۔۔ کالج میں آج آپ کا آنا اور آغا بابر صاحب کے بارے میں آپ کا بہت سی باتیں اتنا بہت اچھا لگا۔۔ ''بیاض غالب کے بارے میں آپ کے جس مضمون کا حوالہ میں نے دیا تھا، وہ رسالہ ''نقوش'' (لاہور) کے شمارہ ۱۱۲ میں چھپا تھا، حسب طلب اس کا تراشا ملفوف ہے۔۔۔۔۔ فورٹ ولیم کالج کے موضوع سے آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ایک کتاب (از: پروفیسر سید وقار عظیم) آپ کی نذر ہے اس کی جمع و ترتیب میں کچھ حصہ اور دخل میرا بھی رہا۔ فورٹ ولیم کالج سے میر تقی میر کی وابستگی کا حوالہ میں نے دیا تھا۔ یہ روایت اس کتاب میں آئی ہے۔ دیوان غالب نسخۂ خواجہ کے بارے میں آپ کے مختصر تحریری تاثر کا مشتاق اور متمنی ____ ڈاکٹر سید معین الرحمن

۱۳ دسمبر ۱۹۹۸ء

○

مندرجہ بالا خط اور کتابوں کا ایک پیکٹ ،اپنے بیٹے وقار معین کے ہاتھ اعجاز بٹالوی صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ ۱۴۔ دسمبر ۱۹۹۸ء کی شب، اعجاز صاحب کا فون آیا کہ:

> وقار عظیم صاحب کی کتاب ''فورٹ ولیم کالج۔ تحریک اور تاریخ'' ____ اور دوسری کتابوں کے لیے دلی شکریہ۔ اگر خود گھر (۳ے شادمان ۱۱ لاہور) آئے تھے تو رکے کیوں نہیں، پیکٹ دروازے پر دے کر چلے کیوں گئے۔ پھر کتابوں پر میرے لیے اپنے دستخط بھی نہ کیے!؟ غالب نے کہیں کچھ ''لاہور'' کے بارے میں لکھا ہوگا؟ اس پر کوئی حوالہ جاتی نوٹ لکھ بھیجیے۔ نسخۂ خواجہ پسند آیا۔ ابھی جیسا چاہیے دیکھ نہیں سکا ____ اعلیٰ عدالتوں میں تین ہفتے کی چھٹی ہوگی۔ اس فرصت میں اسے دیکھوں گا اور پھر اس پر اظہار خیال کروں گا۔۔۔۔۔۔۔

جواباً میرا تیسرا مراسلہ:

محترم اعجاز بٹالوی صاحب: ''دیوان غالب نسخۂ خواجہ'' کا غالب کے دوصد سالہ جشن ولادت کی مناسبت سے لاہور سے چھپنا، ایک معنی رکھتا ہے۔ ان تعطیلات میں آپ نسخۂ خواجہ پر کچھ لکھ دیجیے۔ مضمون کی تمہید

بار ہاتھ اٹھی نے، کے لیے غالب اور لاہور کے موضوع پر کچھ حوالے آپ کی نذر ہیں ــــ نسخۂ خواجہ پر لکھنے کی گذارش بالمشافہ کی، پھر فون پر بھی بات ہوئی، آگے پیچھے دو خط لکھے، اور اب یہ تیسرا نامۂ شوق ہے، مضمون واحد، زیادہ کیا عرض کروں خیر طلب

ڈاکٹر سید معین الرحمن

۲۲ـ دسمبر ۱۹۹۸ء

غالب اور لاہور (ایک یادداشت):

غالب نے اپنے حالات خود بہ صیغۂ غائب لکھے ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے خطوط غالب (جلد دوم) ناشر مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۶۹ء (صفحہ ۹۸۹ـ ۹۹۳) میں یہ "مرزا غالب کے خود نوشت سوانح" محفوظ کر دیے ہیں۔ اس خود نوشت کے مطابق ۱۸۶۴ء میں غالب کا لاہور آنے کا امکان پیدا ہوا تھا، لیکن "بے مقدوری و تہی دستی" مانع آئی اور ان کا لاہور آنا رہ گیا:

"اب کے بار جو (۱۸۶۴ء میں) لاہور میں لاٹ صاحب کا دربار ہوا تو موافق سابق کے ــــــ صاحب کمشنر بہادر (دہلی) نے رئیسوں اور رئیس زادوں کے، اس (غالب) کو بھی خط لکھا۔ اب بے چارہ بہ سبب تہی دستی اور بے مقدوری کے لاہور نہ جا سکا۔ ستر برس کا آدمی، کانوں سے بہرا ہوں اور اکثر بیمار رہتا ہوں لیکن اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو ان عوارض کو نہ مانتا اور بے شک لارڈ صاحب کے دربار میں لاہور حاضر ہوتا)

غالب کے بزرگ سمرقند سے اوّلاً لاہور ہی میں وارد ہوئے، دہلی ان کا مسکن بعد میں بنا:

"ــــ غالب کے دادا قوقان بیگ ـــ اپنے باپ سے ناراض ہو کر محمد شاہ کے عہد میں سمرقند سے ہندوستان چلے آئے ـــ وہ پہلے لاہور میں نواب معین الملک (صرف میر منو) کی ملازمت میں داخل ہوئے پھر نواب معین الملک کی وفات پر لاہور سے دلی پہنچے اور نواب ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں کی سرکار سے وابستہ ہو گئے

(کلیات نثر غالب لکھنؤ ۱۸۷۱ء، ص ۱۵۲) ـ مالک رام، ذکر غالب، دہلی ۱۹۷۶ء، ص ۱۳۱

ㅇ

میر منو (معین الملک) ـ جن کے پاس (غالب کے دادا) میرزا قاقان بیگ خان لاہور میں ملازم رہے ۱۷۵۰ء میں وفات (پائی)۔

ㅇ

مولانا غلام رسول مہر

غالب کے اردو خطوں میں کئی جگہ ضمناً لاہور کا ذکر کیا ہے:

''جستجو'' کی خریداری کا حال معلوم ہو گیا۔ میرا بھی یہی گمان تھا کہ لاہور کے ضلع میں گئی ہوں گی۔

(خطوط غالب 'مہر' پنجاب یونیورسٹی ۱۹۶۸ء ص ۱۰۵)

''سرکار (رامپور کو) مجھ سے اصلاح نظم مطلوب ہے۔ چاہوں دلی رہوں، چاہوں اکبر آباد، چاہوں لاہور، چاہوں لوہارو ______'' (ص ۲۵۶)

o

''مرزا علائی مولائی! لاہور پہنچ کر تم نے مجھے خط نہ بھیجا، اس کی جتنی شکایت کروں بجا ہے۔ (ص ۸۳۳)

''فرزند ارجمند ... پیارے مولائی' لاہور پہنچ کر تم نے مجھے خط نہ بھیجا۔ اس کی جتنی شکایت کروں بجا ہے۔'' (ص ۸۲۳)

تمہارے مکان میں جو چھوٹی بیگم رہتی تھی ---- لاہور گئی ہوئی ہے۔ مولوی صدر الدین خاں لاہور ہیں (ص ۹۲۶)

''استماع ہوا ہے کہ ایک محکمہ لاہور میں معاوضہ نقصان رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے۔'' (ص ۲۰۷)

''پہر دن چڑھے ڈاک کا ہرکارہ ایک حکم نامہ محکمہ لاہور --- لایا۔ (ص ۶۲۸) ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے'' (ص ۶۵۱)

''کچھ پرسشیں لاہور سے آئی تھیں، یہاں سے ان کے جواب گئے ہیں''۔ (ص ۶۷۳)

(ڈاکٹر سید معین الرحمن)

۲۳۔ دسمبر ۱۹۹۸ء

o

اپنے مندرجہ بالا خط اور حوالہ جاتی یادداشت کی براہ راست رسید تو نہ آئی لیکن یکم جنوری ۱۹۹۹ء کو ''مقامی'' ڈاک سے اعجاز کا قلمی، درج ذیل مضمون پر مشتمل یہ تہنیتی پیام پایا:

پروفیسر ڈاکٹر سید معین الرحمن صاحب: Season's Greetings

نئے سال کی تبریک اور خیر و برکت کی دعائیں:

جام ہر ذرہ ہے سر شار تمنا مجھ سے
کس کا دل ہوں کہ اکایا ہے دو عالم سے مجھے[1]

غالب

اعجاز حسین بٹالوی

یکم جنوری ۱۹۹۹

۳ے۔ شادمان II لاہور

o

[1] دیوان غالب کے مطابق مصرعے کی صحیح شکل: ''کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے'' (معین)

اعجاز حسین بٹالوی صاحب محترم ۲۲ جنوری ۱۹۹۹ء

نئے سال کی تحریک اور خیر و برکت کی دعا پائی۔ دل کشادہ ہوا۔ اللہ آپ کو اہل خانہ کے بشمول بخیر اور خوش رکھے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمن

نیاز مند

میں نے کوئی چار مہینے کی خاموشی کے بعد جون ۱۹۹۹ء میں اعجاز حسین بٹالوی صاحب کو لکھا!

ایک رویہ تو ہے منیر نیازی والا کہ.......دیر کر دیتا ہوں!

ایک صورت یہ ہے کہ آدمی شاید چاہتا بھی ہو اسے توفیق ہی نہ ہو اصاحب علم وثروت ہونا بھی بڑی عطا ہے لیکن خوش توفیقی اس سے بھی بڑی نعمت ہے اگر میسر آسکے۔

پچھلے برس سے ایک درخواست آپ سے کرتا چلا آ رہا ہوں۔ آپ وعدہ کرتے نہیں تھکتے۔ لیکن زیادہ بامعنی کام آپ کا پیچھا نہ چھوڑتے ہوں گے، خالی خولی دل دہی کی بات نظر انداز ز قلم زد ہوتی چلی آ رہی ہے۔ اب مزید تاب انتظار نہیں، اس لیے اپنی درخواست بحسرت و یاس واپس لے رہا ہوں کہ عذاب انتظار سے چھوٹوں۔ اور آپ پر بھی، اگر کوئی ذرا سا بار ہو تو اس سے سبکدوش ہوں!...... ''تحقیق نامہ'' (شمارہ ۸) آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ اس شمارے کے لیے ''دیوان غالب نسخہ خواجہ'' پر آپ کے تاثر کی آرزو کی تھی...... یہ بھی ہماری قسمت!

نیاز مند

ڈاکٹر سید معین الرحمن

چند ہفتوں کی خاموشی کے بعد ایک روز خلاف امید اعجاز بٹالوی صاحب کا درج ذیل نامہ عنبر فشاں، پیام فرحت لایا:

73 شادمان II لاہور

28 جولائی 1999ء

برادر عزیز آپ نے کرم کیا کہ ''تحقیق نامہ'' (تازہ شمارہ) میرے نام ارسال کر دیا۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ میرے عرق ندامت کے چند قطرے خشک ہو گئے۔ مگر ندامت اسی قدر وافر تھی کہ اس سے پیچھا چھڑاتا تھا۔

اس سے پہلے جب آپ نے شکوے کا خط لکھا تو مجھے احساس ہوا کہ آپ کا غصہ بجا اور آپ کی برہمی برحق ہے۔ مگر میں اپنے پیشہ ورانہ کاموں میں ایسا گرفتار تھا کہ اپنے دیگر ذاتی کاموں کی طرح مکتوب معذرت کو بھی ملتوی کرتا رہا۔ میں معذرت کا کوئی رسمی خط آپ کو نہیں لکھنا چاہتا تھا۔ خواہش تھی کہ ذاتی خط لکھوں، کہ شاید آپ میری مجبوریوں کو ایک ہمدردانہ نظر سے دیکھ سکیں۔

برادر محترم پلٹ کر دیکھتا ہوں تو یاد پڑتا ہے کہ جب میں نے لکھنا پڑھنا شروع کیا اور پھر ادب کی قلم

گاہ میں قدم رکھا تو بہت جلد میری تحریر کو پذیرائی نصیب ہوئی۔ بزرگان ادب نے اسے پسند بھی کیا اور سنجیدگی سے قبول بھی کیا۔ ڈھارس بندھی، اوڑھنا بچھونا بنانے کو جی چاہتا تھا۔ میں باقاعدگی سے لکھتا رہا۔

پھر ایک واقعہ ہوا۔ میں نے ریڈیو کی ملازمت ترک کی۔ استعفیٰ دیا اور مزید تعلیم کیلئے انگلستان کا سفر اختیار کیا۔ کم وبیش چھ سال یورپ میں بسر ہوئے۔ لکھنا ترک نہ کیا مگر کم ضرور ہو گیا۔ لندن میں حلقہ ارباب ذوق کی ایک شاخ قائم کی (ممکن ہے اس پر میرا ایک مضمون ''نام میں کیا رکھا ہے'' آپ کی نظر سے گزرا ہو)۔ بیرسٹری کی ڈگری ملی تو مزید پریکٹس شروع کر دی۔ وطن واپسی کا خیال ترک یا ملتوی کرتا رہا۔ ایک واقع ہوا (جس کا ذکر پھر کبھی کروں گا) کہ واپس آنا پڑا۔ لاہور میں ہائیکورٹ میں قانون کا پیشہ مقابلے کے امتحان سے کیا کم تھا اور مجھے ناکام وکیلوں کو دیکھ کر عبرت ہونے لگتی تھی۔ ادھر کے نہ ادھر کے۔ بے خطر آتش نمرود میں کود تا پڑا۔ شکر خداوند کا کہ جسم و جان سلامت ہیں اور پیشہ وری کا گریبان بھی چاک نہیں ہوا۔ اس کے کرم سے جو ملا غنیمت ہے۔

آپ سے کیا کہوں کہ یہ پیشہ کس قدر ظالم ہے۔ انگریزی میں اسے Jealous Distress کہا گیا ہے یعنی وہ حاسد محبوبہ جو خاتون خانہ کو بھی قریب نہیں پھٹکنے دیتی لیکن ہمت کی داد دیجئے کہ سب نے اس کے باوجود عمر بھر ادب سے دوری اختیار نہ کی۔ لکھنے پڑھنے کو ترک نہ کیا۔ حالانکہ وقت فروش پیشے میں اس کیلئے وقت نکالنے میں روز بروز دقت بڑھتی چلی گئی اس کے باوجود میں اس امر پر متشکر ہوں کہ ایام جوانی میں علم و ادب کا وہ طوق جو نشتوں کے ساتھ گلے کی زینت بنایا تھا اسے آج تک بڑھانے کا خیال نہیں آیا اور سچ پوچھئے تو اگر کسی چیز نے مصیبتوں میں ساتھ دیا اور مشکل مرحلوں میں دستگیری کی تو وہ شعر و ادب کے سوا کچھ نہ تھا۔

پریشانی صرف یہ ہوئی کہ وکیلانہ وقت فروشی کے باعث جو آج کرنے کا کام تمہارے کل پر ملتوی کرنا پڑا۔ ذہن عدالت میں اگلے روز پیش ہونے والے مقدمے کے نشیب و فراز میں مبتلا ہو تو تحریر ادب کیسے شروع کروں

مجھے اعتراف کہ میرے ناخن بے ہنر پہ ہزار طرح کے قرض ہیں
مرا ذہن مجھ کو رہا کرے تو میں سارے قرض اتار دوں

ان قرضوں میں ایک قرض ''نسخہ خواجہ'' پر مضمون کا ہے جس کے وقت پر ادا نہ کر سکنے پر آپ ناراض ہو گئے۔ کل ہائی کورٹ میں ایک مقدمے کے بعد میں گرمی کی تعطیلات پر ہوں گا۔ اگست کے وسط میں چار ہفتے کے لئے نیویارک جانا ہوگا۔ اس دوران میں یہ قرض ادا کرنے کی نیت رکھتا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب، آپ خوش قسمت ہیں کہ ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ ان لوگوں کا کیا حشر ہوتا ہے جو دو کشتیوں کے سوار ہوتے ہیں۔

چلئے اس معاملے کا فیصلہ اسد اللہ خان غالب کی عدالت سے کرا لیتے ہیں۔

''آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں''

گناہگاری اس عمل کے سرزد ہونے کا نام ہے جو نہ ہونا چاہیے تھا۔ اس کے لئے سزا بھی ہے عفو بھی۔ لیکن کافری تو عقیدے میں کجی اور ایمان کی غیر موجودگی کا نام ہے۔ نعمت کی ناشکری ایمان کی نفی۔ گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں۔ توبہ تو خدا بھی قبول کرتا ہے کہ وہ خود ''تواب'' ہے۔ انسان کیوں نہیں کرے گا۔

خط لکھئے اور اعلان کیجئے کہ آپ نے تاخیر کو معاف کیا۔

خاکسار۔۔۔اعجاز حسین بٹالوی

جواباً میں انہیں فوری طور پر مختصراً صرف یہ لکھ پایا:

برادر گرامی اعجاز حسین بٹالوی صاحب: آپ کا ۲۸۔ جولائی ۱۹۹۹ء کا لکھا ہوا خط (دو ہفتے سے زیادہ آپ کے دفتر میں پڑا رہا) ۱۲۔ اگست ۱۹۹۹ء کو TCS کے سپرد ہوا اور آج ۱۳ کو مل گیا۔ دل پر ایک کیفیت سی گزر گئی۔ اور دھیان میر کے ایک شعر کی طرف گیا:

موسم ہے نکلے شاخوں سے پتے ہرے ہرے
پودے چمن میں پھولوں سے دیکھے بھرے بھرے

آپ ''نسخہ خواجہ'' پر کہیں اس عزت اور مروت کو میں اپنا مقدر اور مقسوم نہ جان کر یکسو ہو چلا تھا کہ آج آپ کے ایک گرامی نامے نے از سر نو مجھے امید و بیم کے عرصہ محشر میں لا ڈالا۔ آپ کی مجبوری سر آنکھوں پر۔ میں کیا میری ناراضی کیا۔ میری تحریر کسی درجے میں آپ کی دل آزاری کا باعث ہوئی ہو گی، اس کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔

آپ نے ان تعطیلات گرما میں ''نسخہ خواجہ'' پر کچھ لکھنے کا عندیہ دیا ہے۔ یہ بڑا ہی کرم ہو گا میرے حال پر۔۔۔ میں ''نزول کرم'' کا منتظر رہوں گا۔ آپ لکھتے ہیں کہ:

''جب میں نے ادب کی قلم گاہ میں قدم رکھا تھا تو بزرگان ادب نے اسے پسند بھی کیا اور سنجیدگی سے قبول بھی کیا۔ ڈھارس بندھی، دل خوش ہوا، اور میں نے دھڑا دھڑ لکھنا شروع کیا ______''

اب کہ آپ بزرگان ادب میں ہیں، آپ پر یہ فرض ہے کہ چھوٹوں کی (اگر ان میں کوئی قابل لحاظ بات ہے) ڈھارس بندھائیں اور انہیں سہارا دیں۔ زیادہ کیا لکھوں۔ تحقیق نامہ کا تازہ شمارہ (نمبر ۸)، آپ کو مل گیا، اس سے اطمینان ہوا۔ محبت کے ساتھ۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن
۱۳۔ اگست ۱۹۹۹ء

اس سلسلے کا میرا آخری مختصر تر مراسلہ مورخہ ۱۹۔ ستمبر ۱۹۹۹ء کو یہ تھا:

گرامی قدر اعجاز حسین بٹالوی صاحب تسلیم:

۲۸۔ جولائی ۱۹۹۹ء سے آپ تعطیلات گزار رہے تھے۔ اگست کے وسط میں چار ہفتے کے لئے نیویارک جا رہے تھے۔ اس دوران آپ نے ''نسخۂ خوبجہ'' پر مضمون لکھنے کا عزم و ارادہ ظاہر فرمایا تھا۔ کہنا یہ ہے کہ میں حالت انتظار میں ہوں!

آپ کی خوش نیتی کا معتقد،

نیاز مند

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

فون آیا: لکھنے کی نیت سلامت ہے اور مستحکم بھی ___ مگر ___ وقت کے ہاتھوں کچھ اس بری طرح رہن ہوں کہ اس قید سے رہائی ابھی دور کی بات معلوم ہوتی ہے۔

اعجاز حسین بٹالوی گھر باہر، اپنے بھائیوں: ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی اور آغا بابر بٹالوی کے بعد یا ساتھ ڈاکٹر داؤد رہبر سے سب سے زیادہ قریب تھے۔ ۱۹۴۲ء میں بقول داؤد رہبر ان کی اعجاز بٹالوی سے ''یاری کا آغاز'' ہوا۔ وہ انھیں ''یارِ غار'' کہتے ہیں۔ داؤد رہبر نے مراسلت کے فن کو ''افسانہ و افسوں'' بنا دیا ہے۔ وہ کوئی چالیس پینتالیس برس سے دیارِ مغرب کے مکین ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

خط لکھنے کا خبط سبھی کو تھوڑے ہوتا ہے!۔ (سلام و پیام ص ۱۴۳)

پردیس میں اچھی ڈاک جیون کا سہارا ہوتی ہے۔ (ص ۴۱۴)

خط لکھنے میں مجھ کو کچھ نشاط میسر ہوتا ہے۔ (ص ۱۹۸)

اچھی ڈاک (میرے لیے) ڈاکٹر سے بہتر علاج ہے۔ (ص ۲۶۷)

''سلام پیام'' ڈاکٹر داؤد رہبر کے خطوں کا مطبوعہ ہے۔ (مطبوعہ لاہور ۱۹۹۶ء) کتاب کا دیباچہ اعجاز بٹالوی نے لکھا ہے۔ اس میں اعجاز صاحب کے نام ڈاکٹر داؤد رہبر کے متعدد خط بھی شامل ہیں۔ یہ خط اعجاز بٹالوی کو جاننے اور سمجھنے کے لیے رہبر نامے یا ''مصدر نامے'' کی سی اہمیت رکھتے ہیں۔

خط نویسی سے اعجاز بٹالوی کے گریز، ان کی علمی، ادبی سرگرمیوں، ان کی تقریباتی مہمات اور پیشہ ورانہ مصروفیات و مرتبت بحیثیت مجموعی ان کی افتادِ مزاج پر ''سلام و پیام'' سے بڑی رہبری اور جانکاری ملتی ہے۔ ڈاکٹر داؤد رہبر، اعجاز بٹالوی کو لکھتے ہیں:

''خدا کے لیے نہ ترساؤ، خط جلد لکھو، دل تم لوگوں کو کیسا ترس گیا'' (ص ۱۴۴۔۱۴۵) ''وہ دن دور نہیں کہ ہمارا شمار چل چلاؤ والے لوگوں میں ہونے لگے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چہار درویش کی طرح ہم ویرانے میں ایک قبر کے کنارے بیٹھے ہوں گے اور آندھی کے باوجود دوستی کا دیا اپنی جنبش لو پر ناز کرے گا۔ اس وقت میرے دل میں سکون ہوگا کہ میں ان دوستوں سے غافل نہ ہوا جو مجھ سے غافل ہوئے۔ (سلام و پیام، ص ۱۴۵)

''مجھی اعجاز تمہارے خط نہ لکھنے کو کاہلی پر ہرگز محمول نہ کروں گا۔ اس کے اسباب اور ہوں گے۔ تمہارے آگے ملک کی مہمات ہیں۔ خدا تم کو قیادت و سیادت کی سعادت دے اور سیاست کی لگام تمہارے ہاتھ

میں ہوں اور ملک و قوم کو نئی منزلیں دکھاؤ، مگر ہم کو بھی پوچھتے رہو'۔ (ص ۱۴۹)

''مجھی اعجاز' کچھ تو لکھو۔ ہائے رے احتیاط نہ رہی یاری کی بات۔ کیا تم' کبھی نہ لکھو گے؟ حکیمانہ سوچو اور لکھو۔ ملکہ رکھتے ہو ہم پڑھیں گے' اسی کو تمہارا خط سمجھ لیں گے۔'' (ص ۱۵۱)

''اعجاز بٹالوی سلام علیکم کس حشر کے انتظار میں ہو؟ پچھلے سال تم کو جو خط لکھا اس کا جواب نہ آیا۔'' (ص ۱۵۶)

''میدان عدالت و وکالت کے شہباز اعجاز بٹالوی کو سلام پہنچے۔۔۔۔۔۔بھائی بابر سے معلوم ہوا کہ تم خط فقط ہوائی جہاز میں بلندیوں پر جا کر لکھتے ہو۔ زمین پر تمہیں فرصت نہیں ملتی'' (ص ۱۶۰)

''اپنی طبیعت پر جبر کر کے ایک خط لکھ دو۔ بھائی بابر کا فرمانا ہے اعجاز ''خط لکھنے کے معاملے میں چور ہے۔ وکالت کے فرائض ادا کر کے فرصت پاتا ہے تو انجمن آرائی کرتا ہے، خط لکھنے سے ہچکچاتا ہے۔ لیکن برادر کب تک ٹالو گے۔ (ص ۴۱۴)

''اعجاز بٹالوی نے جج نہ کیا اور نہ جج بننا قبول کیا۔ اعجاز کی نجات کیسے ہوگی؟ مزاح بر طرف مجھ کو یقیناً خوشی ہوئی کہ اعجاز نے عدل کو عدالت پر ترجیح دی۔ وکالت رنگین پیشہ ہے۔ آرٹسٹ کا پیشہ ہے۔''

(بنام: ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ص ۱۹۱)

''اعجاز ی ۔۔ پچھلے ہفتے بلند بانگ آفتاب احمد خان کا فون آیا۔۔۔۔ ''چوٹی کا'' ایک صفت ہے جو وکیلوں سے مخصوص ہو گئی ہے۔۔۔ آفتاب نے فون کرتے ہوئے بتایا کہ اعجاز کی وکالت اوج کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ اس ٹکر کا وکیل اس وقت پاکستان میں کوئی نہیں۔ مبارک ہو؟ لیکن اپنی صحت کا خیال رکھو؟ فراغت نکال کر قوالی کے ریکارڈ بھی سنا کرو۔ (ص ۴۹۱)

''میرا سلام اور یہ پیغام اعجاز کو پہنچا ئیں کہ وکالت اللہ میاں بھی کرتے ہیں۔ وکیل اسمائے حسنیٰ میں شامل ہے۔ وکیل اس کو کہتے ہیں جس پر تکیہ کیا جائے جو سہارا دے اور دلاسا دے۔ وکالت کے اس پہلو کے بارے میں اعجاز کا کیا خیال ہے؟ مطلب یہ کہ ہم کو سال میں ایک آدھ خط لکھ دیا کرے۔ (بنام ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، ص ۱۸۳)

خط نہ لکھ پانا، مزاج اور حالات کا ایک ایسا جبر تھا جس کے ہاتھوں وہ مجبور محض تھے' یوں بھی خط لکھنا انہیں شاق تھا اور ان کے مزاجی تحرک سے مناسبت نہ کھاتا اور ساز نہ رکھتا تھا۔ بایں وہ اپنے چاہنے والوں کا حد درجہ خیال رکھنے اور انہیں دھیان میں رکھنے والے تھے۔

غالب، ناہنجاروں کی جانب سے نالش کا شکار ہوئے۔ یہ معاملات تاریخ میں گئے۔ یہاں کہنا صرف یہ ہے کہ غالب کے نام کی ''برکت'' کے اثرات اور سائے مجھ پر بھی پڑے! یہ چند برس پہلے کی بات ہے۔ مجھ پر کہ ان معاملات میں بالکل پیدل اور کورا تھا، بوجھ ہوا۔ ان مشکل لمحوں میں منجملہ اصحاب دگر مجھے اعجاز حسین بٹالوی

صاحب سے بڑی اخلاقی قوت اور ڈھارس ملی۔

میرے معاملے میں بعض معقول وجوہ سے وہ منظر عام پر آنے کو اپنی وضع داری سے متصادم خیال کرتے تھے۔ انہوں نے اس معاملے کو روبراہ لانے کے لیے ایک ذی استعداد اور قابل بھروسہ رفیق کار (غائب) احمد اویس صاحب کو موزوں جانا۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ اویس صاحب کی سوجھ بوجھ، پیشہ ورانہ لیاقت، انکی جرأت اظہار اور شخصی وقار کے بارے میں بہت مضبوط رائے رکھتے ہیں اور ایک طرح سے انہیں اپنا مستقبل جانتے ہیں۔

میری موجودگی میں انہوں نے فون پر اویس صاحب کو یہ کوشش پکڑا۔ وہ نیب کے کسی کیس میں اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔ ان سے میرا محبت آمیز غائبانہ تعارف کرایا اور ان سے دو تین دن بعد کا وقت لے کر دیا۔ اور مجھے یقین دلایا کہ اویس صاحب کے جواب کو ایسا ہی جانیے گا، کہ گویا خود میرا تیار کیا ہوا ہے، یوں اپنے اطمینان کے لیے چاہیں تو ڈرافٹ مجھے دکھا دیجئے گا۔ اس بات پر بطور خاص زور دیا کہ درجہ بہ درجہ معاملے کی اونچ نیچ سے باخبر ضرور رکھیے گا۔ بدقسمتی سے میں اویس صاحب کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔ لیکن اعجاز حسین بٹالوی صاحب کی توجہ اور تلطف میرے لیے مستقلاً تقویت کا باعث رہی اور وہ برابر میری خبر گیری کرتے رہے۔

مجھے ان کی مصروفیت اور ان کے وقت کی قیمت اور اہمیت کا اندازہ تھا، اس لیے اکثر صورتوں میں جی چاہنے کے باوجود ان سے رابطہ نہ رکھ پاتا، وہ از رہ لطف خود فون کرتے اور اس حوالے سے جب جب انہوں نے فون کیا مجھے ان کی زبانی فیض کے ان مصرعوں کی گونج یا سماعت کی خوشی میسر آئی:

تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو۔۔۔۔۔ دکھ بتاتے نہیں!

اپنے عشاق سے ایسے بھی کوئی کرتا ہے!؟

کیا بھی فیض تو کس بت سے دوستانہ کیا!

اس معاملے میں ان کا ہمیشہ یہی کہنا رہا کہ اس خیال سے کہ مجھ پر بار نہ ہو، اگر آپ نے اپنا دکھ مجھ سے نہ کہا تو یہ میرے لیے تکلیف دہ بات ہوگی۔ میری دعا رہتی ہے کہ خدا میرے کسی دوست کو آزمائش میں نہ ڈالے، لیکن دنیا نامعقولوں سے کب خالی ہوئی ہے کہ میرے دوست، سدا شر سے محفوظ رہیں۔ ایسی صورت حال پیش آجائے تو دوستوں کا میری پریشانی خاطر کے خیال سے مجھے اپنے معاملات کی پیش رفت سے لاعلم یا بے خبر رکھنا میرے لیے سوا بے چینی کا باعث ہوتا ہے۔ خاص میرے الجھاوے میں ان کا اصرار رہا کہ مدعیان سے ضرور پوچھا جائے کہ مال پر ان کا "دعویٰ" ہے تو انہیں اتنا تو پتہ ہونا چاہیے کہ مبینہ مال کب غتربود ہوا؟ کب تک یہ ان کی تحویل میں رہا۔ اس کی گم شدگی کی ذمہ داری کا تعین کرنے کا انہوں نے کب اور کیا اہتمام کیا؟۔ برآمدگی میں کچھ کشٹ بھی اٹھایا؟ یا پھر وہ بس اسی معصومانہ انتظار میں رہے کہ "مال" لے جانے والے ایک خوشگوار شب یا شام مال کی گٹھڑی از خود ان کے آنگن میں پھینک جائیں گے؟!

غالب کو طرح طرح کے "مقدمات" کا مرکز اور نشانہ بنایا گیا۔ ازالہ حیثیت عرفی کا ایک دعویٰ انہیں واپس بھی لینا پڑا۔ مقدمہ عشق نے بھی انہیں برسوں آزار میں رکھا۔ اعجاز بٹالوی صاحب ان مقدموں کو غالب کے وکیلوں کی نالائقی خیال کرتے تھے۔ اپنی پیشہ ورانہ تحقیق کے حوالے سے اعجاز بٹالوی صاحب نے مقدمات غالب سے منسلک معاملات اور موجود دستاویزات کا بغور مطالعہ کیا اور وکلاء نیز مجاز اور متعلقہ حکام کی کمزوریاں ان پر روشن ہوئیں۔ اس موضوع پر وہ اکثر گفتگو کرتے اور ضروری لوازمات کی کرید میں رہتے۔ وہ برسوں کے غور و فکر کے بعد بجائے خود ایک جوابی مقدمہ صفائی تیار کر چکے تھے۔

بعض ماخذ انہوں نے مجھ سے حاصل کیے۔ وہ اکثر بڑی فراخدلی سے برملا اور برسر عام تقریباتی ملاقاتوں میں اس کا اعتراف و اظہار کر کے شرمندہ کرتے۔ میری کتاب "غالب اور انقلاب ستاون" کے وہ ان چند سنجیدہ قارئین میں سے ایک تھے جنہوں نے اس تالیف کو حرف حرف پڑھا۔ اس کتاب کا غالباً ہر اضافہ شدہ ایڈیشن ان کی نظر سے گزرا۔

دسمبر ۲۰۰۰ء کے بالکل اواخر کی بات ہے۔ عقیل روبی صاحب مجھے ان کے ہاں لے گئے۔ یہ اعجاز بٹالوی کے ساتھ، ان کے گھر پر میری آخری اطمینان بخش ملاقات ٹھہری۔ ملتے ہی انہوں نے داد اور استفسار کے ملے جلے انداز میں کہا کہ پچھلے کچھ عرصے سے آپ کے ہر علمی کام پر ایک آدھ اختلافی آواز ضرور اٹھتی ہے، معلوم ہے کیوں؟ پھر خود ہی کہا کہ اس میں کام کرنے والی شخصیت کی بڑائی مضمر ہے، لطفاً یہ بھی کہا کہ ہر محقق یا مصنف کے یہ نصیب کہاں!

اس روز وہ اپنے خوب صورت سٹڈی میں بھی لے گئے۔ بہت سی چیزیں دکھائیں۔ یہاں انہوں نے بالخصوص اس گوشے کی جانب میری توجہ مبذول کرائی جہاں ہمارے ایک مشترک دوست عبد الوہاب خاں سلیم (نیویارک) کے مراسلات اور علمی عطیات رکھے گئے تھے۔

اعجاز حسین بٹالوی نے ایک سے زیادہ بار بڑے محبت آمیز کلمات کے ساتھ مجھے بتایا کہ انہوں نے میرے نام ایک طویل خط شروع کیا ہوا ہے۔ یہ بہت طویل بھی ہے اور معرکے کا بھی! اس روز بھی انہوں نے اپنے اس خط کا تذکرہ چھیڑا، لیکن میرے کسی قدر اشتیاق کے باوجود انہوں نے اسے میرے سپرد کر دینے کو غیر ضروری یا قبل از وقت جانا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! کاش کہ معرض اظہار میں آ جانے والا یہ خط میں دیکھ اور حاصل کر پاتا!

اعجاز بٹالوی کی محبت اور شفقت، ان کی سخت جانی، ان کی طاقت لسانی، ان کی خوش کلامی، ان کی ذہانت و ذکاوت، ان کی طرحداری، ان کی کج کلاہی اور شہر یاری کس کس کا ذکر کروں۔ یہ سب ان کی ذات سے تھا اور ان کے ساتھ گیا!

گزرے جس دم "وہ" دنیا سے

ہم نے جانا دنیا گزری
کس سے کہیے کون سنے گا
کیا کیا گزرا، کیا کیا گزری!

ڈاکٹر داؤد رہبر نے ۱۹۸۰ میں جو بات کسی اور سیاق و سباق میں کہی تھی وہ مجھے اعجاز بٹالوی کے انتقال پر بھی برمحل معلوم ہوتی ہے: ''اعجاز کو جو یاد کرے گا، خدا کو بھی یاد کرے گا، اور بے اختیار کہہ اٹھے گا ''نعم المولیٰ ونعم الوکیل'' ہر اعجاز، سنسنی خیز ہوتا ہے!۔۔'' (ص ۱۶۵) اعجاز بٹالوی سے محرومی کا سانحہ سنسنی خیز ہی نہیں، حد درجہ دل دوز بھی ہے۔ خدا اسے ان کی بیگم فلاحت، بچوں، شاگردوں، احباب اور اقارب کے لیے قابل برداشت بنائے اور انہیں آسودۂ خاک رکھے۔

حلقہ ارباب ذوق لاہور کی ایک نشست غالب پر اعجاز حسین بٹالوی صاحب کے مقالے کے لیے مخصوص کی گئی۔ حلقے کے فاضل سیکرٹری نے مجھے فون پر اس کی اطلاع دی۔ میں نے کہا کہ حلقوں وغیرہ کی نشستوں میں شریک ہونا میرا معمول نہیں لیکن اعجاز بٹالوی صاحب کو سننا ایک بڑی نعمت ہو گی، بالخصوص غالب پر ـــــ میں حاضر ہوں گا۔ انہوں نے کہا کہ اس اجلاس کی صدارت بھی آپ کریں گے ـــــ مجھے یہ بڑا عجیب لگا۔ میں نے اپنے محدودات کے حوالے سے معذرت کی اور کہا کہ بطور سامع ضرور حاضر ہوں گا۔ انہوں نے کہا کہ ''آپ آیئے تو ـــــ '' یہ بات کچھ اس لہجے میں کہی گئی کہ میں نے وضاحت چاہی: ''میں آؤں اور آپ عین وقت پر میری صدارت کا اعلان فرما دیں، یہ ہنسی کی بات ہو گی۔ اگر آپ اس طرح کی صورت حال پیدا نہ ہونے یا نہ کرنے کی ذمہ داری لیں تو میں آؤں ورنہ بہ حسرت و یاس بطور سامع بھی میں شریک ہونے سے معذور ہوں گا اور محروم رہوں گا۔ اگر چہ جس عزت اور محبت سے آپ نے دعوت دی ہے، اس کا بہر طور احسان مند رہوں گا۔''

اس پر حلقے کے سیکرٹری صاحب نے فرمایا کہ آپ کی صدارت کی بات خود اعجاز بٹالوی صاحب نے کہی ہے۔ میں محرک نہیں' اس تجویز کا پر زور تائید کنندہ ضرور ہوں! میں نے عرض کیا کہ اعجاز بٹالوی صاحب مجھ ایسے ''خورد'' کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہ ان کی بڑائی ہے لیکن میں اسے مان لوں، اس میں مجھے کوئی بھلمنساہٹ اور معقولیت دکھائی نہیں دیتی، یہ سوئے ادب ہو گا کہ میں کسی ایسی تقریب کی صدارت کروں جس کے تنہا مقرر اعجاز حسین بٹالوی صاحب ہوں۔ میں مزاجاً تقریبات کا آدمی نہیں اور شدت سے اس پر عامل بھی ہوں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔

کچھ دیر بعد اعجاز بٹالوی صاحب کا فون آیا کہ آپ نے انکار کیوں کیا؟ ـــــ میں نے عرض کیا کہ غالب پر آپ کو سننا میرے لیے سعادت کی بات ہے لیکن یہ میری ''وضعداری'' کے منافی ہو گا۔ میں تقریبات میں نہیں جاتا۔ پھر یہ تو حد درجہ نامناسب اور ناہموار بات ہو گی کہ تقریب آپ ایسے صاحب کمال اسکالر کی ہو اور اس کی صدارت میں ''فرماؤں''! میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں جانتا۔ اعجاز بٹالوی صاحب نے فی الفور کہا کہ وہ

الگ الگ باتیں ہوئیں:

(۱) کیا اپنے کسی طے شدہ مفروضے یا منطق کی بنیاد پر آپ کسی ادبی جلسے میں نہیں جاتے؟ ـــــ میں نے کہا ''جی بالکل! آپ ہی یاد کیجئے لاہور کی کسی تقریب میں آپ نے مجھے دیکھا ہو۔'' کہنے لگے ایسا ہی ہے تو ''وضعداری'' کو ترک کرنے پر اصرار نہیں کرتا، اس کی قدر کرتا ہوں اگر اسے معقول سمجھوں یا نہ سمجھوں!''

(۲) آپ کی دوسری بات کو کہ آپ کسی ایسی علمی تقریب کی ''صدارت'' کرنے کے مکلف یا متحمل نہیں جس میں ''تنہا مقرر'' میں ہوں ـــــ امید ہے میرے عدم اتفاق کی آپ تائید کریں گے۔ عرض کیا کہ: ''تائید'' نہ کرنا بھی سوئے ادب اور ''صدارت فرمانا'' بھی!

اپنے بس کی بات ہی کیا ہے، ہم سے کیا منواؤ گے!

اعجاز بٹالوی صاحب نے برجستہ فرمایا کہ: ''فیض صاحب کے جس شعر کا دوسرا مصرعہ آپ نے پڑھا ہے اس کا پہلا مجھ سے سن لیجئے:

''عہد وفا یا ترک محبت جو چاہو سو آپ کرو!''

اعجاز بٹالوی صاحب کی دانشوری اور خوش گفتاری، ان پر ختم ہوئی اور ذاتی طور پر میں ایک بے بدل اور بے مثل کرم فرما کی رفاقت اور شفقت سے محروم ہو گیا:

دل کے تئیں اس راہ میں کھو، افسوس کناں اب پھرتا ہوں
یعنے رفیق شفیق پھر ایسے میر کہاں میں پاؤں گا!

(لاہور، ۲۰۔ مارچ ۲۰۰۴ء)

اعجاز صاحب

عبدالقادر حسن

لاہور کے ایک انتہائی خوشگوار اور نکتہ آفریں شخص اعجاز بٹالوی کو میں نے پہلی بار ریڈیو پاکستان لاہور میں دیکھا۔ یہاں میرے چند دوست سینئر عہدوں پر کام کرتے تھے اور مجھ پر شفقت کرتے تھے۔ اظہار کاظمی' الیاس عشقی' شاد امرتسری' امین الرحمن اور بعض دوسرے ریڈیو کے کارکن میری پذیرائی فرماتے تھے۔ میں بچوں کے پروگرام لکھا کرتا تھا بعد میں خبروں کا ترجمہ بھی شروع کر دیا۔ بٹالوی صاحب ریڈیو کے ملازم نہیں تھے مگر یہاں کئی پروگراموں میں حصہ لیتے تھے اور کمرہ بہ کمرہ چہکتے مہکتے اور اپنی غیر معمولی خوبصورت گفتگو سے سب کو محظوظ کرتے تھے۔ اخلاق احمد دہلوی انہیں بے تکلفی میں اعجاز بٹالے والا کہتے تھے۔ اعجاز صاحب سے یہاں کا تعلق صرف انہیں دیکھنے سننے کی حد تک تھا۔ میں بہت جونیئر تھا۔ ادبی مجلسوں میں بھی ان کو دیکھا کرتا تھا۔ جن میں وہ باقاعدگی کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ اس زمانے میں' میں ہفت روزہ لیل و نہار میں کام کرتا تھا اور اعجاز صاحب کا اس ادبی و سیاسی پرچے کے دفتر میں آنا جانا رہتا تھا۔ لیکن وہ روشن خیال تھے' کمیونسٹ نہیں تھے' جبکہ لیل و نہار کے مدیران فیض صاحب اور سید سبط حسن سکہ بند کمیونسٹ لیڈر تھے۔ مگر اعجاز صاحب کی اپنی ایک شخصیت تھی اور وہ کسی ایسے مخصوص نظریئے کے پابند نہ تھے۔ میں ادیب نہ تھا اس لئے ان کے ادبی دور میں ان سے برائے نام رابطہ رہا' تعلقات میں اضافہ یا تعلقات کا آغاز تب ہوا جب وہ ایک قانون دان کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔

وکیل بننے کی وجہ وہ یہ بتاتے تھے کہ لاہور کے علاقہ ماڈل ٹاؤن میں انہیں جو مکان الاٹ ہوا وہ کسی وکیل کا تھا۔ مطالعے اور علم میں نئی راہیں تلاش کرنے والے اس شخص نے یہاں موجود قانون کی کتابیں پڑھنی شروع کر دیں وار اپنی قانون دانی کا آغاز لاء کالج میں لیکچر دینے سے کیا۔ گفتگو کے اس بادشاہ کے لئے وکالت کا پیشہ آئیڈیل تھا' چنانچہ وہ اس پیشے میں درجہ کمال حاصل کر گئے۔ اتفاق سے انہیں بعض مشہور مقدمات بھی مل گئے اور ان کی قانونی صلاحیتیں اتنی اجاگر ہوئیں کہ ان کا شمار اونچے وکلاء میں ہونے لگا۔ اسی دوران ان کے ساتھ میری رشتہ داری بھی قائم ہو گئی اور باہمی تعلقات میں بے تکلفی کے ساتھ ساتھ اعتماد بھی بڑھتا گیا۔ قدرت نے

انہیں بڑے دونوں بھائیوں مرحوم عاشق حسین بٹالوی اور آغا بابر کی طرح بلا کی ذہانت عطا کی تھی۔ آخری دنوں میں جب وہ ابھی صاحب فراش نہیں ہوئے تھے انہوں نے مجھے اپنے اور دونوں بھائیوں کے بارے میں چند مضامین کے تراشے بھجوائے اور بعض دوسرے موضوعات پر بھی۔ شاید وہ اپنے بھائیوں اور ضمناً اپنے بارے میں بھی کچھ لکھوانا چاہتے تھے۔ خود انہوں نے اس سے پہلے کبھی ایسی خواہش ظاہر نہیں کی تھی اور نہ ہی انہیں اپنی کسی مزید شہرت کی ضرورت تھی لیکن پھر بھی انہوں نے یہ مواد بھجوایا۔ مگر میں اس کے پیچھے ان کی خواہش کو بھانپ نہ سکا۔ اگر ان کی خواہش تھی تو مجھے اس کے پورا نہ کرنے کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔

اتفاق کی بات ہے کہ ۱۱-۹ کے امریکی حادثہ کے دوسرے روز ایک عزیز کے ہاں ان سے ملاقات ہو گئی۔ وہ دور پار کے عزیزوں کی غمی خوشی میں لازماً شریک ہوتے تھے۔ میں نے اس واقعہ کا ذکر کیا جو ہر ایک کی زبان پر تھا تو انہوں نے ایک ایسا جملہ کہا جو اپنے اندر حال اور مستقبل کے مضمرات کا ایک ہجوم سمیٹے ہوئے تھا۔ انہوں نے فی الفور کہا اب خود امریکہ نہ وہ رہے گا جو اس سے پہلے تھا اور نہ پوری دنیا کو وہ رہنے دے گا جو اس سے پہلے تھی۔ ان کی یہ بات ہم دیکھ رہے ہیں کہ حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ ان کی گفتگو کا حسن صرف الفاظ اور ان کی خوبصورت انداز میں ادائیگی میں ہی نہیں بلکہ یہ ان کی ذہانت اور گہری سوچ کا بھی مظہر ہوتی تھی۔ اعجاز مرحوم کی باتوں کا اعجاز یہ تھا کہ وہ جس محفل میں موجود ہوتے سب کی خواہش یہ ہوتی کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ اعجاز باتونی نہیں تھے کہ کسی کو بولنے نہ دیتے' بلکہ وہ بحث و مباحثہ کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ لیکن یہ الگ بات ہے کہ کسی مجلس میں شریک لوگ گفتگو کا موقع انہیں ہی دیتے کہ اس میں جو لذت تھی وہ کسی کی باتوں میں نہیں تھی۔ ایک بار لندن سے واپسی پر میں نے دیکھا کہ وہ بھی اسی جہاز میں سوار ہیں۔ پوچھا کیسے آنا ہوا۔ بتانے لگے کہ انگریزوں کو انگریزی لٹریچر پر لیکچر دے کر آ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ انگریز ان کی زبان سے اپنی زبان کی باتیں سن کر بہت متاثر ہوتے ہوں گے کہ ان کی تقریر کسی بھی زبان میں ہو برابر کی لذت رکھتی تھی۔ ان کے قریبی ادبی دوستوں کا کہنا ہے کہ ان کا اصل میدان ادب تھا لیکن وہ وکالت کی طرف نکل گئے۔ یہ وکالت ہی ان کا ذریعہ معاش تھی ورنہ صرف ادب کی خدمت میں وہ کیسے ایک بہتر زندگی بسر کر سکتے تھے۔ ان کی ایک خوش نصیبی یہ ہوئی کہ انہیں ایک نہایت ہی اچھی شریک حیات مل گئیں۔ باجی فلاحت نے ان کی بڑی خدمت کی اور ان کی ادبی و قانونی مصروفیات میں ان کی مکمل معاونت کی۔ گھر کا بہتر اور آسودہ ماحول ان جیسے ذہنی کام کرنے والے کے لئے ضروری تھا' جو قدرت نے انہیں عطا کر دیا۔ میں اکثر ان کے معنی خیز اور برمحل فقرے یاد کر لیتا تھا اور انہیں اپنے کالموں میں استعمال کر لیتا تھا وہ اپنا کوئی فقرہ دیکھ کر اس ضمن میں مزید کئی نکات بیان کر دیتے تھے۔ ایک بار میں ان کے پاس کسی دوست کا مقدمہ لے کر گیا تو انہوں نے فائل دیکھنے کے بعد رائے دی کہ اس میں جان نہیں ہے اس لئے کسی دوسرے وکیل کو دے دیں۔ ہر وکیل کی طرح فیس بھی انہیں مطلوب تھی لیکن صرف کسی ایسے مقدمے کی جس میں وہ کچھ کہہ سکیں اور کسی قانونی نکتے کو قابو کر سکیں محض فیس کے لئے انہیں مقدمے لڑنے ہوتے

تو میرا یہ مقدمہ وہ ضرور لے لیتے جس میں مدعی ایک بڑی موٹی آسامی تھی اور اعجاز بٹالوی کو وکیل کرنے پر مصر تھی۔

اعجاز صاحب اس شہر میں ایک بڑا خلا چھوڑ گئے ہیں۔ ان جیسا ایک دوسرے انداز کا صاحب گفتار جناب اشفاق احمد ہیں جو ان دنوں بیمار ہیں۔ محفلوں پر چھا جانے والی کوئی تیسری شخصیت اس لاہور میں دکھائی نہیں دیتی۔

اعجاز حسین بٹالوی

امجد اسلام امجد

غالب نے اپنے بارے میں ''شاعر نغز گوئے و خوش گفتار'' کے اسمائے توصیفی استعمال کیے تھے۔ اعجاز حسین بٹالوی مرحوم باقاعدہ شاعر تو نہیں تھے (اگرچہ ان کے حوالے سے کچھ منظومات کا سراغ ملتا ہے) لیکن ''خوش گفتار'' وہ یقیناً تھے اور اس فن میں انہیں ایسا کمال حاصل تھا کہ بہت کم لوگ ان کی ہم سری کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ ہمارا ان سے نیاز مندی کا سلسلہ کم و بیش چار دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے کہ وہ ان سینئرز میں سے تھے جنہوں نے ہماری شاعری کے ابتدائی دور میں ہی ہم پر توجہ کی اور اپنے تعریفی کلمات سے ہمارا حوصلہ بڑھایا۔ ان دنوں وہ حلقہ ارباب ذوق کے جلسوں میں اکثر آیا کرتے تھے اور جلسے کی بعد پاک ٹی ہاؤس میں ان کی میز سب سے زیادہ آباد ہوا کرتی تھی۔ اپنے اشفاق صاحب کی طرح ان میں بھی قصہ گوئی کی صلاحیت فطری طور پر موجود تھی۔ سو وہ کوئی پرانی اور سنی ہوئی بات بھی کرتے تو ان کے منہ سے وہ نئی نئی لگتی تھی۔ ان دنوں وہ افسانے بھی لکھا کرتے تھے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے ''نقوش'' کے کسی شمارے میں ان کا افسانہ ''دس پیسے کے بارہ'' (غالباً یہی نام تھا) شائع ہوا اور ہم نے محسوس کیا کہ ان کی تحریر میں بھی وہی شگفتگی اور سحر کاری ہے جس کا احساس ان سے بات کرتے وقت ہوتا تھا۔

انہی دنوں ہم نے عینی آپا کا ''آگ کا دریا'' پڑھا تو بٹالوی صاحب کی شخصیت سے اور زیادہ مرعوب ہو گئے کہ قرۃ العین حیدر جیسی بڑی ادیبہ نے اس میں ان کا ذکر غیر معمولی محبت اور احترام سے کیا تھا۔ جب ہم پنجاب آرٹ کونسل سے منسلک ہوئے تو ان کے بڑے بھائی آغا بابر مرحوم سے ایک دفتری تعلق پیدا ہو گیا ان کے افسانے پڑھنے اور ملاقات کرنے سے پتہ چلا کہ دونوں بھائیوں میں بہت سی قدریں مشترک ہیں۔ آگے چل کر ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی صاحب کے علمی و ادبی کمالات سے آشنائی ہوئی تو کھلا کہ ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' اردو ادب کی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا خاندان ہو جس میں بیک وقت تین بھائیوں نے اپنے اپنے میدان میں اتنی شہرت اور ناموری حاصل کی ہو۔ اعجاز حسین بٹالوی پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے اور اس میدان میں بھی ان کا

ڈنکا بجتا تھا کہ ہم نے بڑے بڑے ججوں اور نامور وکلاء کو ان کا نام ہمیشہ عزت سے لیتے دیکھا ہے اور ان کے شاگرد تو ان کے دیوانے تھے جو اعجاز صاحب کی کلاسوں میں گزارے ہوئے وقت کو اپنی تعلیمی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے۔

وہ ایک بہت عمدہ براڈ کاسٹر بھی تھے اور جن لوگوں نے ریڈیو پر ان کی آواز سنی ہے وہ اس کے گواہ ہیں کہ وہ "خوش گفتاروں" کی صف اول کے آدمی تھے۔ چند برس پہلے انہوں نے اپنے گھر پر ہونے والی ایک ملاقات میں "حلقہ ارباب ذوق" کے ابتدائی دنوں سے متعلق کچھ دستاویزات ہمیں دکھائیں جنہیں وہ ایڈٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس حوالے سے ایسی دلچسپ باتیں سنائیں کہ اب تک ان کا لطف ہمارے حافظے میں ایک خوشگوار یاد کی طرح محفوظ ہے۔ پتہ نہیں وہ انہیں لکھ پائے کہ نہیں!!

اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود ہماری اور عطاء الحق قاسمی کی ہر دعوت پر انہوں نے ہمیشہ مہربانی کی۔ نہ صرف تشریف لائے بلکہ آخر تک بیٹھتے اور ہر بار کوئی نہ کوئی ایسی بات سنا کر جاتے کہ ہمیں یوں محسوس ہوتا جیسے ہم ان لوگوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جو ہمارے ہوش سنبھالنے سے پہلے اس دنیا سے جا چکے ہیں۔ اس پر مستزاد ان کی حس ظرافت تھی کہ وہ ان محبوب لوگوں کی باتیں اس طرح سناتے کہ وہ محبوب تر محسوس ہونے لگتے تھے ہمیں یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ ہم ان کے ان گنتی کے چند جونیئرز میں سے ہیں جن پر انہوں نے مضامین لکھے۔ وہ ان بزرگوں میں سے تھے جنہوں نے بڑھاپے کو تسلیم تو کیا مگر کبھی اسے خود پر طاری نہیں ہونے دیا۔ ان کی آنکھوں اور آواز میں وہی روشنی اور شگفتگی تھی جو ہم نے ابتدائی ملاقاتوں میں دیکھی اور محسوس کی تھی ان کی باڈی لینگوئج میں ایسی اپنائیت تھی کہ ان کا مخاطب ان کی توجہ سے شرابور ہو جاتا تھا۔ وہ خوش وضع اور خوش لباس بھی تھے۔ جس محفل میں جاتے ان کی شخصیت نمایاں رہتی تھی اور اس سونے پر سہاگے کا کام ان کی خوش گفتاری کرتی تھی کہ بڑے بڑے بولنے کے شوقین اور ماہران کے سامنے خوشدلی سے سامعین بن جاتے اور ان کی محفل سے اٹھنے کا حوصلہ کم لوگوں کو ہوتا تھا۔

اعجاز حسین بٹالوی صاحب کی رحلت سے لاہور شہر اور اردو ادب اپنے ایک بے مثال "ساتھی" سے محروم ہو گیا ہے اور وہ خلاء وسیع تر ہو گیا ہے جسے پر کرنے والے اب دور دور تک نظر نہیں آتے۔

اعجاز بٹالوی......ایک عظیم انسان

ہمایوں گوہر

افسوس کہ اس نسل کے لوگ جو یہ کہہ سکتے تھے کہ وہ قیام پاکستان کے وقت موجود تھے تیزی کے ساتھ دنیائے فانی سے رخصت ہو رہے ہیں۔ زندگی کے ناگزیر اور خوفناک پہلوؤں میں سے ایک یہ ہے کہ اسے اس جہاں میں بہرحال انجام کو پہنچنا ہے جس کے بعد اگلی زندگی کا سفر شروع ہوگا۔ حال ہی میں دنیا سے رخصت ہونے والی شخصیت اعجاز حسین بٹالوی ہیں جو ایک غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل وکیل تھے جن کی شخصیت ان کے کیریئر کی طرح ممتاز اور رنگین تھی مگر ان سے متعلقہ نسل کے بارے میں انتہائی غیر معمولی بات یہ تھی کہ 'جیسا کہ میں نے اپنے والد الطاف گوہر کے انتقال پر لکھا (دی نیشن ۲۶ نومبر ۲۰۰۰ء) کہ 'اس نے ہجرت کئے بغیر تین بار اپنی قومیت تبدیل کی۔ بٹالوی خاندان نے قیام پاکستان کے وقت پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کیا اور اگست ۱۹۴۷ء میں بٹالہ سے لاہور منتقل ہو گیا۔ پہلے انہوں نے ٹمپل روڈ لاہور پر ایک پر ہجوم گھر میں رہائش اختیار کی اور بعد ازاں انہیں ماڈل ٹاؤن میں ایف ۸۳ اور ایف ۸۴ نمبر کے مکانات الاٹ کر دیئے گئے اور جہاں ان کی رسم سوئم ادا کی گئی۔

دیگر لوگ اعجاز بٹالوی مرحوم کی زندگی کو ان قانونی کیسوں کے حوالے سے دیکھیں گے جو انہوں نے لڑے جس میں یوسف رینا نا کیس۔ اٹک سازش کیس۔ گنگا ہائی جیکنگ اور ذوالفقار علی بھٹو قتل کیس وغیرہ شامل ہیں اور جو انہوں نے لیگل کیریئر میں لڑے اور کسی قسم کا سرکاری عہدہ قبول نہ کر کے خواہ یہ بنچ میں شمولیت ہو یا کابینہ میں' اپنے کیریئر کو داغدار نہ ہونے دیا حالانکہ کئی بار انہیں اس قسم کے عہدوں کی پیشکش کی گئی۔ مگر بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ان کی تحریروں کا ذکر کریں گے۔ بعض لوگ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران ریڈیو پر ان کی ان حوصلہ افزا باتوں کو یاد کریں گے جو وہ میرے انکل تجمل حسین کے ہمراہ کرتے رہے تھے۔ شاید یہ کسی کو بھی یاد نہ ہو کہ وہ ایک دفعہ انٹرنیشنل فیڈریشن آف ماڈرن لینگوئجز اینڈ لٹریچر کے نائب صدر بھی رہ چکے تھے۔ میں آسانی کے ساتھ ان کی زندگی کے کوائف نکال کر ان پر ایک آرٹیکل لکھ سکتا تھا مگر ایک انسان کی شخصیت درحقیقت اس کی کامیابیوں سے بڑھ کر اور زندگی کی کوائف سے کہیں بڑھ کر ہوتی ہے۔ میں ایک ایسے شخص کا تذکرہ کروں گا' ایسا انسان جو

نسلوں کا دوست تھا اور وہ شخص جو عمر میں مجھ سے ۳۶ سال بڑا تھا مگر جس کے ساتھ میرا ناطہ اس نوعیت کا تھا کہ گویا وہ میرا ہم عمر ہو۔

اعجاز بٹالوی کی شخصیت ایک بہت بڑے نرم و گداز کمبل کی سی تھی جس نے تمام نسلوں کو اپنی حرارت کی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ان کے بارے ہر کسی کی رائے یہ تھی کہ ایک بار جسے ان کی صحبت نصیب ہو جاتی وہ پھر عمر بھر کے لئے انہی کا ہو کے رہ جاتا تھا۔ مجھے یہ افتخار حاصل ہے کہ میں نہ صرف انہیں اپنے والد کے دوست کی حیثیت سے جانتا ہوں بلکہ ان لوگوں میں بھی شامل ہوں جو اس وسیع و عریض کمبل کی لپیٹ میں تھے۔ وہ میرے والد کے قریب ترین دوستوں میں سے تھے اور دانشوروں کی سطح پر غالباً قریب ترین۔ بٹالوی مرحوم کی زندگی میں اس قدر وسعت تھی کہ وہ نہ صرف میری زندگی کا ایک حصہ تھے بلکہ ایسا لگتا ہے کہ ان کے جانے سے ایک نسل دنیا سے چل دی۔ یہاں تک کہ میرے بچوں کا بھی کہنا ہے کہ مرحوم کی دنیا سے رخصتی کے ساتھ وہ اپنے بچپن کے ایک حصے سے محروم ہو گئے۔ اس طرح دو نسلیں چلی گئیں۔ میری بچیوں کو اچھی طرح یاد ہے کہ جب وہ ۸ اور ۶ سال کی عمر میں پہلی بار چھٹی پر لاہور گئیں تو اعجاز دادا انہیں قومی عجائب گھر' قلعہ اور بادشاہی مسجد دکھانے کے لئے لے گئے۔ وہ لڑکیوں کو پورا دن بچوں کے لئے قابل فہم انداز اور زبان میں ان مقامات کے بارے میں داستانیں سناتے رہے۔ بچوں کو چند منٹوں کے لئے بھی اپنی طرف متوجہ رکھنا مشکل ترین کام ہے چہ جائیکہ پورا دن انہیں متوجہ رکھا جائے۔ مگر اعجاز بٹالوی ایک غیر معمولی قسم کے داستان گو بھی تھے اور اس معاملے میں غالباً صرف ان کے بھائی ممتاز مورخ عاشق حسین بٹالوی ہی ان سے آگے تھے۔ دونوں بھائی نہ صرف ایک معمولی کہانی کو ایک دلچسپ داستان کے طور پر پیش کرنے کے ماہر تھے بلکہ اسے ایک متاثر کن اور لچھے دار سٹوری بنانے میں بھی زبردست مہارت رکھتے تھے۔ سیر سے واپسی پر انہوں نے میرے والد کو بتایا کہ انہوں نے ایک خوبصورت دن گزارا اور اسی شب انہوں نے میری بیٹیوں کو اپنی ماڈل ٹاؤن کی رہائش گاہ پر مہمان خصوصی کے طور پر ڈنر پر مدعو کیا۔ میرے والدین میری اہلیہ اور میں دیگر مہمانوں میں شامل تھے۔ عام طور پر اس عمر کے بچے دن بھر کی سیر و تفریح کے بعد جسمانی تھکاوٹ اور ذہنی طور پر سیر ہو جانے کے باعث جلد سو جاتے ہیں مگر اعجاز دادا کی باتوں میں وہ کشش تھی کہ بچوں نے ڈنر میں خوب سیر ہو کر کھایا۔ جونہی ہم ان کے گھر میں داخل ہوئے میری بیٹی فضیلہ نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ شادی شدہ ہیں۔ اس کا سوال اس انداز کا تھا گویا کہ وہ کسی ہم عمر کے ساتھ بات کر رہی ہو۔ انہوں نے اس سوال کا اثبات میں جواب دیا اور کہا آئیے میں اپنی اہلیہ فلاحت کے ساتھ آپ کا تعارف کراؤں۔ انہوں نے بچوں کے ساتھ برابر عمر کے افراد کا سا رویہ رکھا اور انہیں ایسا محسوس کرایا' گویا کہ وہ بچے نہیں بلکہ جوان اور بالغ ہیں اور ان کے ساتھ بچوں کی سی زبان یا انداز اختیار نہیں کیا۔

کئی سال پہلے ۱۹۷۲ء میں اعجاز بٹالوی کی اس وقت کے امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے کو ۱۹۶۰ء سے جانتے تھے واپسی پر اپنی گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے ہنری کسنجر

ان کے ساتھ والی سیٹ پر اور حامد جلال پچھلی نشست پر تھے۔ بٹالوی نے ہنری کسنجر سے سوال کیا کہ ہنری صاحب کئی تہذیبیں آئیں اور گئیں۔ مجھے ایسے دو عوامل کے بارے میں بتایئے جو آپ کے خیال میں امریکہ کے زوال کا سبب بن سکتے ہیں۔ اس پر کسنجر نے فیصلہ کن انداز میں کہا ہماری تہذیب تمام تہذیبوں سے زیادہ مستحکم اور ترقی یافتہ ہے۔ اس پر کبھی زوال نہیں آئے گا۔ مگر ۱۱ستمبر کو میرے اللہ نے ان دونوں کی نسل ہی کو ایک تبدیلی دکھا دی۔ میں محسوس کرتا ہوں بلکہ خدشہ محسوس کرتا ہوں کہ ہماری نسل کے اگلے جہان سدھار جانے سے پہلے ہی ہم اس سے بھی بڑی تبدیلی دیکھیں گے۔

اعجاز بٹالوی اور الطاف گوہر کی پہلی ملاقات گورنمنٹ کالج لاہور کی اردو مقررین کی ٹیم کے ارکان کے طور پر ہوئی۔ انہوں نے اردو کے مرکز علی گڑھ یونیورسٹی کو شکست دے کر آل انڈیا ڈیبیٹنگ ٹرافی جیت لی۔ مگر اس کے بعد اردو زبان کو موثر حیثیت ملنا شروع ہوگئی اور اسے پنجاب میں فائدہ بخش انداز میں جگہ مل گئی۔ ان کے اساتذہ میں صوفی تبسم، پروفیسر سراج الدین سوندھی، فیض، پطرس اور ذوالفقار علی بخاری شامل تھے۔ یہ ایسے نام ہیں جن کی حیثیت آسمان پر ستاروں کی سی ہے۔ انہیں کیمبرج یا آکسفورڈ جانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ انہوں نے آل انڈیا ریڈیو جائن کر لیا۔ میرے والد نے پشاور اور اعجاز بٹالوی نے دہلی میں ملازمت اختیار کی جہاں ضیا جالندھری اور ظہور الظہیر ان کے باس اور معروف شخصیت پطرس ڈائریکٹر جنرل تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اعجاز بٹالوی کو فوج میں لے لیا گیا مگر جلد ہی نکال باہر کر دیا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ میں بہت سا عرصہ چاند پر نظریں جمائے رکھنے اور شعر لکھنے میں صرف کر دیا کرتا تھا حتیٰ کہ ان کے برطانوی کمانڈنگ آفیسر نے انہیں کہا مجھے افسوس ہے کہ ہم آپ کی سروس برقرار نہیں رکھ سکتے۔ اعجاز بٹالوی کو اس پر مایوسی بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ ''بہت اچھا جناب نقصان تمہارا ہی ہوگا'' انہوں نے ترکا سا جواب دیا۔ اعجاز چچا میرا خیال قطعاً ایسا نہیں ہے کیونکہ آپ جس قدر بلا کے ذہین تھے اس قسم کے شخص کو کبھی جنرل نہ بنایا جاتا۔

تقسیم ہند کے بعد اعجاز بٹالوی لنکن ان میں قانون کی تعلیم کے لئے برطانیہ چلے گئے۔ میری والدہ نے مجھے بتایا کہ جب وہ خدا حافظ کہنے کے لئے آئے تو اس وقت میری عمر صرف پانچ ماہ تھی مگر انہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا جب میں واپس آؤں گا تو تم جوان ہو چکے ہو گے۔ وہ ۷ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو کراچی سے ایس ایس چترال نامی بحری جہاز میں سوار ہوگئے اور ۲۸ اکتوبر کو لندن پہنچ گئے۔ میرے والد اکثر مجھے بتایا کرتے تھے کہ قانون کی پریکٹس کے ابتدائی دنوں میں اعجاز بٹالوی کس قدر عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ میرے جوان ہونے سے بہت پہلے واپس آ گئے تھے کیونکہ پاکستان واپس نہ آنے کا خیال تک بھی ان کے دل میں نہ آ سکتا تھا۔ ان کے پریکٹس کے ابتدائی دنوں میں ان کی عسرت بھری زندگی کی کہانی سن کر میرے دل میں کبھی وکیل بننے کا خیال نہ آیا۔ آج کے مقابلے کو دیکھ کر بعض اوقات مجھے افسوس ہوتا ہے۔ اعجاز بٹالوی کا مقابلہ انتہائی شاندار لوگوں سے کیا جاتا ہے۔ ان میں منظور قادر، محمود علی قصوری اور اے کے بروہی جیسے لوگ شامل ہیں۔ انہوں نے کچھ وقت

منظور صاحب کے ساتھ کام کیا۔ وہ پاکستان کے بہترین فوجداری وکیل تھے اور اللہ کا شکر ہے کہ انہوں نے مایوسی کے دور میں جن ملٹی نیشنل فرموں کو درخواستیں بھیجیں ان میں سے کسی نے بھی انہیں انٹرویو تک کے لئے نہ بلایا۔ کہا جاتا تھا کہ ان کی جرح کا سامنا کرنا ذہن کو سفوف بنا دینے والا تجربہ ہوا کرتا تھا وار ان کی نگاہوں میں عقابی قوت ہوا کرتی تھی۔ مجھے حیرت ہے کہ اب جبکہ میرے سر کے بال جھڑ چکے ہیں انہوں نے اپنے گنجے پن کو چھپانے کا اہتمام کس طرح کیا حالانکہ سر سے گنجے تھے۔ یہ یقیناً ان کی شخصیت کا اعجاز ہے۔ اپنے دوست گوہر کی طرح اعجاز بٹالوی بھی پروسٹیٹ کینسر سے موت کا شکار ہوئے۔ انہوں نے جوانمردوں کی طرح موت کو گلے سے لگایا۔ وہ اس قدر عاقل تھے کہ موت کا انہیں قطعاً خوف نہ تھا کیونکہ خوف وجود کو مٹا کر رکھ دیتا ہے اور انسان کو گوشہ گمنامی میں دھکیل دیتا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری روز انہیں گھر کے برآمدے میں لے جایا گیا تاکہ وہ آخری بار اپنے محبوب شہر لاہور کی ہوا کے جھونکوں کو اپنی سانسوں میں بسا سکیں۔ اس کے خوبصورت درختوں اور آسمان کو دیکھ سکیں اور پرندوں کی چہچہاہٹ سن سکیں۔ انہوں نے اپنا رخ بیٹے سلمان کی طرف کیا اور کہا کہ میری زندگی بچانے کے لئے اتنی دوڑ بھاگ نہ کرو۔ اب کھیل ختم ہو چکا ہے۔ انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا مگر جب واپس لایا گیا تو انہوں نے اپنی اہلیہ کو مخاطب ہو کر کہا اچھا فلاحت جی خدا حافظ۔ جس پر انہوں نے اپنے شوہر کو کلمہ پڑھنے کو کہا جس پر انہوں نے آہستگی سے لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ پڑھا۔ اس کے بعد انا للہ وانا الیہ راجعون کے الفاظ ادا کئے اور اس کے ساتھ ہی ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ صرف تھکا ہوا جسد خاکی باقی رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے۔ آمین۔

کچھ باتیں اعجاز حسین بٹالوی کی

سرفراز سید

اعجاز بٹالوی بڑی خاموشی سے چلے گئے۔ اخبارات میں اچانک خبر چھپی کہ اعجاز بٹالوی رخصت ہو گئے۔ کچھ عرصہ سے علیل تھے صحت اور زندگی نے وفا نہ کی۔ وہ اپنے ساتھ بہت سی یادیں بہت سی باتیں لے گئے! ایک نامور قانون دان' بہت اچھا افسانہ نگار' نقاد' محقق' حلقہ ارباب کے قدیم ترین رکن اور اس حلقہ کے اس زمانہ کے دلیر اور بے باک سیکرٹری جب ایوب خان کے مارشل لاء میں فوج کے باوردی افسر پاک ٹی ہاؤس میں آ کر حکم دے جاتے تھے کہ اس بار حلقہ کا اجلاس نہیں ہو گا مگر اجلاس پھر بھی ہو جاتا تھا۔ حلقہ ارباب ذوق کی طویل تاریخ میں چند افراد نے ہر قسم کے موضوعات پر بلا توقف اور مسلسل و مربوط گفتگو کرنے کی شہرت حاصل کی' ان میں ظہیر کاشمیری' صفدر میر اور اعجاز حسین بٹالوی کے نام نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔

اعجاز حسین بٹالوی کے بھائی ڈاکٹر عاشق بٹالوی اور آغا بابر بھی اس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک فرق یہ تھا کہ ڈاکٹر عاشق بٹالوی اور آغا بابر نے مسلسل بہت لکھا' جبکہ اعجاز بٹالوی نے کم لکھا اور باتیں زیادہ کیں انہیں باتیں کرنے کے لئے وکالت کا ایسا فورم ہاتھ آ گیا جس کا پیشہ ہی صرف باتیں کرنے پر مبنی ہے۔ اعجاز بٹالوی کم لکھتے تھے' مگر جو لکھتے وہ اپنی جگہ حوالہ بن جاتا۔ ڈاکٹر خورشید رضوی نے بارہ برس کی تحقیق اور محنت کے بعد عربی زبان و ادب سے تعلق رکھنے والی کتاب ''امکان'' لکھی تو اس نہایت معتبر اور ٹھوس علمی تخلیق کا دیباچہ لکھنے کے لئے انہیں اعجاز حسین بٹالوی سب سے بہتر شخص نظر آئے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ''امکان'' کا متن اور اس کا اعجاز بٹالوی کا لکھا ہوا دیباچہ اپنی جگہ ایک حوالہ کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔

اعجاز بٹالوی ۱۹۵۰ء کے بعد نمودار ہونے والے ادیبوں اور شاعروں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے' جس میں الطاف گوہر' تجمل حسین' صفدر میر اور ضیاء جالندھری وغیرہ شامل تھے۔ اعجاز بٹالوی میرا جی کی شاعری' خاص طور پر ان کے دوہوں سے بہت متاثر تھے۔ میرا جی سے متاثر ہو کر انہوں نے بھی شاعری شروع کر دی مگر شاعری انہیں راس نہ آئی' مزید یہ کہ خود میرا جی نے نثر لکھنے کا مشورہ دے دیا۔ اس کے بعد انہوں نے افسانے

لکھنے شروع کر دیے۔ کبھی کبھار حلقہ میں کوئی تحقیقی مضمون پڑھ دیا۔ لندن گئے تو لائبریریاں چھان کر مرزا غالب اور دوسرے معروف و غیر معروف شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں تحقیق کر کے مواد ڈھونڈ لائے۔ افسانے کم لکھے شاعری بھی کم کی مگر کبھی کبھار اندر کا شاعر بول پڑتا۔ کچھ عرصہ پہلے افتخار عارف نے نظم لکھی ''کتاب کیچڑ میں گر پڑی'' اعجاز حسین بٹالوی نے بلاتوقف اس کے جواب میں نظم کہہ دی۔

طبیعت کے اعتبار سے درویش صفت تھے۔ مزاروں پر جاتے۔ خاص طور پر محرم کے دوران امام باڑوں کا ضرور چکر لگاتے' مرثیے اور نوحے بڑے التزام کے ساتھ سنتے۔ ایک وصف یہ کہ چھوٹوں کے ساتھ بڑی شفقت کے ساتھ پیش آتے۔ ۶۰ کے عشرہ میں وکالت کی طرف زیادہ مائل ہوگئے اور پھر اسی کے ہو کر رہ گئے۔ کبھی کبھار بلانے پر حلقہ ارباب ذوق میں آ جاتے۔ اصرار کرنے پر ایک آدھ مضمون بھی لکھ لاتے مگر زیادہ وقت وکالت میں ہی گزر گیا۔ انہیں شعر و ادب کے حوالے سے اتنی پہچان نہیں ملی' جتنی پہچان اور شہرت وکیل کے طور پر حاصل ہوئی۔ ایوب خان کے دور میں انہیں خاص طور پر اسی لئے حلقہ ارباب ذوق کا سیکرٹری منتخب کیا گیا تھا کہ وہ وکیل کی حیثیت سے حکومتی دباؤ کا بڑی آسانی سے سامنا کر لیتے تھے' مگر بطور وکیل انہیں اصل شہرت ذوالفقار علی بھٹو کیس میں سرکاری وکیل کے طور پر حاصل ہوئی۔ وہ اس کیس میں اتفاقیہ آئے تھے۔ ان دنوں منظور قادر' ایم انور' ایم اے رحمٰن اور اعجاز بٹالوی مل کر ایک کمپنی کی صورت میں کام کرتے تھے۔

ذوالفقار علی بھٹو کیس میں ایم انور ایڈووکیٹ سرکار کے وکیل تھے۔ کیس کی سماعت عروج پر تھی کہ اچانک ایم انور کا انتقال ہوگیا۔ اس پر اعجاز بٹالوی کو کیس سنبھالنا پڑا۔ اس کیس میں ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کی سزا ہوگئی تو کچھ دوستوں نے اعجاز حسین بٹالوی کو ایک عرصہ تک گوشہ نشین رہنے کا مشورہ دیا مگر انہوں نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا۔ ان کا موقف تھا کہ وہ اس مقدمہ میں ذاتی طور پر فریق نہیں تھے محض وکیل تھے۔ کیس کا فیصلہ انہوں نے نہیں بلکہ عدالت نے کرنا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح کسی سکیورٹی کے بغیر پھرتے رہے۔ انہیں کسی نے کچھ نہیں کہا' یہ پیپلز پارٹی والوں کی سمجھداری اور معاملہ فہمی تھی کہ انہوں نے اعجاز حسین بٹالوی کی ذات کو مسئلہ نہیں بنایا' البتہ یہ کیا کہ مرحوم کے جنازہ پر پیپلز پارٹی کا کوئی وکیل یا رائٹر نہیں آیا۔

اعجاز حسین بٹالوی کے جانے کے بعد اب حلقہ ارباب ذوق کے ۱۹۴۷ء سے پہلے والے پرانے رکن صرف ضیاء جالندھری رہ گئے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد حلقہ میں انتظار حسین' شہزاد احمد' اسرار زیدی اور دوسرے افراد کا دور شروع ہوا۔ ان کے ساتھ شہرت بخاری' صلاح الدین محمود اور دوسرے لوگ بھی شامل ہوتے گئے۔ اعجاز حسین بٹالوی ۶۰ء کے عشرہ کے بعد حلقہ میں کم آنے لگے۔ وہ وکالت کے جھمیلوں میں پھنستے چلے گئے۔ البتہ ہر سال محرم کی مجالس میں ضرور جاتے۔ لاہور میں مضافات سے آنے والے نوجوان ادیب و شاعر اعجاز حسین بٹالوی سے آشنا نہیں تھے۔ حسین مجروح نے چند سال قبل حلقہ کے سیکرٹری کا چارج سنبھالا تو پھول لے کر تمام زندہ اور پرانے لوگوں کی سالگرہ پر ان کے گھر جانا شروع کیا۔ ان میں شہرت بخاری' انجم رومانی' احمد راہی' یونس ادیب اور

دوسرے لوگ شامل تھے۔ اعجاز بٹالوی صاحب کے ہاں بھی جانا چاہا تو انہوں نے کہا کہ میں تو ٹھیک ٹھاک تندرست آدمی ہوں' خود آؤں گا اور پھر وہ خود حلقہ میں آ گئے۔ ان کی زندگی میں ان کی نگارشات جمع نہ ہو سکیں۔ شاید ان کے جانے کے بعد جمع ہو جائیں۔

سو ہوا یہ کہ اس تحریر نگاراں سے شاہراہ ادب کا ایک اور مسافر رخصت ہوا۔ ایک وضعدار' خوبصورت افسانہ نگار' غالب و میر پر اتھارٹی کے ساتھ تحقیق کرنے والا نقاد' ایک اچھا شاعر' درویش صفت انسان' جو شاعر کے طور پر آیا' ادیب کے طور پر متعارف ہوا اور وکیل کے طور پر مشہور ہو کر چلا گیا۔ وہ شخص بہت سی حکایتیں اور رونقیں اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ جس کی تحریر میں لفظ بولتے تھے اور جس کے الفاظ سند کی حیثیت رکھتے تھے!

☐

لحد میں اترنے والا ایک زندہ شخص

عطاء الحق قاسمی

میں اس روز لندن میں تھا جب احسان شاہد نے جنگ لندن کی ایک خبر پر انگلی رکھی اور کہا "عطا صاحب! یہ کیا ہو گیا؟" یہ اعجاز حسین بٹالوی کے انتقال کی خبر تھی جس نے احسان شاہد کی طرح مجھے بھی ہلا کر رکھ دیا۔

لاہور سنگ و خشت کی عمارتوں کا نام نہیں' اس کی پہچان اس کی صدیوں پرانی تاریخ اور اس سے وابستہ جید علماء' تاریخ دان' سیاستدان' شاعر' ادیب' دانشور' خطیب اور عظیم المرتبت صحافی ہیں۔ اعجاز حسین بٹالوی بھی لاہور کے ماتھے کا جھومر تھے' وہ ان لوگوں سے تھے جو لاہور میں رہتے تھے اور لاہور ان میں رہتا تھا' ایک خوش شکل' خوش کلام اور خوش پوش شخص' جو جس محفل میں بیٹھتا تھا وہ محفل سج جاتی تھی۔ اعجاز بٹالوی' عاشق حسین بٹالوی اور آغا بابر تینوں سگے بھائی تھے اور اپنی داستان گوئی اور دانشوری کے حوالے سے سگے بھائی لگتے بھی تھے' مجھے اعجاز حسین بٹالوی کی جو بات سب سے اچھی لگتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ ایک بہت قابل' بے انتہا مصروف اور بہت مہنگے بیرسٹر ہونے کے باوجود ایک طویل عرصے تک پاک ٹی ہاؤس میں اپنے دوستوں انتظار حسین' شہرت بخاری اور انور سجاد وغیرہ کے ساتھ منڈلی جماتے رہے اور ان میں سے کسی کے ساتھ سیاسی اختلاف کو اپنی محبت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ ان کے ادبی رشتوں میں دراڑیں اس وقت آئیں جب ٹی ہاؤس کے کچھ دانشور ذوالفقار علی بھٹو کی دردناک شہادت کے بعد ذاتی تعلقات بھی سیاسی نظریات کی عینک سے دیکھنے لگے۔ اعجاز بٹالوی استغاثہ کے وکیل تھے اور یوں انہوں نے ایک طویل عرصے کے لئے ٹی ہاؤس اور حلقہ ارباب ذوق کو خیر باد کہہ دیا مگر انتظار حسین اور کچھ دوسرے دوستوں کی وضعداری قابل داد ہے کہ انہوں نے اس سانحہ کے بعد بھی رشتوں کے اس آئینے میں بال نہیں آنے دیا۔

اعجاز بٹالوی بہت عمدہ افسانہ نگار تھے۔ تاہم وہ ہمارے ان دانشوروں میں سے تھے جنہوں نے لکھنے سے زیادہ اپنا زیادہ وقت دوستوں کی محفلوں میں علم و ادب کے موتی بکھیرنے پر صرف کیا۔ ان کے پاس یادوں کا

ایک خزانہ تھا اور جب وہ لب کھولتے تو حاضرین محفل صرف بنا کرتے۔ ان کی خوش بیانی ان کی پہچان تھی۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں اس خوبصورت ادیب اور اس خوش بیان مقرر نے جب سارا شہر بلیک آؤٹ کی زد میں تھا' لاہور کی تاریک راتوں میں ریڈیو سے اپنی حوصلہ بلند کرنے والی گفتگوؤں کی قندیل روشن کی' لوگ اپنے گھروں میں محصور ان کی آواز سنتے تھے اور انہیں یہ اپنے دل کی آواز لگتی تھی۔ میں نہیں جانتا ان کی یہ تقریریں محفوظ ہیں کہ نہیں' اگر نہیں تو ضرور محفوظ ہونی چاہئیں۔

میں ان سے بہت جونیئر تھا لیکن ان کی محبت اپنے سینئرز اور جونیئرز سب کے ساتھ یکساں تھی۔ وہ ایک دو بار ہماری بھابی فلاحت کے ساتھ اور متعدد بار اکیلے میرے گھر آئے۔ میرے پاس ایک یادگار تصویر میرے علامہ اقبال ٹاؤن والے گھر کی ہے جس میں مرحومین میں سے ابوالاثر حفیظ جالندھری' پروفیسر محمد عثمان' محمد ادریس (پاکستان ٹائمز) ولدار پرویز بھٹی اور اعجاز بٹالوی سمیت کتنی ہی ایسی شخصیات موجود ہیں اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ جب مجھے ادبی خدمات پر صدر پاکستان کی طرف سے پرائڈ آف پرفارمنس ملا تو اعجاز بٹالوی مبارک باد کہنے میرے گھر آئے اور کاغذ قلم منگوا کر فارسی کا ایک شعر لکھا جس کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ یہ انعام خود انعام کے لئے باعث فخر ہے۔ اسی طرح ایک دن دستک ہوئی تو میں نے دیکھا کہ اعجاز بٹالوی ہیں' ان کے ہاتھ میں ایک رجسٹر اور ایک کاپی تھی۔ کچھ دیر گپ شپ کے بعد انہوں نے یہ دونوں چیزیں میرے سپرد کیں اور کہا ''یہ حلقہ ارباب ذوق کا پرانا ریکارڈ ہے۔ اس کی حفاظت تمہارے ذمے ہے'' اور میں نے اس ادبی ورثے کی حفاظت یوں کی کہ برادرم یونس جاوید جب حلقہ ارباب ذوق پر پی ایچ ڈی کر رہے تھے' میں نے یہ ادبی امانت ان کے سپرد کر دی اور یہ ریکارڈ کتابی صورت میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا۔

اب یہ اعجاز حسین بٹالوی ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ لاہور ایک ایک کر کے ان لوگوں سے خالی ہوتا جا رہا ہے جن کے دم سے لاہور' لاہور کہلاتا تھا۔ پھر بھی ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارے درمیان احمد ندیم قاسمی' اشفاق احمد' بانو قدسیہ' انتظار حسین اور کچھ دوسرے لوگ موجود ہیں۔ خدا انہیں عمر خضر عطا کرے۔ آخر میں اپنے اس ذاتی دکھ کا اظہار کہ میں اعجاز بٹالوی کے جنازے میں شرکت نہیں کر سکا کہ میں اس وقت لندن میں تھا لیکن اگر لاہور میں ہوتا تو بھی میں ایک زندہ شخص کو لحد میں اترتے کیسے دیکھتا؟

یادوں کا شہر

O

اعجاز حسین بٹالوی

یادوں کا یہ شہر تو گورستان سا بنتا جاتا ہے
کہاں گئے وہ لوگ
کہ جن سے رات چراغاں ہوتی تھی

وہ دیوانے
جن کے دم سے اس بستی کی گلیاں زندہ رہتی تھیں

چہرے
پھول سے نازک چہرے
جن کی مہک سے شام کی محفل بجتی تھی

وہ احباب
وہ یار ہمارے حرف و سخن کے پارکھ سارے
کہاں گئے کس گھاٹ اترے اور کس مٹی کا رزق ہوئے
کیسے کیسے لوگ
کہ جن کی نقطہ وری اور نقطہ شناسی
ان کی جان کا بوجھ بنی
آپ ہی اپنی ذات کا ایندھن آپ ہی چشم تماشہ تھے

کتنی دلکش آوازیں تھیں شہر کے شور میں ڈوب گئیں
کتنے گلشن چہرے تھے جو دیو عمر کی نظر ہوئے
جسم و جاں کے کتنے الاؤ بجھ گئے اور خاموش ہوئے
اب اس شہر کی گلیوں گلیوں یادوں کی یہ ڈھیریاں اک دن
خار و خس سے ڈھک جائیں گی وقت کی گرد میں دب جائیں گی
اور پھر تم بھی
تم بھی ادھر سے کب گزرو گے

دردِ زیستن

O

اعجاز حسین بٹالوی

میں تو دل کے دھڑکنے کا مقروض ہوں
نقدِ جاں کس نے بخشا تھا اور کب تلک
میری تحویل میں اس کو رکھنے کی تجویز ہے

حسنِ پیشِ نظر
فاصلے درمیاں، زندگی مختصر
دید ہوتی رہی، دل دھڑکتا رہا

لذتِ جلوہ نما
اور معانی غزالِ حسیں کی طرح
پاس آ آ کے پھر دور جاتے رہے
دور ہی دور سے جھلملاتے رہے
لذتِ وحشت کے صحرا کی پہنائیاں
پاؤں کی یہ تھکن، آبلہ پائیاں
لذتِ وحشت کا یہ کھیل چلتا رہا۔ دل دھڑکتا رہا
یہ مہ و سال کی گردشیں
دشمنوں کے ستم، دوستوں کا فراق
عشقِ ناکام کی بے بسی
اور نا کردہ جرمِ محبت کی رسوائیاں

سب مبارک
مگر زیست کرنے کو ایسا زمانہ ملا
جس میں مجبوریوں کے سوا کچھ نہ تھا
اپنی زنجیرِ پا
اہلِ قریہ کی زنجیرِ پا کی طرح
جھنجھناتی رہی
ایک منزل
بہت دور سے رخ دکھاتی رہی
پاس اپنے بلاتی رہی
میں لپکتا رہا، دل دھڑکتا رہا
یوں گزرتی رہی
جیسے میں (اپنے خوابوں کے مدفون ہونے کے بعد)
اب کسی اور کی زندگی کا امیں
اس کے شام و سحر صرف کرنے میں مصروف ہوں
میں جو مقروض تھا اب بھی مقروض ہوں
دل دھڑکتا رہے گا مگر کب تلک
قرض خواہ کی طرف دیکھتا ہوں کہ اس کو تو معلوم ہے
بس اسی کو تو معلوم ہے

سلمان اور بتول کے لئے

انتخابِ کلام

ڈاکٹر سعادت سعید

نظم کے حوالے سے ڈاکٹر سعادت سعید ایک اہم اور معتبر نام ہے۔ انھوں نے جدید نظم کو نئی لفظیات سے آشنا کیا ہے۔ وہ ایک باکمال امیجسٹ ہیں۔ ان کی نظموں کے عنوان اچھوتے اور مصرعے چونکانے والے ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں عصری، نفسیاتی اور فکری مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ کہیں وہ ماضی کے کرداروں اور واقعات سے اپنی نظم بُنتے ہیں تو کہیں ہماری مشرقی معاشرتی زندگی اور مردہ تہذیب کے نوحہ کناں نظر آتے ہیں۔

چغلیاں، معرکے

O

چغلیاں، معرکے، کھٹے لپڑے
جن میں الجھے ہیں لوگ ترکانہ
فرستوں ہی کے تازیانے ہیں
امجاہی لڑائیاں، شوشے
جن کا دن رات چرچا رہتا ہے
اک جہالت کے شاخسانے ہیں

خانقاہی مناقشے، فتنے
مردہ تہذیب کی علامت ہیں
تیرہ بختی کے کارخانے ہیں

٭

روح کی جھیلوں میں نغمات کی موجیں جاگیں
کیسی خوشبو ہے مرے سنگ چلی آئی ہے
ساعتیں دائمی چہکار کا عنوان بنی جاتی ہیں
مرا ایقان بنی جاتی ہیں
رامش و رنگ کے پرنور نظاروں سے دمکتا ہوا دل
اپنے ہی خول میں چھپ کر شاید
چھیڑتا رہتا ہے اکتارے پہ غمناک دھنیں
اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا ہے
جاں نوازی کے ہر اک موسم میں
جھومتی گاتی ہوائیں اکثر
مجھ پہ کرتی ہیں زر گل کے خزینے روشن
آج گھر اوٹے ہیں پھر مجھ سے گریزاں لمحے
اے مری چشم طرب ان کو ابد گیر نہیں کہہ سکتا
ان سے میں فیض تو پا سکتا ہوں
سامنے پیڑ ہے شیشم کا کہ جس پر مکڑے
جگمگاتے ہوئے جالے ہی تنا کرتے ہیں
اور شہتوت کے زرخیز چھتاروں میں تڑپتے کیڑے
ریشمی کوئے بناتے ہیں فقط مرنے کو
عہد بے درد کے مارے ہوئے یارو اک پل
اپنے سہمے ہوئے افکار سے فرصت پاؤ
لذتیں تھپکیاں دینے کو چلی آئیں گی
اپنے حساس خیالوں کو کہیں غرق کرو
ندیاں گیت سنانے کو چلی آئیں گی
زلزلے آ کے گزر جاتے ہیں
سانحے روز کا معمول ہیں ان سے گزرو
آنکھ میں حسن بھرو گے تو ہوسناک نگاہوں کے طیور
قاف کے سایے میں رہتی ہوئی پریوں کو بلا لائیں گے

نیند میں ڈوبی حسینائیں جگا ڈالیں گے
ناچنی خواب میں رقصاں ہوں گی
چوری چھپے ہی سہی ساتھ بھگا لائیں گے
راگنی رنگ سے بوجھل ہے تو تھرکے گی ضرور
اور اخلاق کے پرہول فصیلوں کو زمیں بوس کرے گی
آخر

☆

موقلم چاقو، بدن دھجی ہے

○

شہر کا کوئی تو دروازہ تحفظ کی قسم کھا سکتا
جسم کی ساکھ بچا پاتے تو کچھ بات بھی تھی
دوستو دیکھو کہ دریوزہ گری کے شہر سے
کوچۂ شرم کی دہلیزوں کے پتھر ٹھہرے
چاندنی رات ہے کشکول بکف کرنیں ہیں
کہکشاؤں کو بھی دریوزگی راس آئی ہے
کسی آزاد جزیرے کے دمکتے ہوئے تالابوں پر
رنگ در رنگ کشادہ موسم
آرزوؤں کی قلم کاری سے
موج تا موج کنول لکھتے ہیں
کوئی آزاد غزل لکھتے ہیں
ایک غالیچے کی دھجی ہے بدن کی زینت
دست خودکار میں اوہام کے جگنو چمکے
اک شبستان دل آویزی میں
کدڑیاں پہنے ستاروں کا ہجوم

ان گے ہونٹوں کے ترانے

شب یلدا میں کف گردشنیدان سے معری ہیں

بڑی بات کہی

پھیر آواز کے دریا کا کوئی دیکھ سکا ہے اب تک

آرزو زہرہ شناسی کی اگر ہے تو مجھے

لمس پیمانے بدل جانے دو

دغدغے' برج' چھتیں' ملبہ' نشاں

راکھ قدموں کا دھواں

اونگھتی درد کی قندیل' بلکتے کرمک

سمت بے سمت تعطل زدہ غاروں میں

چراغوں کی نمی کس کو نظر آئے گی

پتلیاں بجھ بھی چکیں' راکھ ہوئیں

دفن ہوتے ہوئے احساس کی فریاد سنا کر دیکھو

ساعتیں' ریگ رواں' غرقہ نگاہوں سے گرتے موتی

روشنی اور بصیرت کی لہو رنگ لویں

بحر مواج خلفشار کی لہروں کے طمانچے کھائیں

جاں کنی' فاقہ کشی

دھند میں ڈوبے ہوئے شہر کی وحشی چیخیں

چار سو اس کی دھمک ہونے دو'

آگ دینے کے بہانے آؤ

کوبہ کو بکھرے ہیں مرجان کفن چور درندے سپنے

ہاں وہی چین کا مہتاب گل خیرہ شعاعیں روشن

خونچکاں ہوئے افکار' دریدہ جذبے

روغنی زنگ سے رخشندہ گلابوں نے نمو پائی ہے

اک توارد پہ ہے موقوف مساموں کا خلا

اور انساں کے تحفظ کا نیا روپ ابھر آیا ہے

خوف جب صورت انگر سر مژگان چمکے

بامِ ہیجان پہ جانے کے لئے
میرے مستور حراروں کا کوئی زینہ کھلے

اس نے محسوس کیا
حسن جب عشق سے مشروط ہوا کرتا تھا
دل مرا آنچ سے معمور ہوا کرتا تھا
اس سے مربوط ہوا کرتا تھا

☆

آنسو

○

آنسو رکنے کا نام لیتے نہ تھے
بادلوں میں نمی کے لشکر تھے
ہچکیاں' بین' سوز' آہ و بکا
المیے' نوحے اور کیا کیا کچھ
زندگی کی حسین رنگینی
بارشِ انبساط کی طالب
موت کا راز کس نے پایا ہے!
قبر کی انتہا؟ شعورِ حیات!
سانس کی ڈور! ایک الجھاوا
گھاؤ گہرا ہے' اے سسکتے دل
مرتے پنچھی کی آخری ہچکی
ڈوبتی دھڑکنوں کے سناٹے
غرق ہوتے شعور کے قصے
کون سنتا ہے' کس کو فرصت ہے

ساربانِ وجود کے آنسو
وقت کے تشنہ دشت میں گر کر
زیست کے آئینے بنے ہوتے!

٭

مرا احساس

○

مرا احساس مر چکا ہے کہ میں
محفلِ ہست و بود سے ہوں الگ
موت سے رابطہ نہیں میرا
زیست سے سلسلہ نہیں میرا
پھر بھی دن رات کے سواحل پر
پتھروں سے کلام کرتا ہوں
درد کی سیپیاں سمیٹتا ہوں
ان میں مستور موتیوں کو مگر
فاصلے سے سلام کرتا ہوں
بے حسی کی سپاٹ سڑکوں پر
گھومتا ہوں، قیام کرتا ہوں
اپنے افکار کے کھلونوں کو
وہم کے پنچھیوں سے بھرتا ہوں
دل کے پھیلے ہوئے پھپھولوں کو
تشنہ رکھتا ہوں اور مرتا ہوں

٭

زندگی کے کندھوں سے

O

زندگی کے کندھوں سے بوجھ سا گرا ہے کیا
ایک نور کا وقفہ گہرے کالے قلزم میں گر پڑا ہے چپکے سے
سوچ کے سفینوں نے بادبان کھولے ہیں
سامنے فصیلیں ہیں جن کے اندھے آئینے ہمکلام ہوتے ہیں
ہم محاصرے میں ہیں راستہ نہیں ملتا
ذات کے بیاباں میں گونجتی ہے خاموشی
واپسی کی تیاری ہو چکی ہے چلتے ہیں

ہم

محروم بصارت

O

محروم بصارت ہیں بے مہر تمنا ہیں
اک بیل امنگوں کا، چندراتی ترنگوں کا
منزل پہ پہنچنا ہے بے سمت زمانے میں
اوہام زدہ رستے ہم ناپنے لگتے ہیں
اک سال نیا آیا، خوشیوں کا ثمر لایا
احباب چہک اٹھے، ہم سب کو مبارک ہو
اک سال نیا آیا، مل مل کے گلے کھنکے
کچھ جام ملنگوں کے
روزن سے پرے جاگی پھر بھونکتی خاموشی
چشمک ترے باطن کی، شوخی مرے ظاہر کی
چوٹوں سے بھری محفل، چہلوں سے سجی محفل

ماحول نیا پیدا، باتیں تو پرانی تھیں
افلاک تو بنتے تھے اور اک نیا پیدا
ہم وقت سے بسر ہیں گے
وہ ہم سے جدا ہوگا
معدوم زمانے میں
موجود بھی کیا ہوگا

٭

یہ موسم سرما ہے

o

یہ موسم سرما ہے
کہرے کے لبادے میں
برفانی ہواؤں نے ہر چیز چھپائی ہے
آنسو بھری آنکھیں بھی پتھرائی سی لگتی ہیں
خاموش کرن جذبے عیاش وریدوں میں ٹھہرائے سے لگتے ہیں
آغوش میں بکھری ہے نمناک سفیدی سی
سوچوں کے سمندر تو برفائے سے لگتے ہیں
آنکھیں مری بوجھل ہیں
نیندوں کے پرندے بھی سودائے سے لگتے ہیں
ماضی کے جھروکوں سے جھانکے ہیں کئی منظر
پکھوڑا کھ زمانے بھی صحرائے سے لگتے ہیں
دیوار پہ آویزاں گھڑیاں بھی ہیں لب بستہ
اک برف کی جمتی سل
پنہاں مرے سینے میں
لمحوں کے بھی لشکر پسپائے سے لگتے ہیں

سب پیڑ ہیں خوابیدہ
کھمبوں پہ نیو بیں بھی
ٹھٹھرائی سی لگتی ہیں
گاہک تو بہت کم ہیں
بازار کی دکانیں
تنہائی سی لگتی ہیں
آنکھیں مرے دلبر کی
شیدائی سی لگتی ہیں
خاموش سمندر کی
انگڑائی سی لگتی ہیں
میری سبھی شریانیں
بل کھائی سی لگتی ہیں
شرمائی سی لگتی ہیں
سرمائی سی لگتی ہیں

٭

بے حسی، انتشار

O

بے حسی انتشار آوازیں
خامشی بے قرار آوازیں
سامنے رہگزار گم صورت
بزدلی شہسوار آوازیں
زندگی بے تضاد کی ماری
آگہی شرمسار آوازیں
یعنی سکھ چین کا تقاضا ہے

خودکشی اشکبار آوازیں
گردشیں اور ان کے قصے
مفلسی سوگوار آوازیں
سانس کی ڈور سے الجھتی ہیں
باؤلی سنگسار آوازیں
مستقل قید قاعدے قسمت
عاجزی روبکار آوازیں
آدمی جستجو کا رسیا ہے
سرکشی آرپار آوازیں
دور کا ڈھول ہے سہانا سا
بانسری آبشار آوازیں
دوڑتی ہیں ہواؤں کے پیچھے
کاغذی شاہکار آوازیں
شہر بل کھاتے راستے گلیاں
گندگی بیوپار آوازیں
فکر ہے ایک قصر بوسیدہ
بندگی شرمسار آوازیں
مقتدر عالی شان قلعوں کی
لکھ پتی تاجدار آوازیں
ذہن لایعنیت کی دلدل ہے
اجنبی مستعار آوازیں
زندگی ایک وہم لافانی
عارضی مرغزار آوازیں
موت کی بے کرانیاں چنچل
شاعری پائیدار آوازیں
میرا پندار بے نشہ میرا
بے خودی آشکار آوازیں

مجھ کو اتنا شعور کافی ہے
سرسری اختیار آوازیں
ہے قیامت مرے تعاقب میں
جوہری شعلہ بار آوازیں
عقل گم صم ہے رہنما خاموش
سامری اختیار آوازیں
دفن ہیں وحشت دل کے دامن میں
باطنی غمگسار آوازیں
سارے دروازے بند ہیں مجھ پر
بے کسی کوہسار آوازیں
آپا دھاپی' اجارہ داری ہے
آدمی افتخار آوازیں
ظلم ہے اور چھینا جھپٹی ہے
دفتری چوبدار آوازیں
کب تلک بچ سکیں گی کتوں سے
بھک منگی خاکسار آوازیں
دہر میں عافیت کی طالب ہیں
ان سنی شیر خوار آوازیں
ایسی درماندگی' خدا کی پناہ
عالمی انحصار آوازیں

٭

لوگ آئینے ہیں

O

لوگ آئینے ہیں کہ جن میں ہم
اپنی آنکھوں کے عکس دیکھتے ہیں
اپنے چہرے پہ لکھی عبرت کو
حرف در حرف پڑھتے رہتے ہیں
اپنی تضحیک کی غلاظتوں کو
حاشیوں میں سجا کے لکھتے ہیں
''روگ آئینے توڑ دیں گے ہم''
''جھوٹی تہذیب کے خداؤ سنو
بحرِ احساس کے شناوروں کو
ڈوبنے سے بچا سکا ہے کون!''

☆

ابد کنار ہواؤں......

○

ابد کنار ہواؤں کے سنگ پھیلے ہیں
وہ کھیت جن میں دمکتی ہے چاندنی کی فصل
وہ کھیت جن پہ شعاعوں کا رقص ہوتا ہے
ابد کنار مناظر کی سرزمیں مرا دل
جہاں بہار درختوں کی چھتریوں سے چھنی
دمکتی دھوپ کا سونا بکھرتا رہتا ہے
اس انجمن سے مری خلوتیں گریزاں ہیں
ہر ایک بیج کی اک منفرد کہانی ہے
ہر ایک شاخ یہاں داستاں نمو کی ہے
ہر ایک پھول عجب رزمیہ رتوں کا ہے

٭

یہیں قریب......

O

یہیں قریب بڑی شاہراہ سے ملحق
شعورِ سنگ کی سنگینیوں سے قائم ہے
دھوئیں میں لپٹا ہوا شہر
جس کی دہلیز پر
غلاظتوں کے ڈھیر سے اُگلتی رہتی ہیں
فلک پہ تیرتے شوریدہ اژدہوں کے دہن
خموش نیند مساکن میں آگ پھینکتے ہیں
حصارِ قہرِ زماں میں سسکتے لوگوں کو
اذیتوں کے پہاڑ سے ڈراتے رہتے ہیں
متاعِ درد کی مٹی سے ہمکلام بدن
سلگتے، کانپتے، فٹ پاتھ کی گرجتی لے
شدید کرب کے عالم میں سنتے رہتے ہیں
فصیلِ کارگہِ زندگی کے کارندے
سیاہ راتوں کی آہ و بکا سے دور بہت
سرور و شوق کے یخ بستہ نرم بستروں پر
نشاطِ عمرِ مسلسل کے خواب دیکھتے ہیں

٭

مہا رشیو، مہا گنیو......

O

مہا رشیو، مہا گنیو
کہیں کچھ کھٹ سے کھلتا ہے
دوآبہ ہے کہ دامن ہے
خزانہ ہے کہ تالا ہے
صحیفہ ہے کہ درپن ہے
شگوفہ ہے کہ چھالا ہے
دریچہ ہے کہ روزن ہے
تمہارا دل نہیں کھلتا
عقیدوں کی فصیلوں میں مقید
دل نہیں کھلتا

سراسیمہ معابد میں
لہو کے چشمے بہتے ہیں،
کہ جن میں کہکشاں اشنان کرتی ہے
عقیدوں کی دہکتی برچھیاں
جسموں پہ چلتی ہیں
تو چیخوں کے سمندر گونج اٹھتے ہیں
مہا رشیو، مہا گنیو
کہیں کچھ کھٹ سے کھلتا ہے
تمہیں قبریں بلاتی ہیں
عجائب گھر بلاتے ہیں

☆

خانہ خراب زندگی

O

خانہ خراب زندگی
ایک عذاب زندگی
صورتیں مسخ ہو چکیں
رنگتیں زرد ہو چکیں
میرے لئے کھلی رہی
مثل کتاب زندگی
قافلے جسم و جاں کے ہیں
فاصلے قبرماں کے ہیں
میں نے انہیں پرکھ لیا
مجھ کو نہیں وہ جانتے
مجھ کو نہیں سیانتے
ڈوبتے سائے بے گماں
مرمر جاں میں دفن ہیں
فکر کے کتنے آسماں
میرا وجود رائیگاں
تیرا وجود رائیگاں
کرب کی دور نگاہ کا
الجھا نصاب زندگی
بارہا منکشف ہوا
نار وجود میں گیا
ایک سوال زندگی؟
ایک جواب زندگی؟
خانہ خراب زندگی
ایک عذاب زندگی

تحقیق و تنقید

وزیر آغا کا فکری سومنات

(ایک تجزیہ — قسط 2)

رشید ملک

مادری نظام اور پدری نظام

ہند کے شاعر و صورت گر و ''انشائیہ'' نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

(اقبال سے لفظی تغیر کے لئے معذرت) تفصیل درج ذیل ہے:

پچھلی قسط (معاصر، جلد ۲، شمارہ ۳، ۴) میں ہم دیکھ آئے ہیں کہ ڈاکٹر وزیر آغا تنتر ازم یعنی ایسی ثنویت پر یقین رکھتے ہیں جو جنس پر مبنی ہے۔ اس ثنویت کی دو کیٹیگریز ہیں: نر (تنتر ازم کا پرش جس کی علامت لنگ یا قلم ہے) اور مادہ (تنتر ازم کی پرکرتی جس کی علامت یونی ہے)۔ اس ثنویت کا تقاضا ہے کہ اس پر عمل کرنے والے یا یقین رکھنے والے ہر چیز میں لنگ یعنی مذکر یا یونی یعنی مونث دیکھیں۔ چنانچہ آغا صاحب کو اپنی اس علمی یا ذہنی مجبوری کے تحت سماجی ارتقا کے مراحل میں بھی پرش اور پراکرتیاں یعنی نر اور مادہ نظر آئے اور انہیں مادری اور پدری نظاموں کے نر اور مادہ کے متبادل سمجھ کر حسب ضرورت اٹھا لیا اور کسی کاوش کے بغیر اپنے شاہکار میں سماجی ارتقاء کے مختلف مراحل، تمدن اور ثقافت کے مزاجوں پر چسپاں کر دیا۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ ''آریاؤں کا معاشرہ پدری تھا جبکہ دراوڑوں کا معاشرہ مادری تھا۔'' دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ ''آریا متحرک اور آوارہ خرامی کے علمبردار تھے اس لئے زمین کے ساتھ ان کا رشتہ زیادہ مضبوط نہیں تھا۔'' (مزاج ۱۰۱) یعنی وہ زراعت کے چکر میں نہیں پڑے اس لئے ان کے ہاں پدری نظام تھا۔ اس کے برعکس دراوڑوں کا معاشرہ مادری تھا کیونکہ وہ زراعت پیشہ تھے۔ تاریخی لحاظ سے یہ دلیل ہی غلط ہے۔ مادری اور پدری نظام وضع کرنے والوں کا کہنا یہ ہے کہ زراعت سے پہلے مادری نظام تھا اور زراعت کے بعد نظام بدل کر پدری ہو گیا۔ ''زرعی انقلاب نے زمانہ قبل تاریخ کے مادری نظام

ہی شروع ہو گیا اور پدری نظام معاشرہ برسرِ کار آ گیا" (جالبوری 1969: 51)۔ آغا صاحب ذرا توقف کرتے اور سوچتے کہ اب جبکہ دنیا بھر میں زراعت عام ہے اور وہ خود بھی زراعت پیشہ ہیں تو کیا اس زمانے میں مادری تہذیبوں اور تمدنوں کا مزاج مادری ہے؟ چنانچہ آغا صاحب ہمیں تاریخ کا غلط درس دے رہے ہیں۔ ان کا یہ بیان اور کئی دیگر بیانات گمراہ کن، تاریخ مقصد اور علمی شعبدہ بازی ہیں۔ ہمارے ڈاکٹر صاحب ایسی علمی شعبدہ بازیوں کے کافی شائقین ہیں۔

ان حالات میں مادری اور پدری نظاموں کے تصورات کے ارتقا پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہو جاتا ہے بالخصوص اس لئے بھی کہ یہ اور ایسے جہت سے متروک تصورات ڈاکٹر وزیر آغا کی ساری کتاب "اردو شاعری کا مزاج" پر پوری طرح چھائے ہوئے ہیں مثلاً کتاب کے آغاز میں ہی وہ فرماتے ہیں:

> اردو شاعری کے اس پس منظر نے اپنی دونوں سطحوں پر ثنویت (دوئی) کا مظاہرہ کیا ہے۔ یعنی ایک سطح پر دراوڑ اور آریا اور دوسری سطح پر مادری نظام اور پدری نظام کی آویزش ہیں۔ (مزاج 11)

پھر تحقیق کی ہیں اظہار خیال کرتے ہوئے اسی کتاب میں فرماتے ہیں:

> آریا پدری نظام کا علم بردار تھا ... یہ مسافر ہندوستان کے مادری نظام سے قریب تر آ پہنچا ... (مزاج 145)

اور ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> ٹھہرا ہوا معاشرہ زمین اور جنگل سے وابستہ ہونے کے باعث "مادری نظام" کا علم بردار ہے جب کہ آوارہ اور خانہ بدوش قبیلے میں زمین سے رشتہ منقطع ہونے کے باعث "پدری نظام" وجود میں آ جاتا ہے۔ (مزاج 48)

ان اقتباسات سے بھی واضح ہوتا ہے کہ مادری اور پدری نظاموں کے متعلق آغا صاحب کی معلومات بڑی ناقص، علمی اور ان کی فکری بحروی پر مبنی ہیں یا وہ دانستہ اپنے قاری کو گمراہ کر رہے ہیں۔ یہ سنگین علمی کوتاہی ہے اور اگر کسی اور ملک میں وہ اس کا ارتکاب کرتے تو اہل علم ان کا بڑا سخت مواخذہ کرتے۔ اس گمراہ کن تعمیم کے ضمن میں ہمارے محترم ڈاکٹر وزیر آغا صاحب مزید فرماتے ہیں:

> دیکھنا صرف اس قدر ہے کہ افریشیا کی ارضی تہذیب سے متصادم ہونے کے موقع تک آریا ایک طویل آوارہ خرامی اور طویل خانہ بدوشی کے دور سے گزر چکے تھے اور اس لئے ان کے ہاں پدری نظام کے نقوش پوری طرح ابھر ہو گئے تھے ... خود ایشیائی تہذیب کے باشندے کسی زمانے میں آوارہ گرد تھے لیکن پھر ہزارہا سال تک زمین سے وابستہ رہنے کے باعث ان کے ہاں مادری نظام پوری طرح مسلط ہو گیا تھا ... ۔

(مزاج: 48)

مزید فرماتے ہیں:

> دراوڑی تہذیب میں روح کی آمیزش کا آخری روپ ہندوستانی زبان اور اس کا ادب تھا لیکن دلچسپ بات یہ ہے یہاں بھی ین اور یانگ، مادری نظام اور پدری نظام، دراوڑ اور آریا کے تصادم اور انضمام کی صورت ہی ابھر کر سامنے آئی ۔ (مزاج: 122)

تصوف پر اظہار خیال کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:

> مثلاً تصوف کے بارے میں یہ بات قابل غور ہے کہ آٹھویں اور نویں عیسوی میں اس کی نمو دراصل اس کا احیا ہے آغاز نہیں۔ اس کی ابتدائی کڑیاں تو آٹھویں صدی قبل از مسیح کے لگ بھگ وجود میں آئی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آریا (جو پدری نظام حیات کے علم بردار تھے) غیر آریا (جو مادری نظام کے نظام حیات سے منسلک تھے) سے متصادم ہو چکے تھے۔ (مزاج: 217)

یہ مادری نظام اور پدری یا فادری نظام کے تصورات کی گردان اس شاہکار میں کئی اور صفحات پر بھی نمایاں طور پر نظر آئے گی مثلاً

45، 48، 55، 57، 59، 64، 67، 89، 108، 122، 109، 111، 217 صفحات۔

یہ صفحات صرف قاری کی سہولت کے لئے پیش کئے گئے ہیں۔ ویسے یہ کتاب کے دیگر صفحات پر بھی بآسانی مل سکتے ہیں کیونکہ یہ اس کتاب کے صفحے صفحے میں بوریت کی حد تک سرایت کئے ہوئے ہے۔ ان کے ان تمام بیانات پر اگر گفتگو کی جائے تو بات بہت لمبی ہو جائے گی اور یہ مختصر سطور اس طوالت کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔

اس طرح اس تکرار مسلسل سے یہ شاہکار کتاب دراوڑ اور آریا اور مادری اور فادری نظاموں کی ''انضمام اور آویزش'' کی روئیداد بن جاتی اور ہمارے سارے فنون، ثقافت، تہذیب اور تمدن کے تمام مظاہر پر چھا جاتی ہے۔ اس لئے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کے ان بنیادی تصورات پر غور کیا جائے اور اس پر ان کے اس قدر اصرار کرنے کی وجوہات کا کھوج لگایا جائے تا کہ ان کے قارئین پر ان کی حقیقت واضح ہو جائے۔

لیکن پہلے درج ذیل اقتباس کو دیکھنا ضروری ہے کیونکہ اس سے ہمارے محترم ڈاکٹر صاحب کے قلم کی چابک دستی کی وضاحت ہو جائے گی۔ وہ فرماتے ہیں:

> بحیثیت مجموعی یہ کہنا ممکن ہے کہ ہمالیہ اور اس کی شاخوں نے ایک ایسا نصف قطر تشکیل دیا ''جو ہلال'' سے مشابہ تھا۔ اس ہلال کے شمال مشرق میں انسان ایک مستقل آوارگی کی حالت میں زندہ تھا لیکن ''ہلال'' کے جنوب مغرب کی طرف اس نے زمین کے ساتھ وابستہ ہو کر سندھ، شثار، مصر کریٹ وغیرہ کی تہذیبوں کو جنم دے دیا اور اگر چہ

افریشیا کا علاقہ بے حد وسیع تھا نیز ان تہذیبوں کا درمیانی فاصلہ بہت زیادہ تھا تاہم یہ تہذیبیں اپنی مخصوص صفات کے باعث تہذیبی ارتقا میں ایک خاص مقام کی نشان دہی کرتی ہیں۔ اولاً یہ کہ ان تمام تہذیبوں کا رشتہ زمین کے ساتھ بے حد مضبوط تھا۔ اور جنگل اور زراعت نے ان پر گہرے اثرات مرتسم کئے تھے۔ ثانیاً یہ تہذیبیں مادہ پرستی کی علم بردار تھیں اور ان میں روح کی بجائے کثرت کا نظریہ رائج تھا۔ اور اس کے زیر اثر ایک خدا کے بجائے لاتعداد دیوتاؤں وغیرہ کی پوجا کا تصور بے حد مقبول تھا۔ رابعاً ان تہذیبوں میں فرد محض ایک پرزہ تھا جو سماج کی مشین کے ساتھ وابستہ تھا۔ اس کی اپنی انفرادیت صفر کے برابر تھی۔ خامساً یہ تہذیبیں موت کے خوف میں مبتلا تھیں اور موت پر فتح حاصل کرنے کے لئے مادی وسائل کو بروئے کار لانا پسند کرتی تھیں۔ ان تمام خصوصیات کے پس پشت مادری نظام کے اثرات بے حد واضح تھے۔ اور یہ تہذیبیں مادری نظام کی نمائندہ تھیں ۔(امتزاج:45و46)

اس بیان سے ان کے علمی کجروی اور گمراہی میں مزید سنگینی کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ چار برس کے عمیق غور و فکر کے بعد ہمارے محترم ڈاکٹر وزیر آغا نے ہلال کی اصطلاح کو استعمال کیا ہے تاکہ وہ ایک امریکی مستشرق کی وضع کردہ اصطلاح "ہلال زرخیز" یا "فرٹائل کریسنٹ" سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اگر ایسا نہیں تو یہ اصطلاح انہوں نے اپنی بے خبری کی بنا پر استعمال کی ہے۔ انہیں شاید پتا ہی نہیں کہ زرخیز ہلال ہے کیا اور اس کا انطباق کن ممالک پر ہوتا ہے۔ ان دونوں نکات کی وضاحت کے لئے زرخیز ہلال کی تعریف یہاں درج کی جاتی ہے تاکہ ان کی چابک قلمی پر بھی کچھ روشنی پڑے۔

1۔ زرخیز ہلال مشرق وسطی کا وہ علاقہ ہے جس میں تقریباً وادی نیل، بحیرہ روم کا مشرقی ساحل، سیریا، لبنان اور میسوپوٹیمیا شامل ہیں۔ پہلے یہاں کی آب و ہوا مرطوب تھی۔ یہی علاقہ تہذیب کا گہوارہ تھا۔ اس میں آباد ہونے والوں کے آثار 9000 سال تک پیچھے جاتے ہیں۔ (میکمیلنز انسائیکلوپیڈیا،1985)

2۔ مشرق قریب کے ان علاقوں کے لئے ہلال زرخیز کی اصطلاح مستشرق جیمز بریسٹڈ نے 1916 میں وضع کی جہاں ہماری معلومات کے مطابق قدیم دنیا کی قدیم ترین تہذیبیں شروع ہوئیں۔ یہ علاقہ قوس کی شکل میں ہے جو شمالی مصر کی وادی نیل، بحیرہ روم کے مشرقی ساحل اور اس کے بعد جنوب اور مشرق میں دجلہ اور فرات کی وادی سے ایک قوس کی صورت میں گزر کر خلیج فارس کی راس تک آتا ہے۔ اس میں اسرائیل، لبنان، سیریا، عراق اور مغربی ایران شامل ہیں۔ یہ سارا علاقہ قابل زراعت ہے جہاں

مصر کے شمال میں آب و ہوا گرمیوں میں خشک تھی مگر سردیوں میں بارش ہوتی تھی۔ یہ مشرق وسطی کا وہ زرخیز ہلال ہے جہاں 9000 سال قبل زراعت کا آغاز ہوا تھا۔ بعدازاں 5000 ق۔م میں ہلال کے مغرب کی طرف مصر میں اور مشرقی طرف سمر میں خواندہ معاشرے ابھرے۔ بحیرہ روم کے مشرقی ساحل پر کنعانی سلطنت قائم ہوئی جس کے بعد آنے والی صدیوں میں فونیشیا اور قدیم اسرائیل کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ میسوپوٹیمیا میں بابلیوں اور اسیریوں کا غلبہ رہا۔ (رالف ایس سولیکی، گرولیئر)

3۔ زرخیز ہلال کی اصطلاح کو امریکی مستشرق جیمز ہنری بریسٹڈ نے مقبول بنایا۔ اس کے تحت مشرق قریب کے وہ علاقے آتے ہیں جہاں تہذیب کا آغاز ہوا۔ ہلال کی شکل میں اس میں وہ زرخیز علاقے آتے ہیں جہاں بحیرہ روم کی آب و ہوا پائی جاتی تھی اور زمین نسبتاً زرخیز ہے۔ یہ علاقہ بابل اور اس کے قریب ایلام سے شروع ہو کر دریائے دجلہ اور فرات کے ساتھ ساتھ اسیریا تک اور اس کے بعد مغرب میں شام اور بحیرہ روم کے ساحل تک اور پھر جنوب میں فلسطین تک جاتا ہے۔ اس کی وسیع تر صورت میں وادی نیل کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔ زرخیز ہلال جس میں مصر بھی شامل ہے، ان علاقوں سے پوری پوری مطابقت رکھتا ہے جن پر تحقیق کے متعلق عبرانی روایات منطبق ہوتی ہیں۔ یہی وہ علاقے ہیں جہاں سے اہل یونان اور اہل روما نے تہذیب سیکھی۔ یہ عقیدہ کہ انسان کا ابتدائی شہری کلچر زرخیز ہلال سے شروع ہوا، ریڈیو کاربن کے طریقے سے متعین ہو چکا ہے۔ ان تاریخوں کے مطابق ابتدائی زراعت کا آغاز اور دیہی آبادیوں کی ابتدا کی تاریخ تقریباً 8000 ق۔م تک جاتی ہے۔ (برٹینیکا، مائکرو، جلد 4، 1983) اس کتاب میں دیے گئے نقشے پر ایک نظر ڈالنا سودمند ہو سکتا ہے۔

ان سطور سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہلال یا ہلال زرخیز کا ہندوستان یا وادی سندھ سے کوئی جائز یا ناجائز تعلق نہیں۔ اوپر کی شہادت میں ہمالیہ، اس کی شاخوں کا یا کسی پہاڑ کا کہیں ذکر نہیں آیا اور نہ ہی ایسا کوئی تاثر ابھرتا ہے کہ اس ہلال کی تشکیل پہاڑوں نے کی۔ کیا ڈاکٹر صاحب بتا سکتے ہیں کہ ہمالیہ کی کون کون سی شاخیں ہیں اور اس کی کون سی شاخوں نے ان کے اس ہلال کی تشکیل کی؟ انہوں نے کہیں بھی وضاحت نہیں کی کہ ان کا ہلال بریسٹڈ کے ہلال زرخیز سے مختلف ہے۔

کسی مقبول اصطلاح کو کھینچ تان کر ایسے علاقوں پر منطبق کرنا جو ایک مروجہ اور مقبول اصطلاح کی ذیل میں نہیں آتیں، ایک گمراہ کن غیر علمی حرکت ہے۔ اصطلاحات علمی ضرورت کے تحت بڑی معصومیت سے وضع ہوتی ہیں لیکن ایک دفعہ مقبول ہو جانے کے بعد وہی متعلقہ علمی شعبے کی جہت اور ارتقا کو متعین کرتی ہیں۔ ہلال زرخیز کی

اصطلاح کو توڑ موڑ کر وادی ءسندھ یا ہند کے کسی علاقے پر چسپاں کرنا ایک سنگین علمی لغزش ہے جو ان کے قاری کو الجھن میں ڈال سکتی ہے۔ یہ بد احتیاطی ہے جس سے بچنا ہر لکھنے والے کے لئے بہت ضروری ہے۔ آثاری تحقیق کے سلسلے میں اصطلاحات کے استعمال میں اسی قسم کی بداحتیاطی وادی ءسندھ کے متعلق بھی دیکھنے میں آئی ہے۔ اس سے کافی انتشار پیدا ہوا اور اس شعبے کے ماہرین اس پر احتجاج کر چکے ہیں۔ (ڈاکسن (جونیئر) 425)

اور ''نصف قطر'' سے ہمارے محترم آغا صاحب کی کیا مراد ہے؟ کیا وہ اپنی جیومیٹری بھول گئے ہیں یا انشائیے کی طرح وہ کوئی نئی جیومیٹری ایجاد کر رہے ہیں؟

نصف دائرے کی جگہ نصف قطر استعمال کرنے والے مصنف اور اس کی ذمہ داری کے متعلق اہل علم کیا خیال کریں گے؟ علمی اصطلاحوں سے متعلق آغا صاحب کی اس قسم کی بداحتیاطی کی ایک مثال مادری اور فادری نظاموں کے متعلق اوپر پیش کی جا چکی ہے۔ یہاں بھی ہمارے ''عہد ساز'' مصنف کی وہی بداحتیاطی یا کم نظری نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے جو ان کی نگارشات کا طرہ امتیاز ہے اور ہمارے ہاں زوال علم اور دانش کی نمایاں علامت۔ وہ ایسے ''اہل نظر'' ہیں کہ ایک سادہ سی دوربین سے وہ بلیک ہولز دیکھ لیتے ہیں (وزیر آغا، (1986)، 273 تا 278) جو خلا میں موجود ہبل دوربین کو بھی ابھی تک نظر نہیں آئے۔ آگے بھی اصطلاحات کے غلط استعمال کی ہمیں بہت سی ایسی سنگین مثالیں ملیں گی۔

ان کے اپنے مندرجہ بالا بیانات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں مادری اور پدری دونوں نظام متوازی چلتے رہے ہیں۔ ایسا تاثر ان نظاموں کے متعلق ان کے لفظ ''انضمام'' کے استعمال سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان اصطلاحات یا تصورات کو وضع کرنے والوں کی نظر میں یہ معاشرے کے کلچرل مراحل تھے جو یکے بعد دیگرے پیش آئے۔ آغا صاحب کے خیالات کے بالکل برعکس پہلا مرحلہ مادری نظام تھا لیکن زراعت آنے کے بعد وہ پدری نظام میں تبدیل ہو گیا۔ چنانچہ ان نظاموں کی متوازیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور اگر متوازیت نہیں تھی تو ان کے تصادم یا ان کے بقول ''آویزش'' کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ضرور تسلیم کیا گیا کہ یہ عمل ہر کلچرل اکائی یا مختلف آدی باسی قبائل میں اب بھی اسی ارتقائی صورت پر چل رہا ہو۔ چنانچہ ہمارے ڈاکٹر صاحب کا بنیادی مفروضہ ہی کالعدم ہو جاتا ہے اور اس مفروضے کی بنیاد پر تعمیر شدہ ان کا تھیسس بے معنی، بے مغز، (اور اگر مجھے صحیح لفظ استعمال کرنے کی اجازت ہو تو لغو) اور مجہول ہو جاتا ہے۔

انہوں نے اپنے شاہکار میں کہیں بھی مادری نظام کی تاریخ یا اس کے خدوخال کی وضاحت نہیں کی۔ نہ ہی انہوں نے یہ سوچا ہے کہ ایم اے اردو میں اول نمبر پر آنے والے ان کے قارئین کے علاوہ اس اصطلاح کو ان کا عام قاری سمجھ بھی سکے گا کہ نہیں۔ اس لئے مادری نظام اور فادری نظاموں کی وضاحت مزید ضروری ہو جاتی ہے۔

یہ گریز قدرے طویل ہو گئی ہے جس کے لئے قارئین سے معذرت کے ساتھ یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اس کے بغیر ہمارے اس ''عہد ساز'' مصنف کی تصنیف و تالیف سے وابستہ ذمہ داری کی وضاحت ممکن نہیں۔ ویسے

ان کے مندرجہ بالا بیانات میں کئی اور نکات بھی ہیں جن پر بحث ہو سکتی ہے اور آغا صاحب اور ان کے شاہکار پر داد کے ڈونگرے برسانے والوں (اردو شاعری کا مزاج، معاصرین کی نظر میں، مرتبہ سجاد نقوی؟) ناشر (پھر وہی جدید ناشرین) کے علم کی قلعی کھل سکتی ہے لیکن یہ پھر کبھی سہی۔ اب ان کے مادری اور فادری نظاموں کی طرف لوٹتے ہیں۔

(2)

مادری اور فادری نظاموں کا تعلق خاندان کے تصور اور اس کے ارتقائی مراحل سے ہے۔

''طلسم بود و عدم جس کا نام ہے آدم'' کی طفولیت اور بچپن کا زمانہ ایل۔ ایس۔ بی لیکے نے ٹانگانیکا کے اولڈووائی کھائی سے ملنے والی باقیات سے تقریباً 18.000.000 برسوں پر محیط بتایا ہے۔ (کیمبل:XX) کچھ محقق آدم کی آمد کا زمانہ تقریباً 8 لاکھ برس بتاتے ہیں۔ تاریخ کی روشنی زیادہ سے زیادہ صرف دس ہزار برسوں تک پیچھے جاتی ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ان تاریک صدیوں پر حضرت انسان پر کیا بیتی۔ خاندان کا تصور اور معاشرے کا تصور کب وجود میں آئے؟ انیسویں صدی کے وسط کے قریب چند اہل علم نے ان تصورات کے مطالعہ کی ابتدا اور ارتقا کی طرف توجہ دی تو ان تاریک ادوار کا مطالعہ شروع ہوا۔ ان عالموں کی تمام کوششوں کے ذکر کی یہ مختصر سطور متحمل نہیں ہو سکتیں۔

فریڈرک اینگلس نے ان محققین کی کاوشوں کی ایک بڑی جامع اور خوبصورت تلخیص اپنی کتاب ''خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز'' کے چوتھے ایڈیشن (1891) کے دیباچے میں پیش کر دی ہے۔

اینگلس کے الفاظ میں:

''اس صدی کی ساتویں دہائی کے شروع تک خاندان کی تاریخ جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس شعبے میں علم تاریخ پر اس وقت تک موسیٰ کی توریت کا اثر حاوی تھا۔ خاندان کی پدری شکل کو توریت میں جتنی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اتنی تفصیل سے اس کا بیان اور کہیں نہیں ملتا۔ چنانچہ اس کو نہ صرف خاندان کی سب سے قدیم شکل مان لیا گیا تھا بلکہ ___ کثرت زوجگی کے نظام کو الگ کر کے ___ اس کو اور موجودہ زمانے کے بورژوا خاندان کو ایک ہی چیز سمجھ لیا گیا تھا، گویا خاندان اصل میں کسی تاریخی ارتقا سے گذرا ہی نہ ہو۔ زیادہ سے زیادہ بس اتنا مانا جاتا تھا کہ ممکن ہے قدیم زمانے میں آزاد جنسی تعلقات کا کوئی دور رہا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یک زوجگی کے علاوہ مشرق کی کثرت زوجگی اور ہندوستان اور تبت میں کثرت شوہری کا حال بھی لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا۔ لیکن یہ تینوں شکلیں اس وقت کسی تاریخی سلسلے کی کڑیاں نہیں بنی تھیں اور آپس میں بلا کسی تعلق کے ایک دوسرے کے متوازی دکھائی دیتی تھیں۔ یہ امر کہ قدیم زمانے کے کچھ لوگوں اور آج کل کے کچھ وحشیوں میں بھی نسل باپ سے نہیں بلکہ ماں سے چلتی ہے اور اس لئے ان میں صرف عورت کے سلسلہ نسب کو ہی صحیح سمجھا جاتا ہے، اور یہ کہ مذکورہ زمانے کے بہت سے لوگوں میں چند مخصوص گروہوں کے اندر ___ جن کے بارے میں اس وقت تک زیادہ چھان پھٹک

نہیں کی گئی ـــــ شادی کرنے کی ممانعت ہے، اور یہ کہ یہ رواج دنیا کے بھی حصوں میں پایا جاتا ہے ـــــ یہ باتیں لوگوں کو معلوم تھیں اور نئی مثالیں برابر سامنے آ رہی تھیں۔ لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان سے کیا نتیجہ نکالا جائے۔ ای۔ بی۔ ٹائلر کی کتاب "بنی نوع انسان کی ابتدائی تاریخ اور تہذیب کے ارتقا کی تحقیقات" (1865ء)(2) میں ان باتوں کو اسی طرح کی "عجیب و غریب" رسموں کے زمرے میں ڈال دیا گیا جیسے بعض وحشیوں میں جلتی لکڑی کو لوہے کے اوزاروں سے نہ چھونے کا رواج، اور اسی طرح کی دوسری مہمل اور بے معنی باتیں۔

خاندان کی تاریخ کا مطالعہ 1861ء سے شروع ہوا جب باخوفن کی کتاب "مادری حق" شائع ہوئی۔ اس کتاب کے مصنف نے مندرجہ ذیل خیالات پیش کئے۔ 1۔ انسانوں میں شروع میں آزاد جنسی تعلقات کا رواج تھا۔ مصنف نے اسے hetaerism (کئی عورتیں رکھنے کا رواج) کے غیر موزوں نام سے پکارا۔ 2۔ اس آزاد جنسی تعلق کی وجہ سے کسی کے بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس کا باپ کون ہے۔ اس لئے نسب کا سلسلہ صرف ماں سے ـــــ مادری حق ـــــ چل سکتا تھا۔ اور ابتدا میں قدیم زمانے کی سبھی قوموں میں یہ بات پائی جاتی تھی۔ 3۔ چونکہ والدین میں صرف ماں کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا، اس لئے عورتوں کی بڑی قدر و منزلت ہونے لگی اور باخوفن کی رائے میں یہ اتنی بڑھ گئی کہ پوری طرح عورت کا راج (gynaecracy) ہو گیا۔ 4۔ یک زوجگی کا نظام جس میں عورت پر صرف ایک مرد کا حق مانا جاتا ہے، اس کے قائم ہونے کا مطلب ایک مذہبی اصول کی خلاف ورزی (یعنی اصل میں اس عورت پر دوسرے مردوں کے قدیم حق کی خلاف ورزی) تھی۔ اور اس کی تلافی کرنے کے یا ہرجانہ ادا کرنے کے لئے عورت کو ایک خاص مدت کے لئے غیر مردوں کے حوالے کرنا پڑتا تھا۔ (اینگلس، 1949ء)

مارگن نے اپنی تحقیقی بصیرت کی بنا پر اس زمانے کو تین ادوار میں منقسم کیا ہے: دور وحشت، دور بربریت اور دور تہذیب۔ آخری عہد وہ دور ہے جس میں تاریخ کی روشنی جاتی ہے یعنی ہمارا وہ دور جس کے بارے میں ہمیں معلومات ملتی ہیں یا مل سکتی ہیں۔

جیسا کہ نام سے ہی واضح ہو جاتا ہے دور وحشت میں حیوانات کی طرح رشتوں کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ہر طرف آزاد جنسی تعلقات کا دور دورہ تھا۔ ہر مرد کئی عورتوں سے اور ہر عورت کئی مردوں سے تعلقات استوار کر سکتی تھی۔ صرف ایک ہی رشتہ تھا ـــــ ماں اور بچے کا رشتہ ـــــ جو بڑا واضح تھا۔ یہ رشتہ بھی حیوانی رشتوں کی طرح وقتی تھا۔ سماج کی بنیاد جنسی تعلقات پر ہے اس لئے اس زمانے میں نہ خاندان کا کوئی تصور تھا اور نہ ہی سماج کا۔ بچے کا باپ کون ہے کسی کو یہاں تک کہ ماں کو بھی کبھی کبھی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں انسان نے بولنا سیکھا۔ لفظ کی ایجاد سے رشتوں کا تصور پیدا ہوا اور آگے چل کر یہی خاندان، قبیلہ اور قوم کی بنیاد بنا۔

باخوفن بھی اسی نتیجے پر پہنچا کہ انسانی معاشرے تین مراحل سے گزرے تھے۔ پہلے مرحلے کو وہ ٹیلرازم (tullerism) کا نام دیتا ہے۔ اس کے خیال میں اس مرحلے پر مادری نظام موجود تھا۔ شادی کا رواج یا ادارہ موجود

نہیں تھا۔ جنس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ہر عورت جس سے چاہے اختلاط کر سکتی تھی۔ ریاست کا وجود نہیں تھا۔ کاشتکاری اور زراعت ناپید تھے بلکہ یہ طرز زندگی ابھی وجود میں بھی نہیں آیا تھا۔ دوسرے مرحلے کو وہ لیونرازم (Lunrism) کا نام دیتا ہے۔ اس دور میں باقاعدہ شادی کا رواج ہوا اور شادی کو ایک سماجی ادارہ تسلیم کیا گیا۔ اصلی اور باضابطہ اولاد کا تصور وجود میں آیا اور ان کے ساتھ ہی کاشت کاری اور زرعی سکونت پذیر برادریوں کا آغاز ہوا۔ تیسرے دور کو یہ محقق سولر (Solor) عہد کا نام دیتا ہے۔ اس عہد میں مادری نظام والے معاشرے کا اختتام ہوا اور اس کی جگہ پدری نظام کا قیام عمل میں آیا۔ تقسیم کار کا تصور وجود میں آیا اور ساتھ ہی ذاتی املاک کا تصور معاشرے کا بنیادی اصول قرار دیا گیا۔ ہنری مین (Maine) کو باخوفن سے اختلاف تھا۔ اس کے مطابق پہلے پدری نظام وجود میں آیا اور اس کے انحطاط کے بعد مادری نظام آیا اور ایک عرصے کے بعد وہ بھی انحطاط کی نذر ہو گیا۔ اس اختلاف کی تفصیل ٹیلر کی کتاب سیکس ان ہسٹری (Sex in History)، پینتھر، (1965)، کے ملحق B سے مل سکتی ہے۔

مندرجہ بالا نتائج پر پہنچنے کے لئے باخوفن نے علم کے مختلف شعبوں سے شہادت اکٹھی کی: قدیم قانون، اساطیر اور مذہب۔

1۔ قدیم قانون

قانون کی بنیاد زمانے کے رسم و رواج پر ہوتی ہے۔ باخوفن کا کہنا ہے کہ ماضی کی تاریخ میں اہم ترین تاریخ لسیا (Lycia) کے باشندوں کی ہے کیونکہ اس زمانے کے دیگر اقوام کے مقابلے میں ان کے متعلق ہماری معلومات قدرے زیادہ ہیں۔ یہ لوگ کریٹ سے ہجرت کر کے ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر آباد ہو گئے تھے۔ ان کے متعلق ہیروڈوٹس کا مشاہدہ ہے:

In their manners they resemble in some ways the Cretans and in other the Carians. but in one of their customs. that of taking the mother's name instead of father's, they are unique. Ask a Lycian who he is. and he will tell you his mother's name and great grandmother's and so on.

Herodotous, *The Histories*, Penguin Classics. P.111

دمشق کا نکولس (Nicolaus) بھی اس بیان کی تائید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اہل لسیا کے غیر تحریری قوانین کے مطابق حق وراثت صرف بیٹیوں کو ہی حاصل تھا۔

(Fragamenta in Muellar, *Fragmenta Historicorum Ghaecorum*)

مصری ڈائیڈورس (Diodorus) کے مطابق بوڑھے والدین کی نگہداشت بیٹیوں کی ذمہ داری تھی۔ سٹرابو (34.18) کہتا ہے کہ کینٹ بری میں بہنیں ہی بھائیوں کے لئے جہیز کا انتظام کرتی تھیں۔ پولائبیس (Polybeus) کے بیانات سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ

1- مادری حق اس کلچرل دور سے تعلق رکھتا ہے جو پدری نظام کا پیش رو تھا۔ اور
2- پدری نظام کی فاتحانہ ترقی پر یہ نظام روبہ انحطاط ہو گیا۔
اس اصول کی شہادت کئی دیگر قبائل سے بھی دستیاب ہوتی ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو باخوفن: 71 اور آگے) (نوٹ۔ سب حوالے باخوفن کے ہیں)

فقط یہی نکتہ ہی ڈاکٹر وزیر آغا (ایم اے، اقتصادیات، پی ایچ ڈی، اردو) کے مادری اور فادری نظاموں کو اپنے شاہکار کی بنیاد بنانے کے عمل کا مکمل انہدام کر سکتا ہے۔ مگر ابھی بات کو مکمل کرنا باقی ہے۔

ہیروڈوٹس کا مندرجہ بالا بیان اس بحث میں بڑا اہم ہے۔ اس کی بازگشت ہمیں مادر وطن، ماتر بھومی، مدر لینڈ وغیرہ ترکیبوں میں آج بھی سنائی دیتی ہے۔ ہمارے اپنے زمانے کے جدید ترین دین اسلام میں بھی اس کی صدائے بازگشت اس عقیدے میں سنائی دیتی ہے کہ روز قیامت لوگوں کو ان کی ماؤں کے ناموں سے پکارا جائے گا یا اس جامع کلیہ میں کہ جنت ماں کے پیروں کے نیچے ہے یا یہ کہاوت کہ ماں کی دعا جنت کی ہوا۔ یہ سب آوازیں خواندہ اور ناخواندہ اسلامی معاشروں میں سنائی دیتی ہیں۔

2- اساطیر

باخوفن کہتا ہے کہ "اساطیری روایت اس زمانے کا قابل اعتماد عکس ہے جس میں تاریخی قدامت کی جڑیں تھیں۔ یہ انسان کی انتہائی ابتدائی فکر ہے اور یہی تاریخی انکشافات کا مبدا ہے۔" (باخوفن: 73)

تمام علوم کی ابتدا اساطیر سے ہوتی ہے۔ اسطور ہی انسانی فکر کا نکتہ آغاز ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ "ہم تاریخ کی ابتدا کے لئے اساطیر کے مبدا کی طرف رجوع کریں۔ کیونکہ یہ ابتدا ہی ہے جو ان کی نوعیت اور جہت کا تعین کرتی ہے۔ بغیر اس مبدا کی طرف رجوع کئے تاریخ کا علم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ یہ طرز بیان ہی ہے جو اسطور اور تاریخ میں امتیاز کا سبب بنتا ہے۔ قدیم ادوار کی تاریخ کے مطالعہ کے لئے یہی ہمارا نقطہ آغاز ہیں۔" (باخوفن: 75)

اسے اعتراف ہے کہ "اساطیر ریگ رواں کی طرح ہیں اور آسانی سے گرفت میں نہیں آتیں۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ "اس علامت کا اطلاق اساطیر پر نہیں بلکہ ان کی تعبیر پر ہے۔ اپنی ظاہری حالت میں کسی ایک اسطور کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں اور یہ زمانے کے ساتھ بدلتی بھی رہتی ہیں۔ تاہم اساطیر اٹل قوانین کے تابع ہیں اور ان سے قرار واقعی اور بڑے محفوظ نتائج ایسے ہی برآمد ہو سکتے ہیں جیسے کسی تاریخی مآخذ سے۔" (باخوفن: 76)

اساطیر سے شہادت کے لئے دیگر کلاسیکی ادب کے علاوہ وہ ہومر کی (وزیر آغا کی نہیں) اوڈیسی اور ایلیڈ سے رجوع کرتا ہے۔

3- مذہب

انسانیت کی تشکیل میں باخوفن مذہب کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اس کے مطابق "مادری نظام کی مذہبی بنیادیں

اس نظام کا اظہار انتہائی ارفع و اعلیٰ مراتب میں کرتی ہیں، زندگی کو بلند ترین مقامات سے منسلک کرتی ہیں اور اس قدیم عہد کو گہری بصیرت عطا کرتی ہیں جیسے ہیلن ازم (Hellenism) نے اس کے تصورات کی گہرائی اور بلندی پر تو نہیں بلکہ صرف ظاہری چمک دمک پر برتری حاصل کی۔ میں ہمیشہ سے اس عہد عتیق کے خیالات اور تاریخ کے متعلق حالیہ بنیادی نظریات کے درمیان خلیج سے پوری طرح آگاہ ہوں۔ مذہب قوموں کی زندگی کی تشکیل کرنے والی پہلی قوت ہے جس سے استنباط کا عمل قدیم فکر کی تاریک ترین پہلوؤں کو روشن کرتا ہے، مگر آج کل کے مورخوں کے دیوتاؤں کی حکومت کے ایک غیر فطری رجحان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ ازمنہ تاریک کے ادوار کی طرف لوٹنے والی جیسی ہی تنگ نظری ہے۔" (باخوفن :83، 85)

قدیم مذاہب میں جنس پرستی اور مختلف ممالک میں دیوتاؤں کی بجائے دیویوں کی پرستش وغیرہ شامل ہیں۔

کانسی کا دور چار سے تین ہزار سال ق۔م کا زمانہ ہے۔ اس میں بابل میں اشتار دیوی کی پرستش ہوتی تھی۔ اس کے حضور مانگی جانے والی دعائیں مٹی کی تختیوں پر کندہ کی ہوئی ملتی ہیں۔ انانا دیوی کی پرستش سمیریا میں ہوتی ہیں۔ ایسی دیوی مصر میں آئسس اور روم میں سبیلی تھی۔ ان شہادتوں سے پتا چلتا ہے کہ ماں کی کتنی اہمیت تھی۔ ای۔او۔جیمز کے خیال میں ان مجسموں میں مادر پرستی کے اصول کی تجسیم کر دی گئی تھی۔ یہ صورت احوال مغربی ایشیا کریٹ اور بحیرہ ایجین کے ساحلوں پر تھی۔

ان جگہوں پر دیوتاؤں کی حیثیت ثانوی تھی انسٹیٹیوٹ آف آرکس ایج سٹڈیز کے رینڈل وائٹ کے مطابق (آثاری) اشیا ٹھوس ہیں، ان کی اپنی تاریخ ہے۔ یہ مستند ہیں اور سماجی اقتدار اور کھرے پن کی حامل ہیں۔ ماہر اساطیر جوزف کیمبل اپنی کتاب *Primitive Mythology* پریمیٹو میتھالوجی میں کہتے ہیں کہ زنانہ مورتیاں مجسموں کی اولین مثالیں ہیں۔ حیوان ناطق یعنی انسان نے سب سے پہلے انہی کی پرستش کی۔ (Internet. *Our Many Mothers*) ۔ دیویوں کی پرستش کا یہ مذہب عالمگیر تھا۔ قدیم تہذیبوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی محدود دنیا میں مردانہ اور زنانہ اعضائے تولید کی پرستش ہوتی تھی۔ اگلے مرحلے پر ان کے نقشے، مورتیاں اور مجسمے وغیرہ بنائے جاتے تھے۔ اور ان کی پرستش کی جاتی تھی۔ مصر، روم، یونان، مشرق وسطی اور یورپ میں یہ مذہب بہت وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا تھا اور اس کی فسق و فجور کی حامل رنگ رلیوں کو عبادت کا درجہ حاصل تھا۔

جیسا کہ تنتر ازم کی بحث کے دوران ہم دیکھ آئے ہیں کہ مشرق وسطی میں الہامی مذاہب نے جنس پرستی کو ختم کر دیا لیکن جہاں یہ مذاہب پہنچ نہیں پائے وہاں جنس پرستی جاری رہی۔ ہندوستان ایسے ہی ملکوں میں سے ایک ہے جہاں جنس پرستی ایک مذہب کے طور پر بڑی فعال ہے۔ یہاں آج بھی لنگم اور یونی کی صورت میں اعضائے تولید کی پرستش کی جاتی ہے اور جنسی فعل کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ ہندوستان کے مختلف مقامات پر اب بھی موجود ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے اس مذہب یا اس نقطہ نظر پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں جنہیں تنتر کہتے ہیں۔ تصویریں اور پتھر اور دھات میں جنسی اختلاط کے مجسمے بھی تیار ہوئے جو آج تک موجود ہیں۔

ان سے مادر گیتی یا جگت ماتا کا تصور ابھرا۔ اس نے ایک مذہب کی صورت اختیار کر لی جو آج بھی فعال ہے۔ ان مشاہدات سے یہ استنباط کیا گیا کہ کبھی نہ کبھی خواتین کی سیادت ضرور رہی ہوگی۔

عام خیال تو یہی ہے کہ مادری نظام کے تصور کو وضع کرنے والے باخوفن، ہنری مین اور چند دیگر محقق تھے۔ اس کی پرورش ڈاروِن ازم (باخوفن اور ڈاروِن دونوں ہم عصر تھے اور دونوں کی آپس میں خط وکتابت بھی تھی) اور اس زمانے میں چلنے والی رومانویت کے زیر سایہ ہوئی۔ باخوفن بھی اس رومانوی تحریک سے بہت متاثر تھا۔ انیسویں صدی میں ان ماہرین کا سماجی ارتقا کا نظریہ بڑے زور شور سے ابھرا اور اس نے پورے یورپ کے دانشوروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس پر مستزاد یہ امر ہے کہ انیسویں صدی میں رومانویت کی تحریک بھی اپنے عروج پر تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے بی اے میں انگریزی شاعری پڑھی ہے اس لئے ان کا اس رومانوی تحریک سے تھوڑا بہت تعارف ضرور ہوا ہوگا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس تعارف کو صرف شاعری تک ہی محدود رکھا ہے۔ انہیں یہ معلوم نہیں ہوا کہ اس رومانوی تحریک نے یورپ میں اس دور کے انسان کے ذہن، اس کی فکر، نظریات، خیالات اور جذبات کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

رومان کا تعلق حقائق سے نہیں ہوتا۔ اس زمانے کے بہت سارے تصورات جیسے

1۔ ہندوستان کی کوئی تاریخ نہیں،

2۔ اہل ہند اپنے آپ پر حکومت کرنے کے اہل نہیں اور ہمیشہ باہر کے لوگ یہاں آ کر حکومت کرتے رہے۔

3۔ ''مشرقی مطلق العنانی'' کا تصور (اورینٹل ڈیسپاٹزم) (Oriental Despotism)

4۔ آریا اور آریایت۔

5۔ نسلی فضیلت

6۔ دراوڑ

7۔ اور مادری نظام اور فادری نظام، وغیرہ

گمراہ کن مفروضے بھی اسی رومانوی تحریک ہی کی پیداوار تھے۔ اس کے لئے مزید ملاحظہ ہو رومیلا تھاپر کی ہسٹری اینڈ بی یانڈ (*History & Beyond*)۔

ماتا دیوی یا مادر کائنات یا دیویوں کی بہتات سے مادری نظام اخذ کرنے والوں کو جن میں اس کے پُرجوش مبلغ اور ہمارے محترم ڈاکٹر وزیر آغا بھی شامل ہیں، درج ذیل تنبیہ ذہن میں رکھنی چاہئے:

> الوہی ہستیوں کی صوریات اور تاریخ کا تجزیہ کرتے وقت کئی امور کو پیش نظر رکھنا ناگزیر ہے۔ اول، اگرچہ کسی معاشرے کی دیوی یا دیوتا اس معاشرے کی روایات اور اقدار کو منعکس کرتے ہیں لیکن اس بنا پر الوہی دنیا اور انسانی معاشروں کے درمیان

مماثلت قائم کرنا گمراہ کن ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی معاشرہ ماتا دیوی کو اہمیت دیتا ہے تو اس سے یہ مراد نہیں لی جاسکتی یہ معاشرہ مادری نظام کا پیرو ہے۔ دیوی دیوتاؤں کی اساطیر انسان کے تاریخی تجربات کو بلاواسطہ منعکس نہیں کرتیں۔ (لڈوگ، 6: 59 و 60)

نام نہاد مادری نظام کے نام سے ملتے جلتے سماجی نظام کو میٹری لینیل (Matrilenial) نظام کہا جاتا ہے۔ اس میں ہر شخص اپنا شجرہ اپنی ماں کے حوالے سے طے کرتا ہے اسے مدر رائٹ کہا جاتا ہے۔ یہی وہ تصور یا نظام ہے جو اس بحث میں خلط مبحث کا سبب بنا ہے اور باخوفن کے مندرجہ بالا اقتباس کا مطلب یہی تھا مگر اس سے غلط استنباط اور اصطلاحات کے غلط معنی لے کر (جیسا کہ ہمارے ڈاکٹر صاحب کا وطیرہ ہے) یہ فرض کرلیا گیا کہ کسی نہ کسی وقت عورتوں کا راج رہا ہوگا۔ اس میں خواتین کے حقوق کے علمبردار پیش پیش تھے۔ میٹری لینیل نظام یا رواج کے متعلق ایک ماہر کے خیالات یہ ہیں:

> مادری نظام یا مدر رائٹ کا تصور بڑا پیچیدہ ہے۔ یہ وہ سماجی نظام ہے جس کے تحت تمام رشتے داریاں ماں کے ساتھ رشتے سے متعین ہوتی ہیں۔ ان میں ہر فرد کے فرائض اور اس کے حقوق اور اس پر لازم پابندیاں اسی رشتے کے تحت طے پاتی ہیں جو اس کا اس کی ماں کے ساتھ ہے۔ یہ مسئلہ بہت گنجلک ہے۔ اس کے عناصر یہ ہیں:
>
> 1- توارث   2- رشتے داریاں   3- وراثت
>
> 4- جانشینی   5- اختیارات   6- شادی
>
> موجودہ ہندوستان میں اس کے صرف دو مرکز ہیں: اول کھاسی قبیلہ جو آسام میں آباد ہے اور دوم مالا بار کا ساحل جہاں نائر، شمالی تایان اور مسلمان موپلوں میں اس کے کچھ آثار ملتے ہیں۔ یہاں اس نظام کو مارامکوتم کہتے ہیں اور اس کا تعلق چند شوئی سے ہے۔ (ریورز، انسائیکلوپیڈیا آف رلیجن اینڈ ایتھکس: بذیل مادہ مدر رائٹ)

(3)

فلسفے کے استاد محترم علی عباس جلال پوری نے اپنی کتاب ''خرد نامہ جلالپوری'' میں پدری نظام کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

> 1- تاریخ عالم میں زرعی انقلاب کے بعد پدری نظام معاشرہ قائم ہوگیا جس میں مرد کی سیادت عورت پر مسلم ہوگئی اور بچے باپ کے نام سے پکارے جانے لگے۔ من چلے جنگجوؤں نے لشکر اکٹھے کئے اور بستیوں پر قبضہ کرکے ریاست کی بنیاد رکھی۔ (جلال پوری (2000ء) ص 75)
>
> 2- علم الانسان کے طلبہ کہتے ہیں کہ زرعی انقلاب کی ابتدائی صدیوں میں مادری

> نظام معاشرہ قائم رہا جس میں ایک ہی قبیلے کے مرد عورتیں مل جل کر رہتے تھے اور ان میں خوراک اور عورت کا اشتراک تھا۔ (جلال پوری، وہی کتاب، ص، 64)

یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ان دونوں اقتباسات میں اہم ترین ترکیبیں زرعی انقلاب اور ''خوراک اور عورت کا اشتراک'' ہیں۔ مادری نظام سے متعلق بحث میں ان تصورات کی کلیدی حیثیت ہے۔

یہاں بڑے واضح الفاظ میں وضاحت موجود ہے کہ جو درس ڈاکٹر وزیر آغا ہمیں دے رہے ہیں عین اس کے برعکس مادری نظام زراعت کے آغاز سے پہلے تک قائم تھا۔ لیکن جب معاشرہ زراعت کے دور میں داخل ہوا تو اس کی جگہ پدری نظام بتدریج رائج ہو گیا۔ مادری نظام کا ''کاشت کاری'' یا ''زمین سے چمٹے رہنے سے'' یا کسی ''ٹھہرے ہوئے معاشرے'' سے جیسا کہ ہمارے محترم وزیر آغا کا خیال ہے، کوئی تعلق نہیں۔ پیش کردہ اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے اول تو کوئی مادری نظام تھا ہی نہیں اور نہ ہی کوئی پدری نظام تھا۔ یہ محض انیسویں صدی کے رومانوی مفروضے ہیں۔ ان کا کوئی تعلق زراعت یا کاشت کاری سے نہیں تھا۔ اور بالفرض اگر کوئی مادری نظام تھا بھی تو وہ زراعت کے آغاز سے پہلے تھا۔ زراعت کے آنے پر وہ بتدریج ختم ہو گیا اور اس کی جگہ پدری نظام آ گیا۔ ہیروڈوٹس کے مندرجہ بالا اقتباس سے بھی ایسا واضح ہوتا ہے جب وہ لسیا کی اس رسم پر اظہار تعجب کرتا ہے کہ ان لوگوں کا شجرہ ماں سے چلتا ہے۔ اس کے متعجب ہونے کی وجہ یہی تھی کہ اس کے زمانے میں (یعنی پانچویں صدی ق۔م میں) پدری نظام کا دور دورہ تھا۔ کسی کو بھی اب ماں کی نسبت سے پکارا نہیں جاتا تھا۔

گویا مادری نظام ایک ایسا فرضی نظام ہے جس میں یہ فرض کیا جاتا تھا کہ خاندانی اور سیاسی سیادت خواتین کے ہاتھوں میں تھی۔ انیسویں صدی میں ماہرین بشریات اور مورخوں نے ڈارون کے نظریہ ارتقا کا زیر اثر ان نظاموں کے بارے میں تصورات وضع کئے۔ انہوں نے شہادت یا مشاہدے سے کام نہیں لیا اور اپنے تصورات کی بنیاد قیاسات اور منطقی استنباط پر رکھی۔ شہادت کی بجائے صرف منطقی سوچ سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا سماجی ارتقا میں پہلے مادری نظام کی موجودگی لازمی ہے۔ اگرچہ ان خیالات کی بنیاد بڑی کمزور تھی تاہم خواتین کے حقوق کے علم بردار اسے اپنے حق میں استعمال کرتے رہے۔

اب مادری اور فادری نظاموں کے متعلق ہمعصر ماہرین کی تحقیقات کے نتائج پر غور کرنا سودمند ہو سکتا ہے تاکہ یہ مفروضے ہمارے علم و ادب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خارج ہو جائیں اور آئندہ آنے والا کوئی ڈاکٹر وزیر آغا ہمیں سماجی ارتقا کا غلط درس نہ دے سکے۔

1۔ مادری نظام ایک ایسا مفروضہ ہے جس میں خاندانی اور سیاسی اقتدار خواتین کے پاس ہوتا تھا۔ ڈارون کے اصول ارتقا کے نتائج اور بالخصوص سوئٹزرلینڈ کے ماہر بشریات جے۔ جے۔ باخوفن اور انیسویں صدی کے کچھ مورخوں اور ماہرین بشریات نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آزادانہ جنسی ملاپ اور مردانہ حاکمیت سے پہلے ارتقائی تسلسل کے طفیل معاشرہ مادری نظام سے گزرا ہے۔ مگر اب تمام ماہرین بشریات اور معاشروں کے

ماہرین اس پر متفق ہیں کہ ایک قطعی مادری نظام کبھی وجود میں نہیں آیا۔(انسائیکلو پیڈیا برٹینکا (مائکرو)، (1983) جلد vii، ص 691 و 692)۔ مگر یہ ایک عمومی بیان ہے۔ علم بشریات کے ماہرین نے بھی ان تصورات کو ان الفاظ میں رد کر دیا ہے:

2- نظریہ سازوں کے خیال میں نسلی افزائش اور زرعی عمل نے نوع انسان پر مرد کی تخلیقی اہلیت کا انکشاف کیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان اپنی موجودگی کے ملین برسوں کے دوران صرف پچھلے دس ہزار برسوں میں پدریت کو سمجھ سکا اور حسب نسب میں عورت اور مرد دونوں کا شمار ہونے لگا۔ یوں ماں اور بچے کے رشتے کو کنبے کے رشتے نے چیلنج کیا۔ ہنری سٹیفن، بریفالٹ اور ہنری مین کا پیش کردہ یہ خیال کہ اقتدار عورتوں کے ہاتھوں میں ہوتا تھا، کب کا باطل قرار دیا جا چکا ہے۔ لیکن ایشیا اور یورپ میں مادر پرستی کو موجودہ علم قبول کرتا ہے۔(رایوزی، جلد 5، ص 279)

مادری نظام کے استرداد پر مزید ملاحظہ ہو:

i- سیلی آرجنو رو، متھز اینڈ میٹری آرکیٹ (Myths and Matriarchate)۔

ii- کیرولن فلیبر لوبان کا مقالہ مارکسٹ ری اپریزل آف دی میٹری آرکیٹ (Marxist Reappraisal of Matriarchate) مطبوعہ مجلہ کرنٹ انتھرو پالوجی، نمبر 20 (جون 1979) ص 341 تا 360)۔

اس موضوع پر ایک اور ماہر یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

> تقابلی مذاہب کے سکالرز جن میں حقوق نسواں کے سکالرز بھی شامل ہیں، اس بات پر متفق ہیں کہ ابتدائی مادری نظام خرافات تھی۔ لیکن زمانہ قبل از تاریخ مرد اور عورت کے کردار پر تحقیق کو یہ امر مانع نہیں۔ چونکہ فیلڈ ورک سے ابھی تک مادری نظام پر مبنی کسی معاشرے کی تائید نہیں ہوئی اس لئے مادری نظام کی بحث نیم مذہبی موضوع بن گئی ہے اور اس کا ماتا دیوی کے سنجیدہ مطالعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس سے کہیں زیادہ اہم حقوق نسواں کے علمبرداروں کے وہ مطالعیات ہیں جو انیسویں صدی کے مشکوک مسائل جن میں اوائلی مادری نظام بھی شامل ہے، بیچ میں لائے بغیر مذہب کے ساتھ انسانی جہات کے رشتے کی ہماری تفہیم کو مزید گہرا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سارے کام کے بیشتر حصے میں خواتین جدید دور میں اپنے تشخص کے لئے ایک فوکس کی تلاش میں ہیں۔ ماتا دیوی کی پرستش کا اس کوشش سے بڑا قریبی تعلق ہے۔(پریسٹن، ص 56)

انگلستان کی ریڈنگ یونیورسٹی کے شعبہ بشریات کی ریڈر مرحومہ ریولا کلین (Reola Klein) (وفات 1973) نے اپنے مقالے ''سٹیٹس آف ویمن'' (Status of Women) میں اس ساری بحث کی تلخیص درج ذیل الفاظ میں

کی ہے:

خواتین کی ایک مسلسل تاریخ لکھنے کی کوششیں کی گئی ہیں جن میں مختلف معاشروں اور کلچرز میں ان کا کردار بھی شامل ہے۔ بشریات کی روز افزوں شہادت کے زیر اثر جو خاندان کے رشتوں کے عظیم تنوع کو واضح کرتی ہے، اور قدیم معاشروں سے آثار کی روز افزوں شہادت کے گہرے اثرات جس کے مطابق ان قدیم معاشروں میں خواتین کا رتبہ اس زمانے کے یورپی معاشروں میں عورتوں کے رتبے کی نسبت خاصا بلند تھا، اور ڈاروِن کے نظریہ ارتقا کے زیر اثر انیسویں صدی کے آخر کے زمانے کے مصنفین نے یہ خیال پیش کیا کہ تہذیب کے آغاز میں مادری نظام موجود تھا جس سے بہتر جسمانی طاقت کی بنا پر اور جائیداد کی صحیح وارثوں کو منتقلی یقینی بنانے کے لئے خواتین کو بتدریج خارج کر دیا گیا۔ "مدر رائٹ" (مادری اصول یا حق مادر) کو اینگلس اور مارکس کے بعد آنے والے اس کے پیروکاروں نے ایک پروٹو ٹائپ اور معاشرے کی مثالی تنظیم کے طور پر قبول کیا۔ مگر بشریات کے موجودہ ماہرین نے اولین مادری نظام کے تصور کو دو وجوہات کی بنا پر مسترد کر دیا۔ اول، مادری نظام جس میں اقتدار اعلیٰ خواتین کے پاس ہوتا ہے اور میٹری لینیل معاشرے کے درمیان تفریق کو پیش نظر رکھنا لازمی ہے۔ اوائلی معاشروں میں شجرہ ماں سے نسبت کی بنا پر کثرت سے چلتا تھا (جیسا کہ رومن کہتے تھے کہ ماں کا وجود تو یقینی ہے) مگر وہاں کہیں مادری نظام نہیں تھا۔ اور نہ ہی یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ ایسے معاشرے میں جس میں شجرہ ماں سے شروع ہوتا ہے، اقتدار اعلیٰ خواتین کے پاس ہوتا ہے کیونکہ وہاں اقتدار ماں کے بھائی کو بھی سونپا جا سکتا ہے۔ کوئی معاشرہ بیک وقت پدری اور میٹری لینیل بھی ہو سکتا ہے۔ رشتے داریوں کی کئی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں ان عناصر کو اکٹھا بھی کیا جا سکتا ہے۔ (کلیمن جلد 19، ص، 909، (1983) اور یہی کتاب سی ڈی پر 2000 ڈی لکس ایڈیشن)۔

بقول اینگلس باخوفن علم کے اس شعبے کا خضر تھا۔ اس کے منتخب کام کا انگریزی ترجمہ پرنسٹن یونیورسٹی سے متھ، ریلیجن اینڈ مدر رائٹ *(Myth, Religion & Mother Right)* کے نام سے بولنجن سیریز کے 84 نمبر پر 1967 میں شائع ہوا۔ اس کا دیباچہ جارج بواس نے اور تعارف جوزف کیمبل نے لکھا۔ جارج بواس کے دیباچے کے پہلے دو فقرے اس موضوع پر حرف آخر معلوم ہوتے ہیں، درج ذیل ہیں:

The name of Johann Jakob Bachofen, if mentioned in books of reference, is attached to a theory of social development which maintains that the first

period of human history was matriarchal. And if any discussion of the theory is added, it will be to the effect that it is Myth, almost universally discredited. (Italics added) Ralph Manheim (tr), *Religion And Mother Right* p.xxi

چنانچہ ماہرین کی تحقیق پر مبنی آرا اور مندرجہ بالا شہادت سے ہی ڈاکٹر صاحب کا مادر پرستی کے مذہب سے مادری نظام کے معاشرتی تصور کا استخراج مجہول ہو جاتا ہے۔ مادری اور فادری نظاموں کے تصور کے مجہول ہونے سے ڈاکٹر وزیر آغا کے پیش کردہ "مادری مزاج" اور "فادری مزاج" کے تصورات بھی مجہول ہو جاتے ہیں۔ ان کا زندگی کے باقی مظاہر جیسے تہذیب، تمدن، فنون پر مادری اور فادری نظاموں کے لیبل چسپاں کرنے کا فعل بھی مجہول ہو جاتا ہے۔ یوں ان کے اس فکری سومنات میں زلزلہ آ جاتا ہے۔ اور اس میں سجے ہوئے حنوط شدہ بت منہ کے بل گر کے قل ھو اللہ احد کہتے ہیں۔ یوں ان کا یہ شاہکار یعنی "اردو شاعری کا مزاج"، "ایک تحقیقی اور تنقیدی کارنامہ" کی بجائے مجموعہ خرافات اور خرافات قرار پاتا ہے۔

کتابیات

(اردو)

اینگلس، خاندان، ذاتی ملکیت، اور ریاست کا آغاز، چوتھا ایڈیشن، فکشن ہاؤس، مزنگ روڈ لاہور، 2000ء۔

جلالپوری، علی عباس، روح عصر، بار پنجم، تخلیقات، لاہور، 2000ء۔

جلالپوری، علی عباس، خرد نامہ جلالپوری، تخلیقات، لاہور، 2000ء۔

وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، جدید ناشرین (؟) اردو بازار، لاہور، 1965ء۔

وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی منڈیر سے، مکتبہ فکر و خیال، اقبال ٹاؤن، لاہور، 1986ء۔

English

Boas, George, 1987

Preface: Manheim, Ralph (tr.) *Myth, Religion and Mother Right- J.J. Bachofen's Selected Writings*

Campbell, Joseph, 1987

Introduction To Manheim, op.cit.

Manheim, Ralph (tr.) op.cit.

Macmilan's Encyclopaedia, 1985

Rabuzi, Katherine L. 1987

Goddess Worship—Theoretical Perspectives, In Mercia Elaide (Ed.)

Encyclopaedia of Religion, Macmillan, New York

Rivers, W.H.R. 1930

Mother Right, in Hastings (ed.).) *Encyclopedia of Religion and Ethics* Vol. IX

Romila Thapar, 1987

History and Beyond, Oriental Longman, New Delhi

Taylor, G. Rattray, 1965

Sex in History, Panther Books

Klein, Revola, 1983

Status of Women in *Encyclopedia Brittanica* (Macro), vol 19

ادیب اور معاشرہ

جیلانی کامران

یہ موضوع کہ ادیب کا معاشرے کے ساتھ کیا تعلق ہے ایک پرانا مسئلہ بن چکا ہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں اس پر ایک بار پھر غور کرنا ضروری دکھائی دیتا ہے۔ ایسی ضرورت اس لئے بھی محسوس ہوتی ہے کہ معاشرے نے ادیب کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور اس کی تخلیقی آزادی بری طرح پامال ہو رہی ہے۔ ادیب نے جس نقطہ نظر کو اپنا رکھا ہے وہ معاشرے کی عکاسی اور ترجمانی اور نمائندگی کا انداز فکر ہے۔ اور یہ نقطہ نظر گزشتہ ایک صدی سے برابر کارفرما ہے۔ اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جا رہی ہے کہ کیا اس انداز فکر پر نظر ثانی کی ضرورت تو نہیں ہے! اس کیفیت نے انداز فکر کو جمود کی صورت بھی دے رکھی ہے اور کسی نئی سوچ کے راستے بند کر رکھے ہیں!

اس امر میں یہ قابل غور ہے کہ معاشرے کی خرابی، صحت یا عدم صحت، اور ایسے بے شمار مسائل اپنے طور پر ایک بامعنی عمل اور بامقصد جدوجہد کا تقاضا کرتے ہیں۔ جس کا اظہار معاشرتی سائنسدان، اخبارات اور سیاسی جماعتیں کرتی ہیں۔ کیوں کہ ایک قومی ریاست میں حکومت کو منصوبہ بندی کے لئے معاشرتی سائنسدان، جرنلزم اور سیاسی پارٹیاں مسائل کی ترجیحات فراہم کرتی ہیں اور حکومت کی ذمہ داری معاشرے کی تشکیل، اصلاح اور بامقصد تعمیر کی صورت میں آشکار ہوتی ہے۔ قومی ریاست کی کوئی بھی حکومت اس ذمہ داری سے روگردانی نہیں کر سکتی۔ اگر اس زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو ادیب معاشرتی تشکیل و تعمیر کے عمل میں اس طرح شامل ہوتے نظر نہیں آتا جن معنوں میں معاشرتی سائنسدان، اخبارات یا سیاسی جماعتیں نظر آتی ہیں۔ اگر اس نقشہ میں ادیب موجود نہیں، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادیب کا معاشرے کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ تاہم یہ کہنا ضروری ہے کہ معاشرے کی جس صورت کے ساتھ سرکار کا، سیاسی پارٹیوں کا، جرنلزم کا اور معاشرتی سائنسدان کا تعلق ہے وہ معاشرے کا طبعی وجود ہے اور سائنسی فکر کا موضوع ہے۔ طبعی وجود یقیناً تخلیقی ادب کا موضوع نہیں ہے۔ یہ بات ادیب کے غور و فکر کے لئے لازمی ہے!

انیسویں صدی کے اواخر میں آرنلڈ نے معاشرے پر غور و فکر کرتے ہوئے یہ بات کہی تھی کہ معاشرے کی سطح پر جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ حوادث کی صورتیں ہیں جن کو معاشرے کے عارضی مظاہر میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ان کو ادب کا موضوع نہیں بنایا جا سکتا۔ ادب کا موضوع معاشرے کی گہرائیوں میں رواں رہتا ہے جس کی پہچان ادیب کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ ان گہرائیوں کو روایت کا مرکزی دھارا بھی کہا گیا ہے۔ اور عہد حاضر میں میں اسٹریم لٹریچر کا نام بھی دیا گیا ہے۔ آرنلڈ نے معاشرے کو سطحی وجود اور عمیق وجود کے حوالے سے دیکھنے کی روش کو رواج دیا تھا۔

۲

معاشرے کے بارے میں اس امر کا ملحوظ نظر ہونا ضروری ہے کہ مغربی معاشرہ روایت سے پیوست ہے اور تسلسل روایت کی پیروی کرتا ہے۔ اس لئے آرنلڈ نے بڑی آسانی سے معاشرے کے عمق میں جھانکنے کی ضرورت پر اصرار کیا تھا۔ لیکن معاشرے کی جو صورت ہمارے ادیب کا سامنا کرتی ہے اس میں معاشرہ ایک جزیرہ بنتے نظر آتا ہے جس کے چاروں جانب طبعی قوتیں، وسیع ترپانیوں کے مانند پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اس لئے جب ادیب معاشرے کے باہمی رابطے کی بناء پر لکھتا ہے تو وہ بھی اس جزیرے کا قیدی بن جاتا ہے جس کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ ادیب کے رویے کو معاشرے کے ساتھ مسافت مکانی کا اختیار کرنا لازمی ہے۔

مسافت مکانی کا رویہ اختیار کرنے سے معاشرے کے ساتھ کیفیت زمانی کا آشکار ہونا لازمی ہے۔ اس طرح معاشرے کا طبعی وجود تہذیبی وجود کے طور پر رونما ہوتا ہے جو درحقیقت ادیب کا اصل موضوع ہے۔ تہذیبی وجود اعلیٰ اور ارفع صداقتوں کے مظاہر میں جاگزیں ہوتا ہے اور صداقتوں کی تلاش، ان کا سراغ، اور انسان کے فعل وعمل کا زائچہ ترتیب دیتا ہے۔ اس طرح ہر عہد کے انسان کی پیمائش ممکن ہو سکتی ہے۔ طبعی وجود اور تہذیبی وجود کے مابین انسان رابطے کا پل بن کر جس تجربے اور واردات کو بیان کرتا ہے اسے ادب میں ایک نمایاں مقام دیا جانا ضروری ہے۔ ایسا رابطہ اور ایسا مان ابھی تک ادیب کے قلم سے وارد نہیں ہوا۔ انسان کو صرف جبلتوں، کشاکش، تضادات اور تصادم اور پامالی کے حوالے سے ناپا گیا ہے۔ ایسا رویہ شاید متروک ہو چکا ہے۔ معاشرے کے تہذیبی وجود کا ادراک عہد حاضر کی بنیادی ذمہ داری بن چکا ہے۔

۳

طبعی وجود کے مظالم کی روداد (کے ملبے) سے ایک نئے دور کے ادب کی اساس کو مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اور تہذیبی وجود کی شناخت کے لئے زائرین کا سفر، تجربے، مشاہدے اور انکشافات کا ایک نیا سفرنامہ ادب کی گرفت میں آ سکتا ہے، جسے ادیب کے غور و فکر کی سنجیدگی دریافت کر سکتی ہے۔ یہ کارگزاری ادیب کی تخلیقی آزادی کے ذریعے ممکن ہو سکتی ہے اور اس کے ساتھ مستقبل کی جانب سفر بھی ممکن ہو سکتا ہے۔

ادبی فکر کی تاریخ میں اب وہ مقام آ چکا ہے جہاں ادیب کے لئے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ وہ کون

ہے؟ اب وہ عکاسی کے متروک نظریے کا قیدی نہیں ہے۔ وہ اب معاشرے کے تہذیبی وجود کا فرد بن چکا ہے اور تہذیبی وجود کے مظاہر کا صورت گر بن کر رونما ہونے کو ہے۔ اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ صورت گری کے خدوخال اور اسالیب کو اپنی تخلیقی آزادی کی وساطت سے خود دریافت کرے۔ اور نئے مظاہر کا سراغ لگا کر ان کو آشکار کرے۔ یہ کام شاید آسان بھی نہیں ہے لیکن غیر ممکن نہیں ہے۔ ان مظاہر کی تلاش اور ان تک باریابی سے بیچارہ ادیب ایک نئی اور بالاتر انفرادیت سے ہمکنار ہوگا۔ اور ایک نئی تخلیقی سرشاری سے عہد حاضر کے ادبی منظر میں ایک بلند تر باب کے اضافے کا سبب بھی بن سکے گا۔ ایسا ہونا مقدر ہو چکا ہے۔ ادیب اپنی بدلی ہوئی ذمہ داری اور تہذیبی وجود کے ساتھ اپنی رشتہ بندیوں سے الفاظ کی حرمتوں کو ایک جداگانہ مقام فراہم کرے گا جس کے انتظار میں الف ثالث کے آنے والے شب و روز ہیں۔

مجید امجد: شاعری کے کندن کا لشکارا

ڈاکٹر سعادت سعید

اردو نظم نے اپنے ارتقا کی مختصر عمر میں بے پناہ ترقی کی ہے۔ نظیر اکبر آبادی، علامہ محمد اقبال، ن۔ م راشد، میرا جی، مجید امجد اور افتخار جالب کی تخلیقات باور کراتی ہیں کہ اردو نظم کو دنیا کی کسی بھی بڑی زبان میں ہونے والی شاعری کے سامنے فخر سے رکھا جا سکتا ہے۔ کسے خبر تھی کہ ۱۱ مئی ۱۹۷۴ء کو ساہیوال میں انتقال کرنے والا شاعر مجید امجد اس عہد نا پرساں میں تعلقات عامہ میں صفر ہونے کے باوجود محض اور محض اپنی ان تخلیقات کی بدولت کہ جو تخیل کی بلند پروازی، شاعرانہ رفعت، نفسیاتی گہرائی اور لسانی تازہ کاری میں لاثانی ہیں، اردو نظم کے عظیم شعرا کی صف اول میں آ بیٹھے گا۔ مجید امجد نے ۲۹ جون ۱۹۱۴ء کو جھنگ میں آنکھ کھولی، والد اور والدہ کی نا چاقی کی وجہ سے ان کی ابتدائی پرورش ان کے نانا نے کی اور انہیں فارسی اور عربی زبان کے اولین درس دیئے۔ انٹر تک گورنمنٹ کالج جھنگ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور سے بی اے کا امتحان پاس کیا اور بعد ازاں جھنگ کے ایک ہفت روزہ ''عروج'' سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۳۹ء کے بعد انہوں نے کچھ عرصہ ڈسٹرکٹ بورڈ جھنگ میں بطور کلرک کام کیا۔ انہوں نے فوڈ ڈیپارٹمنٹ میں بطور انسپکٹر سول سپلائز، اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر کی حیثیت سے طویل عرصہ ملازمت کی۔ ۱۹۷۲ء میں وہ اسی محکمے سے ریٹائر ہوئے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ ساہیوال میں گزارا۔ ان کی موجودگی کی بدولت ساہیوال کے شاعروں نے غزل کے ساتھ ساتھ جدید نظم کا دامن بھی تھاما۔ ناصر شہزاد، مراتب اختر، قیوم صبا، سجاد میر، محمد انیس، فہیم جوزی اور راقم الحروف نے اس فن بالیدہ کا ابتدائی درس مجید امجد جیسے عظیم انسان اور بڑے شاعر ہی سے لیا ہے۔ کیفے ڈی روز ساہیوال اور سٹیڈیم ہوٹل ساہیوال میں مجید امجد کی موجودگی میں ہر شام نجی ادبی نشست کا اہتمام ہو جایا کرتا تھا۔ مقامی احباب کے علاوہ کبھی کبھار منیر نیازی، ظفر اقبال، خواجہ محمد زکریا، عبدالرشید اور کئی دوسرے شاعر بھی ان سے ملاقات کرنے آ جایا کرتے تھے۔ مجھے ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۴ء تک ان کے ساتھ بیٹھنے کا بار ہا شرف حاصل ہوا۔ ساہیوال کی بزرگ نسل کی تربیت میں اگر عطاء اللہ جنوں، منظور احمد مکان شریفی (مجید امجد ساہیوال میں ان کے ہاں بھی جایا کرتے

تھے) اور مولانا گرامی کے شاگرد مولانا عظامی وغیرہ نے حصہ لیا ہے تو نوجوانوں کی ایک بڑی کھیپ کی تخلیقی صلاحیتوں کو مجید امجد نے بھی نکھارا ہے۔ مجھے اور میرے کئی ساتھیوں کو یہ شرف حاصل ہے کہ ہم نے ''شب رفتہ کے بعد'' کی کئی نظمیں ان کی زبانی سنی ہیں۔ ان نظموں پر گھنٹوں بحث بھی کی ہے۔ مجید امجد کی موجودگی ہی میں ساہیوال میں کہ جو تب منٹگمری بھی ہوا کرتا تھا۔ فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی'ن۔م۔ راشد' حفیظ جالندھری نے بھی ساہیوال کے دورے کیے۔ اردو نظم کے ایک معتبر نام مصطفیٰ زیدی بھی کئی برس تک ساہیوال کے ڈپٹی کمشنر رہے۔ زیدی صاحب کے میاں مجید امجد سے خصوصی مراسم تھے۔ مجید امجد کی زندگی میں صرف ان کی ایک کتاب ''شب رفتہ'' شائع ہوئی۔ ''شب رفتہ کے بعد'' ان کی وفات کے بعد ان کے چند احباب کی مدد سے چھپی۔ جہاں تک ان کے شاعرانہ فن کا تعلق ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ شعر میں خیال اجالنے والے شاعر مجید امجد اپنے تخلیقی عمل کی نوعیت پر گہری نظر ڈالتے ہیں تو انہیں نظم کے ایوان کی سلیں تراشنے کے باوجود اظہار کی حسرت ہی کا غم ملتا ہے۔

مختصر زندگی کے دوران مجید امجد کا سابقہ جن مسائل' الجھنوں اور داستانوں سے پڑتا ہے ان کا مرکز ویرانہ حیرت ہی ٹھہرتا ہے۔ امجد شدت احساس کے حامل شاعر تھے۔ ان کے حواس بڑے تیز تھے۔ وہ بڑی مہارت اور کاریگری سے انسان اور کائنات کے مشاہدے میں مشغول دنیا کو ایک جمالیاتی شاہکار اور گہوارہ امن بنانا چاہتے تھے

ان کا مسلک تھا کہ انسان ہی کی وجہ سے دنیا کی دیگر اشیا میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ انسان کا سایہ جب دیگر اشیا کے وجود پر پڑتا ہے تو ان میں بھی جمال چھلک اٹھتا ہے۔ امجد کی ابتدائی شاعری اردو نظم کی رومانی تحریک سے متاثر ہے مگر ان کی نظمیں رومانی شعرا کی نظموں کی نسبت زیادہ منجھی ہوئی، مزین اور تراش خراش کے قرینے سے معمور ہیں۔

شب رفتہ میں ''وہم شرر'' کے حصے کی سب نظمیں رومانی شعرا کے اثر ہی کا نتیجہ ہیں۔ مگر ان میں امجد کی انفرادیت' مخصوص تمثال نگاری' لفظوں کی ملائم ترتیب و تنظیم اور آہنگ کی مناسبت کی خصوصیات ان کے اعلیٰ شعری مرتبے کی عکاس ہیں۔

امجد کی نظموں میں حال سے بے اطمینانی کا احساس تو موجود ہے مگر اس میں شدت نہیں ہے۔ انہوں نے مخصوص تہذیبی معیارات کا جو خاکہ اپنے ذہن میں بنا رکھا تھا' حال کے لمحے ان معیارات سے گریزاں ہیں۔ وہ نظم میں اپنے ذاتی آدرش سے کام لیتے ہوئے اپنے احساسات کو متوازن اور معتدل بناتے ہیں۔ ان کے آدرش میں داخلی طرز احساس کی بدولت ایک نئے تمدن اور نئی اپروچ کی تدوین ملتی ہیں۔ یہ کلچر اور اپروچ انہیں ورثے میں ملی ہوئی اقدار سے بغاوت کا سبق نہیں سکھاتے اور نہ ہی معاشرے کی زبوں حالی پر نفرت کا رویہ اپنانے کا درس دیتے ہیں۔ یہ تفہیم خارج کی محرومیوں' تشدد اور المیہ صورت حال کو ایک آئیڈیل کی صورت میں پیش کرتی

ہے۔ اشیا کی تہذیبی تنظیم اور داخلی ارتباط اس کا جوہر ہیں۔ امجد کی ایک نظم افریشیا ملاحظہ ہو۔

دریا کے پانیوں سے بھری جھیل کے کنارے
آئے ہیں دور دور سے افریشیا کے پنچھی
اجلے پروں کا بھاگ ہیں یہ رزق جو ازا ہیں!
اتنے سفر کے بعد یہ تت یہ ذرا سا کھاجا
جو نہر میں اک سڑی ہوئی پتی پچھوں کا پوکا
اک گھونٹ زرد کیچ کا مرغابیوں کا راتب
اور اس کے ساتھ گھات میں زرد کارتوس کی جھی
چنگاریوں کے تیز تڑختے ہوئے تریز ے
اور پانیوں میں بہتی ہوئی سنسناہٹوں میں
لہراتے پنکھ، ابھرتے کمانڈار، زندہ چونکس
آزاد آبناؤں میں جیتے ہیں جینے والے
ٹھنڈی ہوا کے پاس میں بارود کے دھوئیں میں

امجد کی نظموں میں نئے عہد کی صنعتی زندگی کے ساتھ ابھرنے والے نئے شہروں کے جغرافیے سے لے کر پرانی قصباتی تہذیب کی متوازن قدروں کے تحفظ تک کے موضوعات عمومی ہیں۔ نیا صنعتی شہر فطرت کی حدود سے گریز کا عمل سکھاتا ہے۔ آبادی میں اضافے کے نتیجے کے طور پر مکانوں، سڑکوں اور بنگلوں کی تعمیر کے لئے اشجار کو کلہاڑی سے کاٹا جاتا ہے۔ سائنس اور مادہ پرستی کے اثرات نے انسان میں تنہائی کے شدید احساس کو جنم دیا ہے۔ اداروں، تنظیموں اور دفتری زندگی کی مصروفیات نے انسانی زندگی کو میکانکی بنا دیا ہے۔ امجد اپنی نظموں میں نئی شہری زندگی اور پرانی قصباتی فضا کو ابھار کر اپنے آدرش اور پیغام کو عام کرتے ہیں۔

وہ چھپر اچھے ہیں، جن میں ہوں دل سے دل کی باتیں
ان بنگلوں سے جن میں بسیں گونگے دن بہری راتیں
چھت پر بارش، بھیگے اجلے کالر، گدلی استریاں
بنتے کھیل، ذکراتی قدریں، بھوکی مایا کے سب مان

ان کی نظم 'کنواں' شب رفتہ کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ اس میں کنوئیں کی علامت کے حوالے سے دنیا کے معاملات و امور کی کروٹوں کا بڑے تجزیاتی انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔ نظم کا کینوس کنوئیں تک محدود نہیں رہتا، تمام تر معاشرتی زندگی کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ کنواں زندگی کی علامت بنتا ہے جو ازل سے جاری و ساری ہے اور ابد تک جاری و ساری رہے گی۔

امجد زندگی کو امکانات کا ہیر پھیر کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کسی بھی لمحے نئے اور عجیب منظروں کے رو برو کھڑا ہو سکتا ہے۔ ان کی نظم "طلوع فرض" معاشرے میں زندگی کے کاروبار کی تفصیل پیش کرتی ہے۔ اس میں معاشرتی طبقے اجاگر ہوتے ہیں۔ شہر کی میکانکی زندگی سے اکتاہٹ اور کرب کا اظہار ملتا ہے۔

امجد کی نظمیں زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور مسائل سے مرتب ہوتی ہیں۔ تحیر ان کی شاعری کا بنیادی وصف ہے۔ تحیر کی مدد سے وہ حیات وکائنات کی مختلف چیزوں تک پہنچتے ہیں۔ ان کی نظم 'دل دریا سمندروں ڈونگھے' اسی طرز اظہار سے مرتب ہوئی ہے۔

امجد اپنی نظموں میں ایسی تصویروں کی تشکیل کرتے ہیں جو ذہنی' بصری اور محسوساتی ہوتی ہیں۔ ان کی نظموں میں زندگی کی گہما گہمی اور معروضی اشیا کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ ان کی تمثالیں بڑی ملائم، اجلی' نفیس اور متوازن ہوتی ہیں۔ لفظوں کے استعمال میں انہوں نے کلاسیکی رویہ اپنایا ہے۔ جذبے' احساس اور تجربے کے پھیلاؤ کو مضبوط کرنے کے لئے وہ معتدل' متوازن اور متناسب الفاظ منتخب کرتے ہیں۔

امجد کی نظموں کے مصرعوں میں ایک خاص قسم کے ربط، تسلسل اور انضباط کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ آٹو گراف ان کے فنی ارتقا میں کلیدی حثیت کی حامل نظم ہے۔ اس میں انہوں نے لفظوں کے صوتی تلازمات سے بڑی چابکدستی سے کام لیا ہے۔ کھلاڑی' پھاٹک' شخصیت' باؤلر جیسے غیر شعری الفاظ امجد کی ریاضت کی بدولت شعری اظہار کا بہترین نمونہ بن کر ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اس نظم میں قافیوں کی تکرار کچھ اس طور سے ہوئی ہے کہ قاری کو ان کا احساس تک نہیں ہوتا۔

تو' زندگی اے زندگی' بربط اور ایکٹرس وغیرہ میں بھی یہی انداز موجود ہے۔ ان کی نظم دیوں کے جلنے سے پہلے ملاحظہ ہو۔

دیوں کے جلنے سے پہلے
شام کی دھندلی ٹھنڈک میں
گھنے درختوں کے پیچھے
کل' جب تیرے نام کی زرد سیاہی طلوع ہوئی
اور پھر' اس کے بعد
رفتہ رفتہ جب ہر جانب سے
تیرے ذکر کی اک رمزیلی تاریکی ابھری
تاریکی جو تیرے نور کا اک رخ ہے
تو اس دم اک جابر دانائی
روحوں کی ظلمات سے یوں گزری

جیسے اچانک رستہ روک کے کوئی کسی سے کہے
''ادھر' ہماری جانب بھی تو دیکھا
ان مردہ قلبوں کے اندر بجھے ہوئے
بلبوں کی نگری میں پھرنے والے
ہم تو اندھیروں میں بھی تیرے ساتھ ہیں......
ہم جو اندھیروں کے اس بھیس میں
اپنی روشنیوں میں اجاگر ہوتے ہیں

☆

لوحِ شعر کا حرفِ دائم

ڈاکٹر سعادت سعید

یوں تو ہر عام آدمی کی طرح غالب کو بھی یہ احساس تھا کہ وہ لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہیں اور زمانہ انہیں مٹانے پہ تلا ہوا ہے لیکن انہیں اپنے شعری وجدان اور تخلیقی پیش بینی کے حوالے سے مکمل یقین تھا کہ ان کا نام اور کام آئندہ زمانوں پر محیط ہوگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے عہد میں نظر انداز ہونے والے مرزا غالب کی شہرت مقامی حدوں کو پار کر کے بین الاقوامی حدوں تک جا پہنچی ہے۔ مغرب و مشرق کے بیشتر ممالک میں مرزا غالب کو بہت پذیرائی ملی ہے۔ اب انہیں شہرتِ عام بھی میسر ہے اور بقائے دوام بھی۔ ایسا کیوں نہ ہوتا

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

یہ تلمیذ الرحمٰن شاعر خود آگاہی کی اس منزل پر تھا جہاں حقانیت ایک باندی کی طرح دست بستہ کھڑی رہتی ہے۔ اس لیے اگر کلامِ غالب کے ضمن میں وید مقدس کا تذکرہ ہوا ہے تو یہ بے جا نہ تھا۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

غالب کو معلوم تھا کو وہ جس باغ میں اپنے تصور کی مستی و سرخوشی میں نغمے گا رہا ہے' وہ اس کا باغ نہیں ہے۔ اجڑا ہوا باغ اس کا ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ اس کا باغ وہ تھا جو اس دور میں عالمِ وجود میں نہ آیا تھا۔ حالی سے لے کر جیلانی کامران اور پھر عہدِ حاضر کے کئی نوجوان نقادوں تک غالب کی نثر و نظم کی عظمت کو تسلیم کرنے والے کیسے کیسے بڑے نام ہیں اور کیسے کیسے بڑے کام ہیں کہ ان کی فہرست مرتب کرنے کے لیے کئی سو صفحات درکار ہیں۔

غالب لوحِ شعر پر ثبت ہونے والے وہ حرفِ دائم ہیں جسے مٹانے پر کمر بستہ کئی شعرا اور نقاد پہلے ہی منہ کی کھا چکے ہیں اور آئندہ ہمارے انیس ناگی سمیت باقی کئی حاسد و نافہم بھی منہ کے بل گریں گے۔ غالب کی تحسین میں سخن شناس لوگوں نے سکوت سے کام نہیں لیا البتہ ناشناسوں نے ان کے شعر کی قدر کو ختم کرنے کے

لیے نیا شور و غوغا اور ہنگامہ آفرینی سے کام لینے کی کوشش کی لیکن اس حرف و اثر کو اوج شعر سے نہ ملنا تھا نہ ملا۔

وہ شخص جو اپنے عہد کے حالات سے آگاہ ہو اور جس کا ہاتھ زمانے کی نبض پر بھی ہو وہ جہاں حقائق سے ہم کناری کرے گا وہاں اپنے قارئین کی رہنمائی کا سامان بھی فراہم کرے گا۔ غالب جان چکے تھے کہ عیسائی تہذیب اور انگریزی ثقافت اپنے جال اس حد تک پھیلا چکے ہیں کہ ان سے بچ کے نکلنا محال ہے اس لیے جہاں انہوں نے کلیسا کے آگے اور کعبہ کے پیچھے ہونے والی بات کہی اور دونوں کے مابین موجود کشاکش و کشمکش کا ذکر کیا وہاں سرسید احمد کی کتاب ''تصحیح آئین اکبری'' کی منظوم فارسی تقریظ لکھتے ہوئے انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر اب نئے خیالات و وسائل کو حاصل کرنا ہے تو ہمارے ادیبوں اور دانشوروں کو مغرب میں ہونے والے تحقیقی، تخلیقی اور سائنسی کاموں کی جانب رجوع کرنا ہوگا۔ اس تقریظ کا ترجمہ کچھ یوں ہے کہ:

''یاروں کو نوید ہو کہ سید کی توجہ کی بدولت
اس پرانی کتاب کا دروازہ کھلا ہے
آنکھ کو بینائی اور بازو کو طاقت میسر آئی ہے
کہنگی نے نیا لباس پہنا ہے
آئین کی تصحیح کا کام ان کی ہمت والا کے مقابلے میں
باعث ننگ و عار ہے
وہ دلی طور پر اس شغل سے وابستہ ہوئے
اور اپنے لیے مسرت کا سامان پیدا کیا اور رائیگاں کام کیا۔
اگر کوئی ان کے گوہر کی تعریف نہیں کر سکتا تو
ان کے اس کام کی بدولت ان کا مداح ہو جائے گا۔
جس کام کی اصل ایسی ہو اسے وہی سراہے گا
جس کا طور طریقہ ریا کاری ہے
میں کہ ریا کاری کے دستور کا دشمن ہوں
اور مجھے اپنی وفا کا از خود اندازہ ہے
میں ان کے اس کام پر اگر آفرین نہیں کرتا
تو یہ میرے لیے آفرین کی جا ہے۔
میں شاعری میں بے آئین لوگوں کی مثل نہیں ہوں
فن شعر کے بارے میں جو کچھ مجھے معلوم ہے کوئی نہیں جانتا۔

زمانے میں اس متاع کا کوئی خریدار نہیں ہے
سید کو اس سے نفع کی نہ جانے کیوں امید تھی
انہوں نے خیال کیا ہوگا کہ یہ بلند پایہ دفتر ہے
تا کہ اس کی مدد سے وہ کچھ دیکھا جائے جسے دیکھا جانا چاہیے
اگر آئین کے بارے میں ہم سے پوچھا جائے تو ہم کہیں گے کہ
اس پرانے بت خانے میں آنکھیں کھول کر
انگلستان کے صاحبوں کو دیکھو
ان کے انداز اور طور طریقے کو دیکھو
انہوں نے کیسے کیسے قوانین کو رائج کیا ہے
جو کچھ کسی نے نہیں دیکھا تھا اسے وجود بخشا ہے
ان کے ہنرمندوں نے ہنرمندی میں اضافہ کیا ہے
ان کی سعی ان کے پیش روؤں پر سبقت لے گئی ہے
آئین رکھنا اسی قوم کا حق ہے کہ
ملکی نظم و نسق میں ان سے کوئی بہتر نہیں ہے
انہوں نے انصاف اور دانش کو باہم مربوط کیا ہے
اور ہند کو صد گونہ قوانین فراہم کیے ہیں
وہ آگ کہ جو پتھر سے نکالتے تھے
ان ہنرمندوں نے اسے خس سے پیدا کیا ہے
انہوں نے پانی پر کیسا جادو کیا ہے کہ
دھواں کشتی کو پانی میں چلاتا ہے
کبھی بھاپ کشتی کو جیحوں (دریا) میں لے جاتی ہے
اور کبھی بھاپ گردوں کو دشت میں لے جاتی ہے
بھاپ مشین کے پرزوں کو گھماتی ہے
اور وہ بیل اور گھوڑے کی مثل بھاگتی ہے
بھاپ سے چھوٹی کشتی رفتار پکڑتی ہے
اس کے سامنے موج اور ہوا دونوں بے بس ہو جاتے ہیں۔
وہ ساز سے مضراب کے بغیر نغمے نکالتے ہیں۔

اور حرف پرندوں کی مانند اڑنے لگتے ہیں
کیا تو نہیں دیکھتا کہ یہ دانا گروہ بات کو
دو لمحوں میں سو کوس سے لے آتا ہے
یہی لوگ ہوا میں یوں آگ لگا دیتے ہیں کہ وہ
انگور کے مانند روشن ہو جاتی ہے
لندن جاؤ کہ اس درخشندہ باغ میں
بغیر چراغ کے شہر روشن ہو جاتا ہے
ان ہشیار مردوں کے معاملات کو دیکھو
ان کے ہر آئین میں کئی سونئے آئین ملاحظہ کرو
ان کے آج کے زمانے کے دستور کے سامنے
دوسرے آئین پارینہ ہو گئے ہیں
اے بیدار مغز عاقل انسان کتاب میں
اس طرح کے بیش قیمت ذخیرے موجود ہیں
جب کوئی اس قسم کے موتیوں کا خزانہ دیکھ لیتا ہے
تو پھر وہ اس خرمن کی خوشہ چینی کیوں کر کرے گا
اگر تو سوچتا ہے کہ اس کا طرز تحریر عمدہ ہے
تو جو تو سب سے بہتر جانتا ہے اس سے بھی بڑھ کر ہے
ہر عمدہ کام سے بڑھ کر عمدہ کام بھی موجود ہوتا ہے
اگر سر موجود ہے تو تاج بھی تو موجود ہوگا
خدائے فیاض کو بخیل شمار نہ کر
اس نخیل سے اب بھی تازہ کھجوریں دستیاب ہیں
مردوں کو پالنا مبارک کام نہیں ہے
تو خود ہی بتا کہ اس کے علاوہ اور کوئی معاملے نہیں ہیں
غالب خاموشی کا دستور دلکش ہے اگرچہ تو نے عمدہ بات کہی ہے
تاہم اس کا نہ کہنا اور بھی عمدہ ہوتا ہے
دنیا میں تیرا دین اسید پرستی ہے
تعریف سے گریز کر اور دعا دے کہ یہ تیرا دستور ہے

اس سراپا صاحب دانش و عقل سید احمد خان عارف جنگ پر
کرم خداوندی ہو کہ وہ جو بھی چاہیں اسے پالیں
خوش قسمتی ان کی خادم بنی رہے''!

غالب مردہ پرستی کے حق میں نہیں تھے۔ غالب نے انگریزی تہذیب و ثقافت کے حوالے سے بعد میں بھی بہت کچھ لکھا حتیٰ کہ اپنی کتاب ''دستنبو'' میں فرنگیوں کو بہت حد تک مظلوم و مجبور بھی ٹھہرایا اور اپنی طرف سے انگریزی حکومت کی اطاعت کا اخباری اشتہار بھی شائع کروایا اور ''صاحبان عالی شان'' کے قصائد بھی لکھے۔ ان میں سے بہت سی باتیں تو انہوں نے اپنی جان بخشی کروانے اور سکہ نویسی کا الزام دھونے کی وجہ سے لکھیں لیکن جب سرسید احمد کو وہ نئی انگریزی ایجادات و علوم کے بارے میں بتا رہے تھے تو اس قسم کا کوئی دباؤ ان پر نہیں تھا۔ کعبہ اور کلیسا کے مابین کشمکش انہیں بہت پہلے نظر آ گئی تھی۔ سرسید کی توجہ نئی عالمی علمی و فکری تبدیلیوں کی جانب دلا کر انہوں نے اس عظیم مصلح کی رہنمائی کی جس نے آگے چل کر مسلمانوں کو ہندوستان میں اپنی غلامی کے باوجود سر اٹھا کر چلنے کا حوصلہ و مان دیا۔

غالب انگریزوں کے رائج کردہ قوانین کو سراہتے ہوئے انہیں حیرت انگیز قرار دیتے ہیں۔ مغربی سائنسدانوں اور ہنرمندوں کی ہنرمندی اور ایجادات کو اپنے پیش روؤں پر سبقت لے جانے والا سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کسی ملک کے نظم و نسق کی بنیاد اس کا دستور ہے اور فی زمانہ اس معاملے میں فرنگیوں سے کوئی بہتر نہیں ہے۔ وہ نہ صرف انصاف اور دانش کو باہم مربوط کرنے والے ہیں انہوں نے ہند کو کئی قسم کے قوانین فراہم کیے ہیں۔ انہوں نے چقماق کی جگہ تنکے سے آگ پیدا کی ہے۔ ان کے دخانی جہاز سمندروں کو مسخر کر رہے ہیں۔ ریل گاڑی بہت تیزی سے دشت و صحرا پار کرتی ہے۔ انہوں نے بے تار برقی ایجاد کی اور تیزی سے پیغام رسانی کا بندوبست کیا۔ انہوں نے ساز سے مضراب کے بغیر نغمے نکالے ہیں اور لفظوں کو پرندوں کی مانند اڑایا ہے۔ غالب اگرچہ لندن نہیں گئے تھے لیکن وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس شہر نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ وہ ایک روشن باغ کی مانند ہو گیا ہے، اس میں بغیر چراغ کے شہر روشن ہو جاتا ہے۔ فرنگیوں کے موجودہ آئین کے سامنے دوسرے آئین پرانے ہو گئے ہیں۔ غالب کی ذات میں موجود نئی باتوں کو قبول کرنے کے رجحان نے انہیں صداقتوں کا حامل شاعر بنایا ہے۔ ایک نقاد کا کہنا ہے۔

''غالب کو آج جو شہرت عام اور بقائے دوام حاصل ہے وہ ان کے افکار و خیالات اور جذبات و احساسات کی فنی و تخلیقی پیش کش کی ابدی جہانگیری کا ذکر کر کے اسے جوہر آئینہ جاں قرار دیا ہے۔ چوتھے شعر میں کہتے ہیں کہ جب چمن خلد کی تلاش کی تو معلوم ہوا کہ وہ تیری راہگذر کی گرد کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ اس نعت کو وہ حضورؐ کی شفاعت کے یقین پر ختم کرتے ہیں۔ وہ عام نعت گو شاعروں کی طرح یہ اعلان نہیں کرتے کہ حضورؐ کی رحمت کے پیش نظر انہیں دوزخ کا کیا غم۔ وہ جانتے ہیں کہ زندگی کی کثافت کو دور کرنے کے لئے حکمت الٰہی نے

دوزخ کی آگ کو روشن کیا ہے لہٰذا وہ اپنی نعت کا اختتام اس یقین پر کرتے ہیں کہ آپ کی شفاعت اپنے کسی امتی کو ہمیشہ کے لیے دوزخ میں نہ رہنے دے گی۔ غالب کے فارسی دیوان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس اہتمام سے انہوں نے اسے مرتب کیا تھا۔ ابتدا ایک منفرد حمد سے کی ہے' دوسری غزل کا آغاز نعت سے' تیسری غزل کا اختتام نعت پر۔ اور ان غزلوں کے علاوہ ایک مکمل نعت جو اپنی خوبی میں بے نظیر ہے۔ غالب کی نعتیں اور شاعروں کی نعتوں سے بہت مختلف ہیں' جامی عشق رسولؐ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کے ہاں محبت کی وارفتگی ہے غالب کے ہاں محبت سے زیادہ تحیر ہے۔ وہ مقام رسالت کی عظمت سے حیران ہو کر اپنے تاثرات کو بیان کرتے ہیں۔ ان کی حمد و نعت دونوں میں احساس سے زیادہ فکر کا عنصر نظر آتا ہے۔ ان کے خیال کی پرواز اور ذہن کی جودت نے کہیں ان کا ساتھ نہیں چھوڑا' نہ عشق رسولؐ میں' نہ حمد خدا میں اور نہ کہیں اور۔ یہی غالب کا خاصہ ہے اور یہی چیز ان کو دوسروں سے ممتاز بھی کرتی ہے۔ لہٰذا غالب کو صرف بادہ خوار شاعر سمجھنا نہ صرف ان کے ساتھ زیادتی ہے بلکہ تاریخ کو مسخ کر دینے کے مترادف ہے۔ وہ ماہر انسانیات' ارضیات اور فلسفی اور کائنات شناس ہونے کے ساتھ ساتھ عشق رسولؐ اور اطاعت خداوندی کا مادہ بھی اپنے دل میں رکھتے تھے۔ اس کا اظہار ان کے بعض اشعار میں موجود ہے۔ نعت اور حمد کا ذکر تو انہوں نے اس منفرد انداز سے کیا ہے کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ کیا غالب بھی دل میں عشق رسولؐ اور باری تعالیٰ کے لئے نرم گوشہ رکھتے تھے؟ اور کیا واقعی غالب مردود کائنات اور خدا تعالیٰ سے انکاری رہتے تھے؟ ان سوالوں کا جواب خود ان کے اس شعر میں ہے جو دراصل اپنی عاجزی کا اظہار ہے:"

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

میر کی ایک غزل کے انگریزی تراجم

بشریٰ شریف

ترجمہ، عام طور پر زبان کے ارتقاء اور پھیلاؤ میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ دو قوموں، ثقافتوں اور تہذیبوں کے مابین حائل اجنبیت کے پردوں کو چاک کرتا ہے اور انہیں ایک دوسرے کے قریب لانے کی سعی کرتا ہے۔

ترجمہ کی جانب رجحان، عام طور پر اس وقت تقویت پکڑتا ہے جب مقامیت کے دائرے کو عبور کر کے ادبیات عالم کی طرف نگاہ دوڑائی جائے۔ ایسے میں ترجمہ دو اقوام کے مابین ایک ایسے پل کا کام کرتا ہے۔ جس کی مدد سے دو ممالک کی اشیاء درآمد اور برآمد کی جاسکیں۔ یوں اقوام دیگر اشیا کی طرح ادبیات کے ضمن میں بھی ایک دوسرے سے اکتساب کرتی ہیں اور اس اکتساب کے ضمن میں ترجمہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔

کلاسیکی شاعری میں غالب کے بعد میر کی شاعری کے انگریزی تراجم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میر کے آٹھ مترجمین ملتے ہیں جنھوں نے اپنی اپنی فہم کے مطابق ان کے اشعار کو زبان غیر میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔

مثال کے طور پر میر کے ۵۰۰ منتخب اشعار کو راجندر سنگھ ورما نے ترجمہ کیا اور اس امر کا ثبوت دیا کہ میر ایک بڑا شاعر ہے اور اس کی شاعری آفاقیت کی حامل ہے۔

شہاب الدین رحمت اللہ میر کی شعری عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"Mir Taqi Mir, this is not only the greatest name in the poetry of the period, but also one of the greatest in urdu poetry. He may be regarded as the master Ghazal-writer, whose poetry all the greatest poets that followed him looked upon as models for their own composition.[2]

میر کے تمام مترجمین اس امر پر متفق ہیں کہ میر کی فکر کو تو ترجمے کے قالب میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ لیکن

ان کے احساسات کا انتقال ناممکن ہے۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے راجندر سنگھ ورما لکھتے ہیں:

"Ideas can be translated but not the feelings and emotions.[4]

شاعری کے ترجمے کے حوالے سے ڈاکٹر سموئیل جانسن کی رائے دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے خیال

میں:

''شاعری ترجمہ ہو ہی نہیں سکتی''۵

اسی طرح اوٹوکار فیشر (Otokar Fischer) شاعری کے ترجمے کو difficult task سے تعبیر کرتا ہے۔۶

ذیل میں میر کی ایک معروف غزل اور اس کے انگریزی تراجم اس امر کا واضح ثبوت فراہم کرتے ہیں

کہ میر ایک بڑا شاعر ہے۔ اور اس کی شاعری کو اپنی گرفت میں لینا سہل نہیں ہے۔

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا — لہو آتا ہے جب نہیں آتا
ہوش جاتا نہیں رہا لیکن — جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا
صبر تھا ایک مونس ہجراں — سو وہ مدت سے اب نہیں آتا
دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش — گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

قطعہ

عشق کو حوصلہ ہے شرط ورنہ — بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا
جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم! — پر سخن تا بہ لب نہیں آتا
دور بیٹھا غبار میر اس سے — عشق بن یہ ادب نہیں آتا۷

غزل کے پہلے شعر (اشک آنکھوں۔۔۔ الخ) کا ترجمہ کرتے ہوئے راجندر سنگھ ورما لکھتے ہیں:

O when tears don't surge in mine eyes

Blood oozes from them when it is not so.[8]

مذکورہ ترجمہ کو میر کے شعر میں موجود باطنی استفہامیہ حالت کے ابلاغ میں نامکمل خیال کیا جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر اس کا شمار وضاحتی تراجم کی ذیل میں کیا جا سکتا ہے۔ احمد علی مذکورہ شعر کو اس طرح سے بیان کرتے ہیں۔

My eyes are dry of tears; only when blood flows from them and wets my face.[9]

احمد علی کا ترجمہ، بہت حد تک شعر کا لفظی ترجمہ محسوس ہوتا ہے، جو کیفیت کے ابلاغ میں رکاوٹ کا

سبب بنتا ہے۔

میر کے ہاں سوز۔ درد۔ اور تڑپ کی روانی دکھائی دیتی ہے۔ نیز عشق کے نتیجے میں بے خودی اور محبوب کی آمد کے سبب ہوش کا رخصت ہونا، بہت موثر پیرائے میں ملتا ہے۔ غزل کا دوسرا شعر (ہوش جاتا۔۔۔۔۔۔ الخ) کچھ اسی قسم کا مضمون سمیٹے ہوئے ہے۔

راجندر سنگھ ورما غزل کے دوسرے شعر کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

Well, I can't say that I'm bereft of sense

But when she arrives senses ebb away [10]

راجندر سنگھ ورما کا ترجمہ، شعر میں موجود ''تضاد'' کی کیفیت کو نمایاں کرتا ہے۔ نیز مصرعہ ثانی میں ''آتا ہے'' اور ''نہیں آتا'' کو پرکشش انداز میں ابھارتا ہے۔ مجموعی طور پر مترجم ''وہ آتا ہے'' کو She سے ظاہر کر کے ہماری نظر میں محبوب عورت کا تصور اجاگر کرتا ہے۔ جس کے آنے کے باعث ہوش نہ آنے کی عکاسی senses ebb away سے کی گئی ہے۔

احمد علی غزل کے دوسرے شعر کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

My senses are intact, But when the loved one comes I lose all consciousness. [11]

احمد علی ''جب وہ آتا ہے'' کے لیے "When the loved one comes" کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے آفاقیت کے عنصر کو اجاگر کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر ان کا ترجمہ مفہوم کو واضح کرنے کے ضمن میں موثر خیال کیا جا سکتا ہے۔

غزل کے تیسرے شعر (صبر تھا ایک ..... الخ) کا ترجمہ کرتے ہوئے راجندر سنگھ ورما لکھتے ہیں۔

Only patience was cheerer in exile That too has been since long out of reach [12]

احمد علی غزل کے تیسرے شعر کا ترجمہ اس انداز میں کرتے ہیں:

My only friend in grief was fortitude which now Has stopped befriending me. [13]

مذکورہ تراجم، ترجمانی کا حق تو ادا کرتے ہیں۔ لیکن میر کے محسوسات کو ترجمے کے قالب میں بدلنے سے قاصر رہتے ہے:

غزل کے چوتھے شعر (دل سے رخصت ...... الخ) کا ترجمہ اس طرح سے ملتا ہے۔

Some desire did from the heart depart After all you don't lament by the way. [14]

احمد علی کا ترجمہ:

Not one desire left my heart, and I bewail And weep for all that's not. [15]

راجندر سنگھ ورما کا ترجمہ ''دل سے خواہش'' کے رخصت ہونے اور گریہ کے بے سبب نہ آنے کی

کیفیت کو پر تاثیر انداز سے سامنے لاتا ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں احمد علی کا ترجمہ، عشق اور اس کی تمام تر شدتوں کو خواہش کے رخصت ہونے کی وجہ اور گریہ کے بے سبب نہ آنے کے باعث موثر خیال کیا جا سکتا ہے۔
غزل کے پانچویں شعر (عشق کو ..... الخ) کا ترجمہ کرتے ہوئے راجندر سنگھ ورما لکھتے ہیں۔

Patience is the mark of love otherwise who's ignorant of How to say his say 16

مصرعہ اول کا ترجمہ کرتے ہوئے راجندر سنگھ ورما، "Patience is the mark of love"
کے الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے عشق کی تقدیس کو ظاہر کرتا ہے۔ نیز مصرعہ ثانی کا مفہوم واضح کرنے کے لیے انہوں نے جو الفاظ برتے ہیں وہ عشق اور غیر عشق میں تفریق کے حوالے سے اہم خیال کیے جا سکتے ہیں۔
احمد علی مذکورہ شعر کو اس طرح سے بیان کرتے ہیں۔

The one condition of love is desire, or else who is there who desn't know how to feign?[17]

مندرجہ بالا ترجمہ کا شمار لفظی تراجم کی ذیل میں کیا جا سکتا ہے۔ تاہم اسے مفہوم کے ابلاغ میں معاون سمجھا جا سکتا ہے۔
غزل کے چھٹے شعر (جی میں کیا کیا ..... الخ) کا ترجمہ کرتے ہوئے راجندر سنگھ ورما لکھتے ہیں۔

How many wishes are in my heart, o, friend! Not a single word comes up to my lips.[18]

احمد علی کا ترجمہ:

There's much I wish to say To you, dear love, but words fail to come to my lips.[19]

راجندر سنگھ ورما اور احمد علی ایک محبت زدہ انسان کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کو اپنے اپنے انداز سے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر مندرجہ بالا تراجم تشنہ خواہشات اور آرزوؤں کے تاثر کو اجاگر کرنے کے ضمن میں اہم خیال کیے جا سکتے ہیں۔
غزل کے آخری شعر (دور بیٹھا ..... الخ) کا ترجمہ کرتے ہوئے راجندر سنگھ ورما لکھتے ہیں۔

At a distant spot sat ashes of "Mir" only love could show shuch a decorum 20

راجندر سنگھ ورما کا ترجمہ، مجموعی طور پر عشق کے سبب انسان کی عظمت کو اجاگر کرتا ہے۔
میر کی غزل کے مختصر سے تجزیے سے جہاں یہ بات سامنے آتی ہے کہ میر کے کلام کے انگریزی تراجم ان کے فکری رجحانات کو واضح کرتے ہیں، وہاں اس امر کا احساس دلاتے ہیں کہ ان کے اشعار کو زبان غیر میں منتقل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ میر کے مترجمین نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ ان کے کلام کو انگریزی میں ڈھالنے کے لیے صرف صنائع بدائع یا فلسفہ و تصوف و جدید سماجی و عمرانی عوالم ہی سے آگہی ضروری نہیں بلکہ اس تخلیقی مزاج کی بھی ضرورت ہے جو عرفان حیات اور انکشاف ذات کی منزلوں سے گذرنے کی

سعادت حاصل کر سکے۔

حواشی

1. Rajinder Singh Verma. Pick of Mir. Lahore-Urdu Academy. 1999

2. Shahabudin Rahmatullaha - Art in urdu poetry- karachi - Anjuman-e- Tarraqi-e-urdu - 1954 - p-13

3.(i) Ahmed Ali. The Golden Tradition New york- columbia university press. 1973.

3.(ii) Rajinder singh verma- pick of Mir. 1999

3.(iii) Shahabudin Rahmatullaha- Art in Urdu poetry. 1954

3(iv) Russel Ralph. The pursuiuts of urdu literature- Delhi- oxfod university press-1992

3.(v) Kanda- k-c- Master Pieces of Urdu Ghazal

3.(vi) Khurshidul Islam and Ralph Russell-Three Mughal poets. Mir Savda - Mir Hassan - Delhi- oxford university Press- 1998.

3.(vii) Muhammad Sadiq Dr. - A History of Urdu literature- London- Oxford University 1964.

3(viii) Umesh Joshi- 786 Ashar of Ghalib and 25 others. poets- India Gropsons papers Pvt. Ltd. 1995.

4. Rajindar Singh Verma. Pick of Mir -P- (vi)

۵۔ بحوالہ۔ حامد بیگ مرزا۔ ڈاکٹر۔ مغرب سے نثری تراجم۔ اسلام آباد۔ مقتدرہ قومی زبان مئی ۱۹۹۸ء ص ۵۔۶

۶۔ حامد بیگ مرزا۔ ڈاکٹر۔ ترجے کا فن۔ اسلام آباد۔ مقتدرہ قومی زبان۔ جون ۱۹۸۷ء ص۔ ۸۶

۷۔ کلیات میر۔ (دیوان اول)۔ مرتبہ کلب علی خان فائق۔ لاہور۔ مجلس ترقی ادب۔ جون ۱۹۸۶ء ص ۱۵۸۔۱۵۹

8. Rajindar Singh Verma, Pick of Mir P.26

9. Ahmed Ali, The Golden Tradition P-154

10. Rajindar Singh Verma, Pick of Mir- P.26

11. Ahmed Ali, The Golden Tradition P-154

12. Rajindar Singh Verma, Pick of Mir -P_ 26.

13. Ahmed Ali- The Golden Traditon P-154.
14. Rajindar Singh verma. Pick of Mir - p.26.
15. Ahmed Ali- The Golden Tradition. P-154.
16. Rajindar Singh Verma. Pick of Mir p.26.
17. Ahmed Ali- The Golden Traditon P-154.
18. Rajindar Singh verma. Pick of Mir P-26.
19. Ahmed Ali. The Golden Tradition P-154.
20. Rajindar Singh Verma - Pick of Mir -P-26.

ٹ

پاکستانی ادب میں مزاحمتی رویّے
(کشمیری ادب)

طاؤس بانہالی

کشمیر کی تاریخ میں چودھویں صدی عیسوی کا زمانہ کشمیری شاعری اور ادب میں اسلام کی ترویج و اشاعت کا سنہری دور کہلاتا ہے۔ چودھویں صدی عیسوی کے ابتدائی چالیس برس جہاں نا اہل ہندو حکمرانوں، با اثر سازشی برہمنوں، فرسودہ مذہبی رسموں اور زوال آمادہ استحصالی معاشرے میں خانہ جنگی کو ہوا دینے والے چھوٹے بڑے جاگیرداروں کی سرگرمیوں کی عبرت آموز تصویر پیش کرتے ہیں وہاں ان ہی ابتدائی برسوں میں منگولوں کے حملوں کا وہ سیلاب کشمیر کے بلند و بالا پہاڑوں کو پھلانگ کر اس وادی ایمن تک بھی جا پہنچا جہاں کے لوگ کسی بیرونی حملے کے تصور سے بھی نا آشنا تھے۔ کشمیر کو ہمیشہ ناقابل تسخیر تصور کرنے والے لوگوں پر تاتاری اور ترک قبائل کے ان غیر متوقع حملوں سے جو تباہی اور بربادی ہوئی اس کا تذکرہ اکثر سرسری طور پر کیا جاتا ہے، لیکن جو عظیم ذہنی اور روحانی صدمہ کشمیریوں کو ان بیرونی حملوں سے پہنچا ہے اس کا گہرا تجزیہ کیے بغیر اس کشت زعفراں کے مخصوص مزاج کا ادراک شاید ناممکن ہوگا۔ کشمیر کے ایک مزاج شناس سنسکرت شاعر اور ''راج ترنگنی'' کے مصنف پنڈت کلہن نے بارہویں صدی عیسوی کے نصف اول ۱۱۴۸ء میں کشمیر کی پہلی مفصل تاریخ مرتب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

''میرے ملک کے لوگوں کو صرف پاکیزگی اور پارسائی کی قوت سے جیتا جا سکتا ہے۔ تلوار کی قوت کا ان پر کوئی اثر نہ ہوگا''۔

پنڈت کلہن ایک شاعر تھا اور اس کے نزدیک ''شاعری'' وہ آب حیات ہے جو نہ صرف شاعر کو بلکہ اس کے موضوع یا ممدوح کو بھی دوام بخشتی ہے۔ کلہن کو اس بات کا پختہ یقین تھا کہ شاعر ایک ایسی روحانی قوت کا مالک ہوتا ہے جو ماضی کی بازیافت کے بعد اپنی چشم تصور سے دوسرے لوگوں کو بھی اس کی ایک جھلک دکھاتا ہے۔ سنسکرت میں نظم ہندوستان کے کسی خطے کی پہلی تاریخ لکھنے والے کلہن کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اے ایل بھشم نے لکھا ہے کہ پنڈت کلہن میں علاقائی حب الوطنی (Regional Patriotism) کا ایک شدید احساس بھی

کارفرما دکھائی دیتا ہے اور وہ اپنے وطن کو ایک چھوٹی سی پہاڑی ریاست خیال نہیں کرتا بلکہ ایک ایسی عظیم اور حسین ترین مملکت سمجھتا ہے جس کا علم و ادب، حسن و جمال اور جاہ و جلال اس کے ناقابل تسخیر ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔۔۔۔ ہوسکتا ہے کہ کلہن کے حسن ظن اور شاعرانہ خوش فہمی کے ساتھ ساتھ اس کے سامنے ایک ڈیڑھ صدی پہلے کے وہ واقعات بھی تازہ ہوں جب کشمیر پر سلطان محمود غزنوی کے حملوں کا کامیاب دفاع کر کے کشمیر نے اس روایت کو سچا ثابت کیا تھا کہ کشمیر ناقابل تسخیر ہے لیکن کلہن کی وفات کے بعد کی ایک ڈیڑھ صدی میں کشمیر کا سارا معاشرتی نظام اپنی افادیت کھو چکا تھا اور تاتاریوں کا حملہ وہ آخری زلزلہ تھا جس سے یہ سارا نظام زمین بوس ہوگیا۔ یہ سب کچھ ایک فطری عمل تھا اور کشمیر کی تاریخ کا کوئی بھی ذہین طالبعلم اس بات کی نشان دہی کر سکتا ہے کہ پچھلے دو ڈھائی ہزار برس کی مدت میں جب کشمیر کے حکمرانوں نے اس خطہ لالہ و گل کو ویرانی کے کنارے تک پہنچایا اور کسی بیرونی حملہ آور نے وادی پر لشکر کشی کی۔۔۔۔ اس تصادم کے نتیجے میں ہمیشہ کشمیر ایک نئی انگڑائی لے کر جاگ اٹھا اور کشمیریوں نے علم و ادب، فن اقتصادیات، سیاست غرض ہر شعبے میں نئی بلندیوں کو چھو لیا۔ کشمیر کی دیو مالا لوک روایت اور تاریخ بتاتی ہے کہ ماقبل تاریخ کے ناگ۔ پشاچ اور آریائی قبیلوں کے تہذیبی ٹکراؤ سے لے کر ہند یونانی۔ ایرانی اور اشوک اعظم اور کشانوں کے دور تک کشمیر کے تن آسان، کاہل عیاش یا غافل حکمرانوں کے ہاتھوں پامال معاشرے نے جب بھی کسی خارجی یورش کے سبب سے نئی کروٹ لی تو عوام کو نئے سرے سے ایک توانائی مل گئی۔ مغلوں، افغانوں، سکھوں اور ڈوگروں کے تسلط سے پہلے کشمیر پر تاتاریوں کی تباہ کن یلغار کا تذکرہ کرتے ہوئے بے اختیار علامہ اقبال کا یہ شعر یاد آتا ہے:

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

کشمیر پر دولچو اور اچلہ کے حملوں کے نتیجے میں خلاف توقع مسلمان حکمرانوں کا برسراقتدار آنا ایک اچانک انقلاب ہی نظر آتا ہے حالانکہ اس کے سارے اسباب موجود تھے۔ تاہم یہ بات آج بھی پہلی نظر میں عجیب سی لگتی ہے کہ بیس سال کے عرصے میں دو پردیسی نو وارد کیوں کر کشمیر کے حکمران بن گئے؟ ان میں پہلا نو وارد تبت کا ایک بدنصیب بدھ راجکمار RINCHON تھا جو اپنی جان بچانے کے لیے کشمیر پہنچا۔ راجہ سہدیو کے کمانڈر رام چندر کا مصاحب بنا اور پھر اسی کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ ہندو رعایا کا دل جیتنے کے لیے بدھ مت کو چھوڑ کر ہندو مت اختیار کرنے کا خواہش مند ہوا لیکن اونچی ذات کے برہمنوں کو یہ بات منظور نہیں تھی کہ لداخ کا بدھ رنچن ان کے دھرم کو بھرشٹ کرے چنانچہ بدھ راجکمار رنچن کے لیے برہمنوں کا یہ رویہ عبرت کا تازیانہ بن گیا۔ وہ ایک روحانی بحران میں مبتلا ہو گیا اور آخر ایک مرد فقیر۔۔۔ ترکستان کے ایک صوفی بزرگ عبدالرحمن بلبل شاہ کے ہاتھوں مسلمان ہو گیا۔۔۔ دوسرا اجنبی سوات کا ایک باشندہ شاہ میر تھا جسے اس کے روحانی مرشد نے کشمیر جانے کا حکم دے کر وہاں حکمران بن جانے کا مژدہ سنایا تھا۔ شاہ میر بھی رنچن کی طرح سہدیو کے کمانڈر انچیف رام چندر

کا ملازم ہو گیا اور رنچن کی وفات کے بعد پندرہ سولہ برس تک کوٹہ رانی کا ہمنوا بن کر تخت و تاج کے لیے مناسب تدبیریں کرتا رہا تا آنکہ ۱۳۳۹ء میں کوٹہ رانی اور ولی عہد کو راہ سے ہٹا کر سلطان شمس الدین کا لقب اختیار کر کے شمیری خاندان کا بانی بن گیا۔ یہی وہ خاندان ہے جس نے تقریباً سوا دو سو سال تک کشمیر پر بڑے جاہ و حشم سے حکومت کی' سلطان زین العابدین جیسا عظیم حکمران پیدا کیا جسے آج بھی اہل کشمیر بادشاہ یا بڑے بادشاہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

چودھویں صدی عیسوی کا نصف آخر کشمیر میں سیاسی اقتصادی علمی اور تہذیبی ترقی کا وہ دور بھی ہے جب حضرت شاہ ہمدان کی رہنمائی میں عرب و عجم کے سینکڑوں سادات نے کشمیر کو بقول علامہ اقبال دین و دنیا کی دولت سے مالا مال کر کے علم وصنعت و تہذیب و دین کا ایک نیا مرکز بنایا اور کشمیر ایران صغیر کہلوایا۔ سولہویں صدی تک آتے آتے کشمیر نے اسلامی علوم اور خاص طور پر فارسی ادب میں ایسے ایسے مایہ ناز شاعر اور ادیب پیدا کیے جن میں حضرت شیخ حمزہ مخدوم اور شیخ یعقوب صوفی جیسی ہستیاں شامل ہیں جن کی شہرت ہندوستان، ایشیاء اور دوسرے مسلم ممالک تک بھی جا پہنچی تھی۔

کشمیری زبان میں کشمیری ادب کی اولین مکمل تاریخ '' کاشرہ ادبک تو اریخ '' کے مرتبین (تاجی منور شفیع شوق) لکھتے ہیں '' کشمیری شاعری کی تاریخ حقیقتاً لل دیدی اور نندہ رشی (حضرت شیخ نور الدین نورانی) کی شاعری سے ہی شروع ہوتی ہے۔ ان دونوں کی شاعری اتنی بلند مرتبہ ہے جسے کوئی بھی شخص کسی دور کی ابتدا میں نہیں کہہ سکتا بلکہ یہ شاعری ایک دور کا نقطہ عروج کہلائی جا سکتی ہے'' لل دیدی کی ادبی اور روحانی شخصیت کی عظمت ہر کشمیری کے دل میں نقش ہے اور ان سے عوام کی عقیدت کا یہ عالم ہے کہ چودھویں صدی عیسوی کے دوسرے بڑے شاعر اور کشمیر کے سب سے بڑے روحانی بزرگ حضرت شیخ نور الدین رشی کو ان کا معنوی فرزند کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔ کشمیر کی عبادت گاہوں میں آج بھی لوگ حضرت شیخ کی ان دو مناجاتوں کا ورد کرتے ہیں جن میں اسی بلند روحانی رتبے کی تمنا کی گئی ہے جو للہ عارفہ کو نصیب ہوا۔ اسی طرح نندہ رشی نے حضرت شاہ ہمدان کی معیت میں جنت میں داخل ہونے کی خواہش کا بھی اظہار کیا ہے۔ ان دونوں عظیم ہستیوں سے عقیدت اور محبت کا کشمیری عوام میں آج چھ سو سال گزرنے پر بھی وہی عالم ہے۔ دونوں کا کلام سینہ بہ سینہ صدیوں تک لوگوں کو ازبر رہا اور پچھلے تین چالیس سال میں دونوں کی پر اسرار شخصیت اور فن پر درجنوں کتابیں اور رسالے شائع ہوئے ہیں۔ ہر چند کہ آج چھ سو سال کا عرصہ گزرنے کے بعد اس نقصان کی تلافی ناممکن ہے جو اس دور کے مورخوں یا تذکرہ نگاروں کی مجرمانہ خاموشی اور غفلت کی وجہ سے یا پھر طویل خانہ جنگیوں اور قلمی نسخوں کے تلف ہو جانے کے سبب سے ہوا ہے۔ تاہم جو احوال بعد کے روایتی تذکروں یا تاریخوں میں عوامی معتقدات یا لوک روایات کے حوالوں سے درج کیا گیا ہے اس سے کچھ نتائج یقیناً اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ روایات اور ان دونوں شخصیتوں کے ساتھ جذباتی سطح پر کشمیری عوام کی وابستگی اس قدر گہری ہو چکی ہے کہ لل دیدی، نندہ رشی (شیخ نور

الدین) یا حبہ خاتون تاریخی شخصیت ہونے کے باوجود اب عظیم لوک کردار بن گئے ہیں بلکہ یہ تین شخصیتیں اب ہمارے لیے تین علامتیں بھی ہیں جہاں لل دیدی پاکیزگی اور ماتا کی علامت ہیں وہاں حضرت شیخ نورالدین رشی سادگی، ایمان اور استقامت کی علامت ہیں۔ اسی طرح حبہ خاتون شاعری اور موسیقی ہی کی علامت نہیں ہیں۔ بلکہ وہ مغل سامراجیت کے خلاف حقارت اور نفرت کے ایک خاموش احتجاج کی بھی علامت ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے گرد روحانیت اور عشق حقیقی کی روایات کا ایک وسیع تر دائرہ بھی پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے کیونکہ یہ روحانیت ہزاروں سال سے وادی کشمیر کا بنیادی وصف رہی ہے۔ جو لوک رومانوں اور منظوم قصے کہانیوں سے بھی چھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ہماری لوک روایات، لوک ادب اور کلاسیکی بلکہ جدید ادب میں بھی اتنی گہری مماثلت ہے کہ عام نقاد کے لیے فرق کرنا مشکل ہو جائے۔ ہمارے دو بڑے جدید شعراء مہجور اور آزاد تک لوک ادب کی اسی زلف کے اسیر نظر آتے ہیں اور یہ بات تو مسلمہ ہے کہ لوک سے ہی ہمیشہ تخلیقی ادب کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ جو چیزیں آج ہمارے لیے علامتیں ہیں وہ کل ہمارے پیش رووں کے عقائد کا حصہ تھیں جو انھیں ایک حقیقت سمجھتے تھے۔ کشمیر میں ناگ مت، بدھ مت اور ہندو دھرم کے زیر اثر جنم لینے والے قدیم قصے ''ہیمال ناگرائے'' یا ''اکھہ نندن'' صدیوں کے بعد بھی اپنی علامتی معنویت کو جس طرح برقرار رکھے ہوئے ہیں اور ان کے کرداروں یا واقعات کے علامتی معنی کی پراسرار گہرائی کی جو تفسیریں جدید تنقید نگاروں نے کی ہیں اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لوک ادب انسان کے فکری، ارتقاء کا ایک فطری اظہار بھی ہے جس میں نہ صرف ہمارے موروثی پیکر مخصوص عقائد یا معاشرتی حالات کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے بلکہ علامت پرست فنکار ان اساطیر اور موروثی کو نئے معنی بھی پہناتے ہیں۔ لل دیدی کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کا یقین ہونے لگتا ہے کہ تخلیقی عمل اور خواب کا عمل کس طرح یکساں ہو سکتا ہے اور شاعری جیسے ایک شعوری معاشرتی عمل کو لاشعوری انفرادی عمل کیوں کر تخلیقی یا لافانی بنا سکتا ہے۔ ہمارے اندر کا غیر مہذب وحشی آدمی خوابوں میں بھولے بسرے اساطیر کی کھوئی ہوئی علامتیں کیوں کر تلاش کرتا ہے یا ایک شاعر عشق بلاخیز کے قافلہ سخت جاں کے ساتھ کس طرح ہم رکاب ہوتا ہے اس کا جواب اساطیر اور ادب کے درمیان رشتوں میں پوشیدہ بیان کیا جاتا ہے۔

لیکن بقول شفیع شوق ہمارے زمانے میں تو ادب یا LITERATURE کا لفظ ایک اور ایسے ہی بے وقعت لفظ ''انقلاب'' کی طرح بے معنی ہو کر رہ گیا۔ حالانکہ ابھی کل کی بات ہے کہ انقلاب کے اس لفظ کو کارل مارکس نے پورے استعاراتی معنوں میں استعمال کیا تھا۔۔۔۔۔ خیر کہنا یہ ہے کہ شاعری میں الفاظ کی قدیم اساطیری کیفیت کو زندہ رکھا جا سکتا ہے اور شاعری کی تخلیق میں آرکی ٹائپ کا اہم کردار ہے جو ایک خلقی پیکر (LITERATURE) اور اجتماعی لاشعور کا حصہ ہے۔ اب سطور اور علامت کی روشنی میں لل دیدی کے چار مصرعوں پر مشتمل ایک واقعہ دیکھیے جو طوفان نوح سے لے کر وادی کشمیر کا تمام علاقہ ایک بڑی جھیل ہونے کی روایات کا عکاس ہے۔

ایک ہو گئے تھے۔ ایک بار وادی کے دو کناروں پر کھڑے ہر مکھ اور کونسر کی چوٹیوں پر کوکک پل بنا ہوا تھا۔ سات مرتبہ یہ جھیل جیسے خلا میں تحلیل ہو گئی“۔

للہ عارفہ کے ہم عصر دوسرے بڑے شاعر حضرت شیخ نور الدین رشی جو نندہ رشی کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ ایک روایت کے مطابق عمر میں للہ عارفہ سے ۴۲ برس چھوٹے تھے۔ جس دور میں آپ نے آنکھ کھولی وہ مسلمان عالموں اور مشائخ کے تبلیغ و ارشاد کا دور تھا۔ امیر کبیر میر سید علی ہمدانی اور ان کے فرزند میر محمد ہمدانی سے آپ کی ملاقاتوں کے بارے میں تمام تذکرہ نگار متفق ہیں اور آپ کی زندگی میں ہی آپ کے ارد گرد با کمال بزرگوں اور رشیوں کا جو سلسلہ جاری ہوا تھا وہ آج تک قائم ہے۔ للہ عارفہ کی طرح آپ کا کلام بھی سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا ہے اور کشمیری زبان کی اکثر ضرب الامثال اور محاوروں کا منبع للہ عارفہ کے بعد آپ ہی کا کلام ہے۔ للہ عارفہ کی طرح آپ بھی عوام و خواص کے دونوں طبقوں سے بخوبی واقف تھے۔ ڈاکٹر مرغوب بانہالی کے الفاظ میں ”اگرچہ ان دونوں روحانی ہستیوں پر دیوانگی اور مستی کے الزامات بھی لگائے گئے لیکن آثار و قرائن اور خود دونوں کی شاعری اس بات سے ظاہر ہے کہ ان دونوں نے زندگی کے گہرے مسائل پر بلند پایہ مفکروں کی طرح غور کیا اور اپنی خداداد تخلیقی صلاحیتوں کے بدولت ان مسائل کو حل کرنے کے بارے میں امکانی تاثرات کو تخیل کی قوت سے اشعار میں ڈھالتے رہے۔ فکر و فلسفے کے سلسلے میں دونوں کا نظریہ ایک ہے۔ دونوں کا رویہ برہمن ملا اور بت پرستی کے خلاف اعلان کی صورت میں مشترک ہے۔ ایک روایت کے مطابق دونوں حضرت سید حسین سمنانی سے ہدایت یافتہ تھے تاہم للہ عارفہ وحدت الوجود کی راہ پر چل نکلیں اور حضرت شیخ وحدت الشہود کے قریب ہو گئے۔ لیکن ظلم، جبر اور استحصال کے خلاف دونوں ہی یک آواز ہیں“ ”تذکرۃ العارفین“ قدیم ترین تذکرہ ہے جس میں للہ عارفہ کی وفات کے بعد کوئی سوا دو سو سال گزرنے پر ان کا ذکر مریم مکانی، رابعہ ثانی کے لقب کے ساتھ ہوا ہے۔ یہ تذکرہ حضرت مخدوم شیخ حمزہ کے برادر بابا علی رینہ نے ۹۷۰ میں لکھا۔

بابا علی رینہ کا بیان ہے کہ للہ عارفہ سید حسین سمنانی کی مرید تھیں اور انہی کی ہدایت پر وہ نوزائیدہ نندہ کو دودھ پلانے کے لیے کیموہ تشریف لے گئی تھیں۔ تذکرہ العارفین میں پہلی مرتبہ للہ عارفہ سے یہ بیان منسوب کیا گیا ہے کہ وہ حضرت سید جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت کا استقبال کرنے کے لیے سات کوس تک گئی تھیں اور انھوں نے ہی للہ عارفہ کو یہ خوش خبری سنائی تھی کہ حضرت شاہ ہمدان بہت جلد کشمیر تشریف لائیں گے۔ تذکرہ العارفین کے کوئی ستر سال بعد ۱۰۴۷ھ میں بابا نصیب الدین غازی نے ”نور نامہ“ میں للہ عارفہ کو شیخ منصور حلاج کی ہمشیرہ کا خطاب دیا ہے۔ ان کے مرید بابا داؤد مشکواتی نے ۱۰۶۳ھ میں جو تذکرہ لکھا اس میں تفصیل سے للہ عارفہ کے حالات درج ہیں، لیکن ان تمام تذکروں میں ان کے سوانحی حالات محض افسانوی، کراماتی اور روایتی معلوم ہوتے ہیں۔ جہاں تک دونوں کے کلام کو ضبط تحریر میں لانے کا تعلق ہے، للہ عارفہ کا کلام ان کی وفات کے تین چار سو سال بعد اور حضرت شیخ کا کلام کوئی دو سو سال بعد مرتب کیا گیا ہے۔ شیخ نور الدین نورانی اور حبہ خاتون

کے درمیان کا زمانی وقفہ یا یوں کہیے کہ کشمیریوں کے دلوں پر راج کرنے والے حکمران سلطان زین العابدین بادشاہ اور چک خاندان کے سلطان شمیری کی وفات اور حسین شاہ چک کا درمیانی وقفہ ایک صدی کا ہے یعنی بڈشاہ ۱۴۷۰ء میں فوت ہوئے اور حسین شاہ چک کو تخت ٹھیک ۱۵۷۰ء میں تخت و تاج سے چھٹی ملی۔ اس ایک صدی کے دوران میں کشمیر اس حد تک داخلی انتشار کا شکار ہو چکا تھا کہ ۱۵۷۰ء میں جب مغل شہنشاہ اکبر اعظم نے اپنی ایک سفارت کشمیر کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیج دی اور حسین شاہ چک نے نہ صرف مغل سفارت کا شاہانہ استقبال کیا جبکہ اکبر کے بیٹے شہزادہ سلیم کے لیے اپنی بیٹی کا رشتہ بھی پیش کیا تو دین الٰہی والے اکبر بادشاہ نے حسین شاہ چک کے تحفوں اور بیٹے کے لیے رشتے کو یہ کہہ کر ٹھکرایا کہ کشمیر کا شیعہ حکمران اپنی سنی رعایا پر جو ظلم ڈھا رہا ہے ان کے پیش نظر بادشاہ یہ سب کچھ قبول نہیں کر سکتا۔ اس صدمے کی تاب نہ لا کر حسین شاہ چک دم توڑ گیا ہر چند کہ بعد میں علی شاہ چک کے تخت نشین ہونے پر اکبر اعظم نے تحائف اور رشتہ دونوں قبول کر لیے کیوں کہ علی شاہ چک نے اکبر اعظم کے اقتدار اعلیٰ کو قبول کر لیا تھا۔ بہر حال مغل حکمرانوں نے کشمیر میں شیعہ سنی اختلافات اور درباری امیروں کے تضادات کو ہوا دے کر ۱۸۸۶ء تک کشمیر کو ہڑپ کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ آخر جب ۱۸۸۶ء میں اکبر کے فوجی جرنیل راجہ بھگوان داس نے کشمیر کے حکمران یوسف شاہ چک کو مذاکرات کے بہانے اکبر اعظم کے دربار تک پہنچا دیا اور یوسف شاہ چک دوبارہ کبھی کشمیر واپس نہ جا سکا تو اس کی ملکہ حبہ خاتون نہ جانے کن صبر آزما حالات میں گمنامی اور بے بسی کی زندگی گزار کر شاید اپنے آبائی گاؤں کی مسجد کے زیر سایہ ابدی نیند سو گئی۔ یہ بھی محض ایک روایت ہے ورنہ حبہ خاتون کا نام یا اس کے کلام کا تذکرہ کسی ہم عصر تاریخ میں کہیں بھی نظر نہیں آتا)۔

للہ عارفہ اور حضرت شیخ نور الدین رشی کی روحانی حیثیت ایک مسلمہ حقیقت بن کر قائم رہی ہے جسے چیلنج کرنے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن حبہ خاتون ایک خالص رومانی شاعرہ رہی ہوں گی پھر ان کا نام اور کلام چار سو سال تک کس طرح قائم رہا۔

اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے کہ حبہ خاتون لوگوں کے لیے ایک المیہ کردار بن کر زندہ رہی ہیں۔ یہ المیہ رومانوی بھی ہے اور سیاسی یا قومی بھی۔ بہر حال تاریخ میں حبہ خاتون کا ایک ملکہ اور شاعرہ کی حیثیت سے کیا مقام ہے اس کا تعین میں نہیں کر سکتا لیکن کشمیری ادب اور لوک روایات میں حبہ خاتون کی شخصیت للہ دیدی اور نند رشی کے بعد تیسری بڑی شخصیت ہے۔

ستم یہ نہیں کہ حبہ خاتون کا کلام کسی بیاض یا کسی تذکرے میں بھی نہیں ملتا' المیہ یہ ہے کہ تقریباً سو ڈیڑھ سو سال تک کشمیری شاعری کا پھر کہیں نام و نشان ہی نہیں ملتا۔ ہاں فارسی شاعری میں کشمیر کے درجنوں نام ضرور سامنے آتے ہیں لیکن مغل دور کی روایتی فارسی شاعری میں کسی تخلیقی فن پارے کی توقع کم کم ہی ہو سکتی ہے۔ تاہم اسی مغل دور میں کشمیر نے ایک ایسے فرزند کو جنم دیا جسے کشمیر کے ایک اور عاشق علامہ اقبال نے حضرت شاہ ہمدان

کے حوالے سے یہ کہہ کر خراج حقیقت پیش کیا۔

شاعر رنگین نوا طاہر غنی فقرا و باطن غنی ظاہر غنی کو بھلے ہی کشمیر کا مغل گورنر یہ کہہ کر بلائے کہ بادشاہ سلامت نے یاد فرمایا ہے۔ غنی حکمرانوں کے در پر جانے والا نہیں گیا۔ اسے اپنے بادشاہ یوسف شاہ چک یا اس کے بیٹے یعقوب چک کا انجام نہیں معلوم

حالت مادر فراقش کمتر از یعقوب نیست
او پسر گم کردہ بود و ما پدر گم کردہ ایم

ملا طاہر غنی ایک روز چپ چاپ مر گیا۔ لیکن غنی کاشمیری اور موت بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں گور پیا کوئی ہور۔ غنی کی وفات کی مدتوں بعد ان کے کسی شاگرد نے ان کا دیوان ترتیب دیا تو صاحب نظر لوگوں کو معلوم ہوا کہ صائب اور کلیم جیسے ایرانی شاعر یوں ہی تو غنی کا کلمہ نہیں پڑھتے تھے۔

ما را چو شمع مرگ بود خامشی غنی	اظہار زندگی بزبان می کلیم ما
شد درو تم را شمع کہ در بزم حریفاں	خاموش شدن مرگ بود اہل زبان را
ہمچو سوزن دائم از پوشش گر مزا نیم ما	جامہ بہر خلق می دوزیم و عریا نیم ما
روزی ماہی شود آخر نصیب دیگراں	طالع برگشتہ ہمچوں آسیا دا دیم ما
جمع کردم مشت خاشاکے کہ سوزم خویش را	گل گماں دارد کہ بندم آشیاں در گلستاں
بہ بزم دردمنداں زار نالیدن ہوس دارم	نے خود ہم کہ در فریاد باشم تا نفس دارم

مغلوں کے بعد کشمیر پر افغانوں کی حکومت کے تاریک دور کو کسی شاعر نے اس ایک شعر میں بیان کیا ہے؟

پرسیدم از خرابی گلشن ز باغباں
افغاں کشید و گفت کہ افغاں خراب کرد

اس بعد سکھوں کا دور آیا تو شاعر نے کہا

گور سنگھ صوبہ و رنجیت چو باشد سلطان
شکوہ جو کہ کنن عالم کورا کوری ست

افغانوں اور سکھوں کے دور میں کشمیری شعراء نے فارسی زبان کی بڑی بڑی مثنویوں کو کشمیری نظم میں ڈھالا جن میں رومانوی مثنویوں سے لے کر شاہنامہ فردوسی جیسے رزمیے شامل ہیں۔

کشمیری شاعری کے بنیادی رویے متعین کرنے میں حالات و واقعات کے علاوہ جن شخصیات کا ہاتھ ہے وہ تو یقیناً للہ عارفہ، شیخ نور الدین اور حبہ خاتون ہی ہیں لیکن اس پہلے دور کے بعد کشمیری شاعروں کے مزاحمتی رویے جن شخصیات کے زیر اثر متعین ہوئے ہیں ان میں غنی کاشمیری، علامہ اقبال، منشی محمد دین اور سعادت حسن منٹو

بھی شامل ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ چودھویں صدی عیسوی سے سترھویں صدی عیسوی تک کشمیر میں جو عالم فاضل لوگ پیدا ہوئے وہ روایات کے پابند رہے لیکن غنی کاشمیری کی شخصیت اس قدر غیر روایتی اور منفرد رہی ہے کہ اسے اشرافیہ کے روایتی معاشرے میں فقط گوارا کر لینے کی حد تک اپنایا گیا اور اس کی انقلابی شاعری کو بھی محض نازک خیالی اور خواب کہنے کی حد تک برداشت کر لیا گیا۔

یاراں بروند بحر ما را، افسوس کے نام مانہ بروند

غنی کشمیر کی مجروح خودی اور زخمی انا کا پہلا ترجمان تھا جسے تین سو سال بعد ایک اور عظیم کشمیری علامہ اقبال نے صحیح معنوں میں دریافت کیا اور اس کے چراغ سے چراغ جلا کر کشمیر کو ایک نئی روشنی میں دیکھا۔۔۔ وسطی ایشیا کی اسلامی تہذیب کے تناظر میں جگمگاتی ہوئی اس حسین نظیر وادی کے سخن گوئے بلبل صفیر کی شاعری کو روایتی تمثیل نگاری کی توصیف سے اوپر اٹھا کر اقبال نے غنی کی حب الوطنی، انسان دوستی اور خودی کو جدید کشمیر کا منشور قرار دیا اس لحاظ سے پچھلے ۱۵۰،۱۰۰ سال سے کشمیری شاعری کے مدافعتی رویے علامہ اقبال کی دین ہیں۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد اپنی کتاب ''اقبال اور کشمیر'' میں لکھتے ہیں

''کشمیر کے ساتھ اقبال کے سوز عشق کی انتہا ہمیں جاوید نامہ میں نظر آتی ہے جو شعری اعتبار سے اقبال کا شاہکار ہے۔ آنسوئے افلاک جاوید نامہ کے تین اہم ترین ابواب میں سے ہے۔ کہ یہی باب رومی کی رہنمائی میں اقبال کو جنت الفردوس کی طرف لے جاتا ہے۔ یہی وہ باب ہے جس میں کشمیر کے حال زار پر اقبال کا دل تڑپ اٹھا ہے۔۔۔۔۔۔ یہاں رومی نے پنجاب کے حالات سے اقبال کو آشنا کیا اور بتایا کہ۔۔۔۔۔۔تو خود جانتا ہے کہ پنجاب پر کیا گزر گئی۔

خالصہ تلوار اور قرآن دونوں اٹھا کر لے گیا اور اس دیس میں مسلمانی ختم ہو گئی۔

اقبال کہتے ہیں کہ رومی کی اس گفتگو نے میرے دل میں ایک سوز پیدا کر دیا میرے دل میں پرانے غم تازہ ہو گئے حتیٰ کہ اس گلشن میں ایک دردمند آواز حوض کوثر کے کنارے سے بلند ہوئی۔

جمع کردم مشت خاشاکے کہ سوزم خویش را

گل گمان دارد کہ بندم آشیاں در گلستاں

یہ کشمیر کے شہرہ آفاق شاعر غنی کی آواز ہے اور یہیں سے اس موضوع کی ابتدا ہوئی ہے جس کے لیے اقبال قاری کی انگلی تھامے اسے قدم بقدم اپنے ساتھ لیے جا رہے ہیں۔

ایں مشت پر کجا و سرود ایں چنیں کجا

روح غنی ست ماتمی مرگ آرزوے

باد صبا اگر بجنیوا گزر کنی حرفے ز ما بمجلس اقوام باز گوے

دہقان و کشت و جوے و خیاباں فروختند

قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند

یہ سکھوں کی حکومت کے خاتمے کے بعد انگریزوں اور ڈوگروں مہاراجہ کے مابین طے ہونے والے ۱۸۴۶ء کے بیعنامہ امرتسر کے خلاف صدائے احتجاج تھی

۱۹۴۷ء میں ایک اور بیعنامہ ہوا جو آزاد ہندوستان اور مہاراجہ کشمیر کے درمیان طے پایا۔

اس کے خلاف آج تک صدائے احتجاج جاری ہے اور جس طرح علامہ اقبال نے لیگ آف نیشنز کی کفن دزدی کے باوجود اس وقت کی اس عالمی انجمن سے خطاب کیا تھا اسی طرح ہمارے کشمیری شاعروں نے بھی اقوام متحدہ کے عالمی ادارے سے کشمیر کے مسئلے پر دادرسی کا تقاضا کیا ہے اس سلسلے میں علامہ اقبال کے ایک مقلد اور نیازمند مہجور کی نظم توجہ طلب ہے یہ بات قابل ذکر ہے کہ مہجور کو قومی شاعری کی راہ پر لانے کا سبب علامہ اقبال ہی کی ذات ہے جو اپنی جوانی کے ایام میں ہی منشی محمد دین فوق وغیرہ کے ساتھ انجمن کشمیریاں پنجاب کی سرگرمیوں میں پیش پیش تھے۔ کلیات مہجور کے مرتب محمد یوسف ٹینگ لکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔ انہی دنوں (۱۹۰۵) میں منشی محمد دین فوق کا پرچہ کشمیری میگزین مہجور کی نظر سے گزرا اور وہ بیتابی کی عالم میں فوق صاحب سے ملاقات کے لیے لاہور جا پہنچے اور فوق صاحب کے گھر میں ہی قیام پذیر رہے۔ دونوں میں تاریخ اور شاعری سے بھی زیادہ کشمیر کا درد مشترک تھا اور فوق سے جلا پا کر مہجور کی شاعری کو ایک نیا رنگ و آہنگ نصیب ہوا۔ کیا معلوم کہ فوق کی تحریک پر ہی مہجور نے تاریخ ادبیات کشمیر لکھنے کا ارادہ کیا ہو اسی کتاب کے لکھنے کی تاکید کرتے ہوئے اقبال نے مہجور کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ کسی زمانے میں جب کشمیر کی اپنی یونیورسٹی ہوگی تو یہ کتاب ضرور نصاب میں شامل ہوگی۔

مہجور کی یہ کتاب کبھی مکمل نہ ہو سکی، لیکن سرینگر یونیورسٹی میں شیخ محمد عبداللہ نے سب سے پہلے اقبال چیئر قائم کی اور پروفیسر آل احمد سرور کی سربراہی میں یونیورسٹی نے علامہ اقبال پر قابل تعریف کام کیا۔

مہجور کے شاگرد رشید، عبدالاحد آزاد کو علامہ اقبال سے ملنے کا کبھی موقع نہیں ملا، لیکن آزاد کی شاعری کو ہم بلاخوف تردید علامہ اقبال کی شاعری کی صدائے بازگشت کہہ سکتے ہیں۔ آزاد کی نظمیں "شکوہ ابلیس"، "دریا" آبشار اور شمع وغیرہ پڑھتے پڑھتے کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے نظمیں کشمیری زبان میں لکھی ہیں۔

یہ علامہ اقبال کی تقلید کا ہی فیض ہے کہ آزاد اور مہجور کی قومی یا سیاسی نظموں کے بعد آج کشمیری شاعری میں جدید نظم کے کامیاب تجربے ہو رہے ہیں۔

کشمیری ادب کا نیا دور مہجور اور آزاد کی شاعری سے شروع ہوتا ہے۔ مہجور استاد تھا اور آزاد اس کا شاگرد دونوں ایسے بڑے شاعر ہیں جنھوں نے روایتی شاعری کو اتنا پیچھے چھوڑ دیا جسے ایک انقلاب سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ۳۸۔۱۹۳۱ء کا دور مہجور کی شاعری کا اہم ترین دور ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کشمیر میں جاگیردارانہ نظام انتہا کو پہنچ چکا تھا اور کشمیر کے عوام دنیا بھر کے دوسرے لوگوں کی طرح کسی انقلاب کی راہ دیکھ رہے تھے اور علامہ اقبال کی شاعری کا جادو کشمیر کے پڑھے لکھے طبقے پر چھا چکا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں آزاد کی ملاقات مہجور سے ہوئی۔ آزاد مارکسی

فلسفے کا قائل اور علامہ اقبال کی شاعری کا پرستار تھا۔ وہ علامہ اقبال کی لے میں شاعری کر رہا تھا۔ مہجور کے انداز سخن پر بھی جان دیتا تھا۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس نے فکری طور پر مہجور کو زیادہ متاثر کیا۔ آزاد اور مہجور کا ذکر کشمیری ادب میں ہمیشہ ساتھ ساتھ آئے گا۔

☆

رفیق خالد کارائی

ترکی کا ایک مشہور اور ہردلعزیز کہانی نگار

نورائی اوز ترک شین / رجب دورگون

1896 میں ترکی ادب میں ''ثروت فنون'' کے نام سے ایک نئی تحریک شروع ہوئی۔ اس زمانے کے افکار یہ تھے کہ ادب برائے ادب ہے، ادب لوگوں کے لئے نہیں ہے۔ اس لیے ان کی تخلیقات عوام تک نہ پہنچ سکیں۔ تحریک ثروت فنون نے علامت پسندی کی فرانسیسی تحریک کا بہت اثر لیا تھا۔

1908 میں آزادی کے اعلان کے بعد ثروت فنون کے مقابلے میں ایک گروپ ''فجری آتی'' کے نام پر بنایا گیا۔ فجری آتی کا مقصد تھا ادب کے بارے میں لوگوں کو بتانا۔ لسانیات اور آرٹ کو ترقی دینا۔ ادب برائے ادب نہیں بلکہ ادب کی اجتماعی حیات کو آگے بڑھانے کے لیے استعمال کرنا۔ یہ تحریک بھی مغربی ادب سے خوب متاثر تھی۔ فجری آتی کے نمائندہ ادبا یعقوب قدری، محمد فوات اور رفیق خالد کارائی تھے

(1) ''فجری آتی'' کی نامور شخصیت رفیق خالد کارائی 1888 میں استانبول میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان علم و فضل کے لیے مشہور تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے ماموں سے حاصل کی۔ اس دور کے مشہور سکول گلاتا سرائے ہائی سکول میں داخلہ لیا۔ آخری سال کے دوران استاد سے بحث و مباحثہ میں انہیں سکول کو خیرباد کہنا پڑا۔ لیکن اس سکول میں انہیں نئے علوم و خیالات سے آگہی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد وہ قانون پڑھنے کیلئے یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ لیکن پڑھائی کے دوران ہی میں انھوں نے وزارت مالیہ میں ملازمت اختیار کر لی۔ آئینی حکومت کے اعلان کے بعد ایک اخبار میں بطور اخبار نویس شامل ہوئے۔ ''فجری آتی'' کے حلقے میں بھی داخل ہوئے۔ اور ''کرپی (Kirpi) کے نام سے افسانے لکھنے لگے۔ Ittihat Terakki کی حکومت کی طرف سے ان پر استانبول میں رہنے کی پابندی عائد کر دی گئی۔ اس لیے وہ اناطولیہ کے شہر بلے جک، انقرہ اور چورم میں زندگی بسر کرنے لگے۔ وہاں جا کر انہوں نے اناطولیہ کے لوگوں کو دوسرے شہروں کے لوگوں کی زندگی سے متعارف کرایا۔ ان کی مشہور کہانیوں کا مجموعہ ''مملکت حکایات'' وہاں مکمل ہوا۔ ان کہانیوں کے ذریعے اناطولیہ کے لوگوں کے رسوم و رواج اور

عادات بھی سامنے آتی ہیں۔ اس سے پہلے کسی ادیب یا لکھاری نے ان کے متعلق زیادہ کچھ نہیں لکھا تھا(2)

استانبول واپس آنے کے بعد 1918 میں رابرٹ کالج میں استاد مقرر ہوئے۔ جنگ نجات کے دوران ان کی باغیانہ تحریروں کی وجہ سے انہیں ملک بدر کر دیا گیا اور وہ اپنا ملک چھوڑ کر لبنان اور شام میں جلا وطنی کی زندگی گزارنے لگے۔ یہاں انہوں نے اپنی سرگزشت لکھی اور اپنی مشہور کہانیوں کا مجموعہ جلا وطنی کی حکایات (Gurbet Hikayeleri) مکمل کیا۔

رفیق خالد کرائی کی تحریریں جو جلا وطنی کے زمانے میں لکھی گئیں، کمال اتاترک اور ان کے ساتھیوں کو بہت پسند آئیں۔ اتاترک رفیق خالد کو معاف کرنا چاہتے تھے لیکن انہوں نے صرف اپنے لیے اس معافی کو قبول نہ کیا۔ چنانچہ اس پر ترکی جمہوریت کی طرف سے ایک عام معافی کا اعلان کیا گیا۔ اور یوں رفیق خالد کے سبب بہت سے جلا وطن مصنفین اپنے ملک واپس آئے۔

رفیق خالد نے اپنے ملک واپس آنے کے بعد ایک اخبار میں بطور جرنلسٹ ایک بار پھر اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور بقایا زندگی اسی میں گزار دی۔ انہوں نے 18 جولائی 1965 میں استانبول میں وفات پائی۔

کرائی کی ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ادب کی کئی اولیات ان سے ہی منسوب ہیں۔ انہوں نے کہانی اور ناول سوانح اور طنز و مزاح میں اپنے جوہر دکھائے۔ ان کے تقریباً بیس ناول ہیں۔(3)

Bugunun Saraylisi, Anahtar, Surgun, Nilgun ان کے سب سے مشہور ناول ہیں۔ Bugunun Saraylisi ڈرامے کی صورت میں ترکی ٹیلی ویژن کے چینل TRT1 پر قسط وار پیش کیا گیا۔

وہ اپنے ناولوں اور کہانیوں میں آزادی کی جنگ کے بعد ابھرنے والے معاشرے کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ جنگ کے بعد کے ہنگامے، جنگ کے دوران نو دولتیے بننے والے اشخاص، استانبول کے متوسط اور غریب گھرانوں کی زندگی، گھریلو زندگی میں جھگڑے کے نمونے، یہ سب کچھ ان کے سامنے پیش آئے اور انہوں نے یہ سب کچھ اپنی تحریروں میں پیش کیا۔

ان کے بعض ناولوں اور افسانوں میں فرانسیسی ادب کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ بالخصوص موپساں کے(4)

60 سالہ ادبی زندگی کے دوران درجن بھر افسانوی مجموعوں کے علاوہ متنوع موضوعات پر متعدد مضامین لکھنے والے رفیق خالد ہمارے ملک میں ''مملکت حکایات'' کے حوالے سے زیادہ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ مجموعہ پانچ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ان میں ''ایک عجیب تحفہ'' کے عنوان کہانی کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

ایک عجیب تحفہ

فریدون بازار میں سنار کی دکان کے سامنے دو گھنٹے سے گھوم رہا تھا۔ اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ

دکان کے اندر جائے۔ کیونکہ بیچنے کیلئے اس کے پاس کوئی خاص چیز نہیں تھی۔ البتہ اس کی جیب میں ایک چیز تھی اور وہ تھا شیونگ برش۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کی کیا قیمت ہو سکتی ہے۔ وہ برش جس کے دستہ پر نقوش کندہ تھے اور وہ ہاتھی دانت کا بنا ہوا تھا۔ وہ اس کی قیمت پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن پوچھنے میں اسے عار محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ ذرا سا ڈرتا بھی تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ یقیناً اس کی کوئی قیمت نہیں ہوگی۔ اس برش کو ایک یہودی نے اسے تحفے کے طور پر دیا تھا۔ دیتے وقت اس نے کہا تھا کہ ''یہ برش بہت قیمتی ہے۔ اس کی قدر کرنا اور اسے کبھی بھی نہ پھینکنا۔ یہ کسی وقت تمہارے کام آئے گا''۔ فریدون سوچتا تھا کہ اس یہودی نے اس سے مذاق کیا ہوگا۔ ورنہ اس قسم کے برش کی کیا قیمت ہو سکتی ہے۔

یہ سوچتے سوچتے وہ بہت اداس اور غمگین ہو گیا اور کسی حد تک ناامید بھی۔ وہ رونا چاہتا تھا۔ مہینوں سے اسے مایوسی نے گھیر رکھا تھا۔ اس کے دل کو روگ سا لگ گیا تھا۔ وہ مرنے کی تمنا کرنے لگا۔ کیا اچھا ہو اگر اسے موت آجائے تاکہ سارے دکھ درد ختم ہو جائیں۔

اس نے برش کو اپنی جیب سے نکالا اور دیکھا۔ عام سا برش تھا یہ ہر کسی کے پاس ہوگا۔ اسے اس میں کوئی خاص خوبی نظر نہ آئی۔ اس کی قیمت دو چار پیسے ہو سکتی ہے۔ اس سے زیادہ کوئی بھی نہیں دے گا۔

اس نے واپس جانے کا فیصلہ کیا لیکن نہ جا سکا' اس میں بڑی دکان میں داخل ہونے کی جسارت نہیں تھی۔ ایک چھوٹی سی دکان میں ہمت کر کے داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہونے کے وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ یہ دکان بہت چھوٹی تھی۔ دکان میں ایک شوکیس رکھا تھا۔ جس میں چاندی کے آٹھ دس کنگن اور یمن کے پتھر کے پیالے رکھے تھے۔ ایک سن رسیدہ سنار apron پہنے ہوئے عینک لگائے، اپنے کام میں مشغول تھا۔ اس نے عینک اونچی کر کے آنے والے کو دیکھا اور خوفناک سی آواز میں پوچھا۔ آپ کو کیا چاہیے؟ فریدون نے برش دکھایا: ''کافی عرصہ پہلے ایک شخص نے مجھے تحفہ کے طور پر دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ یہ بہت قیمتی ہے۔ واقعی یہ قیمتی ہے یا نہیں؟ کیا آپ بتا سکتے ہیں؟''

سنار نے دلچسپی سے برش اپنے ہاتھ میں لیا، گھمایا، ہلایا اور اپنے ناخن سے کھرچا اور واپس کر دیا: اس کی کوئی قیمت نہیں ہے' بازار میں اس طرح کا سامان وافر ہے۔ فریدون گھبرا گیا اور تتلا تتلا کر معافی مانگتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اپنے آپ سے کہنے لگا کہ ''یہودی نے کیوں کہا تھا کہ یہ قیمتی ہے۔ اس نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ حالانکہ اس یہودی کے لیے میں نے اپنی جان حاضر کی تھی''۔

(اس واقعے کے) دس سال پہلے فریدون مصر سے سلونیکا واپس آ رہا تھا۔ ان کا بحری جہاز ایک بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا۔ مسافروں میں سے ایک لالچی قسم کا بوڑھا یہودی جہاز کے عرشے پر دنیا سے بے خبر اور اپنے سامان کو ترتیب دے رہا تھا۔ جس وقت وہ کرین کے نیچے سے گزرنے لگا تو ایک بھاری وزنی قسم کا بکس یہودی کے اوپر گرنے ہی والا تھا کہ فریدون نے تیزی سے اچھل کر یہودی کو وہاں سے کھینچا اور اس کی جان بچائی۔ لیکن

کر ین فریدون کے کندھے کو رگڑتی ہوئی گزر گئی جس کی وجہ سے اس کے کندھے پر زخم پڑ گیا۔ یہودی کی جان بچ گئی وہ بہت خوش ہوا اور فریدون کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس نے اپنے سامان میں سے ایک شیونگ برش نکال کر دیا اور کہا:

"یہ بہت قیمتی ہے۔ اسے کبھی نہ پھینکنا۔ اس کی قدر کرنا۔ کسی زمانے میں یہ تمھارے کام آئے گا"۔

چھوٹی موٹی چیزوں کا کاروبار کرنے والا آدمی کیا فائدہ دے سکتا تھا؟ لیکن اس نے ایسا کیوں کہا تھا اور اسے کیوں دھوکا دیا تھا؟ درحقیقت اس وقت بھی فریدون نے اس پر بھروسہ نہیں کیا تھا۔ اس نے برش کو لے کر ایک کونے میں رکھ دیا تھا لیکن جب وہ جنگ میں قید ہوا تو اس وقت اس نے اسے استعمال کیا تھا۔ اسے کبھی بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ برش قیمتی ہے۔

جنگ کے بعد جب وہ استانبول واپس آیا تو کھانے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اسے یہودی کی بات یاد آئی تو وہ برش بیچنے کے لیے سنار کے پاس لے گیا۔ سنار نے اسے مایوس کیا تو اس نے سوچا کہ اس برش کو پھینک دے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اس برش کو حجامت کے لیے استعمال کرے گا۔ اس نے اسے جیب میں رکھ لیا۔

فریدون کی ماں اس کے ساتھ رہتی تھی۔ انھوں نے اپنا گھر بیچ کر ایک غریب محلے میں بسیرا کیا۔ یہاں آنے کے بعد وہ مفلسانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ ماں بیٹا ایک تنگ و تاریک گھر میں اذیت ناک اور تکلیف دہ زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے محلے کے اردگرد باغ تھے جن کی وجہ سے وہاں ہر وقت رطوبت رہتی تھی۔ اس شام بازار سے واپس آنے کے بعد فریدون اپنی غربت بھری زندگی سے مایوس ہو گیا اور اپنی ماں سے مختصر الفاظ میں کہنے لگا۔ "اس کی کوئی قیمت نہیں ہم نے بے فائدہ اسے سنبھال کر رکھا تھا" یہ کہہ کر اوپر اپنے کمرے کو چلا گیا۔

کھڑکی کھول کر سانس لینے لیے باہر کی طرف جھکا۔ ان کا گھر نشیب میں واقع تھا۔ ابھی شام نہیں ہوئی تھی۔ اونچی جگہوں پر یعنی مسجدوں اور پرانے قلعے کی دیواروں پر ابھی تک روشنی تھی۔ البتہ فریدون کے محلے میں روشنی گھنٹوں پہلے سے غائب ہو جاتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے اور اندھیرے گھر مسجدوں کے سایے میں بہت پہلے سے گم ہو جاتے تھے۔ ابھی تک چراغ نہیں جلائے گئے تھے۔ لیکن فریدون کے محلے میں جو ایک تہ خانے کی مانند تھا، اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ پانی سے بھرے ہوئے گلستانوں اور کنوؤں کی وجہ سے رطوبت پھیل رہی تھی اور وہ رطوبت ان کے دماغ میں چھائی رہتی تھی۔ وہاں روشنی کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ روشنی آتی بھی تو کہاں سے آتی سارے گھر ایک بہت ہی نشیب میں بنائے گئے تھے۔ اندھیرے اور رطوبت والے محلے میں کہیں سے بھی روشنی داخل نہیں ہو سکتی تھی۔

سمندر کے دوسری طرف قاضی کوئے کی آبادی ایک حسین اور شوخ عورت کی طرح ہنس رہی تھی اور اس کی چمکدار شعاعیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ اس اندھیری جگہ کے مقابل وہ جگہ بہت دلکش اور روشن نظر آتی تھی۔

یہ منظر اس پر اتنا اثر کرتا تھا کہ وہ اپنی بے بس اور تکلیف دہ زندگی سے مزید نفرت کرنے لگتا تھا اور قاضی کوئے کی روشن زندگی میں رہ کر اپنی جان دے دینا چاہتا تھا۔

اچانک اسے غصہ آیا اور اس نے اپنا ہاتھ بے توجہی سے جیب میں ڈالا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ اس تحفے کو یعنی برش کو قیمتی سمجھتا تھا۔ لیکن اب اس کے لیے وہ وبال جان بن گیا تھا۔ اسے یہودی کی ڈراؤنی صورت اندھیرے میں قہقہے لگاتی ہوئی نظر آنے لگی۔ اس کی لمبی لیکن مختصر داڑھی شکنوں سے پر پیشانی اور پلکوں کے بغیر آنکھیں ایک خوفناک صورت اختیار کر گئی تھیں۔ اسے یہودی کی آواز آئی "میں نے تمہیں دھوکا دیا تھا"۔ جی ہاں اس نے دھوکا دیا تھا۔ اذیت ناک اور بے بسی کے وقت پر دھوکہ۔ ایک شیونگ برش جو صرف حجامت کے کام آتا ہے کتنا قیمتی ہوسکتا ہے۔ ایک بیوقوف آدمی ہی سوچ سکتا ہے کہ برش کو بیچ کر وہ امیر ہو جائے گا۔ اس نے برش کو بے دردی سے پکڑا اور کھڑکی کے باہر دیکھا۔ نیچے قلعے کی دیوار کے قریب ایک بڑی کھرلی تھی۔ اس نے اس کھرلی کے درمیان نشانہ باندھ کر برش کو زور سے پھینکا اور دیکھنے لگا کہ وہ برش کہاں گرا۔ برش کا دستہ جو ہڈی سے بنا ہوا تھا گرا تو تڑاخ کی آواز آئی۔

اندھیرے میں دو نقطے چمکے۔ فریدون نے ان چمکنے والی چیزوں کو حیرت سے دیکھا۔ اچانک اس کے دل میں ایک امید پیدا ہوئی۔ سیڑھیوں کو تیزی سے پھلانگتا ہوا وہ نیچے اترا۔ اس نے کوڑے کے انبار میں جھانک کر دیکھا۔ دو پتھر ابھی تک چمک رہے تھے۔ اس نے انہیں فوراً اٹھالیا۔ اور دوڑتے ہوئے گھر میں داخل ہوا۔ چراغ کی مرجھائی ہوئی روشنی میں دیکھتے وقت اس نے سمجھا کہ وہ ہیرے ہیں۔ لیکن کیا وہ حقیقی ہیرے تھے؟ اس میں بھی یہودی کی کوئی دھوکا بازی شامل ہوگی۔ صبح تک وہ سو نہ سکا۔ ابھی اندھیرا ہی تھا کہ وہ سیدھا اسی دکان پر گیا جہاں وہ پہلے گیا تھا۔ ابھی تک مالک نہیں آیا تھا وہ دکان کے باہر انتظار کرنے لگا۔ اتنے میں اس نے سنار کو دیکھا اس نے دکان کھولنے سے پہلے اسے وہ چمکیلے پتھر دکھائے اور پوچھا "ان کی قیمت کیا ہے؟" سنار نے بے پروائی سے دیکھا۔ بعد میں اس نے اپنی عینک لگائی۔ اور غور سے ان کو دیکھا۔ سورج کی طرف رکھا۔ نظر آرہا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے ان کو پکڑنا نہیں چاہتا۔ اور لجاجت اور نازکی سے اس نے کہا "اچھا مال ہے اگر ان کا خریدار ملتا ہے تو تجھے پیسے دے سکتا ہے۔ آؤ ایک بار دوبارہ دیکھیں اور ان کی قیمت کا اندازہ لگائیں۔"

فریدون بڑے عرصے تک یہ نہ سمجھ سکا کہ آخر یہودی نے ایک حجامت کے برش کے اندر ایسے قیمتی پتھروں کو کیوں چھپایا۔ اسے اچانک یہ خیال آیا کہ خلاف قانون مال کی درآمد یا برآمد کرنے والے دھوکے باز اس طرح کی چیزیں اسی طرح چھپاتے ہیں۔ ایک حجامت کے برش کے دستے کے اندر بھی دو ہیرے رکھے جاتے ہیں جن کی قیمت دو ہزار ترک لیرا ہو!

حواشی

1. Qzkirimli, Atilla, Turk Edebiyati Ansiklopedisi, Cem Yayinevi, Tarihsiz.
2. Okul Kultur Ansiklopedisi, Istanbul, 1984.
3. Tercuman Okul Kultur Ansiklopedisi, 3. Cilt, Istanbul, 1989.
4. Aktas, serif, "Refik H. Karay" Kultur ve Turizm Bakanligi Yayinlari, Ankara, 1986

مرحوم اکابر کے پچیس نادر خطوط

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

میرے شخصی ذخیرے کا ایک مضبوط حصہ اکابر کے قلمی رقعات پر مشتمل ہے۔ تحدیث نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ غالب (۱۸۶۹ء) سے لے کر عہد موجود تک کا کوئی قابل ذکر صاحب علم و قلم ایسا نہ ہوگا جس کے اصل مکاتیب میری تحویل یا زنبیل میں نہ ہوں ــــ ذیل میں محبی عطاء الحق قاسمی کی فرمائش پر ایسے اہل علم کی پچیس تحریریں پیش کی جا رہی ہیں جن کے لکھنے والے، بدقسمتی سے اب ہمارے درمیان موجود نہیں۔

ان پچیس نگارشات کا دورانیہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۷۶ء تک کے برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ خط میں نے اپنے ذخیرے سے علی الحساب لے لیے ہیں۔ ان میں سے پہلے سترہ مکاتیب پروفیسر سید وقار عظیم (ولادت: الہ آباد دسمبر ۱۹۰۹ وفات: لاہور ۷ نومبر ۱۹۷۶ء) کے نام ہیں۔ اٹھارویں اور انیسویں نگارش خود وقار عظیم کی زائدۂ قلم ہے۔ ۲۰ تا ۲۵، آخری ۶ رقعات، راقم الحروف (سید معین الرحمٰن) کے نام ہیں۔ پیش کردہ پچیس (۲۵) خطوں کے ضروری کوائف یہ ہیں:

(۱) خطوط بنام سید وقار عظیم، مکتوب نگار:

۱۔ فراق گورکھپوری، الہ آباد، مورخہ ۱۱۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء

۲۔ ممتاز شیریں، بنگلور سٹی، مورخہ ۱۷۔ نومبر ۱۹۳۶ء

۳۔ مرزا محمد عسکری، لکھنؤ، مورخہ ۲۶۔ فروری ۱۹۴۷ء

۴۔ مختار صدیقی، لاہور، مورخہ ۳۰۔ اگست ۱۹۴۸ء

۵۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان، حیدر آباد دکن، ۱۲۔ فروری ۱۹۴۹ء

۶۔ حفیظ جالندھری، راولپنڈی، مورخہ یکم جون ۱۹۴۹ء

۷۔ پروفیسر آل احمد سرور، لکھنؤ، مورخہ ۱۹۔ جنوری ۱۹۵۴ء

۸۔ فضل احمد کریم فضلی، کراچی، مورخہ ۹۔ اگست ۱۹۵۸ء

۹۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھنؤ مورخہ ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء
۱۰۔ شاہد احمد دہلوی، کراچی، مورخہ ۲۶۔ دسمبر ۱۹۶۶ء
۱۱۔ پروفیسر حمید احمد خان، لاہور، مورخہ ۳۱۔ جنوری ۱۹۶۷ء
۱۲۔ پروفیسر طاہر فاروقی، انقرہ، مورخہ ۱۱۔ دسمبر ۱۹۶۹ء
۱۳۔ پروفیسر سید احتشام حسین، الہ آباد مورخہ ۶۔ جون ۱۹۶۷ء
۱۴۔ حیات اللہ انصاری، نئی دہلی، مورخہ ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء
۱۵۔ ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی، راولپنڈی، مورخہ ۱۴۔ فروری ۱۹۷۵ء
۱۶۔ بیگم صالحہ عابد حسین، نئی دہلی، مورخہ ۲۸۔ جنوری ۱۹۷۶ء
۱۷۔ ن۔ م۔ راشد، پشاور، مورخہ ۲۴۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء

(ب) سید وقار عظیم کی تحریریں، بنام:

۱۸۔ ن۔ م۔ راشد، کراچی، مورخہ ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء
۱۹۔ بسلسلہ مرزا محمد منور[1]، لاہور، مورخہ ۶۔ ستمبر ۱۹۵۴ء

(ج) رقعات بنام سید معین الرحمن، منجانب:

۲۰۔ مولانا عبدالمجید سالک، لاہور، مورخہ ۱۹۔ جون۔ ۱۹۵۹ء
۲۱۔ مولانا اعجاز الحق قدوسی، کراچی، مورخہ ۵۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء
۲۲۔ مولانا عبدالعزیز المیمنی، لاہور، مورخہ۔ ۲۶۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء
۲۳۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری، کراچی، مورخہ ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء
۲۴۔ پیر سید حسام الدین راشدی، کراچی، مورخہ۔ ۱۵۔ اپریل ۱۹۶۹ء
۲۵۔ ڈاکٹر ممتاز حسن، کراچی، مورخہ ۱۹۔ مارچ ۱۹۷۰ء

یہ سب خط، زیادہ تر واضح بالذات (Self explanatory) ہیں۔ خطوں میں مذکور اشخاص کے بارے میں کچھ زمانی و مکانی اشارات اور حواشی خطوں کے آخر میں یکجا کر دیے گئے ہیں۔ تفصیلی توضیحات بعد کا معاملہ ہے، پہلے مرحلے میں مقصود اصلی ان قدیم اور نادر خطوں کا محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس حوالے سے یقین ہے یہ کوشش اور پیش کش قابلِ لحاظ خیال کی جائے گی۔

استاد الاساتذہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کے خط مورخہ ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء اور اس خط سے منسلک ایک وضاحتی نوٹ کا عکس جو ڈاکٹر سید ناظر حسن زیدی مرحوم (وفات: نیویارک، مارچ ۲۰۰۴ء) کے قلم کی یادگار ہے، محفوظ کیا جا رہا ہے۔

ن۔م۔راشد نے اپنے خط (مورخہ ۲۴۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء) میں لفافے پر لکھے گئے اپنے غلط نام کے اندراج پر سید وقار عظیم کے دفتری عملے کی نا اہلی کی شکایت کی تھی۔ اس لفافے پر لکھے گئے نام اور پتے کا عکس تحریر بھی پڑھنے والوں کی ضیافت طبع کے لیے شامل اشاعت ہے۔

امید ہے کہ مکاتیب کی جمع آوری کے اس سلسلے کی قدر افزائی ہوگی اور یہ پیش رفت، متعلقہ شخصیات پر علمی اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے ایک اہم ماخذ اور سرچشمے کا کام دے گی۔

(ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)

(1)

فراق گورکھپوری[۲]، بنام: سید وقار عظیم:

Department of English Studies,
The University, ALLAHABAD

۸/۴ بنک روڈ، الہ آباد
۱۱۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء

بھائی وقار عظیم، سلام۔

محمد احمد صاحب شباب رضوی کا مضمون حسب طلب آپ کی خدمت میں جا رہا ہے۔ میرے ناقدانہ ذوق کو تو اس سے کافی تشفی ہوئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ کہاں تک پسند فرماتے ہیں۔ بھائی یقین مانو اس مضمون کے لکھنے میں رضوی نے دن رات ایک کر دیا تھا۔ اس کے لیے انہیں روپے ضرور ضرور بھجوا دینا۔ ان کا پتہ یہ ہے:

(محمد احمد شباب، جنت محل، حسن منزل، الہ آباد)

اگر کسی سبب سے آپ کو یہ مضمون پسند نہ آئے، جو ایک انہونی بات ہوگی، کیونکہ مضمون بہت متوازن ہے اور بہت ذمہ دارانہ انداز میں ہے، ___ تو آپ سے استدعا ہے کہ اسے میرے یا صاحب مضمون کے پاس آپ واپس بھیج دیں گے۔ ہاں، میری جن کتابوں پر یہ مضمون مبنی ہے وہ آٹھ دس ہفتوں کے اندر اندر نکلیں گی' اس لیے دسمبر ۱۹۴۶ء یا زیادہ زیادہ جنوری ۱۹۴۷ء میں اگر آپ کو یہ مضمون پسند ہو تو اسے شائع فرما دیں، بلکہ کچھ پہلے ہی ___

یکم اگست ۱۹۴۶ء (1st Aug.) کا ''آج کل'' مجھے نہ جانے کیوں نہیں ملا۔ میری غزل موج ترنم کے نام سے اس میں نکلی ہے۔ ہو سکے تو ایک کاپی بھجوا دیں۔ ہاں بھئی دلی آ کر اب کی تو آپ سے ضرور ملوں گا۔

آپ کا: فراق

(۲)

ممتاز شیریں[۳] بنام: سید وقار عظیم

دو ماہی ''نیا دور'' بنگلور، سٹی

(ترقی پسند ادب کے لیے وقف اردو میگزین) ۱۷۔ ستمبر ۱۹۴۶ء

مکرمی تسلیم۔ PEN والوں نے ''نیا دور'' نمبر ۷ پر ریویو کیا ہے۔ اس کا ایک تراشہ ہمیں اور ایک تراشہ آپ کو ہماری معرفت بھیجا ہے۔ یہ اس خط کے ساتھ ملفوف کر کے بھیج رہی ہوں[۴]۔ از راہِ مہربانی رسید سے مطلع فرمائیے گا۔

آپ سے استدعا ہے کہ ''نیا دور'' کے لیے (آپ) کوئی بہت اچھا غیر مطبوعہ مضمون عنایت فرمائیں۔ شاید نمبر ۹ کے لیے تو نہیں ہو سکے گا لیکن ۱۰ یا ۱۱ کے لیے ضرور کوئی مضمون بھیجیں، بڑی نوازش ہوگی۔ (اپنی) فوٹو بھی ضرور بھیجئے گا۔ شاہین[۵] سلام کہتے ہیں۔ امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

ہم نے اب تک P.E.N والوں کو ''نیا دور'' نہیں بھیجا تھا۔ ہمیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ انہوں نے ''نیا دور'' کا نوٹ لیا ہے اور اپنی طرف سے ریویو کیا ہے۔ ''نیا دور'' نمبر ۶ کا ریویو بھی اس میں آل احمد سرور نے کیا تھا۔ اب ارادہ ہے کہ نمبر ۸ سے انہیں پرچے بھیجا کریں۔

نیاز کیش

ممتاز شیریں

(۳)

مرزا محمد عسکری[۶] بنام: سید وقار عظیم

حکیم عبدالعزیز روڈ، لکھنو ۲۶۔ فروری ۱۹۴۷ء

مکرم و محترم! تسلیم ـــــ عنایت نامہ مورخہ ۱۸۔ فروری پہنچ کر باعث مسرت ہوا۔ آپ کے فرمانے کے بموجب آج دو مضامین رجسٹری شدہ ارسال خدمت کیے جاتے ہیں۔ ایک تاریخی مضمون ہے اور ایک ڈراما۔ معلوم نہیں آپ کا اصول، طباعت کے متعلق کیا ہے یعنی کوئی مضمون بالتکمیل آپ ایک ہی اشاعت میں چھاپتے ہیں یا ''اسپیس'' کے خیال سے دو یا زیادہ اشاعتوں میں۔ بہرطور جیسا آپ مناسب سمجھیں کریں۔

رقم معاوضہ کے متعلق آپ کا خیال بالکل صحیح ہے۔ میں یہ جز و معاملہ آپ ہی پر چھوڑتا ہوں ـــــ ''آتی ہے مجھ کو شرم کہ تکرار کیا کروں'' ـــــ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کی سعی و کوشش سے کوئی اچھا اور معتبر پبلشنگ فرم دلی میں ایسا ہو جو میری دو کتابیں رائلٹی یا کمیشن پر چھاپ سکے۔ اس تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں اور اطلاع کا شکر گزار ہوں گا۔ کتابوں کا نام حسب ذیل ہے:

(۱) شیخ جی: مجموعہ اشعار۔ ۱۲۳ شعرائے ماضی و حال جو صرف شیخ و واعظ وغیرہ کے متعلق ہیں مع مختصر

حالات شاعر۔

(۲) لغتِ خیالات: برخلاف معمولی لغتِ الفاظ کے یہ صرف مضامین و مفاہیم کی لغت ہے جس کے متعلق تقریباً چار ہزار حکماء و اکابر قدیم و جدید نے اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں

امید ہے کہ وہ پرچہ ''آجکل'' جس میں میرے مضامین نظمیں ارسال فرمایئے گا۔

والسلام
محمد عسکری عفی عنہ

(۴)

مختار صدیقی[۷] بنام: سید وقار عظیم

لاہور
اتوار (۳۰۔ اگست ۱۹۴۸ء)

جناب مکرم، تسلیم ــــــ والا نامہ آیا اور اس کے دو دن بعد پرچہ بھی پہنچا۔ پرچے کی ترتیب اور مضامین کے تنوع سے جی بہت خوش ہوا۔ نثر میں شوکت تھانوی[۸] اور احمد ندیم قاسمی[۹] کے مضامین اور یزدانی ملک[۱۰] کا افسانہ بہت پسند آئے۔ نظم کے حصے میں استاد آرزو[۱۱] کی غزل اور تابش[۱۲] و اختر[۱۳] کی نظمیں خوب رہیں۔

آپ کا حکم سر آنکھوں پر، مگر میرا تعلق زیادہ ان علاقوں سے رہا ہے جہاں زندگی کا اوڑھنا بچھونا اردو تھی، پنجابی نہیں تھی۔ اس لیے پنجاب کے لوک گیتوں اور کتابی شاعری سے میری واقفیت بہت محدود ہے۔ اس سلسلے میں احمد ندیم قاسمی بہت موزوں آدمی ہیں جنہیں آپ پہلے ہی گرفتار کر چکے ہیں۔ باقی صوفی غلام مصطفےٰ تبسم[۱۴] اور مولانا اظہر امرتسری[۱۵] رہ گئے ہیں۔ ان سے رجوع فرمایئے، ہاں نیاز مند کے لائق اور کوئی خدمت ہو تو بسر و چشم ارشاد کیجئے۔

آپ کا نیاز مند
مختار صدیقی

(۵)

ڈاکٹر یوسف حسین خان[۱۶]، بنام: سید وقار عظیم

جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد (دکن)
۱۶۔ فروری ۱۹۴۹ء

مکرمی، مزاج گرامی ــــــ معاف فرمایئے گا، آپ کے خط (کا) جواب بہت دنوں کے بعد دے رہا ہوں۔ ذاکر[۱۷] صاحب نے جامعہ ملیہ (دہلی) میں آپ سے تعارف کرایا تھا، مجھے یاد ہے۔ انشاء اللہ پھر کبھی ملاقات کی تجدید ہوگی۔ اس دفعہ بہت سرسری طور پر ملاقات ہوئی تھی۔

میں نے ''اردو غزل'' کی اشاعت کی نسبت آپ کو لکھا تھا اور آپ نے جواب میں فرمایا تھا کہ کوئی ناشر صاحب اشاعت کے لیے آمادہ ہیں۔ اس دوران میں یہاں کے ایک مقامی ناشر مالک اعظم اسٹیم پریس کو

بے حد اصرار ہوا کہ کتاب اشاعت کے لیے انہیں دے دوں، تو میں نے انہیں دے دی۔ اب سو صفحوں کی کتابت رہ گئی ہے اور باقی حصے کی بھی غالباً مارچ کے وسط تک کتابت ہو جائے گی اور شاید اپریل کے وسط تک کتاب شائع ہو جائے گی۔

میں نے اردو غزل والے مضمون کا باقی حصہ بھی آپ کو بھیج دیا تھا، جو غالباً آپ کو پہنچ چکا ہے۔ نہ معلوم وہ "ماہ نو" میں شائع ہوا (یا) نہیں۔ "ماہ نو" کے پچھلے کئی مہینوں کے نمبر نہیں ملے۔ اگر کتاب کے شائع ہونے سے پہلے آپ رسالے میں نکال دیجیے تو اچھا ہے۔

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ ڈاکٹر غلام یزدانی[18] صاحب کو میں نے آپ کا سلام پہنچا دیا ہے۔

فقط: یوسف حسین خان

(۶)

حفیظ[19] جالندھری، بنام: سید وقار عظیم

پی۔۱۵۳۴، اصغر مال، راولپنڈی
یکم جون ۱۹۴۹ء

میرے کرم فرما وقار عظیم صاحب، السلام علیکم ـــــ ۱۷۔ مئی کا گرامی نامہ ملا۔ نہ تو میں "ماہ نو" (سے) خفا ہوں، نہ خدانخواستہ آپ سے کوئی کدورت ہے۔ بات یہ ہے کہ میں ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد وہ نہیں رہا ـــــ مجھ میں ایک ایسی تبدیلی آ گئی ہے کہ مجھے خود حیرت ہے۔ "ماہ نو" میری ہفوات کی تاب نہیں لا سکے گا۔ میں شعر نہیں کہتا، ان سب کو کوستا ہوں جو برسر اقتدار ہیں اور جن کو میں بے غیرت اور بد معاش قرار دینے کے لیے مجبور ہوں۔

"ماہ نو" حکومت کا مجلّہ ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ میں آپ کی بنی بنائی ملازمت کو خطرے میں ڈال دوں ـــــ (الا ماشاءاللہ) میری نظر سے جو کچھ گزرا اور گزر رہا ہے، میں ان سب حرامیوں یا دوسرے معنی میں حرام خوروں کو اس کے لیے ذمہ دار قرار دیتا ہوں جو مسندوں پر بیٹھے ہوئے صرف مسلمانوں کا خون پی رہے ہیں ـــــ اور جو آخر مسلمانوں کو انگریز اور ہندو کے ہاتھ بیچ ڈالیں گے۔

میرے دوست جس شخص کے یہ خیالات ہوں اور وہ ابھی پاگل محض (یعنی اپنی نظر میں) نہ ہو، وہ کیسے ایک دوست کو ان خیالات کی اشاعت کے لیے آلۂ کار بنا سکتا ہے؟ ـــــ اور بنانا چاہے بھی تو کون سا بے وقوف اس کی ہفوات کو شائع کرے گا۔

یہ امور ہیں، جن کے باعث "ماہ نو" کو کچھ نہیں ارسال کیا گیا۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں ـــــ میں آپ کا وہی پرانا نیاز مند ہوں۔

حفیظ

(۷)

پروفیسر آل احمد سرور[۲۰] بنام: سید وقار عظیم

۷۔ بیررروڈ، لکھنؤ ۱۹۔ جنوری (۱۹۵۴ء)

برادم وقار صاحب، آپ عرصے سے خاموش ہیں۔ میں تو خط لکھنے میں خاصا کاہل واقع ہوا ہوں؟ لیکن آپ کیوں خاموش ہیں۔

گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا!

عرصہ ہوا آپ نے لکھا تھا کہ "نئے اور پرانے چراغ" کچھ پبلشر اپنے طور پر چھاپنا چاہتے ہیں اور اگر تم مجھ کو حق نمائندگی دے دو تو میں ان میں سے کسی ایک سے معاملہ کرا لوں گا۔ پھر اس سلسلے میں کیا ہوا؟۔ آپ کی خاموشی سے میں یہ سمجھ رہا تھا کہ بات شاید آگے نہ بڑھی۔ اب ایک صاحب نے لاہور سے لکھا ہے کہ شاید کراچی یا لاہور کے کوئی پبلشر جو گپت روڈ کے ہیں، اس کتاب کو چھاپ رہے ہیں یا چھاپ چکے ہیں؟ میں آپ کو اپنا نمائندہ بنا چکا ہوں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو ان حضرت سے باز پرس کیجئے اور اگر معاملے کی صورت ہو تو ان سے رائلٹی طے کیجئے۔ آخر ہم ادیبوں کے حق مار کر انہیں کیا ملے گا۔

عبادت[۲۱] کا خط تو کبھی کبھار مل جاتا ہے لیکن آپ خاموش ہیں۔ ملا صاحب[۲۲] آج کل وہیں ہیں۔ ان سے تو ملاقات ہوتی ہوگی۔ کیا خواجہ منظور صاحب[۲۳] کراچی چلے گئے۔ اگر لاہور میں ہوں تو میرا سلام ضرور پہنچا دیجئے گا۔ امید ہے کہ بیگم اور بچے اچھے ہوں گے۔ مظفر سے کبھی کبھار ملاقات ہوتی رہتی ہے۔

مخلص: آل احمد سرور

(۸)

فضل احمد کریم فضلی[۲۴] بنام: سید وقار عظیم

کراچی ۹۔ اگست ۱۹۵۸ء

مکرمی وقار صاحب، سلام مسنون ____ لاہور سے جانے (؟) کے بعد مجھے جلد ہی ڈھاکہ جانا پڑا۔ وہاں پندرہ روز قیام رہا۔ عزیزی اقبال[۲۵] صاحب سے ملاقاتیں رہیں۔ وہ بے چارے اپنی اہلیہ کی علالت کی وجہ سے پریشان تھے۔ واپسی میں ہندوستان ہوتا ہوا آیا۔ لکھنؤ میں چار پانچ دن ٹھہرا۔ جگر[۲۶] صاحب گونڈہ سے تشریف لے آئے تھے۔ اور ہم لوگ ساتھ ہی رہے۔ میرے دوران قیام میں بھی ان کی بداحتیاطیوں کی وجہ سے ایک دورہ پڑا تھا، بارے دو تین گھنٹے کی تکلیف کے بعد حالت قابل اطمینان ہوگئی۔ کل ہی ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط ملا اور کل ہی شام کو ریڈیو سے یہ خبر وحشت اثر سنی کہ منگل سے پھر وہ شدید دورے میں مبتلا ہیں۔ میں نے خیریت دریافت کرنے کا تار دیا ہے۔ جواب کا انتظار ہے۔ خدا اپنا رحم کرے اور خوش خبری سنائے۔

کہیے حضرت "خون جگر ہونے تک" آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ کیا رائے ہے؟ بے کم و کاست لکھیے گا،

(۱۰)

شاہد احمد دہلوی[۲۹]، بنام: سید وقار عظیم

برادرم، سلام مسنون

کراچی، ۲۶۔ دسمبر ۱۹۶۶ء

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی[۳۰] صاحب سندھ یونیورسٹی میں انگلش کے ریڈر ہیں۔ اب انکا پروفیسری کا موقع آگیا ہے۔ لہٰذا دو EXPERTS سے ان کے متعلق رائے طلب کی گئی ہے۔ ایک صاحب نے لکھ کر بھیج دیا ہے کہ پروفیسری کے لیے بالکل موزوں ہیں۔ دوسرے صاحب حمید احمد خان صاحب آپ کے وائس چانسلر صاحب ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی QUALIFICATIONS سے خان صاحب پہلے سے واقف ہیں۔ اب ان کا پورا CASE بھی ان کے پیش نظر ہوگا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان سے FAVOURABLE REPORT لکھوا کر بھجوا دیجئے۔ رپورٹ میں یہ لکھنا ضروری ہے کہ "پروفیسر" کی جگہ کے لیے ڈاکٹر احسن فاروقی موزوں آدمی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے یہ خط آپ کو اس لیے لکھوایا ہے کہ انھیں اپنے بارے میں خود آپ کو لکھتے حجاب آتا ہے۔ یہ کام جلدی کرنے کا ہے کیوں کہ اگلے مہینے اس جگہ کا فیصلہ ہو جائے گا۔ امید ہے آپ اس سلسلے میں مدد فرمائیں گے کیوں کہ ڈاکٹر صاحب پروفیسری کے مستحق بھی ہیں۔

خاکسار: شاہد احمد دہلوی

(۱۱)

پروفیسر حمید احمد[۳۱] خان، بنام: سید وقار عظیم:

نمبر ۶۳۔ وی سی، ۳۱۔ جنوری ۱۹۶۷ء

وائس چانسلر، سینٹ ہال، لاہور

ٹیلی فون: ۱۴۴۹۱

برادرم، السلام علیکم۔ آپ جانتے ہیں کہ فروری ۱۹۶۹ء میں ہمارے عظیم شاعر مرزا غالب کی وفات کو پورے ایک سو برس گزر جائیں گے۔ پاکستان و ہند میں مختلف اداروں کی طرف سے غالب کی صد سالہ برسی موزوں طور پر منانے کا اہتمام کچھ عرصے سے شروع ہو چکا ہے۔ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کے اہل ذوق حضرات بھی قوم کے اس نامور فرزند کی یاد تازہ کر کے اپنے اعزاز میں اضافہ کریں۔ چند تجویزیں اس وقت پیش نظر ہیں، لیکن ان میں سے کسی کو عملی صورت دینے سے پہلے آپ سے اور دوسرے اہل الرائے احباب سے مشورہ ضروری ہے۔

اس مقصد کے پیش نظر میں ان سب صاحبوں کو دوشنبہ ۶۔ فروری کی سہ پہر کو پنجاب یونیورسٹی کے سنڈیکیٹ روم میں بغرض اظہار خیال جمع ہونے کی زحمت دے رہا ہوں۔ اگر آپ بھی اس دن ساڑھے چار بجے گھنٹے آدھ گھنٹے کے لیے قدم رنجہ فرما سکیں تو میں شکر گزار ہوں گا۔

والسلام مخلص

حمید احمد خاں

مکرر آنکہ: اگر اس دن آپ سہ پہر کی چائے بھی ہمیں پئیں تو
مزید ممنونیت کا باعث ہوگا۔ (ح، ۳۱۔ جنوری)

(۱۲)

پروفیسر محمد طاہر فاروقی [۳۲] بنام: سید وقار عظیم:

پتہ یہ رہے گا:

D.T.C. FUKULTESI

ANKARA (TURKI)

یکم شوال، ۱۱ دسمبر (۱۹۶۹ء)

برادرم مکرم، السلام علیکم

آپ جتنے بھی ناراض ہوں اور بھائی جتنی بھی خفا ہوں بجا ہے۔ عادت کے خلاف اب کے خط نہ لکھ سکا اور تاخیر بھی ڈیڑھ ماہ سے زیادہ کی ہو گئی۔ سخت شرمندہ ہوں۔ بارہا ارادہ کیا مگر نہ ہو سکا۔۔۔۔۔۔ میں یہاں آ کر دو تین ہفتے انفس میں ہوتا رہا جس سے سخت تردد ہوا مگر رمضان شریف کی برکت سے ٹھیک ہو گیا۔ کمزوری تو پوری طرح دور نہ ہوئی مگر عوارض کافور ہو گئے۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے۔۔۔۔۔ آپ کے یہاں سنا ہے آخر دسمبر تک چھٹی ہو گئی۔ اچھا ہوا، مگر آپ (ادارہ) تالیف و ترجمہ میں کب چھٹی کرتے ہیں!۔۔۔۔ آج ہی سے قونیہ میں حضرت مولانا روم کا عرس شروع ہے۔ ایک ہفتہ ہوتا ہے۔ پرسوں جانے کا ارادہ ہے۔ پارسال تو جلسے کا آخری حصہ دیکھنے سے رہ گیا تھا، یعنی درویشوں کا رقص۔ اب کے (انشاءاللہ) ضرور دیکھا جائے گا۔۔۔۔۔

لاہور کے مختصر سے قیام میں اکثر اصحاب سے ملاقات نہ ہو سکی ظہیر صاحب [۳۳]، صدیقی صاحب [۳۴] اور معین صاحب [۳۵] سے نہ مل سکنے کا بالخصوص افسوس ہے۔ معین صاحب سے ندامت بھی ہے کہ انہوں نے میرا انتظار کیا اور میں سلام نہ کر سکا۔ جملہ احباب سے اور ان تینوں سے بالخصوص سلام کہہ دیجئے۔۔۔۔۔ ایک سال کے لیے (یہاں قیام کا) معاہدہ اور بڑھا دیا ہے یعنی فروری ۱۹۷۱ء کے آخر تک۔۔۔ ان دنوں طبیعت خاصی گڑبڑ تھی، اس لیے سوچنا پڑا، مگر مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ ہاں کروں۔ آگے خدا مالک ہے جو چاہے کرے۔۔۔۔۔

ہاں ایک بات اور رہ گئی۔ ۸۔ نومبر کو یہاں طرحی مشاعرہ ہوا تھا۔ میں نے غزل کہی تھی۔ مشغلہ پھر بھی جاری رہا' تین اور ہو گئیں۔ اب چوتھی زیر تعمیر ہے۔ غزل بازی سے زیادہ معصوم مشغلہ سمجھ میں نہ آیا، بس تک بندی ہے۔ معین صاحب کو سنانے کے لائق نہیں، ورنہ آپ کو بھی ملاحظہ کرا دیتا!۔۔۔۔

میں یہاں آ کر ایک پاکستانی دوست کے اصرار پر ان کے گھر ٹھہرا، مگر وہاں چند روز ہی میں پریشان ہو گیا سکون نہ ملا۔ ہفتہ بھر بعد ان کو نوٹس دے دیا، مگر ۲۶۔ نومبر کو نقل مکان کر سکا۔۔۔۔۔ یہاں سکون ہے فیکلٹی بھی قریب ہے۔ ہوٹل بازی۔۔۔۔ اب بھی ہے، یعنی ترکی کھانے۔ بہر حال خیریت سے ہوں۔ خدا کرے آپ سب بھی خیریت سے ہوں۔ بھائی صاحب [۳۶] کی خدمت میں سلام، معذرت و ندامت۔ برخورداران کو دعائیں انور میاں [۳۷] کو دعاؤں کے ساتھ یونائیٹڈ بنک!

آپ کا، طاہر

(۱۳)

پروفیسر سید احتشام حسین [۳۸]، بنام: سید وقار عظیم

S. Ehtesham Hussain

Prof. and Head

Urdu Dept

University of Allahabad

ALLAHABAD

۶۔ جولائی ۱۹۶۷ء

محب مکرم، تسلیم۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ ہاں ۱۷۔ فروری کو میرے رکشے کے پیچھے سے ایک جیپ ٹکرا گئی اور رکشہ ٹوٹ کر گر گیا۔ میں بھی گرا لیکن جیپ تقریباً رک گئی تھی، اس لیے بچ گیا۔ بائیں پیر کے گھٹنے میں سخت چوٹ آئی۔ علاج غلط ہوا، اب تک کچھ تکلیف باقی ہے، ویسے چل پھر رہا ہوں اور سفر بھی کر لیتا ہوں۔ عبادت صاحب کو بھی غالباً بہت دیر میں اطلاع ہوئی اور انہوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ اب میں ٹھیک ہوں۔

ادھر جعفر [۳۹] علی خان صاحب اثر اور شاہد احمد صاحب (دہلوی) مرحوم کے انتقال سے بہت دکھ ہوا، مگر اختیار میں کیا ہے! اعجاز [۴۰] صاحب ویسے تو ٹھیک ہیں لیکن بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ میں کل ہی ملا تھا۔ آپ کی تنفس کی تکلیفوں کا کیا حال ہے؟

آپ کا احتشام حسین

(۱۴)

حیات اللہ انصاری [۴۱]، بنام: سید وقار عظیم

ہفتہ وار ''سب ساتھ'' نئی دہلی

SAB - SAATH

Urdu Weekly

۱۲۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء

مکرمی وقار عظیم صاحب، السلام علیکم۔ ملے ہوئے زمانہ ہو گیا۔ میں نے ایک (ایک) سیٹ ''لہو کے پھول [۴۲]'' کا تین صاحبوں میں مشترک کسی زمانے میں بھجوایا تھا۔ آپ، عبادت [۴۳] صاحب اور احمد علی [۴۴]۔ پھر پتہ نہ چلا کہ کتاب ملی یا نہیں۔ ایک سیٹ احسن فاروقی [۴۵] صاحب کو بھی بھجوایا تھا۔ طباعت بہت خراب ہوئی۔ کیا ردعمل

رہا اس کتاب کا؟ عبادت صاحب کہاں ہیں؟ احمد علی کس حال میں ہیں؟ جی چاہتا ہے آنے کا۔

امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔

حیات اللہ انصاری

(۱۵)

پروفیسر ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی[۲۶] بنام: سید وقار عظیم

PAKISTAN ACADEMY OF

SCIENCES

secretary

Dr. M. RAZIUDDIN SIDDIQI

۳۶۔ سی، سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی

۱۴۔ فروری ۱۹۷۵ء

برادر محترم، السلام علیکم ـــــ حمید احمد خان مرحوم کی کتاب کی تعارفی تقریب کا دعوت نامہ ۱۲۔ فروری ۱۹۷۵ء کو مجھے وصول ہوا۔ افسوس کہ میں شرکت سے محروم رہا۔ بہر حال یقین ہے کہ آپ کی مساعی کی بدولت یہ تقریب نہایت کامیابی اور حسن وخوبی کے ساتھ انجام پائی ہوگی۔

آپ سے ملاقات کے بعد میں کچھ دنوں علاج کے سلسلے میں ہسپتال میں رہا اور بقیہ دن سائنس پالیسی کے سلسلے میں کراچی، پشاور اور دوسرے مقامات کی گردش میں گزرے۔ لاہور آؤں گا تو آپ کی خدمت میں بھی حاضر ہوں گا۔ آئندہ چند دنوں میں حمید (احمد خان) مرحوم کے متعلق اپنے ذاتی تاثرات قلم بند کر کے روانہ کردوں گا۔ 'نذیر احمد خاں' کے لیے ایک مضمون جناب قاسمی صاحب کو دے چکا ہوں ـــــ امید ہے آپ ہر طرح خیر و عافیت سے ہوں گے۔

مخلص: رضی الدین صدیقی

(۱۶)

بیگم صالحہ عابد حسین[۲۷] بنام: سید وقار عظیم

(میر انیس صدی کی تقریب میں شرکت پر اصرار)

جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

۲۸۔ جنوری ۱۹۷۶ء

برادر محترم، تسلیم

آپ کو دو خط بھیج چکی ہوں جس میں سے ایک دستی تھا۔ ایک تار حال میں گوپی چند نارنگ[۲۸] صاحب نے بھیجا ہے۔ ان میں سے کسی کا جواب ابھی تک نہیں ملا جس سے ہم سب کو تشویش ہے۔ وزیر آغا[۲۹] صاحب نے تو لکھا ہے کہ ان کو پاسپورٹ مل گیا ہے اور انہوں نے ویزا کے لیے درخواست دے دی ہے جس کا کوڈ نمبر وغیرہ بھیج دیا ہے تاکہ یہاں کوشش کر کے جلد ویزا بھجوایا جاسکے مہربانی کر کے آپ بھی فوراً ہو سکے تو بذریعہ تار مطلع کیجیے

کہ کیا آپ کو پاسپورٹ مل گیا ہے یا نہیں؟ اور اگر مل گیا ہو ویزا کی درخواست کا نمبر وغیرہ فوراً بھیج دیجیے تا کہ ویزا کے لیے دوڑ دھوپ شروع ہو جائے۔ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ اور ان کاموں میں خاصی دیر ہوتی ہے۔
یہ خط میرے اور عابد صاحب دونوں کی طرف سے سمجھیے۔ وہ ابھی تک لکھنے پڑھنے کا کام اچھی طرح نہیں کر سکتے اس لیے خط کتابت کی ذمہ داری میری ہوتی ہے۔ امید ہے کہ آپ سب بخیر ہوں گے۔ اپنی بیگم اور بچوں کو دعائیں۔ خدا کے لیے ہمیں جلد سے جلد جواب دے کر اس سخت الجھن سے نجات دلایئے۔

خاکسار، صالحہ عابد حسین

(۱۷)

ن۔م۔راشد بنام سید وقار عظیم

Pakistan Broadcasting Service

PESHAWAR

۲۴۔اکتوبر ۱۹۴۷ء

برادرم وقار عظیم صاحب، السلام علیکم ــــــ آپ کا ۲۴۔ستمبر کا خط (نمبر P.D.No. 129) چند دن ہوئے موصول ہوا۔ بے حد خوشی ہوئی کہ آپ بخیر و عافیت ہندوستان کے جہنم آباد سے نکل کر پاکستان پہنچ گئے ہیں۔

''نورنگ'' کے لیے ضرور لکھوں گا لیکن از راہ کرم اس کا ایک پرچہ نمونے کے طور پر بھجوا دیجیے تا کہ یہ اندازہ لگانا ممکن ہو کہ یہ ''آجکل'' سے کس حد تک بہتر ہے! اگر آپ مجھے فی نظم معاوضے کا اندازہ بھی بتا سکیں تو میرے لیے اپنا کلام بھجوانا آسان ہو جائے گا۔ میرا اندازہ پچاس روپے فی نظم ہے۔ شاید آپ اس قدر نہ دلا سکیں۔ اس صورت میں مجھے یقین ہے کہ آپ مزید تقاضا بھی نہیں فرمائیں گے۔

اپنے کلرک کو ہدایت فرما دیجیے کہ لفافے پر پتے کیوں کر درست لکھے جاتے ہیں۔ میں آپ کے گرامی نامے کا لفافہ آپ کے ملاحظے کے لیے اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔

(لفافے کی عکسی نقل:)

مخلص

راشد

(۱۸)

سید وقار عظیم، بنام: ن۔م۔راشد

By Air

کراچی، ۳۰۔اکتوبر (۱۹۴۷ء)

برادرم راشد صاحب، وعلیکم السلام ___ میرے ۲۴۔ستمبر (۴۷ء) کے عریضے کے جواب میں آپ کا ۲۴۔اکتوبر (۴۷ء) کا لکھا ہوا گرامی نامہ مجھے ابھی ملا۔ ''نورنگ'' ابھی چھپا نہیں۔ اس کی اشاعت شروع ہوتے ہی نمونے کے پرچے آپ کی خدمت میں پہنچنے لگیں گے ___ لیکن مجھے اس کا بے حد قلق ہے کہ ''نورنگ'' اپنی بے بضاعتی کی وجہ سے آپ کی گراں بہا نظموں کی اشاعت کے امتیاز سے ہمیشہ محروم رہے گا اور مجھے بھی تقاضوں کے بہانے باریابی کا جو شرف گاہے گاہے حاصل ہوتا رہتا تھا، اس سے محروم ہو جاؤں گا۔ بلکہ مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ ۲۸۔اکتوبر کو ایک تقاضے کا خط آپ کی خدمت میں بھیج چکا ہوں۔ امید ہے کہ معاف فرمائیں گے۔

کلرک کو اس کی بدتمیزی اور بدسلیقگی پر تہدید کر دی گئی ہے۔ لیکن میں بھی معافی کا خواستگار ہوں کہ میں نے یہ کوتاہی کی اور لفافے کا پتہ پہلے نہیں دیکھ لیا۔ امید ہے کہ مزاج عالی بخیر ہوگا۔

بندۂ اخلاص

وقار عظیم

N.M. Rashid Esq.

Pakistan Broad Casting Service

PESHAWAR

(۱۹)

تاثرات: پروفیسر سید وقار عظیم بہ مرزا محمد منور[۵۲]

شعبہ اردو،

پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

۶۔ستمبر (۱۹۵۲)

مرزا محمد منور ایم۔اے دو سال تک اورینٹل کالج، لاہور میں طالب علم رہے اور دونوں سال انہوں نے پابندی سے میرے لیکچروں میں شرکت کی۔ لیکچروں کے دوران میں انہوں نے ہمیشہ ان خوبیوں کا مظاہرہ کیا جو ایک اچھے طالب علم کے شایان شان ہیں۔

جماعت سے باہر بھی مجھے ان سے ملنے کے اکثر مواقع ملے اور ان کی ذہانت اور لیاقت کا زیادہ بہتر اور زیادہ صحیح اندازہ ہوا۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے منور صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ رائیں قائم کرنے میں جلد بازی سے کام نہیں لیتے اور اسی لیے ادب، ادیب، شعر اور شاعر کے متعلق ان کی رائیں ہمیشہ متوازن اور سنجیدہ ہوتی ہیں۔

بالکل میرے قریب تھی۔ آج یہ خالی اور بھائیں بھائیں کرتی ہوئی کرسی مجھے جس قدر تکلیف پہنچا رہی ہے، تم میرے ذہنی اذیت و کرب کا اندازہ نہیں کر سکتے، لیکن ایک عجیب بات ہے، میں جب گردن اٹھا کر اس کرسی کی طرف نظر ڈالتا ہوں تو گو، تم وہاں نظر نہیں آتے مگر تمہاری شرافت، انسانیت اور وضع داری کا پرتو اب بھی اس کرسی پر جلوہ فگن نظر آتا ہے اور میں بوڑھا اس سے یہ نصیحت حاصل کر رہا ہوں کہ ہر آدمی کو اپنی کرسی اسی طرح چھوڑنی چاہیے:

ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو!

بہر حال، اب تم نئے احباب اور نئے ماحول میں ہو۔ نئی دل چسپیاں، پرانے اور فرسودہ ماضی کو بہت جلد بھلا دیتی ہیں اور ماضی بھی ایسا کہ جس میں تقریباً ایک (دو) سال تک سوائے بوڑھوں کے اور ایک آدھ ادھیڑ کے، ایک آدمی بھی اپنا ہم عمر دفتر کی ہم نشینی کے لیے نہ ملا۔ تمہارے اس ماحول میں ویسے ہی دل چسپی کیا تھی جسے یاد رکھا جا سکے، سوائے اس کے کہ نقوی[۵۹] کی چائے (اور چٹکلے) تھوڑی دیر کے لیے اس ماحول کو بدل دیتے تھے۔[۶۰]

بہر حال اگر حافظے میں کبھی ہم لوگوں کی یاد ابھر آئے تو اپنی خیریت سے مطلع کر دیا کرو۔ اپنے والد کی خدمت میں میرا اسلام کہنا۔

نیاز کیش،

اعجاز الحق قدوسی

(۲۲)

رقعہ: علامہ عبدالعزیز المیمن[۵۸] برائے: سید معین الرحمٰن

UNIVERSITY OF THE PUNJAB

ARABIC DEPARTMENT

Oriental Collage,

LAHORE

۲۸۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء   Dated ________ 19

(1) Miss Amat-ul-Hafeez   5th year

(2) Miss amat-ul-Lateef   5th year

ان دونوں بچیوں کو۔۔۔ جو اپنے کارڈ بھول آئی ہیں، ووٹ کی اجازت دی جائے۔

میمن عبدالعزیز

۲۸۔ اکتوبر ۶۵ء

میمن عبدالعزیز عربی

منور صاحب شعر کہتے ہیں اور شعر کا اچھا مذاق رکھتے ہیں اور اس چیز میں فارسی کے مطالعے نے ان کی بڑی رہبری کی ہے۔ وہ نہ صرف مناسب موقعوں پر غالب، حافظ، عرفی اور نظیری کے شعر پڑھنے پر قادر ہیں، بلکہ ان شاعروں کے مطالعے نے ان میں سخن فہمی کا ملکہ بھی پیدا کر دیا ہے۔ منور صاحب نے فارسی کے علاوہ عربی صرف نحو کا مطالعہ بھی مکتبوں میں بیٹھ کر کیا ہے۔ اور اس چیز کی بدولت انہیں لفظوں کے صحیح اور غلط ہونے کا اندازہ ہے، اور یہ ایک چیز ہے جس سے ہمارے اکثر طالب علم محروم ہیں۔ اردو کے استادوں میں بھی آج کل یہ بڑی شدید کمی ہے اور اسی لیے زبان کے معاملے میں وہ اپنے شاگردوں کی صحیح رہنمائی نہیں کر سکتے۔ فارسی اور عربی کی یہ واقفیت، منور صاحب کو اردو کا کامیاب استاد بننے میں مدد دے گی۔

منور صاحب کو حصول علم اور درس و تدریس کا جو فطری ذوق ہے، اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی کی کتنی منزلیں طے کر چکنے کے بعد، پھر علم کی دنیا کو اپنایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو تجربہ انہوں نے زندگی کے دوسرے شعبوں میں رہ کر حاصل کیا ہے، وہ ان کی معلمی کی زندگی میں بہت مفید نتیجے پیدا کرے گا۔

وقار عظیم

(۳۰)

مولانا عبدالمجید سالک [۵۳] بنام: سید معین الرحمٰن [۵۴]

مسلم ٹاؤن، لاہور ۱۹۔ جون ۱۹۵۹ء

جناب من، السلام علیکم

مہینہ بھر ہوا، آپ کا ایک گرامی نامہ موصول ہوا تھا۔ جواب میں تاخیر اس لیے ہوئی کہ میں بدستور بیمار چلا جاتا ہوں اور بہت ہی کم ایسے لمحات آتے ہیں جب ایک دو چٹھیاں لکھنے کی ہمت پڑتی ہے۔

آپ نے میرے متعلق اور میرے وظیفے کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان کے لیے ممنون ہوں۔ اس چھ ماہ کی بیماری نے مجھے سخت تنگ دل و بیزار کر دیا ہے۔ خدا کرے حالات کے اس چکر سے جلد از جلد نجات ملے تو اپنے معمولات کو حسب سابق شروع کروں۔ دعائے صحت کا طالب ہوں۔

عبدالمجید سالک

(۳۱)

مولانا اعجاز الحق قدوسی [۵۵] بنام: سید معین الرحمٰن

ترقی اردو بورڈ، ۲۷۳، اردو منزل،
جمشید روڈ، کراچی۔ ۵ ۵۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء

عزیزی معین الرحمٰن مطالعہ کریں (عکاس اسٹوڈیوز، کالج روڈ، بہاول نگر)

آج پہلا دن تھا کہ میں نے تمہاری کمی شدت سے محسوس کی۔ اتفاق کی بات ہے کہ تمہاری نشست

Head of the Arabic Department

University Oriental Collage,

Lahore.

(۲۳)

ڈاکٹر شوکت سبزواری [۹] بنام: سید معین الرحمٰن:

عزیزِ من معین الرحمٰن صاحب ___ میں پرسوں ڈھاکے سے واپس آیا ہوں۔ انعام کی وصولی پر مبارکباد کا شکریہ (اردو لسانیات پر داؤد ادبی انعام برائے سال ۱۹۶۶ء) ___ تبصرے کے باب میں کئی مرتبہ ریڈیو فون کر چکا ہوں لیکن آپ ہمارے دفتروں کے لیل و نہار سے واقف ہی ہیں۔ ہر شخص کو اپنی فکر ہے۔ فرائض و واجبات کی انجام دہی کون کرے۔ ''نوافل و سنن'' کس حساب میں ہیں۔ آج پھر یاد دہانی کراؤں گا۔ امید ذرا کم ہے۔

میں نے ''نگار'' سے پہلے مولانا تاجور [۱۰] کے پرچے ''ادبی دنیا'' میں لکھنا شروع کیا تھا لیکن وہ زیادہ تر افسانے (ماخوذ) اور بعض دوسری قسم کے ترجمے تھے۔ ''نگار'' میں میرا سب سے پہلا مضمون ''قتال فی سبیل اللہ'' غالباً ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔ ''نگار'' کے علاوہ ''معارف ___ ''اردو'' ___ ''جامعہ'' ''ہمایوں'' ___ ''اردو ادب'' ___ نوائے ادب'' وغیرہ پرچوں میں لکھتا رہا ہوں۔

تقسیم کے بعد ''ساقی'' ___ ''ادب لطیف'' ___ ''خاور'' (ڈھاکا) ___ ''صحیفہ'' ___ ''اقبال ریویو'' اور صہبا لکھنوی [۱۱] کے پرچے (''افکار'') میں بھی لکھا ہے۔ ایک سال تک ''صداقت'' نامے ہفتہ وار کی ادارت کی ہے جس میں نظم و نثر دونوں قسم کی چیزیں ہوتی تھیں۔ آپ کو اس کا فائل گیا ملے گا ___۔

ادبی، تنقیدی اور لسانی مقالات کے علاوہ فلسفیانہ، تاریخی اور خالص علمی و مذہبی چیزیں بھی میرے قلم سے نکلی ہیں جو مذکورہ مجلسوں اور ماہ ناموں میں (بکھری) ہوئی ہیں ___ ''اردو'' ___ اور ''معارف'' کے انڈیکس (اشاریے) نکل چکے ہیں۔ ان سے آپ کو مدد ملے گی۔ اور ہاں، یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ ''آج کل'' ___ اور ___ ''ماہِ نو'' میں بھی کچھ ہلکی پھلکی چیزیں چھپتی تھیں۔ کیا آپ نکال سکیں گے؟

ٹی وی کے پروگرام کو میں نے پسند نہیں کیا۔ آئندہ بھی بہتری کی امید نہیں۔ خدا ہم پر رحم کرے۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ بخیریت ہیں۔ بھائی کچھ کر جاؤ تا کہ ہمیشہ زندہ رہو۔

شوکت

(۴۴)

پیر سید حسام الدین راشدی، بنام سید معین الرحمن

۳۶ ڈی/۳ عامل کالونی۔۲، کراچی۔۵ ۱۵۔اپریل (۱۹۶۹ء)

بھائی! خط پہنچا۔ کتابیں بھی وصول ہوئیں۔ آپ لوگ نوجوان اور خدا کے فضل سے باذوق اور صاحب قلم بھی ہیں۔ خوب لکھیے اردو کا دامن اچھی کتابوں سے بھر جائے۔ انشاء اللہ پہلی فرصت میں دونوں کتابیں پڑھ کر پھر کچھ لکھ سکوں گا۔ بہر حال، فی الحال مبارکباد قبول فرمائیں۔

اور عزیزی اختر وقار [۲۳] تک بھی پہنچا دیجئے۔ میری کتاب "دود چراغ محفل" ابھی چھپی نہیں۔ اگلے ماہ کی دس تک امید ہے کہ (سلسلہ غالب کی) تمام کتابیں نکل آئیں گی، فوراً ارسال کر دوں گا۔ "اشاریہ (غالب)" جب چھپے تو فوراً ارسال فرمایئے گا۔ امید ہے خیریت ہو گی۔

نیاز آگیں

حسام الدین

(۴۵)

ڈاکٹر ممتاز حسن [۲۴] بنام: سید معین الرحمن:

C - 129

KDA Scheme No 1

KARACHI - 8

Mumtaz Hasan

۱۹۔مارچ ۱۹۷۰ء

مکرمی و محترمی: "اشاریہ غالب" کا نسخہ پہنچا۔ اس عنایت کا شکریہ آپ کا کام بنیادی نوعیت کا ہے اور غالب کے مطالعے کے لیے ناگزیر۔ میرے خیال میں کوئی شخص اس کتاب سے بے نیازی برت کر غالب کے کارنامے کا کماحقہ جائزہ نہیں لے سکتا۔ آپ کی محنت قابل قدر اور قابل داد ہے ____ کتاب کا دوبارہ شکریہ ۔امید ہے کہ مزاج عالی بخیر ہو گا۔

مخلص

ممتاز حسن

زمانی و مکانی اشارات اور حواشی:

۱۔اس تحریر کی مصدقہ نقل مجھے عزیزہ صائمہ سلیم (لاہور) سے ملی، جنھیں سال ۲۰۰۲ء میں مرزا محمد منور پر جی سی یونیورسٹی لاہور سے ایم فل (اردو) کی سند فضیلت عطا ہوئی۔

۲۔ فراق گورکھپوری، ولادت گورکھپور ۲۸۔ اگست ۱۸۹۶ء، وفات: نئی دہلی ۳۔ مارچ ۱۹۸۲ء

۳۔ ممتاز شیریں، ولادت میسور ۱۲۔ ستمبر ۱۹۲۴ء، وفات: اسلام آباد ۱۱۔ مارچ ۱۹۷۳ء

۴۔ خط کے ساتھ ملفوفہ تراشہ محفوظ نہیں رہا۔

۵۔ ممتاز شیریں کے شوہر محمد شاہین، وزارت اطلاعات کے سابق اعلیٰ افسر، وفات: اسلام آباد مارچ ۲۰۰۱ء

۶۔ مرزا محمد عسکری (مترجم تاریخ ادب اردو، از رام بابو سکسینہ)، ولادت لکھنؤ ۱۸۶۹ء،

وفات لکھنؤ ۱۵۔ ستمبر ۱۹۵۱ء

۷۔ مختار صدیقی، ولادت: گوجرانوالہ / سیالکوٹ (؟) کیم مارچ ۱۹۱۷ء، وفات: لاہور ۱۸۔ ستمبر ۱۹۷۲ء

۸۔ شوکت تھانوی، وفات لاہور، ۴، مئی ۱۹۶۳ء

۹۔ احمد ندیم قاسمی، ولادت: انگہ، خوشاب، ۱۹۱۶ء

۱۰۔ یزدانی ملک، سبحانی آئس فیکٹری، راجہ بازار، پنڈی۔

۱۱۔ آرزو لکھنوی، (؟) وفات کراچی ۱۶۔ اپریل ۱۹۵۱ء

۱۲۔ تابش دہلوی، ولادت دہلی ۹۔ نومبر ۱۹۱۱ء

۱۳۔ صہبا اختر (؟) وفات: کراچی ۱۹۔ فروری ۱۹۹۶ء

۱۴۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، وفات: لاہور ۷۔ فروری ۱۹۷۸

۱۵۔ الحاج حافظ مظہر علی اظہر امرتسری، وفات: ۲۔ نومبر ۱۹۷۴ء

۱۶۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ولادت: حیدر آباد دکن ۱۸۔ ستمبر ۱۹۰۲ء، وفات: نئی دہلی ۲۱۔ فروری ۱۹۷۹ء

۱۷۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خان، وفات نئی دہلی ۳۔ مئی ۱۹۶۹ء

۱۸۔ ڈاکٹر غلام یزدانی، وفات: حیدر آباد دکن، ۱۳۔ نومبر ۱۹۶۲ء

۱۹۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری، ولادت: جالندھر ۱۴۔ جنوری ۱۹۰۰ء، وفات: لاہور ۲۱۔ دسمبر ۱۹۸۲ء

۲۰۔ پروفیسر آل احمد سرور، ولادت: بدایوں ۱۲۔ ۱۹۱۱ء۔

۲۱۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، وفات: لاہور ۱۹۔ دسمبر ۱۹۹۸ء

۲۲۔ آنند نرائن ملا، وفات: ۱۳۔ جون ۱۹۹۷ء

۲۳۔ خواجہ منظور حسین (علیگ)، وفات: لاہور ۲۰۔ اگست ۱۹۸۶ء

۲۴۔ سید فضل احمد کریم فضلی، ولادت: اعظم گڑھ ۵۔ نومبر ۱۹۰۶ء، وفات: ۱۷۔ دسمبر ۱۹۸۱ء

۲۵۔ پروفیسر اقبال عظیم، وفات: کراچی ۲۲۔ ستمبر ۲۰۰۰ء۔

۲۶۔ جگر مرادآبادی، وفات: گونڈہ ۹۔ ستمبر ۱۹۶۰ء

۲۷۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب، ولادت: بہرائچ (یوپی) ۲۹۔ جولائی ۱۸۹۳ء، وفات: لکھنؤ ۲۹۔ نومبر ۱۹۷۵ء

۲۸۔ یہاں سے تا آخر تفصیل اور معذرت، ڈاکٹر ناظر حسن زیدی مرحوم کے قلم سے ہے جنھوں نے سید وقار عظیم کی زیر نگرانی مومن پر پی ایچ ڈی کیا۔ وہ اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کلاسیکی متنی ادب کے ممتاز ترین معلموں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اہل خانہ کے ہمراہ امریکہ میں رہ بس گئے تھے۔ مارچ ۲۰۰۴ء میں نیویارک میں انتقال ہوا اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔ اللہ انہیں اپنے دامن رحمت میں اعلیٰ مقامات اور آسانیوں سے ہم کنار فرمائے، آمین۔

۲۹۔ شاہد احمد دہلوی، ولادت: دہلی ۲۲۔ مئی ۱۹۰۶ء، وفات: کراچی ۲۷۔ مئی ۱۹۶۷ء

۳۰۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، وفات: ۲۷۔ فروری ۱۹۷۸ء۔

۳۱۔ پروفیسر حمید احمد خاں، ولادت: لاہور یکم نومبر ۱۹۰۳ء، وفات: لاہور ۲۲۔ مارچ ۱۹۷۴ء

۳۲۔ محمد طاہر فاروقی، ولادت: رامپور ۱۳۔ ستمبر ۱۹۰۵ء

۳۳۔ اردو مرکز، گنپت روڈ لاہور کے مالک و مہتمم مرحوم ظہیر الدین احمد۔

۳۴۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، وفات: لاہور ۱۸۔ جون ۲۰۰۲

۳۵۔ راقم الحروف (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: ''الوقار'' ۵۰۔ لوئر مال، لاہور

۳۶۔ بیگم عابدہ وقار، وفات: لاہور ۲۳۔ جولائی ۱۹۹۵ء

۳۷۔ وقار عظیم مرحوم کے بڑے بیٹے سید انور وقار عظیم، یونائیٹڈ بنک کے بعد بنک آف انٹرنیشنل کریڈٹ اینڈ کامرس سے وابستہ رہنے کے بعد ریٹائرڈ ہوئے۔

۳۸۔ پروفیسر سید احتشام حسین رضوی، ولادت: ضلع اعظم گڑھ ۲۱۔ اپریل ۱۹۱۲ء، وفات: الہ آباد یکم دسمبر ۱۹۷۲ء

۳۹۔ جعفر علی خاں اثر، وفات: لکھنؤ ۶۔ جون ۱۹۶۷ء

۴۰۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین، وفات: مظفر پور (بہار) ۲۳۔ فروری ۱۹۷۵ء

۴۱۔ حیات اللہ انصاری، ولادت: لکھنؤ یکم مئی ۱۹۱۱ء وفات: لکھنؤ ۱۸۔ فروری ۱۹۹۹ء

۴۲۔ پانچ جلدوں پر مشتمل ناول ''لہو کے پھول'' کو عہد جدید کا طویل ترین ناول خیال کیا جاتا ہے۔

۴۳۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، سابق پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل لاہور، وفات: لاہور ۱۹۔ دسمبر ۱۹۹۸ء

۴۴۔ احمد علی، وفات: ۱۴۔ جنوری ۱۹۹۴ء، کراچی

۴۵۔ ڈاکٹر احسن فاروقی، وفات: کراچی ۲۸۔ فروری ۱۹۷۸ء

۴۶۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ولادت: حیدر آباد دکن ۱۹۰۵ء، وفات:

۴۷۔ بیگم صالحہ عابد حسین، ولادت: پانی پت ۱۸۔ اگست ۱۹۱۳ء، وفات: نئی دہلی ۸۔ جنوری ۱۹۸۸ء

۴۸۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ولادت: دکی (بلوچستان)، مقیم دہلی ۱۱۔ فروری ۱۹۳۱ء

۴۹۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ولادت: وزیر کوٹ، ضلع سرگودھا، ۱۸۔ مئی ۱۹۲۲ء

۵۰۔ ڈاکٹر سید عابد حسین، وفات: نئی دہلی ۱۳۔ دسمبر ۱۹۷۸ء

۵۱۔ ن۔ م۔ راشد، ولادت: اکال گڑھ، گوجرانوالہ یکم اگست ۱۹۱۰ء، وفات: لندن ۹۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء

۵۲۔ مرزا محمد منور، ولادت: بھیرہ (سرگودھا) ۲۲، مارچ ۱۹۲۲ء، وفات: لاہور ۷۔ فروری ۲۰۰۰ء

۵۳۔ مولانا عبدالمجید سالک، ولادت: بٹالہ ۱۳۔ دسمبر ۱۸۹۳ء، وفات: لاہور ۲۷۔ ستمبر ۱۹۵۹ء

۵۴۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن (ولادت: ۱۹۴۲ء) موجودہ پتہ: الوقار، ۵۰۔ اوور مال لاہور۔

۵۵۔ مولانا اعجاز الحق قدوسی، ولادت: جالندھر ۱۹۰۵، وفات: کراچی ۲۹۔ فروری ۱۹۸۶ء

۵۶۔ خلیق نقوی، نائب مدیر، اردو لغت، ترقی اردو بورڈ، کراچی

۵۷۔ مولانا اعجاز الحق قدوسی کی رائے سے مختلف، بورڈ میں کام کی نوعیت اور منتخب روزگار شخصیات کا ساتھ میرے لیے حد درجہ اعزاز اور آسودگی کا باعث تھا۔ میں ''بورڈ'' سے وابستگی ترک کر کے کالج میں معلمی کو ہرگز ترجیح نہ دیتا اگر پی ایچ ڈی کے لیے کراچی یونیورسٹی سے میرے انرولمینٹ کو ڈاکٹر لیث گوارہ کر لیتے۔ انہیں ہموار اور آمادہ کرنے کے لیے اس زمانے (۱۹۶۴ء میں) محترم حقی صاحب نے بڑی مخلصانہ کوشش بھی کی جو اگرچہ بے نتیجہ رہی لیکن ان کا احسان میرے لیے زندگی کا ایک بیش قیمت علمی اور تہذیبی تجربہ تھا۔ یہاں مجھے عاقلانِ کبیر کی صحبت صالح نصیب ہوئی۔ ان کیمیا گر شخصیات کے کچھ نہ کچھ اثرات، مجھ محدود لیاقت رکھنے اور قصباتی طرزِ معاشرت میں پہنچنے والے پر پڑے ہوں تو عجب نہیں۔

۵۸۔ علامہ عبدالعزیز میمن، ولادت: کاٹھیاواڑ ۲۳۔ اکتوبر ۱۸۸۸، وفات: کراچی ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۷۸ء

۵۹۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری، ولادت: میرٹھ اکتوبر ۱۹۰۸ء، وفات: کراچی ۱۹۔ مارچ ۱۹۷۳ء

۶۰۔ مولانا تاجور نجیب آبادی وفات: لاہور ۳۰۔ جنوری 1951ء

۶۱۔ صہبا لکھنوی، وفات: کراچی ۳۰۔ مارچ ۲۰۰۲ء

۶۲۔ پیر سید حسام الدین راشدی، ولادت: بھمن گوٹھ (لاڑکانہ) ۲۰۔ ستمبر ۱۹۱۱ء، وفات: ۳۔ اپریل ۱۹۸۶ء

۶۳۔ پروفیسر سید وقار عظیم کے بیٹے اختر وقار عظیم، موجودہ مصروفیت: ایم ڈی، پی ٹی وی مرکز، اسلام آباد

۶۴۔ ڈاکٹر ممتاز حسن، ولادت: ضلع گوجرانوالہ ۶۔ اگست ۱۹۰۷ء، وفات: کراچی ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۷۴ء

شفیق سلیمی

جدید غزل کے حوالے سے شفیق سلیمی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں اُن کا شمار ہمارے عہد کے اُن شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے دیارِ غیر میں نہ صرف شاعری کے پھول کھلائے بلکہ اُن کی مکمل آبیاری بھی کی۔ غزل میں اُن کا مزاج تیکھے اور ترش مصرعے کہنے کا ہے جس کے سبب اُن کے اشعار میں معاشرتی بے انصافیوں پر طنز کا عنصر لاشعوری طور پر در آیا ہے۔ ہجرت اور وطن سے دوری کی کسک نے بھی اُن کے بیشتر اشعار کو زندہ، جاوید کر دیا ہے اُن کی غزل قاری کو مثبت رویوں کی طرف راغب کرتی ہے، خیال کو شعر اور شعر کو اچھا شعر بنانا ہی اصل ہنر ہے اور یہ ہنر شفیق سلیمی کو خوب آتا ہے۔
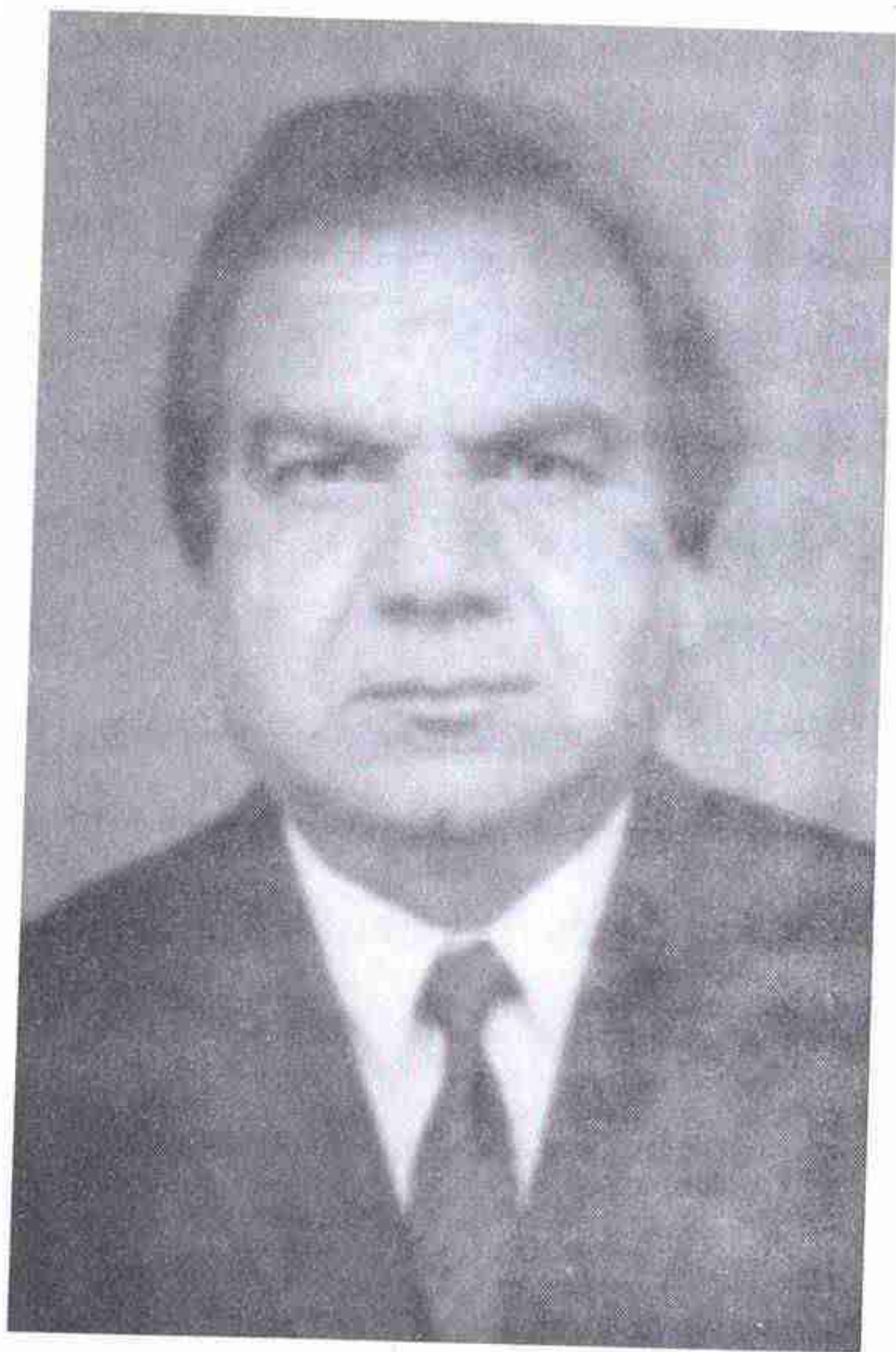
شفیق سلیمی

پسِ آئینہ اظہار ہوتا   خبر کا تختۂ گفتار ہوتا
جسے بھی ساتھ مل جائے انا کا   اُسے آساں ہوا دشوار ہوتا
کسی کی منزلوں تک ساتھ جانا   خود اپنی راہ کی دیوار ہوتا
جدائی میں رہے اک بے کلی سی   بہم ہو کر جنوں آثار ہوتا
اُسے بخشا ہنر چارہ گری کا   ہمیں سکھلا دیا بیمار ہوتا
حقیقت میں تسلسل خواب کا ہے   ہمارا نیند سے بیدار ہوتا

٭

ہم پہ کھلتا نہیں آزردۂ دل کب سے ہیں   دل جو سینوں میں دھڑکتے تھے وہ بسمل کب سے نہیں
رنجِ دنیا و غمِ ذات نے مارا ہم کو   راحتِ عشق میں یہ دردِ مخل کب سے ہیں
ایک مدت سے اسی سوچ میں گم رہتا ہوں   مرے خوابوں میں ترے خواب مخل کب سے ہیں
کربِ دوری کے ہمیں اور ہیں سہنا کب تک   مضطر منظرِ جاں آنکھ کے تل کب سے ہیں
جانے یہ کارِ نمو کب سے معطل ہے شفیق   یوں مقابل میں کھڑے دانہ و گل کب سے ہیں

٭

پنجرا توڑ اڑان کو نکلے بے پر کے پنچھی   مار اڈاری چھت پر جا بیٹھے گھر کے پنچھی
شاخِ تن سے کتر کتر کر پھینک رہے ہیں پھل   پتھر مار اڑائے کوئی یہ ڈر کے پنچھی
ڈھلتی پھرتی چھاؤں رہے کب ایک ٹھکانے پر   ایک ہی ڈال کے یار ہوئے ہیں کب زر کے پنچھی
خشک رُتوں میں بادل برسے پیڑ نہال ہوئے   اک مدت کے بعد نہائے جی بھر کے پنچھی

٭

کبھی منزل کبھی رستا کوئی کیسے بدلتا ہے
ہمیں معلوم ہی کب تھا کوئی کیسے بدلتا ہے

ہمارے درد کی اوقات ہی کیا ہے زمانے میں
کسی کے ہاتھ کا لکھا کوئی کیسے بدلتا ہے

کہانی کے کبھی کردار ہوں جب موم کے پتلے
کوئی کیسے بدل دے گا کوئی کیسے بدلتا ہے

خس و خاشاک کی صورت جو لے جائیں انائیں بھی
بھلا رُخ اُن ہواؤں کا کوئی کیسے بدلتا ہے

یقیں سے بے یقینی کے سفر تک ساتھ تھا میرے
بدل کر اُس نے دکھلایا کوئی کیسے بدلتا ہے

٭

میں تھک چکا ہوں صدائیں نگر نگر دے کر
کہاں گیا وہ مرے پاؤں میں سفر دے کر

وہ جس کے واسطے میں نے قفس قبول کیا
اڑا دیا ہے اُسے کس نے اپنے پر دے کر

اُسی کے بس میں شب و روز زندگی میری
کہ بے گھری مجھے بخشی ہے جس نے گھر دے کر

تغیرات پہ قادر ہے اک وہی جس نے
دیا ہے ایک ہی منظر مجھے نظر دے کر

شجر کو کیسے سپرد ہوائے تیز کیا
شفیق مٹی نے برگ و گل و ثمر دے کر

٭

کسی جواب میں جھلکا نہیں سوال کا رنگ
وہی طلوع کا منظر وہی زوال کا رنگ

مرے بھی چہرے پہ ہوتا ہے نقش لمحوں کو
ترے بھی رُخ پہ بکھرتا ہے ماہ و سال کا رنگ

مرے وجود کا حصہ، ہیں ایک صورت سے
ترے وصال کی خوشبو ترے جمال کا رنگ

لکھا ہوا تھا مقدر میں صید ہونا تھا
وگرنہ ایک سا کب تھا زمین، جال کا رنگ

عجیب کرب کے عالم میں دن گزرتے ہیں
سراب و خواب ہوا کس طرح خیال کا رنگ

٭

کیا سامنے کی بات بھی کہنے کی بات ہے
میں اک دیا ہوں اور ہواؤں کا سات ہے

سورج پرست شہر کے اے بے چراغ فرد
آنکھیں تو کھول دیکھ کھڑی سر پہ رات ہے

اس بے کنار دشت میں دریا نہیں کوئی
اک صید تشنگی ہے سرابوں کی گھات ہے

پسپائی بہار مکمل کہاں ہوئی
لپٹا ہوا شجر سے ابھی ایک پات ہے

یہ بے وجود چہرہ تو میرا ہے، پر شفیق
کاسہ صفت یہ پھیلا ہوا کس کا ہات ہے

جانے کس ڈگر میں ہیں بے جہت سفر میں ہیں
شہر کم نظر ہم بھی کب تری نظر میں ہیں

نقش بھی نہیں رکھتے مشت خاک ہیں پھر بھی
چاک پر دھرے ہیں ہم چشم کوزہ گر میں ہیں

اے عذاب رسوائی اے عتاب تنہائی
کب ترے اثر میں تھے کب ترے اثر میں ہیں

خواب بھی نہیں باقی اب گرفت خواہش میں
ذائقے اڑانوں کے پھر بھی بال و پر میں ہیں

نام تو شفیق اپنا ہے کتاب فردا میں
کل بھی ہم خبر میں تھے آج بھی خبر میں ہیں

یہ مہر بلب چہرے پہ اشک زدہ آنکھیں
کس طور سے ہم چیخیں کس اور سے ہم جھانکیں

جس گُل کی تمنائی ہونے لگی رسوائی
کس شاخ سے ہم توڑیں کس زلف میں ہم ٹانکیں

بے وقت کی فرصت ہے اک چادر غربت ہے
کس ذکر میں دن کاٹیں کس فکر کا تن ڈھانکیں

بے ظرف ہیں، چھلکے ہیں، تنکوں سے بھی ہلکے ہیں
کس بات پہ اترائیں، کس زعم میں بڑ ہانکیں

سو روپ کے ذرہ ہوں گے وہ خاک بسر ہوں گے
جو خاک سدا چھانیں جو خاک سدا پھانکیں

نیا منظر بنا کر دیکھتے ہیں
کبھی آنکھیں بجھا کر دیکھتے ہیں

سرِ شاخِ ہوا اک بار پھر سے
چراغِ گل سجا کر دیکھتے ہیں

انا کا بوجھ بھی سر سے گرائیں
یہ تہمت بھی اٹھا کر دیکھتے ہیں

گزرتی ہیں کہاں سورج کی راتیں
سرِ کہسار جا کر دیکھتے ہیں

تجھے آنکھوں میں اپنی جذب کر لیں
اسی دھن میں برابر دیکھتے ہیں

چلو دریا میں ڈالیں نیکیوں کو
یہ نیکی بھی کما کر دیکھتے ہیں

*

اڑی وہ ریت کے تعمیر کے نشاں بھی گئے
گھروں کے نام پہ بنتے ہوئے مکاں بھی گئے

کہیں بھی میری صدا کو سماعتیں نہ ملیں
ہزار حرفِ دعا سوئے آسماں بھی گئے

یہ اور بات ہوا سے معاملہ نہ ہوا
چلے تھے جس کے بھروسے وہ بادباں بھی گئے

یہ کس مقام پہ لے آئی اب کے مایوسی
یقیں تو جا ہی چکے تھے مگر گماں بھی گئے

وہ کیا ہوئے جو دعاؤں میں یاد رکھتے تھے
ہمارے سر سے تو لفظوں کے سائباں بھی گئے

*

صاحبِ زر تو کئی صاحبِ عزت ہیں ابھی
اور اک سنگِ ملامت کہ سلامت ہیں ابھی

یوں تو بے قفل ہیں لب اور صدائیں آزاد
پھر بھی الفاظ کہ محرومِ سماعت ہیں ابھی

یہ ہنر تھی بہت ان کی خطابت لیکن
چند باتیں ہیں کہ مرہونِ وضاحت ہیں ابھی

سچ کے خیمے میں رہیں جھوٹ کی بیعت کر لیں
کتنے ہی لوگ کہ پابندِ روایت ہیں ابھی

پیار کرنے کی فراغت ہے میسر کس کو ۔۔۔ انتظار اور کہ مصروف عداوت ہیں ابھی

٭

تن گداز کبھی پتھروں سے جاتا رہا ۔۔۔ کہ ذوق شیشہ وری آذروں سے جاتا رہا
کبھی تمام نہ ہوں گی اُداسیوں کی رُتیں ۔۔۔ کہ دائروں کا چلن دائروں سے جاتا رہا
یہ کیا ہوا کہ کوئی بھی نظر میں جچتا نہیں ۔۔۔ وہ کون تھا جو مرے منظروں سے جاتا رہا
وہی مکیں وہی آنگن وہی در و دیوار ۔۔۔ مگر وہ کیا تھا جو بستے گھروں سے جاتا رہا
زمیں تو خیر زمیں تھی کہ تنگ ہم پہ ہوئی ۔۔۔ اک آسمان تھا وہ بھی سروں سے جاتا رہا
تمام عمر اڑانوں میں کاٹ دی ہم نے ۔۔۔ تمام رنگ پروں کا پروں سے جاتا رہا

٭

دشنہ بدست لوگ تھے شہر ستم شعار کے ۔۔۔ منظر جاں لہو ہوا بادل اُٹھے غبار کے
آنکھیں بجھیں تو ساتھ ہی ماہ و نجوم بھی بجھے ۔۔۔ سارے چراغ گُل ہوئے عرصۂ ساز گار کے
ابر یقیں کے دم سے تھا موسم گُل شجر شجر ۔۔۔ بکھرے پڑے تھے معجزے بارش اعتبار کے
کیسی کشش کہاں کی کھینچ پاؤں جمیں تو کیا جمیں ۔۔۔ زیر قدم زمیں نہیں ذرے ہیں ریگزار کے
ہجر کدہ میں رات کیا یاد کا ایک در کھلا ۔۔۔ لائے تھے آشنا مہک جھونکے نئی دیار میں

٭

تیر ختم ہیں تو کیا ہاتھ میں کماں رکھنا ۔۔۔ اس مہیب جنگل میں حوصلہ جواں رکھنا

کیا پتہ ہوائیں کب مہرباں ہو جائیں
پانیوں میں جب اُترو ساتھ بادباں رکھنا

رنجشیں بھلا دینا، فاصلے مٹا دینا
اک مہین سا پردہ پھر بھی درمیاں رکھنا

ہم بھی ہونٹ سی لیں گے جی سکے تو جی لیں گے
کیا کوئی ضروری ہے بولتی زباں رکھنا

یہ گھڑی تو آنی تھی، یونہی سر گرانی تھی
اب فضول لگتا ہے کوئی سائباں رکھنا

لہر لہر بپھری ہے قہر قہر دریا میں
بے جواز لگتا ہے سعی رائیگاں رکھنا

دوسروں کی ضد ہوں میں، کتنا منفرد ہوں میں
یہ بھی کیا کہ سب جیسا سر پہ آسماں رکھنا

گنج تنہائی بسائے ہجر کی لذت میں ہوں
سب سے دامن جھاڑ کر بس اک تری چاہت میں ہوں

کون سا سودا ہے سر میں کس کے قابو میں ہے دل
ہر قدم صحراؤں میں ہے ہر گھڑی وحشت میں ہوں

میں اناؤں کا تھا پروردہ تو پھر دست سوال
کس طرح پھیلا کسی کے سامنے، حیرت میں ہوں

یہ بھی کیا بے چارگی ہے کاغذی شادابیاں
اپنے چہرے پہ سجائے خجلۂ غیرت میں ہوں

ایک خواہش کے ہزاروں رنگ عمر مختصر
کچھ بھی کر پاتا نہیں میں اس قدر عجلت میں ہوں

اے مرے گھر اب تو مجھ کو کھینچ لے اپنی طرف
اور کتنی دیر میں اس عرصۂ ہجرت میں ہوں

سر میں ایک سودا تھا بام و در بنانے کا
آج تک نہیں سوچا ہم نے گھر بنانے کا

یوں نہ رینگتی رہتیں کاغذوں پہ تصویریں
وقت جو ملا ہوتا بال و پر بنانے کا

یوں کہاں بھٹکتے ہم خواہشوں کے صحرا میں
فن اگر ہمیں آتا مال و زر بنانے کا

چل دیئے اکیلے ہی جستجوئے منزل میں
کام خاصا مشکل تھا ہم سفر بنانے کا

یہ ہنر بھی آخر کو اُس نے سیکھ کر چھوڑا
ہم سے ہوش مندوں کو بے خبر بنانے کا

ایک شوق ایسا بھی ہم نے پال رکھا ہے بے وقار لوگوں کو معتبر بنانے کا

جیتے رہنا وبال ہو گیا ہے آب و دانہ ہی جال ہو گیا ہے
آئینے میں ہے نقش سال خوردہ وقت جیسے نڈھال ہو گیا ہے
کوئی نکلے جواب کی صورت چہرہ چہرہ سوال ہو گیا ہے
اتنا سادہ نہ تھا مرا دشمن تیر ہوتا تھا' ڈھال ہو گیا ہے
دوریاں روگ بن گئی ہیں شفیق ہجر وجہِ وصال ہو گیا ہے

سرِراہے شفیق اک حادثہ رکھا ہوا ہے ہوا کے رُخ پہ اک بجھتا دیا رکھا ہوا ہے
بدلتی جا رہی ہیں قربتیں بھی دوریوں میں یہ اک ہم ہیں کہ اب تک فاصلہ رکھا ہوا ہے
وہ صدمے تھے کہ پتھر بھی جو ہوتے ٹوٹ جاتے مگر ہم ہیں کہ ہم نے حوصلہ رکھا ہوا ہے
سماعت قید میں ہے لفظ گونگے ہو گئے ہیں یہ کس نے ہر صدا کو بے صدا رکھا ہوا ہے
ابھی کچھ اور دن یونہی سزائے ناسزا کاٹ سنانا رہ گیا ہے فیصلہ رکھا ہوا ہے
بسر کرتے ہیں اوروں کی طرح سے زندگی ہم بس اتنا ہے وتیرہ دوسرا رکھا ہوا ہے

کسی کے خواب کسی کے خیال میں رکھا تمام عمر ہمیں کس وبال میں رکھا

عجب کیف میں ڈوبی ہے کائنات تری
کسی کو وجد کسی کو دھمال میں رکھا

کسی کے ہاتھ پہ لکھا دمکتے تارے کو
کسی کے بخت کا سورج زوال میں رکھا

ہماری سانسیں بھی کب اپنے اختیار میں تھیں
کہ آب و دانہ بھی رکھا تو جال میں رکھا

بلندیوں پہ بھی پستی کے خوف میں تھے ہم
اسی کمال نے ہم کو کمال میں رکھا

تخلیق اُس نے ہی آئینے کو بھی دی حیرت
کہ جس نے سحر تمہارے جمال میں رکھا

کیا کیا نہ ہوا برسرِ افلاک مرے ساتھ
اب رہنے نہیں دیتی مجھے خاک مرے ساتھ

رستے سے بھٹکنے کی بھی خو ڈال دی مجھ میں
اور اُس پہ بھی اک کر دیا چالاک مرے ساتھ

وہ ہاتھ کہاں ہیں جو کسی شکل میں ڈھالیں
بس گھومتا رہتا ہے سدا چاک مرے ساتھ

بچھڑا ہوں شجر سے بھی تو تنہا ہوں کہاں میں
بردوشِ ہوا ہیں خس و خاشاک مرے ساتھ

اک ذہن ہے سو اس سے بنی تھی نہ بنے گی
کب تک یہ نبھائے دلِ صد چاک مرے ساتھ

رہا شامل جو میرے رتجگوں میں کون تھا وہ
جو تھا تسکینِ جاں تنہائیوں میں کون تھا وہ

مری آواز جیسی اور بھی آواز تھی ایک
یقیناً تھا کوئی تو پربتوں میں کون تھا وہ

جو میرے ساتھ پہنچا منزلوں تک کون ہے یہ
جسے میں چھوڑ آیا راستوں میں کون تھا وہ

بہت ملتا تھا مجھ سے وار کرنے کا طریقہ
وہ اک مجھ سا تھا میرے دشمنوں میں کون تھا وہ

وہ تیرا غم تھا میرا عکس تھا یا واہمہ تھا
جو میرے روبرو تھا آئینوں میں کون تھا وہ

کٹے سر کو ہتھیلی پہ سجائے گھومتا تھا
مری بستی کی خوابیدہ شبوں میں کون تھا وہ

یادِ رفتگاں / حفیظ تائب

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

محمد عباس نجمی

مرشد اور مرید کا رشتہ بھی عجیب رشتہ ہے۔ کسی مرشد کامل کے دست حق پرست پر بیعت کرنے کے بعد محب کو اپنے محبوب کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا اور وہ سلطان العارفین حضرت سلطان باہو کی طرح پکار اٹھتا ہے۔

مرشد دا دیدار اے باہو مینوں لکھ کروڑاں حجاں ہُو

سچے مرشد کا کمال یہ ہے کہ مرید اپنے آپ کو پوری طرح اس کے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ اور عشق کے اس امتحان سے گزرنے کے بعد اسے انعام یہ ملتا ہے کہ وہ ذہنی نفسیاتی علمی اور روحانی طور پر اپنے شیخ کی شخصیت کا پوری طرح قیدی بن جاتا ہے۔ اور یوں ساری زندگی وہ اس زندۂ جاوید مصرعے کی عملی تصویر نظر آتا ہے کہ۔

رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی

کچھ اسی طرح کی نسبت میں نے ہمیشہ حضرت حفیظ تائبؒ کی ہستی سے اپنے حوالے سے جڑی ہوئی محسوس کی۔

میں نے روایتی طریقے سے استاد مکرم جناب حفیظ تائبؒ کے ہاتھوں میں ہاتھ تو نہیں دیا۔ لیکن میرا ان کا رشتہ استاد اور شاگرد سے بڑھ کر مرشد اور مرید ہی کا سا تھا۔

تائب جی پیدائشی درویش تھے۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ تہی دست و فرومایہ ہونے کے باوجود درویش و خدامست اور دل کے غنی تھے۔ اللہ رب العزت نے انہیں فقیری میں شاہی عطا کر رکھی تھی۔

خالق کائنات یوں تو اپنی تمام تر مخلوقات کے لئے رحمٰن اور رحیم ہے تاہم مرشد گرامی پر قادر مطلق کی مہربانیاں اوروں سے کہیں زیادہ تھیں۔ میرے مالک کی حفیظ تائب پر اس سے بڑی عنایت' کرم نوازی اور مہربانی کیا ہوسکتی ہے کہ انہیں رب کائنات نے اپنے محبوب کی محبت کا لازوال خزانہ عطا فرمایا۔

تائب صاحب کے دل کی دوکان میں ایک ہی سودا تھا صرف اور صرف حُبِّ رسول کا سودا۔

قدرت نے انہیں بے مثال شعری عظمتوں سے نواز رکھا تھا۔ ادبی دنیا پر نمایاں ہونے کے سارے کے سارے شعری حوالے موجود تھے۔ نظمیں' غزلیں' گیت' قطعے۔ دردِ دل کے اظہار کے لئے جو صنفِ سخن موزوں خیال کی اس میں بھرپور انداز میں طبع آزمائی فرمائی لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ان سے کوئی اور کام لیا جانا مقصود تھا۔ ان کو ایک ایسا امتیاز ملنے والا تھا جو ان کے ہم عصروں میں سے کسی اور کے مقدر میں نہیں تھا۔ وہ اعزاز انعام اور افتخار تھا۔ حضورؐ کی نعت۔ حضورؐ کی مدح۔ حضورؐ کا ذکر۔ حضورؐ کی شان بیان کرنا۔

پھر ان کے قلم سے نعت کا یہ شعر ہمارے سامنے آیا

نعت حضرت میری پہچان ہے سبحان اللہ

یہی دین ہے یہی ایمان ہے سبحان اللہ

آج سے پچیس برس پہلے جناب حفیظ تائب کا نعتیہ مجموعہ ''صلو علیہ وآلہٖ'' شائع ہوا تو استاد شاعر حضرت احسان دانش نے آپ کی نعت گوئی پر رشک کیا۔ مردِ قلندر صوفی محمد افضل فقیر نے آپ کی نعت کے ہر شعر کو ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق و محبت سے لبریز اور باطنی کیفیات کا آئینہ دار پایا۔ دورِ حاضر کی مقتدر ادبی شخصیت جناب احمد ندیم قاسمی نے برملا جناب تائب کی فنی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ''آپ کی نعت تمام ممکنہ فنی محاسن سے آراستہ ہے اور ایک کڑی حدِ ادب قائم رکھ کر اس اعلیٰ معیار کی نعت کہنا جو اس دور میں سند کا درجہ رکھتی ہو صرف حفیظ تائب کا اعزاز ہے۔''

دل و جان سے حضورؐ خاتم النبیین کے غلام' حضرت حفیظ تائب کو اپنی حیاتِ مستعار میں ایک سے زیادہ مرتبہ روضۂ رسول کی زیارت نصیب ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے آقا و مولا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں بیٹھ کر نعت پیش کرنے کی سعادت عطا کی۔

میرا وجدان اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ جس کسی نے جناب حفیظ تائب کو دیکھا گویا اس نے ایک سچے عاشق کی زیارت کر لی۔

ان کی یاد میں ہونے والی ایک تعزیتی تقریب میں جناب مجیب الرحمٰن شامی کی یہ نکتہ آفرینی میرے قلب و جگر پر ثبت ہو گئی کہ مرحوم نعت کہتے کہتے خود چلتی پھرتی نعت بن چکے تھے۔

مخدومی حفیظ تائب ایک عالم باعمل صوفی باصفا عاشق پاکباز اور باکمال دانشور تھے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں ان سے زیادہ وسیع المشرب دین دار شخص نہیں دیکھا دردمندی' رواداری' حسنِ سلوک' حسنِ اخلاق ان کی شخصیت کے بہت ہی نمایاں پہلو تھے۔

یقیناً وہ اپنے رب سے اپنے لئے بھی دین و دنیا کی بھلائیاں مانگتے ہوں گے۔ لیکن مولانا الطاف حسین حالی اور دوسرے دردمند شاعروں کی طرح وہ زیادہ تر امتِ مسلمہ کی زبوں حالی پر نوحہ کناں رہتے تھے۔

ان کی نعت کا یہ شعر تو گویا میرے لہو میں شامل ہو چکا ہے:

دے تبسم کی خیرات ماحول کو ہم کو درکار ہے روشنی یا نبیؐ
ایک شیریں جھلک ایک نوریں ڈلک تلخ و تاریک ہے زندگی یا نبیؐ

میں اپنے مرشد گرامی کے دنیا سے اوجھل ہو جانے کے بعد سے مسلسل یہ سوچ رہا ہوں اب بارگاہ رسالت سے ہم گنہ گاروں کے لئے تبسم کی خیرات کون مانگے گا' امت کی حالت زار پر آنسو کون بہائے گا۔ ویران دلوں کو نور نعت سے کون منور کرے گا۔ اب اس سراپا محبت مجسم شفقت ہستی کی زیارت کو ترس ترس جائیں گے لیکن وہ ہمیں کہیں دکھائی نہیں دے گا۔

پورے شہر میں وہ واحد شخص تھا جس کو محرم راز بنایا جا سکتا تھا۔ جس سے دل کی ہر بات کہی جا سکتی تھی جس سے مل کر ذہنی سکون اور قلبی اطمینان نصیب ہوتا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ میرے مرشد گرامی دنیا والوں کی نظروں سے اوجھل ضرور ہوئے ہیں۔ وہ ہم دنیا داروں کو چھوڑ کر خالق حقیقی کے پاس چلے گئے ہیں۔ لیکن ہمیں بے آسرا چھوڑ کر نہیں گئے۔ ان کی نعتیں ان کا کلام۔ ان کی شاعری ایک ایسا ابدی چشمہ فیض ہے جو قیامت تک جاری رہے گا اور ہمارے بنجر دلوں کو عشق رسول کی ہریالی عطا کرتا رہے گا۔

جناب حفیظ تائب......الوداع!

زاہد مسعود

حفیظ تائب بھی رخصت ہوئے۔ اب ہم سوچتے ہیں کہ وہ ہمارے کیا لگتے تھے..... استاد، دوست، ہمدرد بزرگ یا اک شفیق اور مہربان شناسا۔ یہ رشتے اگرچہ خونی نہیں کہلاتے مگر پھر بھی خون میں رچ بس جاتے ہیں۔ یہ رشتے خود بخود بنتے ہیں اور انگور کی بیل کی طرح دل کی دیواروں اور آنکھوں کی کھڑکیوں پر ٹھنڈی چھاؤں کر دیتے ہیں۔ حفیظ صاحب سے میری ملاقات بس یونہی سی تھی۔ عباس نجمی نے اورینٹل کالج ہوسٹل میں اک نعتیہ محفل کا اہتمام کیا۔ بہت سے شعراء موجود تھے میں نے بھی ڈرتے ڈرتے اپنی نعتیہ نظم سنائی جس کی آخری چند لائنیں کچھ یوں تھیں:

میں بخت آور
کہ ایسے دربار میں کھڑا ہوں
جہاں پہ دریوزہ گر کی تکریم اس قدر ہے
سوال آنکھوں میں اور کشکول بھر چکا ہے

یہ لائنیں سن کے حفیظ صاحب پھڑک اٹھے۔ محفل کے بعد مجھے پاس بلا کر دوبارہ نعت سنی اور میرا ہاتھ تھامے رہے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے وہ ہاتھ ابھی بھی ان کے ہاتھوں میں ہے۔ اس ایک ملاقات نے برسوں کے فاصلے ختم کر دیئے اور حفیظ تائب صاحب عمر بھر کے لئے ہمارے ہو گئے۔ ان سے ہمارے کئی رشتے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ مسکراتے رہتے۔ ایسی نرمی اور شفقت سے پیش آتے کہ ہم سب اپنے آپ کو ان کی پناہ میں محسوس کرتے۔ عمر کا فرق اگرچہ ان کے احترام میں کمی نہ آنے دیتا تاہم ان کی محبت میں عجیب بے تکلفی سی تھی۔ میں نے شوقیہ ہی ایم اے پنجابی کرنے کا ارادہ باندھا۔ انہیں پتہ چلا تو مجھے بلا بھیجا اور امتحان کی تیاری کے بارے میں پوچھا۔ میں نے سلیبس کی اور جنرل کتابوں کے نام فر فر سنا دیئے۔ یہ کتابیں میں ریاض راہی کے توسط سے جمع کر چکا تھا۔ سن کر نہایت خوش ہوئے اور ان کی خوشی نے میرے ارادے کو اور مضبوط کر دیا۔

ایک زمانے میں اورینٹل کالج کی کینٹین ادبی پرندوں کا ٹھکانہ تھا۔ نئے اور پرانے شاعر ادیب گھومتے گھامتے آنکلتے اور شام تک محفلیں جمتیں۔ اس وقت تک لیفٹ رائٹ کا کوئی چکر نہ تھا اور نہ ہی سرخ اور سبز کا جھگڑا اتنا شدید تھا۔ کنٹین کے ساتھ ہی حفیظ تائب صاحب کا کمرہ تھا۔ ہم نے وہاں پنجاب کے تمام موقر نعت خوان حضرات کو حفیظ تائب کے پاس بیٹھے دیکھا۔ اعظم چشتی اور یوسف گجراتی مرحوم اکثر و بیشتر ان کے پاس تشریف فرما ہوتے۔ یہ دونوں فن نعت خوانی میں صاحب اسلوب تھے۔ ایک اور خوبصورت شخصیت صوفی افضل فقیر بھی تائب صاحب کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ جبکہ بشیر منذر کا پرلیس بھی حفیظ صاحب کا پسندیدہ ٹھکانہ تھا۔ مرحوم اقبال ساجد تواتر سے آتے اور تائب صاحب سے ''استفادہ'' کرتے: اس ''استفادہ'' سے وہی لوگ محظوظ ہو سکتے ہیں جو اقبال ساجد کو جانتے ہیں۔

تائب صاحب کے ایک شاگرد خواجہ رشید انور پنجاب آرٹس کونسل کے انچارج بن کر گوجرانوالہ گئے تو وہاں سے ایک روز ان کا فون آیا کہ یہاں نعتیہ محفل کا اہتمام کر رہا ہوں۔ آپ نے حفیظ تائب کو ہر صورت میں لے کر آنا ہے۔ خالد احمد، عباس نجمی کے علاوہ کچھ اور دوست بھی تیار ہو گئے ہم ایک ویگن بھر کر گوجرانوالہ پہنچے تو وہاں کوئی بندہ تھا نہ بندے کی ذات ـــ خواجہ رشید بھی غائب! معلوم ہوا کہ محفل تو اگلے روز ہونی ہے۔ مجھے سب سے زیادہ پشیمانی حفیظ صاحب سے تھی جو بے چارے بیمار ہونے کے باوجود چل پڑے مگر یہ ان کی شفقت تھی کہ صورت حال بھانپ کر کہنے لگے کوئی بات نہیں اچھی سیر ہو گئی ہے کل پھر آ جائیں گے اور وہ واقعی اگلے روز پھر گوجرانوالہ گئے۔ ہمیں اس طرح کی باتیں کچھ عجیب سی محسوس ہوتی ہیں خصوصاً ایسے دور میں جب بعض بزرگ شاعر دیباچہ لکھنے کے لئے پانچ ہزار روپے طلب فرمانے لگے ہیں اور اب تو دینے والے بھی دستیاب ہیں۔ اندرون ملک اور بیرون ملک ایسا ایسا ''فنکار'' دریافت ہو چکا ہے کہ دو سیدھے مصرعے لکھنے سے معذور مگر کئی کتابوں کے مصنف اور مشاعروں کے خود ساختہ صدر نشین ـــ الحذر الحذر۔

حفیظ صاحب کی ذات میں کئی صفات تھیں۔ وہ واحد بزرگ شاعر تھے جو نوجوانوں کو ہر اچھے شعر پر دل کھول کر داد دیتے۔ ورنہ آج کل کے مشاعرے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مشاعرہ نہیں کوئی تعزیتی اجلاس ہے اور شعراء مشاعرہ نہیں پڑھ رہے ماتم کر رہے ہیں ـــ محبی عطاالحق قاسمی پہلی بار عمرے کی سعادت حاصل کر کے لوٹے تو ایک انتہائی خوبصورت نعت لکھی جس کا ایک شعر کچھ یوں تھا

تو نے تو کچھ بھی دیکھنے نہ دیا
اے مری چشم تر مدینے میں

حفیظ صاحب نے سنا تو ان کے گھر گئے۔ پرنم آنکھوں کے ساتھ کئی بار ان سے نعت سنی اور اٹھتے ہوئے عطا سے دعائے خیر کرنے کی استدعا کی۔ ان کے نزدیک دعائے خیر کرنے کا حق ایسی خوبصورت نعت کہنے والے کو ہی ہونا چاہیے۔ حفیظ صاحب کے ساتھ گزرا ہوا وقت یادوں سے اس قدر بھرپور ہے کہ باقی حیات مستعار

انہی کے سہارے گزر رہی ہے۔ ان میں نرمی انکساری، عاجزی اور خوش اخلاقی تو بدرجہ اتم موجود ہی تھی وہ دوسروں کا خیال بھی بہت رکھتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں محسوس ہو گا کہ ہم کون کون سی چیز کھو چکے ہیں۔ ہمارا نقصان اتنا زیادہ ہے کہ ازالہ ممکن نہیں۔

جن معاشروں سے اس قسم کی ہستیاں اٹھ جائیں وہاں بے برکتی اپنا ڈیرہ جما لیتی ہے۔ ہمارے چاروں طرف بے برکتی ویسے ہی اتنی زیادہ ہو چکی ہے۔ ہم اپنی اغراض کی غلامی قبول کر چکے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ایسی اچھی چیزوں کی قدر کرنے کی فرصت نہیں۔ قومی اثاثے یونہی ضائع ہوتے رہیں گے اور ایسے خلاء کبھی پر نہ ہوں گے۔ بڑے بڑے لوگوں کی موجودگی میں دکھ چھوٹے چھوٹے لگتے ہیں مگر جب لوگ چھوٹے ہونے لگیں تو دکھ بڑے ہو جاتے ہیں سو اب ہمارے دکھ بڑے ہو گئے ہیں۔

عاشق و معشوق

عطاء الحق قاسمی

یہ کئی برس پہلے کا واقعہ ہے لاہور ٹی وی سینٹر میں ایک نعتیہ مشاعرے کی ریکارڈنگ تھی' جولائی کا مہینہ تھا' باہر آگ برس رہی تھی مگر شعراء موسم کی اس چیرہ دستی سے محفوظ' ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھے گپ شپ میں مشغول تھے اور منتظر تھے کہ کب انہیں ریکارڈنگ کے لئے اسٹوڈیو میں بلایا جاتا ہے۔ اس دوران حفیظ تائب میرے پاس آئے۔ پرنور چہرہ' چہرے پر خوبصورت داڑھی' آواز میں دھیما پن۔ بولے "عطا صاحب' آپ مجھے کچھ بے چین سے لگ رہے ہیں خیریت تو ہے؟" میرے دل میں حفیظ تائب صاحب کے لئے بہت احترام تھا اور اس احترام کی وجہ ان کی اعلیٰ درجے کی نعت گوئی اور ان کے کردار کی صلابت تھی' میں نے جھجکتے جھجکتے کہا "بات دراصل یہ ہے کہ میں چین اسموکر ہوں اور سگریٹ ختم ہو گئے ہیں۔ سگریٹ کا کھوکھا ٹی وی سینٹر سے دور بھی ہے اور گرمی بھی بلا کی ہے اس لئے باہر جا کر سگریٹ خریدنے کی ہمت نہیں ہو رہی!" اس پر تائب صاحب نے مسکرا کر کہا "میں اگرچہ سگریٹ نہیں پیتا مگر مجھے اس بے چینی کا پورا اندازہ ہے جس کی زد میں آپ آئے ہوئے ہیں' مجھے بتائیں میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا "کچھ بھی نہیں' بس آپ دعا کرتے رہا کریں!" اس کے بعد میں دوسرے دوستوں کے ساتھ شریک گفتگو ہو گیا! تقریباً پندرہ منٹ بعد تائب صاحب دوبارہ میرے پاس آئے۔ وہ پسینے میں نہائے ہوئے تھے' ان کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا' اور ان کے ہاتھ میں سگریٹ کا ایک پیکٹ تھا۔ میرا جی چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ میں نے کہا "تائب صاحب! یہ آپ نے کیا کیا؟" دھیمے لہجے میں بولے "مجھ سے آپ کی بے چینی دیکھی نہ گئی" اور پھر ہنس کر کہنے لگے "میں نے پانچ منٹ کی واک ہی تو کی ہے اور آپ کو پتہ ہے واک صحت کے لئے بہت مفید ہے!" اس روز مجھے اندازہ ہوا کہ برصغیر میں صوفیاء نے شمشیر کی بجائے تدبیر کا راستہ کیوں اختیار کیا تھا؟ اور وہ لوگوں کی اچھائیوں اور برائیوں کے درمیان میں سے راستہ نکال کر انہیں اپنے قریب لانے میں کس طرح کامیاب ہوئے تھے؟ کیونکہ اس واقعہ کے بعد کئی دنوں تک سگریٹ کو ہاتھ لگانے کو میرا جی نہ چاہتا تھا۔ حفیظ تائب سے میرا رشتہ اب دوستی سے زیادہ عقیدت

کا ہو گیا تھا چنانچہ میری ایک غزل

کہیں گلاب میں ہوں اور کہیں ببول میں ہوں
کسی کی یاد میں ہوں اور کسی کی بھول میں ہوں

میں ایک شعر تائب صاحب سے اسی عقیدت کا مظہر ہے

بندھا ہوا ہے میرا دل حفیظ تائب سے
پڑا ہوا میں در عاشق رسولؐ میں ہوں

یہی حفیظ تائب ایک طویل علالت کے بعد گذشتہ ہفتے لاہور میں انتقال کر گئے۔

میں نے کئی مرحومین اور متعدد زندہ لوگوں کے ساتھ "عاشق رسولؐ" کا خطاب لگا دیکھا ہے۔ ہمارے ہاں عاشق رسولؐ اسے سمجھ لیا جاتا ہے جس کی آنکھیں حضورؐ کے ذکر پر آبدیدہ ہو جائیں' جو نعت کی محفلوں میں سر دھنتا پایا جائے اور جو حضورؐ کے روضے پر حاضری کے لئے بے چین رہتا ہو حالانکہ عاشق رسولؐ کے ٹائٹل کے لئے یہ نشانیاں ناکافی ہیں۔ اس کے لئے امانت' دیانت اور حضورؐ کے اسوہ حسنہ کے دیگر پہلوؤں کی تقلید ضروری ہے' جو آنکھ حضورؐ کے ذکر مبارک پر بھر آتی ہو' وہ آنکھ حضورؐ کے امتیوں کے دکھوں پر بھی پرنم نظر آنی چاہیے' جن عاشقوں میں یہ نشانیاں موجود ہیں' ان میں سرفہرست حفیظ تائب تھے اور یوں نعت گو شاعروں کے ہجوم میں جس شاعر کی نعت سب سے زیادہ میرے دل پر اثر کرتی تھی' وہ حفیظ تائب تھے کہ ان کی نعت پڑھتے ہوئے ان کا کردار میری نظروں کے سامنے آ جاتا تھا!

حفیظ تائب جب اپنے دوستوں اور اپنے چاہنے والوں کے درمیان بیٹھتے تھے تو حضورؐ کی سیرت کا یہ پہلو بھی ان کے مدنظر ہوتا تھا کہ محفل میں خود کو نمایاں اور دوسروں سے الگ تھلگ نہ کیا جائے چنانچہ میرے جیسے گنہ گار بھی خود کو ان کے درمیان بہت آسانی میں محسوس کرتے تھے' وہ اپنا تقویٰ اور اپنی پارسائی ہم پر مسلط نہیں کرتے تھے بلکہ ہم ان کی موجودگی میں بھی گفتگو کے دوران وہ لبرٹی لے جاتے تھے جو کسی ایسے شخص کی موجودگی میں ممکن نہیں ہوتی جس نے اپنے آپ کو پارسائی کے اس بلند مقام پر "بقلم خود" فائز کر دیا ہو جہاں سے اسے دوسرے لوگ کیڑوں مکوڑوں کی طرح نظر آتے ہوں۔ چنانچہ ان کی موجودگی میں جملے بازی بھی ہوتی تھی' لطیفے بھی ہوتے تھے اور ان کی کھلکھلاہٹ ہمیں کسی احساس جرم میں بھی مبتلا نہیں ہونے دیتی تھی!

مرحوم و مغفور حفیظ تائب بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے مگر جب حضورؐ کی غلامی میں آئے تو صرف آپؐ کی مدح کو اپنی شاعری کا محور بنایا۔ ان کی نعت ادب کے تمام پیمانوں پر پوری اترنے کے علاوہ حضورؐ کے سراپے کی خوبصورتی کے بیان تک محدود نہ تھی بلکہ اس میں حضورؐ کی سیرت کا بیان اور عالم اسلام کے مسائل کا ذکر بھی پوری تخلیقی سطح پر آتا تھا۔ استاد مکرم ڈاکٹر خواجہ زکریا نے بجا طور پر کہا ہے کہ مولانا حالی' مولانا ظفر علی خاں اور اقبال کے بعد نعت میں سب سے نمایاں مقام حفیظ تائب کا ہے۔

سوانحی حفیظ تائب کے چھوٹے بھائی عبدالمجید منہاس جب اس عاشق رسولؐ کا جسد خاکی ایمبولینس میں لے کر علامہ اقبال ٹاؤن میں کریم بلاک کے قبرستان میں پہنچے تو وہاں ایک جم غفیر اس پُرنور چہرے کے آخری دیدار اور نماز جنازہ کے لئے موجود تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر قطعاً حیرت نہ ہوئی کہ تمام مکاتب فکر کے سربرآوردہ لوگ اس ہجوم میں شامل تھے کہ جانتا ہوں وہ سب کے لئے قابل احترام تھے۔ میں نے یہاں ان دوستوں کی آنکھوں میں بھی آنسو دیکھے اور انہیں آہ و زاری کرتے پایا جو بڑے سے بڑے صدمے کے دوران بھی خود کو ''کمپوزڈ'' رکھنے میں کامیاب ہو جاتے رہے ہیں۔ جانے والے سے ان کا کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا۔ مگر ایک رشتہ ان آنے والوں اور جانے والوں کے درمیان بہت مضبوط تھا اور وہ باہمی محبت کا رشتہ تھا' حفیظ تائب جسؐ کے عشق میں مبتلا تھے' اس کے صدقے میں وہ خود بھی معشوق بن گئے تھے۔ میں نے اس روز جس شخص کو لحد میں اترتے دیکھا' اس کے چہرے کی تابانی میں ان دونوں انوار کے عکس جھلملا رہے تھے!

ناروے کے سب سے بڑے پبلشرز

Glydendal Norwegian Publishers, OSLO

پیش کرتے ہیں

جمشید مسرور کا نیا ذولسانی شعری مجموعہ

اردو-نارویجین

پچھلے برس کی دھوپ

غزلیں۔ نظمیں۔ اور جمشید مسرور کی تخلیق کردہ نارویجین نظمیں

افسانے

بہزاد آرٹ گیلری میں

احمد ندیم قاسمی

استاد بہزاد جب آرٹ گیلری میں داخل ہوا تو اس کا پہلا تاثر روحانی آسودگی کا تھا۔ چار طرف رنگوں اور خطوں کی چھاؤنی چھا رہی تھی۔ رنگ اور خط ہی تو ایک مصور کی جنت نگاہ اور فردوس جمال ہوتے ہیں۔ پھر اس نے گیلری کے وسط میں رکھی ہوئی ایک بیچ پر، ابتدائی انسان کا ایک مجسمہ پڑا دیکھا۔ اللہ اللہ! گزشتہ صدیوں میں آرٹ نے کتنی بے پناہ ترقی کی ہے۔ اس مجسمے میں اتنی زندگی، اتنی بے ساختگی ہے جیسے وہ ابھی اٹھ کر چلنے لگے گا اور بہزاد ودم بخود رہ گیا جب وہ مجسمہ سچ مچ اٹھ کر چلنے لگا۔ جلد ہی اس نے اپنی حیرت پر قابو پایا اور سوچا کہ یہ وہ صدی ہے جس میں آوازیں پورے کرۂ ارض کا سفر کر کے مشرق و مغرب کے گھر گھر میں سنی جا سکتی ہیں اور جس میں چلتی پھرتی تصویریں ہوا میں سفر کرتی ہوئی آتی ہیں اور گھروں میں سجے ہوئے شیشے کے پردوں پر منتقل ہو جاتی ہیں۔ پھر اگر اس صدی میں آرٹسٹ کا تراشا ہوا ایک مجسمہ عام انسانوں کی طرح چلنے لگے تو اس پر حیرت کا اظہار اپنی جہالت کا اعلان ہوگا۔ استاد بہزاد نے دیکھا کہ ابتدائی انسان کا وہ مجسمہ پلٹا اور سیدھا اس کے پاس آ کر اس کے سامنے رک گیا اور بولا۔ ''کیا آپ میرا ماڈل بننا پسند کریں گے۔''

تو یہ مجسمہ نہیں ہے، اس زمانے کا آرٹسٹ ہے! حسن کے اس تخلیق کار نے اپنی شخصیت کو حسن سے کیوں محروم کر رکھا ہے؟ اس کے بال اتنے بے ہنگم انداز میں کیوں بڑھے ہوئے ہیں؟ کیا اسے معلوم نہیں ہے کہ انسان نے جب کھیتی باڑی کرنا سیکھا تھا تو وہ حجامت بنانا بھی سیکھ گیا تھا؟ آخر آج کا مصور، تصویر بنانے سے زیادہ اپنے آپ کو بنانے میں اتنا وقت کیوں ضائع کرتا ہے؟ اس مصور کے بالوں اور لباس کی یہ بے ترتیبی ایک سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ بے ترتیبی اس نے بڑی ترتیب سے پیدا کی ہے تاکہ وہ مصور نظر آئے۔ مصور جب مصور دکھائی دینے کی اور شاعر، شاعر دکھائی دینے کی کوشش کرنے لگے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی مصوری اور شاعری میں ایک ایسی واضح کمی ہے جس کا خود اسے بھی احساس ہے۔ بہزاد نے سوچا کہ وہ اس کمی کو دور کرنے کی بجائے اسے اپنی شخصیت کی رومانیت میں کیوں چھپاتا ہے۔ اس طرح تو وہ دوسروں کو دھوکا دینے کی

کوشش میں اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے اور اپنے آپ کو دھوکا دینے والا انسان تو کبھی بڑا آرٹسٹ نہیں بن سکتا۔

مصور نے اپنے سوال کو دہرایا تو استاد بہزاد بولا۔

''میں پرانے خیال کا آدمی ہوں۔ گزشتہ صدیوں کی فصیلیں کاٹ کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ مجھے کوئی علم نہیں کہ آج آرٹ کا اسلوب کیا ہے۔ میں آپ کا ماڈل بن کر آپ کا اور اپنا وقت ضائع نہیں کروں گا۔''

مصور نے بہزاد کو بازو سے پکڑا اور ایک تصویر کے پاس لے گیا۔ تصویر پر مصور نے اپنے دستخط بھی انگریزی میں کیے تھے اور نیچے ایک کونے میں تصویر کا نام بھی انگریزی ہی میں لکھا تھا۔ بہزاد کی صورت ہی سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ انگریزی کے علم سے محروم ہے، چنانچہ مصور نے تصویر کے انگریزی نام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ذات کی شکست''

''مگر یہ بنائی کس نے ہے؟'' بہزاد نے پوچھا۔

اور مصور تن کر بولا ''میں نے۔ مگر میں نے اسے بنایا نہیں ہے اس نے خود کو مجھ سے بنوایا ہے۔ میرے اندر کوئی ایسی قوت ہے جسے آپ میری چھٹی حس کہہ لیجیے۔ وہ مجھ سے تصویریں بنواتی ہے۔ اس میں میرا شعور، میرا ارادہ قطعی شامل نہیں ہوتا۔

ایک رات نصف شب کو میری آنکھ کھلی تو میں نے محسوس کیا کہ اگر میں یہ تصویر نہیں بناؤں گا تو مر جاؤں گا چنانچہ تصویر آپ کے سامنے ہے۔''

بہزاد نے تصویر کو بغور دیکھا۔ پھر مصور کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''معذرت چاہتا ہوں مگر فن کا وقار مجھے یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ کاش آپ اُس رات مر ہی گئے ہوتے تاکہ فن اس آلودگی سے محفوظ رہتا جو آپ نے اس تصویر کی صورت میں فن کے منہ پر دے ماری ہے۔ اول تو آپ نے تصویر کے اوپر سے نیچے اور دائیں سے بائیں تک ریت کے اڑتے ہوئے جو ذرات دکھائے ہیں وہ ذرات کی بجائے جوار کے دانے معلوم ہوتے ہیں۔ دوم اس میں سے ذات غائب ہے، صرف شکست ہی شکست ہے۔ پھر شکست کو تو مثبت ہونا چاہیے کیونکہ جب کچھ ٹوٹتا ہے تو کچھ بنتا بھی ہے اور آپ نے ذات کو توڑنے کے بعد تصویر پر اپنے دستخط جڑ دیے ہیں۔ یہ جو کونے میں ایک لمبا سا کیڑا پڑا بل کھا رہا ہے یہ آپ کے دستخط ہی ہیں نا؟ اور یہ بھی انگریزی ہی میں ہیں نا؟ پھر جب آج اپنی زبان میں دستخط نہیں کر سکتے تو اپنی ذات سے کیا انصاف کریں گے؟ معاف کیجیے گا میں آپ کا ماڈل بننے کو تیار نہیں ہوں۔ قدرت نے مجھے ایک خاص ڈھب سے بنایا ہے، میں آپ کے حوالے ہو کر قدرت کی ہتک کا ارتکاب نہیں کروں گا''۔ بہزاد نے یہ کہا اور مصور کو وہیں کھڑا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

آرٹ سے فیض یاب ہونے کے لیے استاد بہزاد پوری آرٹ گیلری میں گھوم گیا اور پھر صدر دروازے پر کھڑے ہوئے ایک شخص سے کہا۔ ''معاف کیجیے گا کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ آرٹ گیلری کے اصلی فن پارے کہاں رکھے ہیں؟ یہاں تو شاید بچوں کی تصویروں کی نمائش ہو رہی ہے۔''

وہ شخص مسکرایا اور بولا۔ ''آرٹ گیلری میں جو کچھ بھی ہے وہ یہیں آپ کے سامنے ہے۔ آپ اگلے وقتوں کے آدمی معلوم ہوتے ہیں ورنہ اس آرٹ گیلری کے بارے میں تو فن کے نقادوں نے لکھا ہے کہ ایشیا کی مصوری اس آرٹ گیلری کی صورت میں اپنی آخری انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ آپ تصویروں اور مجسموں کو ذرا اور غور سے دیکھیے۔''

بہزاد نے سوچا کہ ان چیزوں کو جنھیں یہ تصویریں اور مجسمے کہہ رہا ہے، میں نے دیکھا تو ہے مگر ان میں سے کسی نے مجھے اپنی طرف بلایا نہیں۔ کسی نے میرے دامن نگاہ کو اپنی طرف کھینچا نہیں۔ آج کل بچوں کی تصویروں کی نمائش بھی بہت ہوتی ہیں اس لیے میں سمجھا کہ میں شاید غلطی سے کسی ایسی ہی نمائش میں گھس آیا ہوں ۔ آخر بچے ہی تو رنگوں کو بے ترتیبی سے انڈیلتے ہیں اور دیواروں پر ٹیڑھی ٹیڑھی لکیریں کھینچ کھینچ کر اپنی تخریب پسندی کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ سامنے لگی ہوئی تصویریں اگر سوجھ بوجھ والے بالغ مصوروں کی ہیں تو انھوں نے بیچارے بچوں کے لیے تو کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

یہی آرٹ گیلری تھی اور یہی آرٹ تھا اس لیے اب بہزاد نے ہر تصویر اور ہر مجسمے کے سامنے رک رک کر اس پر غور کرنے کی مہم شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک تصویر دیکھ کر اسے شبہ سا ہوا کہ اسے جلدی میں الٹا لٹکا دیا گیا ہے۔ آگے بڑھ کر اس نے تصویر کو سیدھا کرنا چاہا تو ایک نوجوان نے اسے روک دیا اور بولا۔ ''تصویر کو ہاتھ نہ لگائیے کیونکہ یہ آبگینے ذرا سی ٹھیس سے بھی چکنا چور ہو سکتے ہیں۔''

بہزاد نے اس نوجوان کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں موقلم تھا اور وہ بہزاد کو نصیحت کرنے کے بعد اس تصویر کو اوپر سے نیچے تک یوں دیکھنے لگا تھا جیسے گندی نالی میں کسی کا روپیہ گر پڑا ہو۔ حیران ہو کر بہزاد نے پوچھا۔ ''برخوردار تم اس تصویر میں کیا ڈھونڈ رہے ہو''؟

نوجوان نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''بزرگ محترم۔ میں مصور ہوں اور اس تصویر کا خالق ہوں۔ یہ میری محبوبہ کا پورٹریٹ ہے۔ ملک کے ایک نامور نقاد نے ملک کے ایک مشہور اخبار میں لکھا ہے کہ میری اس تصویر میں ایک کمی رہ گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ میں نے اس میں ناک غلط بنائی ہے۔''

بہزاد نے کہا۔ ''تو تم اداس کیوں ہو؟ موقلم تمھارے ہاتھ میں ہے۔ اپنی محبوبہ کی ناک کی تصحیح کراؤ''۔

اور نوجوان مصور بولا۔ ''تصحیح تو کراؤں گا مگر مشکل یہ ہے کہ اب مجھے وہ ناک مل نہیں رہی ہے۔'' بہزاد نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں دبا کر اسے چکرانے سے روکا اور آگے بڑھا۔ ذرا ستا لینے کے لیے اس نے ایک کرسی نما چیز پر بیٹھنا چاہا تو آرٹ گیلری کے کتنے ہی کارکن چیختے ہوئے لپکے اور استاد بہزاد کو کھینچ کر ایک طرف کھڑا کر دیا۔ پھر ایک کارکن بولا۔

''آجاتے ہیں آرٹ کی قدردانی کا مظاہرہ کرنے۔ میاں تم ایک لاکھ روپے کے اس مجسمے پر بیٹھنے لگے تھے؟''

''یہ مجسمہ ہے؟'' استاد بہزاد نے گھبرا کر کرسی کی طرف دیکھا اور کارکن بولا۔

''ہاں۔ اس کا نام ہے''ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے''۔ کرسی کے یہ دونوں بازو ماں کے بازو ہیں۔ کرسی کی یہ پشت ماں کی پشت ہے۔ کرسی کی یہ نشست ماں کی گود ہے۔''

استاد بہزاد نے پوچھا۔ ''اگر یہ ماں ہے تو اس کا بچہ کہاں ہے؟''

تب تک اس مجسمے کا خالق وہاں پہنچ گیا تھا۔ تماشائیوں کی صف کو چیرتا ہوا آیا اور بولا۔ ''بچہ ابدیت ہے اور ابدیت دکھائی نہیں دیتی، صرف محسوس کی جا سکتی ہے۔ سوچی جا سکتی ہے۔ تم اپنی سوچ کی مدد سے اس ماں کی گود میں ایک بچہ دیکھ سکتے ہو، کوشش کرو''۔

استاد بہزاد سر پکڑ کر وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ لوگ کیا ہوئے جو ایک ذرا سے خط کی تخلیق کے لیے اپنی نیندیں حرام کر ڈالتے تھے! وہ جو رنگوں کی آمیزش سے تخلیق کے مجموعے دکھاتے تھے! وہ جو حقیقت کو ذبح نہیں کرتے تھے بلکہ حقیقت کی آرائش کرتے تھے! وقت کے ساتھ ہر چیز آگے بڑھتی ہے، فن بھی آگے بڑھتا ہے، میرے زمانے کے بعد فن مصوری بھی آگے بڑھا ہوگا مگر یہ تو اتنا آگے بڑھ آیا ہے کہ وہیں جا پہنچا ہے جہاں سے چلا تھا۔ تو کیا لوگ اب اپنے خوابوں کو مصور نہیں کرتے؟ کیا آج کے مصور نے خواب دیکھنا چھوڑ دیا ہے!

تب ایک کارکن یہ سمجھ کر کہ اس بزرگ کو چکر آ گیا ہے، اسے پانی پلانے آیا۔ پھر اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور آرٹ گیلری سے باہر سڑک کے کنارے چھوڑ آیا۔

استاد بہزاد جو جدید آرٹ گیلری میں خود کو زندہ کرنے آیا تھا اب ایک حنوط شدہ لاش کی طرح بس سٹاپ پر کھڑا تھا۔

☙

نیا عاق نامہ یا ہجرت

الطاف فاطمہ

خیراب وہ بات اتنی پرانی اور فرسودہ ہو چکی ہے کہ اس کے اندر اسکینڈل بننے کی سکت رہ نہیں جاتا چاہیے تھی کہ اب تو بات اتنی پرانی ہو چکی ہے کہ اس کو اسکینڈل بنانے والے اور پھر اسکینڈل کا چرچا کر کے اس کو آگے چلانے والوں میں سے بیشتر لوگ تو اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ ان کی ساری باتیں اور ہرزہ سرائیاں وقت کے دھارے کے ساتھ بہہ کر تحلیل ہو چکی ہیں۔ بس اب تو ان کی بھی باقیات رہ گئی ہیں جن میں سے زیادہ تر کے لیے یہ سنی سنائی بات رہ گئی ہے۔ وہ کانوں سنی کہتے ہیں۔ آنکھوں دیکھی بتا ہی نہیں سکتے۔ تاہم یہ اتنی پرانی، اتنی فرسودہ اور بے جان بات اب بھی کسی نہ کسی صورت تازہ دم اسکینڈل کی سی جاذبیت اپنے اندر رکھتی ہے۔

اچھا تو اگر یہ بات اتنی ہی بے سکت اور بے جان ہے تو پھر مجھے کیا ضرورت ہے کہ اس مردہ گھوڑے کو زندہ کرنے بیٹھ جاؤں جبکہ میں ذاتی طور پر اس بات کے حاضرین، ناظرین اور سامعین میں کبھی شامل اور شریک بھی نہیں۔ میں تو یہاں آئی ہی اس وقت جب اس علاقے کے مستقل مکینوں کے نزدیک یہ بات اب کرنے کے قابل نہیں رہی۔ اچھا خیر تو اب یہ تفصیل بیان کرنے کی کیا ضرورت کہ کیوں اور کیا سبب جو میں اس سوئے ہوئے فتنے یا اسکینڈل کو جگانے بیٹھ گئی ہوں۔

وہ بات تو فقط اتنی تھی کہ اس علاقے کی بیشتر وسیع وعریض اراضی کے مالکوں کا ایک بیٹا ریس کا رسیا ہو بیٹھا۔ جیسا کہ اب سے تیس چالیس پچاس سال پہلے اس قسم کے خاندانی پیسے والے لوگوں کے شوق کے لیے یا اوباش بیٹوں کا طریقہ یا شغل ہوتا تھا کہ ان کا وقت کسی کالج یا یونیورسٹی کی چار دیواری میں گزارنے اور کتابوں سے سر مارنے کے بجائے ریس کورس میں گزرتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ شاید پیدا ہی چابک سواری کے لیے گیا تھا۔ وہی دبلا پتلا، دیکھنے میں منحنی پتلی کمر، ایک دم ستا ہوا جسم اور اتنا پھرتیلا جسم کہ ادھر ادھر چلتا پھرتا دیکھو تو مانو کہ اس میں بجلی سی بھری ہوئی ہے۔ اوپر سے نیچے تک برقی تار سا دوڑا ہوا ہے اور جو کوئی گھوڑا سامنے آجائے تو یوں زقندیں بھرتا کہ جانو چیتا اپنے شکار کو دیکھ کر لپکے۔

سو ظاہر ہے کہ اس ڈیل ڈول اور سراپا کے ساتھ ساتھ خاندانی رئیس مالکوں کی اولاد ہونے اور جدی پشتی طور پر گھڑ سواری یا شہسواری کا رسیا ہی نہیں تھا بلکہ اس میدان کا مرد تھا۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے رئیس زادے کہ جن کو موروثی طور پر زمینیں، جائیدادیں، حویلیاں، اور اراضیات گھر بیٹھے، بلا مشقت صرف خاندان کے ایک بڑے کے مر جانے پر مل جاتی ہیں، ان کو اپنے بچوں کے مستقبل اور رکھ رکھاؤ کے بارے میں شروع شروع میں کوئی تشویش نہیں ہوتی۔ البتہ بات اس وقت فکر کی ہوتی ہے جب ان کے خاندانی رکھ رکھاؤ یعنی اسٹیٹس پر زد پڑنے کا امکان واضح ہونے لگے اور پھر چونک کر وہ ایک دم ہی روک تھام کے لیے مختلف ہتھکنڈے آزمانے شروع کر دیتے ہیں۔ سو یقیناً ظاہر بات ہے کہ اسی قسم کے ہتھکنڈے ان پر بھی آزمائے گئے ہوں گے۔

ارے ہاں اپنی باتوں میں میں یہ تو بتانا بھول ہی گئی کہ صاحب مذکور ہیں کون۔ حالانکہ قاعدے سے اس قسم کے مذکورہ کردار کو متعارف کروا دیا جاتا ہے۔

اب صاف بات تو یہ ہے کہ مجھے آج تک شخص مذکور کا نام معلوم نہیں۔ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ کبھی نہ ہی پچھلے آٹھ دس سالوں میں کبھی سوچا کہ مجھے کبھی ان پر لکھنے کی مجبوری لاحق ہوگی۔ بس میرا تو یہ مشاہدہ کہ یہ جوکیز (چابک سواروں) جیسا ایک بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑا شخص ـــ ہاں جی وہ خاصے پکے اور پرانے ہونے کے باوجود فی الحال بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی محسوس ہوتے ہیں۔ دیکھیں ان کی بات کرنے سے دل یوں کتراتا ہے کہ بات کہیں جا پہنچی ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی یہ جو جوکیوں جیسا شخص ہے اس کو دیکھ یوں لگتا ہے جیسے اوی فر آپ کے سامنے کھڑا ہوا ہو۔

بالکل ایسا ہی جیسے ہم آپ کبھی کبھی بچوں کو ڈرانے کے لیے کالے کاغذ پر ہوے کی شکل کاٹ کر دکھاتے ہیں۔ صاف بات یہ ہے کہ میں تو خود ڈرا کرتی تھی۔ لگتا تھا اکیلے ڈکیلے کھڑا دیکھ، کمر سے لگا پستول نکال کر کنپٹی پر رکھ کر کھڑا ہو جائے گا۔ یا پھر رات برات نالے کے پائپ پر چڑھ کر گھر میں کود جائے گا اور ڈانٹ کر چابیاں مانگ لے گا۔ اسی سبب سے ڈر ڈر کر چپکے چپکے لوگوں سے پوچھ گچھ کا آغاز کر دیا۔ اس علاقے کے کئی لوگوں سے پوچھنے پر کہ بھئی یہ کون شخص ہے اور یہ ہر وقت اسی علاقے میں کیوں پھرتا رہتا ہے، تب مجھے کسی نے بتایا تھا کہ وہ تو یہیں اس جگہ کا ساکن ہے۔ کسی نے ایک پتلے سے راستے کے نکڑ پر بنے مختصر سے مکان کی طرف اشارہ کر کے بتایا تھا۔

میں اس مکان کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ آخر اس طرح کی زمین پر مختصر اور تنگ جگہ پر تعمیر کی گنجائش نکالی کس طرح گئی۔ اس لیے یہ تو یقین جانئے، کرتے کی کلی کے انداز اور کٹاؤ والا ایک میڑھا ایک مرلے کا ٹکڑا تھا۔ جس پر اس جوکی نما اوی فر کا گھر کھڑا تھا۔ اس شخص کی پراسراریت کچھ بھی گمبھیر معلوم ہوئی۔

اب یہ باتیں تو رفتہ رفتہ ہی سننے میں آئیں کہ جب رئیسے بیٹے کا ریس سے انہماک اور شوق حد سے

بڑھا تھا اور اس شوق کے مول کا خرچہ بڑے ملک کی جیب پر بھاری پڑنے لگا تو انہوں نے ریسے کی لگا میں کھینچ کر روکنا چاہا۔ ترکیب الٹی پڑی تھی۔ ضدی اور سرکش بیٹا اور بھی بھڑک گیا تھا اور اس کشمکش میں چاہ کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ خیر سننے اور دیکھنے والے تو یہی کہیں گے کہ عاق تو ہونا ہی ہونا تھا' حرکت ہی ایسی تھی۔

پر مجھے کچھ یوں لگتا ہے کہ اتنی معمولی اور چھوٹی سی بات پر اتنی بڑی سزا دینے کا کوئی تک بنتا نہیں تھا۔

اب دیکھئے نا جب کوئی حد سے زیادہ ڈھیل دے کر پالے ہوئے تو جوان بیٹے کی لگا میں کھینچے گا، اس کا جیب خرچ بند کر کے اس کو گھر سے نکال دے گا تو وہ ریس کا دھنی، شراب اور گھوڑے کا رسیا کسی غریب جوگی کے گھر میں ہی تو سر چھپائے گا۔ جوزف مسیح تو اس فن میں اس کا استاد بھی تھا...... باپ نے بیٹے کے سر پر سے ہاتھ اٹھا لیا تو پھر مجبوراً روحانی باپ کو ہی سر پر ہاتھ رکھنا پڑا اور اس طرح لوی فرنما (خیر وہ پہلے تو ایسا نہ تھا) کو اصطبلوں اور ان کے ساتھ والا گراؤنڈ سے بھرے سائیسوں اور جوگیوں کے چند مختصر سی گنجائش والے گھروں میں سے ایک گھر میں رہائش اختیار کرنا پڑی جہاں جوزف مسیح کی سکونت تھی۔ میاں بیوی کے علاوہ چار بیٹوں اور دو عدد بیٹیوں پر مشتمل کنبے کے لیے یہ گھر کچھ زیادہ گنجائش تو نہ رکھتا تھا البتہ استاد کے دل والی گنجائش ضرور میسر تھی۔ بس اسی گنجائش میں گھر سے دھتکارا ہوا بیٹا سما گیا۔

ہاں تو وہ بات تو بیچ میں ہی رہ گئی۔ ارے وہی ذرا سی بات پر بننے والا اسکینڈل جس کے اثرات تمیں بتیس سال گزرنے پر زائل ہونے کی بجائے اور زیادہ اذیت ناک بنتے چلے گئے تھے۔

ہاں او واقعی ایک ذرا سی بات ہی تو تھی کہ...... کہ...... ریسے نے استاد کی تیسری بیٹی شیلا کو اپنا لیا۔

نہیں...... وہ آج کل والا ماڈرن دوستانہ تعلق نہیں۔ ہاں اس نے وہ رکھیل رکھیل والا چکر بالکل نہیں چلایا۔ بلکہ باقاعدہ کورٹ میرج کے بعد گرجا میں رسم کدخدائی کے علاوہ قاضی صاحب کے آگے بیٹھ کر عقد مسنون کے ایجاب قبول کے تمام تر مرحلے طے کئے۔

ہاں یہ تو ہے کہ شاید بڑے ملک کے غیض وغضب میں اس درجہ اضافہ نہ ہوتا، اگر وہ بات رکھیل والی بات تک ہی رہتی۔ پر وہاں تو غضب یہ ہوا...... پکا نکاح۔

اگلے تین دن انہوں نے ایک طرح سے ہنی مون میں گزارے۔ وہ اس طرح کہ شیلا کا بڑا بھائی للیانی کی ڈسپنسری میں کمپاؤنڈر لگا ہوا تھا۔ ساری کارروائی کے بعد ان دونوں کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اس تقریب شادی کا واحد مہمان بھی وہی تھا۔ اس کی بیوی نے اس تقریب میں شرکت سے یوں انکار کر دیا تھا کہ وہ اس بے جوڑ شادی کے حق میں نہ تھی۔ وجہ اپنی نند سے حد درجے حسد ہی ہو سکتا تھا کہ شیلا جیسی کلکتری کو یہ دن لگ گئے۔ وہ اتنے اونچے گھرانے کے بیٹے (وہ نکھٹو اور اوباش ہی سہی) سے بیاہی گئی۔

اس وقت کے دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ چار دن للیانی میں گزارنے کے بعد واپسی پر بڑے اعتماد سے اگلے دن وہ اپنی دلہن کو ساس سسر کو سلام کروانے کو لے کر اپنی کوٹھی پر پہنچا تو یہی بات ہے کہ یہ بات بے

چارہ کے خواب وخیال میں نہ تھی کہ وہ اتنی وسیع وعریض اور شاندار کوٹھی میں بہو کی حیثیت سے داخل ہو رہی ہے۔ اس نے تو اپنے سے ذرا بہتر گھر کا ہی تصور کیا ہوگا۔ پہلے تو اس نے یہی خیال کیا کہ اس کے شوہر کی رہائش کوٹھی کے شاگرد پیشے کے کسی کوارٹر ہی میں ہوگی۔ اب یہ بات تو شیلا نے خود اپنے منہ سے سننے والوں کو بتائی ہوگی کہ، انہوں نے اپنی ٹیکسی آرائشی گملوں اور پھولوں سے لدی بیلوں سے سجے سجائے بڑے سے پورچ کے پاس ہی رکوائی تھی۔ کچھ تو اس لیے کہ پورچ میں ایک عدد اسٹیشن ویگن کے جلو میں ایک عدد مورس پہلے ہی کھڑی تھی اور کچھ یہ سوچ کر کہ بڑے ملک صاحب سخت ناراض ہوں گے کہ وہ ان کی نئی نویلی دلہن کو ٹیکسی میں بٹھا کر سلام کروانے لایا ہے۔ کیا تھا جو فون کر کے گاڑی منگوا لیتا۔ یہ مورس تو اسی کے استعمال میں رہتی ہے۔

بہر حال شیلا کا کہنا تھا کہ بابا میرے تو گھٹنے ہی لرزنے لگے تھے پورچ کو دیکھ کر ہی۔ اندر جانا تو بڑی بات تھی۔ پر ان کی ہمت تو دیکھو میری بانہہ پکڑ کر کے دندناتے ہوئے اندر گیلری میں گزرتے سیدھے اپنے بیڈروم میں جا گھسے اور مجھے مسہری پر بٹھا دیا۔ مسہری پر بیٹھتے میں خود سٹ پٹا رہی تھی۔ اتنا سفید، برف سے نرم نرم پلنگ پوش، اس پر رکھے نرم نرم پروں والے تکیے اور پیروں تلے قالین کہ پیر اندر ہی دھنسے جا رہے تھے۔ سائڈ ٹیبل پر چاندی کے فریم میں لگی ان کی وہ مسکراتی تصویر آج بھی میری آنکھوں میں بسی ہے جو میں نے پہلی اور آخری بار اس وقت دیکھی تھی۔ جرمن سلور کے لمبے سے گلدان میں گلاب مسکرا رہے تھے۔

دوسری سائڈ ٹیبل پر سفید سلک کے شیڈ والا سیاہ اور سنہرا لیمپ رکھا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا یہ کمرہ ہمارے ہی لیے تیار کیا گیا تھا۔ دو منٹ چپ کھڑے رہنے کے بعد انہوں نے لیمپ کا بٹن دبا دیا اور میری طرف محبت سے دیکھ کر بولے تھے۔ یہ ہے جناب کا بیڈروم۔

روشنی ہوئی تو مجھے اپنا آپ بہت برا لگا تھا۔ شیشہ جارجٹ کی لال لہو ساری کے نیچے سفید ٹیٹی کوٹ، سائن کے طوطے جیسے سبز رنگ کے بلاؤز کا گلا میز ھا اور آستینیں کندھوں پر ڈھلک رہی تھیں۔ سستے سنہری سینڈلوں میں گھرے سانولے پیر اور ان کے ناخنوں پر لگی کبوتر کے خون جیسی نیل پالش، اس کو یقیناً خود اپنے آپ کو بری لگ رہی تھی اور سوچ رہی تھی ایسے ہی میرے گال بھی لگ رہے ہوں گے جن پر اس نے ہاتھ کھول کر لال لہو سرخی تھوپ لی تھی۔ ویسے وہ اب پچھتا رہی تھی کہ اس سے زیادہ بھلی تو میں بغیر میک اپ کے لگ سکتی تھی۔ تو خیر اب تو جو ہونا تھا ہو گیا تھا۔ شیشائی بیٹھی تھی۔

اس کمرے میں وہ کتنی بے جا اور نامناسب لگ رہی تھی۔ یہ تو اس کا اپنا دل ہی جان رہا تھا۔ تو خیر وہ کمرے سے نکل کر گیلری میں گئے۔ امی جی! وہ آپ کو سلام کرنے آئی ہے۔ اس کے کانوں نے یہ بات صاف طور پر سنی ''کون؟''

''آپ کی چھوٹی بہو''۔

امی جی نے گیلری سے مڑ کر کمرے کی اور دیکھا اور بے اختیار منہ سے نکلا۔

ٍ

''ئی ہائے میں مرگئی۔''

یہ کہتے کہتے انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑا تو ان کی بھری بھری دم دماتی کلائیوں میں پھنسی پھنسی سونے کی چوڑیاں یوں لشکارے مار رہی تھیں گویا اس پر ہنس رہی ہوں۔

ان سب عوامل نے مل جل کر اس کمرے میں قیام کے وہ پندرہ منٹ پندرہ دن سے بھی زیادہ بھاری بنا دیئے تھے۔ ابھی وہ اس ''ئی ہائے میں مرگئی'' والے نعرے کے تاثر سے سنبھل نہ پائی تھی کہ پورچ میں جیپ رکنے کی آواز کے ساتھ ہی رائیڈنگ بوٹس رائیڈنگ برجیس میں چرمر کرتے ملک صاحب گیلری میں داخل ہوئے تو وہیں سے ان کی چھٹی حس نے کسی ناگوار موجودگی کو تاڑ لیا۔ سناٹے کے عالم میں کھڑی بیگم کا چہرہ مزید ثبوت فراہم کر رہا تھا۔ ان کے چہرے کی طرف نظر کرتے ہوئے چونک کر سوال کیا۔ ''کیوں خیر تو ہے؟''

''خیر؟ ہاے، آپ کو چھوٹا ملک آیا ہوا ہے۔''

چھوٹا ملک گھر سے اکثر غائب رہتا تھا، کبھی گھر میں شکل نظر نہ آتی تھی۔ پر اب تو پورے ایک ماہ سے غائب تھا۔ ویسے صاحب کو اس کی نقل و حرکت کا علم رہتا تھا۔ ریس کورس سے ان کا پرانا تعلق تھا۔ وہاں کے خاص جوکی ان سے متعلق رہے تھے۔ ایک زمانے میں تو ان کے اپنے گھوڑے ریس کورس میں رہتے تھے۔ شیلا کا باپ بھی ایک زمانے میں ان کا بڑا معتمد رہا تھا۔ سچ پوچھو تو چھوٹے کے ریس کے اس شوق کا سبب بھی یہی کچھ تھا۔ اتنی طویل غیر حاضری کے بعد اس کی آمد کا سن کر تیوریاں چڑھ گئی تھیں۔ گھٹنے سے لہجہ میں سوال کیا ''اچھا تو فرصت مل ہی گئی عشق بازی سے''

''جی فرصت تو کیا ملنی تھی۔ اب تو ڈھول ہمارے گلے پڑ گیا ہے۔'' ان کی جانب مڑ کر سرگوشی کے انداز میں بولیں۔

''تو وہ آئی ہے آپ کے سلام کو۔''

طیش کی شدت سے وہ گنگ سے ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ بیوی نے بیڈروم کی طرف اشارہ کیا تو وہ ایسے جھپٹے جیسے بلی چوہے کی طرف جھپٹتی ہے۔ ان کے اس طرح جھپٹنے پر وہ سہم کر کچھ اور سمٹ کر بیٹھ گئی۔ پیچھے آڑ میں کھڑے شوہر نے اشارہ کیا کہ کھڑی ہو کر سلام کرو۔ تو وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ ابھی سلام کے لیے پورا ہاتھ اٹھا بھی نہ تھا کہ یوں لگا جیسے بپھرا ہوا سانڈ ایک دم ہی ڈکرانے لگا ہو۔

''جرات کیسے ہوئی اس کی اس بیڈروم میں قدم رکھنے کی؟ کس کی اجازت سے گھسی تھی؟''

سوالیہ نظر ڈالی تو بیگم پر تھی۔ پر وہ پیچھے سے نکل کر سامنے آ کھڑا ہوا۔ ''یہ میرا بیڈروم ہے اور یہ میری بیوی ہے۔ ظاہر ہے میری بیوی میری اجازت سے ہی اپنے بیڈروم میں داخل ہوئی ہے''۔

''کس کا بیڈروم کس کی بیوی۔ یہ میرا گھر ہے اور یہاں میری اجازت کے بغیر کوئی آ جا نہیں سکتا۔'' طیش کے عالم میں انگلی اٹھا کر دروازے کی طرف اشارہ کیا ''چلو نکلو اور ساتھ ہی اس گند کو بھی لے کر دفع ہو جا۔

غیرت مند ہے تو اب کبھی یہاں قدم نہ رکھنا۔"

چھوٹے ملک کو شاید اس سلوک کی توقع نہ تھی۔ ایک دم منہ پر جیسے بسنت رت کھل گئی ہو۔ دو قدم پیچھے ہٹ کر اسے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ دونوں چل پڑے۔ وہ وہیں کھڑے مغلظات بکتے رہے۔ ساری کی ساری گالیوں کی زد بیگم پر تھی، دل جل رہا تھا۔ دبے قدموں وہ شیلا کے پیچھے پیچھے آئیں اور اس کی مٹھی میں کچھ ٹھونس دیا۔ بھیگی بھیگی آنکھوں سے وہ جاتے ہوئے ان مل بے جوڑ جوڑے کو دیکھتی رہیں۔

ٹیکسی بہت دور چلنے کے بعد ملی تھی یوں کہ ایسی سڑکوں پر شاید ہی کوئی ٹیکسی یا تانگے پر آتا ہو۔ ابھی رکشہ وجود میں نہ آیا تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے ہی پہلا کام شیلا نے یہ کیا تھا کہ اپنی بھیگی ہوئی مٹھی کھول کر دیکھی۔ اس کی بند مٹھی کے پسینے میں بھیگے بھیگے ہزار ہزار کے دو نوٹ اداسی سے اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ گھبرا کے اس نے نوٹ جلدی سے اپنے بلاؤز کے گلے کے اندر ٹھونس لیے تھے کہ اپنا گھٹیا سا پرس تو وہ گھر ہی بھول آئی تھی اور اب اگر اس وقت وہ یہ نوٹ اپنے شوہر کو دکھا دیتی تو وہ ان کو پھاڑ کر ٹیکسی کے باہر پھینک دیتا کہ فرطِ غم سے اس کا منہ اترا ہوا تھا اور طیش کی شدت سے آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

اس سے اگلا دن

شہر کے تمام قابلِ ذکر اخبارات کے شعبہ اطلاعات اور اعلانات میں وہ عاق نامہ جلی حروف میں شائع ہوا تھا جس کی رو سے ملک مختار نے اپنے بیٹے ذوالفقار کو اپنی ولدیت اور ہر قسم کی مملوکہ وراثت سے محروم قرار دیا تھا۔

ایک طرح سے یہاں پر آ کر یہ اپنی سوز تمام ہوئی۔ قاعدے سے اس قصے کو اس انجام تک پہنچ کر ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ یا پھر آگے چل پڑنا چاہیے تھا۔ پر یہ سب تو اس وقت ہوتا کہ جب اس بات کو خاندان والے محض ایک بات اور ایک واقعہ سمجھ کر فراموش کر دیتے مگر ایسا یوں نہ ہو سکا کہ ایسا کرنا ان کے خلاف جاتا اور ان کے مفادات پر زد آتی تھی کہ ملک صاحب کے تین اور بیٹے اور دو بیٹیاں سب کی سب آمنے سامنے اور دائیں سٹوں میں بیاہے ہوئے تھے۔ سارے کے سارے ان کے اپنے بہن بھائیوں کے گھروں میں دیے ہوئے تھے اور ایسا ہی کوئی رشتہ اس چھوٹے ملک ذوالفقار کے سلسلے میں زیرِ غور تھا کہ اس سے یہ لغزش سرزد ہوئی اور وہ قعرِ ذلت میں جا گرا۔ بلکہ خاندان والوں کا تو یہ کہنا تھا کہ اس نے ہمیں ذلت کے گڑھے میں گرا دیا ہے۔ خیر اس بیچارے نے کیا گرانا تھا اور لوگوں کو بھی بھلا اتنی فرصت کہاں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے اتنے چھوٹے چھوٹے واقعات کو یاد رکھیں خصوصاً اس وقت میں جب ملک اور سیاست میں بڑے بڑے واقعات جنم لے رہے ہوں۔ ہاں تو یہ بچاس کی دہائی والے دن تھے۔ اس وقت سے اب تک کیا کچھ نہ ہو رہا تھا۔ اور رہ گیا عزت اور ذلت کا معاملہ تو یہ بات کہ خون کی کتنی ندیاں بہی تھیں، قوم کی بیٹیاں اور بہنیں اغوا کی گئیں، ان کو سرننگا یا برہنہ کر کے سڑکوں پر پریڈ کرنے پر

مجبور کیا گیا اور اس سے بھی بدتر گندی گندی باتیں بروئے کار آئیں، پھر ان سب باتوں سے صرف نظر کر کے لوگ پرائے مال اور متروکہ جائدادوں پر نظریں گاڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ تو یہ تو پھر اپنا مال تھا کہ چھوٹا ملک محروم قرار پایا تو پھر اس کے حق کے حصوں بخروں میں انہیں بھی تو مستحق قرار دیا گیا۔ آمنے سامنے کے رشتوں کی غیرت اس وقت کام آرہی تھی اور اس تمام قصے کو تازہ رکھنے اور گاہے بگاہے بیان کرتے رہنے کے عمل میں سب سے پیش پیش وہی تو تھیں۔ خالص دم دماتے سونے کی چوڑیاں اور کڑوں سے بھری بھری کلائیوں اور ہاتھوں کو نچا نچا کر بات کو تازہ دم کرتی تھیں۔ اور اس طرح کی آتش غضب کو ہوا دے دے کر یاری خاندانوں کے گھروں کے آتشکدوں کی طرح سرد نہ ہونے دیتی تھیں۔ سو اس طرح سے پہلے ہی سکسٹ کی پہلی اپی سوڈ ہی آن ایئر چل رہی تھی۔ اسکینڈل تازہ بتازہ اور زندہ و تابندہ چل رہا تھا۔ وہ بھی اپنوں ہی کے ہاتھوں۔ البتہ چھٹے ملک اور اہل خانہ کے درمیان جو خالی اسکرین آ گئی تھی وہ بدستور حائل رہی۔ جو کچھ یوں کہا اور کیا جاتا تھا وہ پس آئینہ اور پس اسکرین تھا۔ بہر حال چھوٹا ملک اور اس کی منکوحہ بیوی شیلا تقریباً تقریباً بیس سال اس منظر سے غائب رہے چھوٹا ملک اس عرصہ میں کیا کرتا رہا۔ آیا اس نے مستقبل اور آئندہ زندگی کی کوئی منصوبہ بندی کی بھی یا نہیں۔ اس بارے میں اس کے متروکہ علاقے کے لوگ کوئی بیان دینے سے قاصر تھے۔ اس لیے کہ گھر بدری اور عاق ہونے کے بعد چھوٹے ملک یا اس کی زوجہ نے اس علاقے کی حدود میں قدم رکھا ہی نہ تھا، بیس سال گزرنے کے بعد تک۔ ویسے اندازاً تو یہی کہا جا سکتا تھا کہ یہ منصوبہ بندی اور آگے پیچھے کی سوچ کی صلاحیت اس کے اور اس کے خاندان میں سرے سے موجود نہیں تھی کہ وہ دولتوں اور شہری اور دیہی علاقوں میں موجود وسیع رقبوں والی اراضیات اور کوٹھیوں کی موجودگی میں یہ دردِ سر کون مول لیتا۔

سو اندازاً قیاس کیا جاتا ہے۔ عاق شدگی کے چند ابتدائی سالوں میں ممتا کی مجبوری بلکہ جبر کے تحت ملکائین چوری چھپے کچھ رقم پرانے اور اپنے معتمد ڈرائیور کے ہاتھ چھوٹے مالک کو بھجواتی رہی ہوگی اور یہ کہ استاد سسر بھی ان دنوں اپنے پورے فارم میں تھے اور بڑے طمطراق سے اپنے ہنر کے حوالے سے قسمت آزمائی فرما رہے تھے۔ ان کو شیلا اور اس کے خاوند کی گھر دامادی پر اعتراض نہ تھا بلکہ چپکے چپکے اس بات پر بڑا فخر تھا کہ شہر کے اتنے اونچے گھرانے کا بیٹا کا داماد ہے چلو وہ عاق شدہ ہی سہی۔

عاق شدہ داماد اپنے پینے اور ریس کے شغل کو بھی کسی نہ کسی طور پر نبا جتا ہی رہا ہوگا۔ ان تمام بیس سالوں میں چھوٹا ملک ایک اپنے اب آبائی گھر میں قدم رکھنے کی جرات یا حماقت کا مرتکب ہوا تھا۔ موقع یہ تھا کہ باوجود کم تعلیم یافتہ ہونے کے چھوٹا ملک اخبار صبح صبح دیکھنے کا اسی طرح عادی تھا جیسے پینے پلانے یا ریس کھیلنے کا۔ اس روز صبح صبح اخبار دیکھا تو شہر کے معزز گھرانوں کے اچھے برے اعلانات کے کالم میں بڑے ملک صاحب کے راہی ملک عدم ہونے کی خبر پر نظر پڑی۔ بیٹا تو بیٹا ہی ہوتا ہے۔ اخبار ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ آنکھوں سے آنسو چل پڑے، خبر میں نماز جنازہ کا وقت بھی یاد ہوا تھا، نہا دھو کر تیار ہوا۔ سفید شلوار قمیض زیب تن کی اور ٹیکسی لے کر

گھر کی طرف چل پڑا۔ جنازہ پورچ میں رکھا، بھائی، بھتیجوں اور بیٹوں کے کندھوں کا منتظر تھا۔ گھر کے باہر کاریں ہی کاریں کھڑی تھیں۔ دبے قدموں وہ گیٹ کی جانب بڑھا۔ سیدھا پورچ میں پہنچا۔ اندر سے عورتوں کے رونے دھونے کی ملی جلی آوازیں چلی آتی تھیں، کلمہ شہادت کی آواز کے ساتھ پلنگ کا پایہ چھوا ہی تھا کہ ملک صاحب کے منجھلے داماد نے لپک کر اس کو دور ہٹا دیا اور ان کے بھائی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''چاچا جی! اس کو کس نے خبر دے دی۔'' چاچا جی نے حلیمی سے سر کے اشارے سے کہا۔ ''اسے منہ دیکھ لینے دو۔'''' مگر میں اپنے باپ کو کندھا ضرور دوں گا۔''

''یہ نہیں ہوگا۔ مرحوم تم کو عاق کر چکے تھے۔'' منجھلا پھر غرا کر اس کی طرف بڑھا جبکہ بڑے اور چھوٹے داماد نے خاموشی اختیار کی اس لیے کہ وہ ان کے بھائی اور بہن کے بیٹے تھے۔ یہ کنبے سے باہر کا تھا۔ اس کا حق نہیں بنتا تھا۔ البتہ اس کے عاق نامے کے اعلان کے بعد سننے میں آرہا تھا کہ اس کے حصے میں سے کچھ حصہ اس بہن کو دیا جانے کا امکان ہے۔

منجھلے داماد کے تیور دیکھ کر ایک کم حیثیت بوڑھے رشتے دار نے اس کو قریب بلا کر کہا، ملک ذوالفقار یہ وقت جھگڑے اٹھانے کا نہیں۔ بہتر ہے کہ تم ہٹ جاؤ۔ تمہاری پہلے ہی جگ ہنسائی ہو چکی ہے۔

''پر مذہب کی رو سے تو عاق نامے کی کوئی حیثیت نہیں۔''

''جانتا ہوں زمین، جائداد والوں کا مذہب۔'' یہ کہتے کہتے انھوں نے منہ بند کر لیا۔

''بات سیں آپ میری۔ ماما نذیر۔ آخر یہ سارے دنیا بھر کا لفنگا پن کریں تو خیر، کوٹھوں پر جائیں۔ رنگ رلیاں رکھیں، بیویوں کی موجودگی میں اور جو میں نے ایک غریب اہل کتاب کی لڑکی سے نکاح کر لیا تو کیا بات ہو گئی۔ اس برادری میں کتنی میمیں آئی ہیں، ان کو کیوں عاق نہیں کیا گیا۔''

''بیٹے ذوالفقار یہ وقت ان باتوں کا نہیں، اونچی آواز سے بولو گے تو بے حرمتی ہو گی میت کی بھی اور اس کے گھرانے کی بھی'' نرمی سے اس کا بازو پکڑ کر وہ اس کو کوٹھی سے باہر لے آئے۔

سات سال بعد

ایک بار پھر اس کوٹھی میں داخل ہوا تھا جس کی ملکیت کے حق حقوق اور جس میں داخلے کے حق سے اس کو محروم کر دیا گیا تھا۔ آج وہ آیا تھا تو اس کے ساتھ سات سالہ ملک افتخار بھی تھا۔ آج کے داخلے کا سبب بڑی مالکن کی وفات تھی۔ باپ کی میت کو کندھا دینے کے خیال سے وہ ڈرتے ڈرتے، جھجکتے داخل ہوا تھا اور وہاں سے وہ دھکے دے کر نکال دیا گیا تھا۔ پر آج وہ پورے اعتماد اور جمے قدموں سے آیا تھا۔ سیدھا گیلری سے گزرتا ہوا، لاؤنج میں داخل ہوا جہاں کا فرش اٹھا دیا گیا تھا اور جنازہ رکھا ہوا تھا۔ اگرچہ وہ ملک صاحب کے موقع والی رونق نہ تھی پھر بھی گہما گہمی تھی۔ عزیز رشتہ داروں کے علاوہ دو بڑے بیٹوں اور تین بیٹیوں کے سسرالی نا طے دار

سدھیانوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ اس کا گیلری میں قدم رکھنا تھا کہ ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ دونوں بھاوجوں نے تو آگے بڑھنا مناسب ہی نہ سمجھا کہ مورچہ سنبھالنے کو باجی فاخرہ کم نہ تھیں اور صاف بات یہ ہے کہ ان کو تو اس ننھے میں پڑنے کی ضرورت بھی نہ تھی کہ ان کو تو ساس کا چالیسواں کر کے فلائی کر جانا تھا، ایک کو سنگاپور اور دوسری کو نیروبی۔ خاوندوں کے کاروبار ادھر ہی تھے۔ اب امی جی کے بعد اس گھر میں بیٹھنے اور اس کو کھلا رکھنے کی ذمہ داری ان پر اور ان کے نکھٹو شوہر پر ہی عائد ہوتی تھی۔ اس وقت بھی ان کے پلنگ کی پٹی سے لگی بیٹھی سونے کی ان چوڑیوں کو گن رہی تھیں اور ان کا وزن جو کھ رہی تھیں جو امی جی کی چوڑی اور فربہ کلائیوں سے کاٹ کر اتاری گئی تھیں۔ فاخرہ باجی کے نکھٹو اور برادری سے باہر کے شوہر کمروں میں پھر تر کے کمروں میں بچھے قیمتی اور پرانے اور کاشانی قالینوں اور برما اور سنگاپور کی لکڑی سے تیار شدہ فرنیچر کو ابھی سے اپنی ملکیت جان کر اس کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ چھوٹے ملک پر نظر پڑتے ہی انہوں نے باجی فاخرہ کو اشارے سے بلا کر بارعب انداز میں سوال کیا۔ یہ پھر آ گیا۔ آخر اس کو خبر دی کس نے۔ کیوں خبر دینے کی ضرورت کیا تھی۔ بڑے گھرانے کی موت کی خبر اخباروں میں آتی ہی ہے۔ باجی فاخرہ بھی کوئی موقع ان کو یہ جتانے سے نہ چوکتی تھیں کہ وہ بڑے گھرانے کی ہیں اور ان کے نکھٹو خاوند چھوٹے گھرانے کے ہیں۔ ان کے مقابلے کے نہیں۔ یہ کہتی ہوئی باجی فاخرہ نے اشارے سے دونوں بہنوں کو بلایا اور وہ ماں جی کے پلنگ کے ادھر ادھر جا کھڑی ہوئیں تو پھر باجی فاخرہ گرجیں۔

تم کو معلوم ہے ملک ذوالفقار کہ تم اس عاق نامے کی رو سے اس کنبے سے باہر ہو چکے ہو۔ انہوں نے عاق نامہ کی وہ کٹنگ بھری محفل کے سامنے نچائی جو آج سے دس سال قبل مقامی اخبار میں شائع ہوئی تھی اور اب اس وقت ان کے شوہر نے اپنے والٹ سے نکال کر ان کے ہاتھ میں تھمائی تھی۔

''ہاں بالکل جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ عاق نامہ ملک مختار نے دیا تھا، میری ماں نے نہیں جاری کیا تھا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہمارے مذہب میں ایسے عاق ناموں کی کوئی گنجائش نہیں۔ پھر بھی میں اپنے باپ کے فرمان کا پابند ہوں۔'' پھر وہ گرج کر بولا میں اس وقت اپنی ماں کی قدم بوسی کو آیا ہوں جن کے قدموں تلے میری جنت ہے اور اس کے پوتے ملک افتخار کو اس کی دادی کا منہ پہلی اور آخری بار دکھانے لایا ہوں۔'' یہ کہتا ہوا وہ سب کو ہٹاتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے اپنی آنکھیں اپنی ماں کے قدموں تلے لگا دیں، کہنے والے کہتے ہیں کہ اس دم کئی نرم دل بیبیاں اپنے آنچل اپنی آنکھوں پر رکھ کر سسکیاں بھرتی ہوئی باہر کو نکل گئیں۔ پر مالی اور ملکیتی مفادات سے مجبور بہنیں، وہ سپاٹ چہرے اور خشک آنکھیں لئے کھڑی رہیں۔ چھوٹے ملک نے اپنے بیٹے کو ماں کے قدموں میں جھکایا اور اس کا ہاتھ پکڑے باہر نکل گیا۔ تب باجی فاخرہ نے حقارت سے کہا۔

بڑا رام جی بنا تھا۔ بن باس لے کر کیا خیال تھا اس کا کوئی بھرت سنگھاسن پر اس کی کھڑاویں رکھ کر اس کی راہ دیکھے گا۔ تب ماما یوسف اپنے تانبے کی طرح تپے ہوئے چہرے پر سفید برف سی مونچھیں سجائے آگے بڑھے۔ ''فاخرہ بی بی تو فکر نہ کر یہ اب کبھی لوٹ کر نہ آئے گا۔ یہ رام جی نہیں کہ اپنی کھڑاویں چھوڑ کر بن باس کو

نکلے اور چودہ سال گزار کر راج محل کو لوٹ آئے اور وہ بھی مجبوری لاچاری کو۔ دیکھ بی بی کبھی کبھی ہم ہی جیسے عام بندوں میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوتے ہیں جو اپنے ماحول سے اپنے گردو پیش سے گھبرا کر خود رضا سے جوگ لے لیتے ہیں کبھی شاکیہ منی گوتم کے روپ میں کپل وستو کے راج محل سے راتوں رات نکل بھاگتے ہیں اور کبھی ابراہیم ادہم بن کر اپنی بادشاہت چھوڑ چھاڑ کر دریا کنارے گدڑی گانٹھنے جا بیٹھتے ہیں۔ سو بات سن یہ میری بہن کا پوت بھی اپنی رضا سے اپنا مقصد لے بیٹھا ہے۔ بی بی تو سب حق دار بے دھڑک اور بے ور ہو کر اس راج اور سنگھاسن کو سنبھالو۔

کتنی سچ بات کہی تھی ماما یوسف نے۔ اس بات کے پورے بیس سال تک کسی نے ملک ذوالفقار کی جھلک بھی نہ دیکھی تھی۔

اب اس اثناء میں وہ کیا کچھ کرتا رہا تھا اور گزر اوقات کے لیے کیا کیا وسائل اور ذرائع چھوڑتا پکڑتا رہا تھا۔ اس نے اس کام اور پیشے سے کنارہ کیا جس نے اس کو یہ دن دکھائے تھے یعنی اس نے جوکی کے پیشے اور کام کو ترک کیا جس نے اس کو یہ دن دکھائے اور جسے اس نے اپنے خسر پیٹر پال کے گھوڑے سے گرنے اور کام کے قابل نہ رہنے کے بعد اپنا لیا تھا۔

وجہ یہ تھی کہ وہ اب ریس کورس کے ماحول سے اکتا گیا تھا۔ اس کو یہ خیال آتا کہ ایک زمانہ تھا کہ یہاں اس کے گھرانے کے اپنے گھوڑے پلتے اور ریس کے لیے تیار کیے جاتے تھے اور شیلا کا یہ باپ پیٹر پال بڑے ملک صاحب کا بڑا پسندیدہ اور خاص جوکی تھا۔ چھوٹے ملک کو انہوں نے خود اس کی شاگردی میں دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ پھر اسی پیٹر پال کی وجہ سے انہوں نے اس کو عاق نامے کے ذریعے بے دخل کیا۔ گھر سے بے گھر اور محروم آسائش کیا۔ خیر وہ بات تو ملک صاحب اور ملکانی کے مرنے کے بعد آئی گئی ہوئی۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ اس بات نے چھوٹے ملک کا بیڑا ہر طرح غرق کیا۔ ملکانی زندہ تھی تو ہزار دو ہزار چوری چھپے بھجوا دیتی تھی۔ اب تو یہ حال تھا کہ جیب خالی تھی۔ ہاتھ کوئی ہنر تھا نہ ڈگری۔ روز بروز چڑ چڑا اور صورت سے بے صبر ہوتا چلا گیا۔ پیٹر پال کا گھرانہ سوائے شیلا کے اب اس کو ایک ناگوار بوجھ کے طور پر کسی نہ کسی طرح برداشت کرتا تھا۔ اب پیٹر پال کے چارپائی پر پڑ جانے سے تو ہر کسی کو سارا قصور اور ساری خطا اسی کی نظر آنے لگی تھی اور خاص طور پر ساس تو اپنی مخصوص زبان کی ساری ناگفتہ بہ اصطلاحوں کا نشانہ بنائے رکھتی تھی۔ اتنا کہ او بھ گیا۔ پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو بھرے گلے سے شیلا سے کہنے لگا۔ شیلی مجھے احساس ہے کہ میں نے تجھے بھی اپنے ساتھ تختی میں ڈالا ہوا ہے۔ سوچ رہا ہوں تجھے آزاد کر دوں۔ اور تم اپنے گھر والوں کی پسند اور مشورے سے دوسری شادی کر لو۔ پر وہ تو شیرنی کی طرح بپھر گئی۔ "ہونہہ...... سوچ رہا ہوں، بڑا آیا چھوٹا ملک کہیں کا۔ جانتی ہوں اپنی جائداد اور عیش یاد آ رہے ہیں۔ مجھ سے پیچھا چھڑا کر اپنوں سے جا ملو۔ پر یاد رکھنا میں اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی نہیں۔ یہ بتا تو مجھ سے پیچھا چھڑا لے گا اور تیرے کہنے سے میں کسی اور کے گھر بیٹھ جاؤں گی پھر کبھی سوچا ہے اس ملک افتخار

کا کیا بنے گا۔ کہہ سکتا ہے تو یقین سے کہ تیری بہن اور چاچا تائے اسکو بڑے ملک کا وارث قبول کر لیں گے۔ سوچ لو میں عورت نہیں آسیب ہوں۔ اس سے پہلے میں تجھے خود اپنے ہاتھوں سے موت کی نیند سلا دوں گی۔
وہ اپنے مختصر سے سراپا اور نازک سے وجود کے ساتھ اس کے سامنے آگ کی سلگتی ہوئی لاٹھ بنی کھڑی تھی۔ اتنی کہ وہ ہنس پڑا تھا۔ اپنے شدید کرب کے باوجود گلے سے چمٹا لیا تھا۔
''کمینی! پگلی نہیں تو۔ تو مجھے اتنا گھٹیا اور نیچ سمجھتی ہے کہ میں اس بے وفا، ترکے اور وراثت کے لیے اپنی اتنی بڑی دولت چھوڑ دوں گا۔ تو، تو میری محبت کا دریا ہے جس کی موجوں میں سونے کی دھاریں سنگ سنگ چلتی ہیں اور یہ ملک افتخار نہیں موجوں کے دھارے کا پلا ہوا موتی ہے۔ میں اسے ان جھوٹے سہاروں کے بدلے چھوڑ دوں گا۔ اری پگلی محبت کے بوٹے کو تو دکھوں کی کھاد ہی راس آتی ہے۔ اس کے بل پر ہی تو یہ ہونا بنتا ہے۔''
اس کی الجھی ہوئی زلفوں کو اس نے اپنی لرزتی ہوئی انگلیوں سے سلجھاتے ہوئے تسلی دی۔ ''بات یہ ہے میں تیری ماما اور پاپا کی گالیوں اور طعنوں سے گھبرا جاتا ہوں۔''
''بکنے دو سب کو۔ میں خود کتنے ہی دن سے سوچ رہی ہوں۔ ہم اپنے دکھ درد کی تنگی ہیں۔ ان پر بوجھ تو نہیں۔ چلو ہم اپنی چھوٹی سی دنیا کی خود کھوج لگائیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔''
پھر وہ مطمئن ہو کر اپنے اپنے کام بنانے لگے۔ اس تمام دن شیلا کے لبوں پر یہی بول گنگناتے رہے۔
''لٹ الجھی سلجھا جا رے بالم۔''
ہاں تو قارئین یا ناظرین۔
اب اس کے بعد جو ہوا سو ہوا۔ میں اس کی نہ تو عینی شاہد ہوں نہ اس کی تفصیل یا جزئیات کے معلوم کرنے کا مجھے شوق تھا۔ میں تو بس اتنا ہی سن لینا بہت سمجھتی تھی کہ چھوٹے ملک نے پیئر پال کا گھر اس طرح چھوڑا جس طرح روح بیمار جسم کو چھوڑ جاتی ہے۔ پر شیلا اور افتخار ملک تو اس کے جسم و جان کا حصہ تھے۔ سو وہ بھی اس کے ساتھ ہی نکلے۔
اب بے ہنر اور کم سود ملک نے اور دھندا کیا کرنا تھا۔ ایک طرف خاندان کی ساکھ اور وجاہت کا خناس دماغ سے نہ نکلا دوسری طرف پیٹ کا سوال تھا۔ پھر بھی وہ کوئی کھو کھا لے کر تو نہ بیٹھ سکتا تھا۔ بھلے انہوں نے مجھے عاق کر دیا ہے۔ میرا منہ دیکھنا گوارا نہیں پر میں تو ان کی ساکھ اپنے ہاتھوں مٹی میں رول نہیں سکتا۔
سو اب رہ کیا گیا تھا اس کے کرنے کو وہی پھندے بازیاں، جھوٹے اور جعل سازی کے مقدموں میں جھوٹی گواہیاں، جھوٹے حلف اٹھانا بس یہی تو اسکا ذریعہ معاش رہ گیا تھا اور تھا اتنا کٹھور کہ جھوٹے حلف اٹھا کر کبھی اللہ تعالیٰ سے معافی نہ مانگتا۔ کہتا تھا کہ اللہ کو کیا پڑی ہے کہ وہ میری پھندے بازیوں کو بیٹھا معاف ہی کرتا رہے۔ خیر میں اب اتنا بھی بے غیرت نہیں بس جو کماتا وہ کھا پی کر اللے تللے بازیوں میں اڑتا گیا۔ اور شیلا کون سی ایسی گھر گھرہستن تھی کہ آگا پیچھا سوچ کر کچھ جوڑ بچا کر رکھتی۔ وہ تو رئیسوں اور جاگیروں کے درمیان زندگی گزار کر

آئی تھی کہ آ گیا تو لبر مبر نہیں تو فقر فاقہ۔ سو اسی طرح گزر گئی گذران کیا جھونپڑی کیا میدان۔ پر جب ملک افتخار قد نکالنے لگا تو اس کو خیال آنے لگا تھا۔ آج بچہ ہے کل جوان ہوگا بہو آئے گی تو ہمارا تو کوئی ٹھکانہ نہیں۔ سترکی دہائی میں مکانوں کے کرائے اور پگڑیاں اوپر سے اوپر کو جانے لگیں۔ کرایہ نکالنا بھی دشوار ہو گیا۔ ملک کو تو اب مقدموں، پیشیوں کا چسکا لگ گیا تھا۔ ویسے ہی اللہ واسطے گواہیاں دینے لگا تھا اور لوگ تو ذرا پانی ترتا دیکھ لیں۔ ہر کوئی اپنا دکھڑا سناتا اور ملک جی کا دل پسیج جاتا۔

ملک افتخار، پڑھنے میں خاندانی طور پر ڈل اور کوڑھ مغز تھا۔ کچھ کر ہی نہ پا رہا تھا تو اسکو مجبوراً ایک ورکشاپ میں ڈال دیا۔ ان دنوں فیکٹریاں اور کارخانے دھڑا دھڑ بند ہو رہے تھے۔ تالہ بندی عام تھی، نہیں تو ڈھنگ ٹھکانے کی کوئی نوکری لگ ہی جاتی۔ اپنے کارخانے بند کر کے حکومت بیروزگار ہنرمندوں سے نجات پانے کے لیے ان کو دھڑا دھڑ دبئی کے ویزے دے دے کر سر سے بلا ٹال رہی تھی۔

سو ملک افتخار بھی سولہ سال کی عمر میں ٹل گیا۔ ورکشاپ میں اچھا خاصہ کام سیکھ لیا تھا۔ اب شیلا کو یہی رٹ لگ گئی کہ گھر ہوتا تو اس کا گھر بسا دیتے۔ ہم نے تو اپنی بے گھری کے خیال سے اس کے سوا دوسرا بچہ پیدا نہ کیا۔ اب کیا اپنی نسل بھی نہ آگے آنے دو گے۔ اب میں کسی سلم (Slum) میں تو جا کر رہنے سے رہا۔ وہ یہی جواب دیتا۔

ارے تو یہ جو تمہارے اتنے بڑے بڑے گراونڈ خالی پڑے ویران ہو رہے ہیں، کتے لوٹ رہے ہیں۔ تم اس کے کسی کونے میں ایک جھگی بھی نہیں ڈال سکتے۔

تو جانتی تو ہے کہ تیری وجہ سے بڑے ملک صاحب نے میرا عاق نامہ جاری کر دیا۔ بس یہی ایک بات تو تھی جو شیلا کو کھا جاتی تھی۔ جہاں تک چھوٹے ملک کی بات تھی وہ بھی درست تھی اس نے اول تو کوئی کام ٹک کر کیا ہی نہیں اور جو کوئی چھوٹے بازی یا الٹ پلٹ کام کرتا بھی تو بس پیٹ بھر روٹی ہی کھانے کو کما لیتا۔ ادھر باجی فاخرہ کے نکھٹو شوہر کو اللہ نے لمبی حیاتی اور لمبی فرصت دی تھی۔ اب بڑے ملک اور ملکانی کی کوٹھی پر باجی فاخرہ اور ان کے شوہر ہی مقیم تھے، مدت سے، یعنی باقی تین بھائیوں کے ملک سے باہر کینیڈا، سنگاپور اور ہالینڈ جا کر بسنے کے بعد اور باجی فاخرہ کے شوہر اتنے سمارٹ کہ ان بیس سالوں میں انہوں نے ایک دن بھی ایسا گزرنے نہ دیا کہ اس منحوس عاق نامے اور ملک کا ذکر نہ کرتے ہوں اور جب سے ملک افتخار نے قد نکالنا شروع کیا تو باجی فاخرہ بھی چوکنی ہونے لگیں ہر روز جانماز پر بیٹھ کر دردناک آواز میں سارا قصہ دہرا کر شیلا کو بددعا دیتیں۔

شیلا بندی تیرا ککھ نہ رہے۔

یہ بات شیلا تک پہنچی تو وہ ہنس کر بولی۔ ''میرے پاس ہے کیا سوائے ان دو باپ بیٹیوں کے۔ سو وہ بھی میرے تو نہیں ان ہی کا مال ہے۔ ان کے باپ دادا کی نسل ہے پر جن کا مال تھا ان کا یہ حال کہ باجی فاخرہ کو یہ بھی گوارا نہ تھا اس علاقے کی بالشت بھر زمین پر بھی ملک افتخار کا پیر پڑے۔ وہ جب بھی چھوٹے ملک یا اس کے

بیٹے کو اس علاقے کے آس پاس منڈلاتے دیکھتی تھیں، جو کیں اٹھنے لگتی تھیں ان کو، گھڑی گھڑی لوٹا اٹھائے غسل خانے کی طرف دوڑ نے لگتیں۔

چھوٹا ملک بھی ایک ضدی۔ آخر کو اس کے کان میں بھی ہر ایک بات پڑتی تھی اس نے بھی قسم کھائی تھی کہ کٹیا ڈالوں گا تو اسی گھر کے سامنے۔ سو اس نے ملک افتخار کو ایئر کنڈیشن اور ٹی وی کی مرمت کا کچا پکا کام سکھا کر قرض وا کر کے کویت بھجوا دیا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ شیلا کے لاڈ پیار نے زلفی کو ایسا بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بھیجے ہوئے پہلے دو ڈرافٹوں کی رقم سے اس نے کوٹھی کی بغل میں ابھرنے والی نئی آبادی میں تقریباً دو مرلے زمین خرید لی۔ تقریباً دو مرلے پورے تو کیا تھے کرتے کی کلی کی صورت میں ایک آڑا ترچھا قطع زمین تھا جس پر اس نے بڑی محنت اور دماغی کاوش سے چھوٹی سی بنگلہ نما کٹیا بنا ڈالی تھی۔ ان دنوں اس نے لگاتار اتنی محنت سے ہر قسم کا کام دل لگا کر کیا جتنا زندگی بھر نہ کیا تھا۔

اس طویل داستان نما قصے کو لپیٹنا اس طرح سے پڑے گا کہ پہلے تو یہ بتانا پڑے گا کہ چھوٹے ملک کے اس فعل سے سب سے زیادہ اپ سیٹ جو شخص ہوا وہ باجی فاخرہ اور ان کے نکھٹو گھر جوائی قسم کے شوہر تھے۔ باجی فاخرہ دن میں کئی بار اپنی رانوں پر ہاتھ مارتیں وہ بھی جانماز پر بیٹھ کر۔ آئے ہائے اس کو کس نے یہ صلاح دے دی۔ یہ تو ہماری ہی چھاتی پر مونگ دلنے آن بیٹھا۔ وجہ بے چینی کی یہ تھی وہ خود بڑی مالکن کے مرتے ہی نئی نویلی کوٹھی میں آن بیٹھی تھیں۔ شوہر ان کے بڑے ملک صاحب کی شیورلیٹ سے لے کر چھوٹی بڑی تمام گاڑیاں اڑائے پھرتے تھے۔ لڑکے ان کے خود اپنی گاڑیاں چڑھ کر کالجوں میں پڑھنے جا رہے تھے اپنے خیال میں۔ جبکہ چھوٹے ملک کا اکلوتا بیٹا اسی علاقے کے سامنے والی سڑک کے اس طرف ورکشاپ میں گاڑیوں کی مرمت کا کام سیکھتا تھا۔ اور وہیں سے اٹھ کر کویت یا دبئی پہنچا تھا۔

چھوٹا ملک اور شیلا، ملک افتخار کی ملازمت اور اپنی معمولی سی اوقات پر اس حد تک مطمئن ہو گئے کہ وہ اس کی فوری شادی کی بات کرنے اور سوچنے لگ پڑے تھے۔ باجی فاخرہ اس سب سے بے خبر تو نہ رہ سکتی تھیں۔ ایسی خبریں دھوبی مالی اور ڈرائیور کی اہل خانہ یعنی گھر والیوں کی زبانی پہنچتی ہی رہتی تھیں اور یوں ان کی وحشت اور بے کلی بڑھتی ہی جاتی تھی۔

اللہ خیر کرے اب یہ اس علاقے اور زمین پر بیٹھ کر اپنی فصل بوئے گا اور نسل اٹھائے گا۔ سب اس درجہ بے کلی کا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بڑے بھائی جو شروع سے زمینوں کی آبادی کے لیے وہیں جا بیٹھے تھے کبھی کبھار آتے تو ان کے منہ سے یہ نکل جاتا کہ بھائی ابا جی نے چھوٹے ملک کو عاق کیا تھا پر اس کی اولاد کس طرح عاق نامے کی زد میں آسکتی ہے وہ تو..... وہ بات نہ کر پاتے کہ باجی فاخرہ اور ان کے میاں اتنا بولتے اتنا بولتے کہ وہ سختی سے منہ بند کر لیتے تھے۔ ویسے بھی وہ اور ہی رستے پر چل پڑے تھے۔ داڑھی چھوڑ لی تھی وہ بھی بگلے کا پر نظر آتی۔ مسجد جا کر باجماعت نمازوں پر اصرار کرنے لگے تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ تو اب گھر میں لٹھے کی تہ بند باندھ کر پھرنے لگے

تھے۔ تینوں بیٹے باہر نکل گئے تھے، کوئی ڈاکٹر کوئی انجینئر بن کر کینیڈا، جاپان اور کوریا کے عوام کی خدمت کرنے۔ بیٹیاں خود انہوں نے جان بوجھ کر باہر کے لڑکوں کو بیاہی تھیں۔

ان کی حیات بے ثبات کے یہ تمام ویک پوائنٹ باجی فاخرہ کے شوہر کی نوک زبان پر تھے سواب وہ دل کھول کر ان کا نفسیاتی تجزیہ کرتے رہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ وقت سے پہلے ہی senile ہو چکے ہیں

باجی فاخرہ کی دہشت یوں بڑھی کہ جب انہیں اطلاع ملی کہ ان کا بیٹا چھٹی پر آئے گا تو شیلی اپنے بیٹے کا بیاہ رچانے کی اس خاندان کے حوالے سے۔ اسی دہشت کے عالم میں انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب وہ یہ کوٹھی بند کر کے اپنے ڈیفنس والے بنگلے میں منتقل ہو جائیں گی جو ان کے شوہر نے چھوٹے ملک کے حصے کی دو کنال زمین بیچ کر اس کے حصہ کی فصلوں سے آنے والی رقم سے تیار کروائی تھی۔

افتخار کی شادی کا قصہ بھی بڑا عجیب اور باجی فاخرہ کے لیے دل شکن تھا..... وہ ہوا یوں کہ ایک سال پہلے کی بات ہے کہ ایک روز ذوالفقار ملک (وہ اپنے کو ملک نہیں کہلواتا تھا اور اس کی اس حرکت پر باجی فاخرہ کے شوہر حد سے زیادہ مطمئن ہوئے تھے) ہاں تو ہوا یہ کہ کسی سوچ میں گم کچھ آزردہ سا چلا جا رہا تھا کہ ایک ٹیکسی سے کسی نے ہاتھ نکال کر اشارے سے روکا اور اگلے ہی لمحے جو شخص ٹیکسی سے کود کر باہر آیا وہ ملک نسیم تھا اس کے چاچے کا بیٹا۔ پچھلے بیس برسوں سے جرمنی میں رہ رہا تھا۔ صرف ایک بار اپنے ابا جی کے مرنے پر آیا تھا۔ اپنی عاق شدگی کی بنا پر ذوالفقار چاچا جی کو گھر بیٹھ کر ہی رو لیا تھا۔ یہ تجربوں کی بنا پر چاچا جی کو کندھا دینے کی جرات نہ کر سکا تھا۔ اگرچہ بچپن میں چاچا جی کا بڑا لاڈلا رہا تھا۔ لڑکپن میں ملک نسیم ہی اس کا بانی تھا۔ ٹیکسی سے باہر نکلتے ہی اس نے ذلفی پر چھاپا ڈالا اور بڑی دیر پرنم آنکھوں سے اس کو گلے لگائے کھڑا تھا۔ کچھ دیر گم سم رہنے کے بعد چھوٹے ملک نے زبان کھولی۔ سناؤ ملک نسیم کیا حال ہے۔ تو اپنی کہہ یار۔ بہت ماڑا ہو گیا ہے۔ چل نا تو کہاں رہتا ہے وہاں لے چل مجھے تو کوئی بات ہو۔ ہاتھ پکڑ کر ٹیکسی میں بٹھایا اور بولا بن دس کتھے چلیے۔

''ارے ملک نسیم تو ابھی بھی پنجابی وچ گلاں کر سکنا ایں''، حیرت سے ایک تک اس کو دیکھا تو وہ افسردگی سے ہنس پڑا۔ اردو، پنجابی، پشتو جو مانگو حاضر مال ہے۔

ملک نسیم اپنے ساتھ کھیلے کودے چھوٹے ملک کا کلی نما قطعہ زمین پر بنا ہوا بنگلہ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ شیلا نے اپنی ساری تخلیقی قوتوں کو استعمال کر کے اس بنگلے کو سجایا تھا۔ ٹین کے سائبان کے چوبی ستونوں پر خوبصورت بیلیں لپٹی ہوئی بڑی خوش گوار لگ رہی تھیں۔ ملک نسیم نے شیلا کے آگے قدرے جھک کر سلام بھابی جی کہا تو شیلا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، زندگی میں پہلی بار اس خاندان کے کسی فرد نے اس کو بھابی جی کے نام سے مخاطب کیا تھا۔

آدمی کا دل بھی کتنا نازک اور تھوڑا ہوتا ہے۔ پھر دونوں بہت تنگ، تاریک اور مختصر سے ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ مدتوں کے بعد چھوٹے ملک کو کسی نے خونی رشتہ کے ناطے پہچانا..... اور اس کے گھر تک بن بلائے

آیا بھی۔ اس واردات نے اس کو گم سم کر چھوڑا تھا۔ اچھا بیٹے کی سناؤ۔ نسیم نے ہی ابتدا کی۔ ''کویت میں ہے۔''
بھرے گلے سے مختصر جواب دیا۔ اچھا سیٹ ہے نا؟ اچھا کما رہا ہے۔
''ہاں بس کچھ دال روٹی کا سہارا ہمیں بھی دے رہا ہے۔''
میں نے تو اس کو بہت ہی چھوٹا سا دیکھا تھا جب تم چاچی جی کے جنازے پر لائے تھے۔''
کمرے کے کونے والی شیلف پر اس کی تصویر فریم میں لگی ہوئی تھی۔ اچھا نوجوان نکل آیا تھا' وہی خاندانی قد کاٹھ، وہی موٹی موٹی سی آنکھیں اور گھنی سیاہ مونچھیں ..... چھوٹے ملک نے اشارے سے کہا'' یہ تصویر ابھی کویت سے ہی بھیجی ہے۔''
ہونہہ! ہونہہ ملک نسیم بے چینی سے اپنے دونوں گھٹنے ہلاتا رہا۔ باتوں کے لیے دونوں کے پاس رکھا ہی کیا تھا۔ وہ لڑکپن کا جو لنگوٹیا پن تھا وہ تو ایک جرمنی ہی کی گردشوں کی بھینٹ چڑھا چکا تھا۔ دوسرا جو تھا اس نے وطن میں رہ کر ٹھوکروں اور نفرتوں کی نذر کر دیا تھا۔ بس چپ بیٹھے رہے۔ اس چپ کو شیلا نے آ کر توڑا۔
''کھانا لگ گیا ہے ملک جی'' آج اس کے چہرے پر نئی نویلی دلہن والا روپ تھا جس کے گھر پہلے پہل کوئی سسرالی آیا ہو۔
چھوٹی سی میز پر کھانا اتنے سلیقے سے چنا گیا تھا اور وہ بھی انتہائی لذیذ..... کوفتے، کڑھی اور مٹر پلاؤ۔ اس گھر کا رکھ رکھاؤ اور کھانا پینا ملک نسیم کو ایسی طمانیت کا احساس دلا رہا تھا جیسے اس نے پالا مار لیا ہو۔
''آپ بے اطلاع آئے ہیں۔ ہم آپ کی خاطر ہی نہ کر سکے۔'' شیلا جھینپ رہی تھی۔
''ارے ارے بھابی اور خاطر کیا ہوتی ہے۔''
''نہیں بھئی تم لوگ جرمنی میں اتنا اعلیٰ درجے کا کھانا کھاتے ہو۔ یہ تو مجھے بھی پتا ہے ہم لوگ تو بس پیٹ ہی بھرتے ہیں۔'' چھوٹا ملک بھی جھینپ رہا تھا۔
''کمال بات کرتے ہو یار اپنے گھر کے کھانے کی بات ہی اور ہوتی ہے اور یہ تو اتنا نفیس کھانا تھا۔''
ہاتھ دھوتے دھوتے ملک نسیم نے دل کی بات کہہ ڈالی۔ ''یار ذلفی افتخار مجھے دے دے۔'' ملک ذوالفقار حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا تو وہ خود ہی بولتا گیا۔
سارہ اب سولہ سال کی ہو گئی ہے۔ یار میں نے اس کو بڑے دھیان سے پالا ہے۔ اس کی ماں تھی تو جرمن ایک ہوٹل کی ویٹریس تھی پر اچھی عورت تھی۔ سارہ آٹھ سال کی تھی جب نورا فوت ہوئی، سوتیلی ماں بھی جرمن ہے۔ یار میں تو حیران ہوں یار یہ جرمن عورت بھی عجیب ہے اپنا بچہ پیدا کرنے سے بھاگتی ہے پر دوسرے کا بچہ ایسے پیار سے پالتی ہے۔ سارہ اتنی اچھی اور صورت دار نکلی ہے۔ بڑے لڑکے منڈلاتے ہیں۔ اور کم بخت سوتیلی کہتی ہے کیا حرج ہے۔ اس کی ماں بھی تو جرمن تھی۔ اب میں اس چکر میں آیا ہوں تو برادری بھر منہ بناتی ہے۔ اس کی ماں ہوٹل میں کام کرتی تھی۔ وہاں کی عورتیں ایسی ویسی۔ ان کے چہروں پر اُگی نفرت اور حقارت کی فصلیں

دیکھ کر مجھے یہی خیال آتا ہے۔ کہ تمہارے بعد اس برادری کی کالی بھیڑ میں ہی تو ہوں۔

بس اسی قسم کی الٹی الٹی باتیں کر کے رشتہ طے ہو گیا تھا اور یہ بات قرار پائی تھی کہ جیسے ہی ملک افتخار چھٹی لے کر آئے گا ادھر سارہ کا باپ اور متبنیٰ ماں اسے لے کر آجائیں گے۔ بس یہی خبر باجی فاخرہ کی بے کلی اور وحشت کا سبب بنی۔ ان کی اپنی تو کیا سوچ ہوتی۔ ان کے شوہر نے بتدریج ان کی برین واشنگ شروع کر دی۔ دیکھ لینا ...... یہ ملک نسیم کی بیٹی ہی افتخار کو چڑھائے گی۔ یہ چھوٹے ملک کی چال ہے۔ کبھی کہتا بھئی اللہ ملائی جوڑی ایک اندھا دوسرا کوڑھی ..... ملک ذوالفقار نے جوڑی گھر میں ڈالی تو ملک نسیم نے ہوٹل کی خادمہ ..... گھر بسائی اس پر تو باجی فاخرہ بھی برا مان گئی تھیں اور چیخ کر بولی تھیں اور جی اب آپ ایسا بھی نہ کہیں۔ وہ گھر ڈالی نہیں ہے باقاعدہ نکاح کیا ہے زلفی نے، وہ مسلمان ہوئی تھی۔

اس پر وہ کمینگی سے ہنسنے لگتے۔ ”اور وہ تمہاری جرمن بھرجائی ..... سارہ کی ماں ..... سنا تو ہے گرجا میں نکاح کیا تھا نسیم نے بھئی ہیں تو اہل کتاب۔“ وہ پھر نہایت کمینگی سے قہقہے لگانے لگتے۔ ہنس ہنس کر کہتے دیکھ لینا ولیمہ اسی کوٹھی میں ہوگا۔

مارے ہیبت کے باجی فاخرہ نے فیصلہ کیا اور ڈیفنس منتقل ہو گئیں۔

سارہ مشرق اور مغرب کا بڑا شاداب اور رسیلا امتزاج تھی۔ ملکوں کی توقع کے خلاف کسی کو کانوں کان پتہ نہ چلا، ملک نسیم سارہ اور متبنیٰ ماں ریتا کو ساتھ لا کر چھوٹے ملک کے اسی چھوٹے سے مختصر بنگلہ نما مکان میں اترے۔ نکاح ہوا اور برادری کے راندے ہوئے دو بھائی ایک نئے رشتے میں منسلک ہو گئے۔

دو ماہ وطن میں گزار کر جب وہ رخصت ہونے لگے تو متبنیٰ سارہ کو گلے سے چمٹا کر پھوٹ پھوٹ کر روئی، سسکیاں بھرتی، ائیر پورٹ کو گئی۔ سارہ نے ساس کو بتایا میں آٹھ سال کی تھی جب سے ممی نے مجھے اپنے دل سے لگا کر پالا ہے۔

وہ متبنیٰ رخصت ہوتے وقت سارہ کو چمٹا کر ٹھیک ہی پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ وہ بار بار کہتی تھی کہ نسیم نے غلط فیصلہ کیا "لڑکے کو ساتھ لے جانے کی بات کرتے، لڑکا تو اچھا تھا بلکہ اچھا ہونے سے بہت زیادہ اچھا۔ اور سعادت مند اتنا کہ اسی بات نے اس کا اور اس کے بچوں کا مقدر پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

ساس بنتے ہی شیلا کے اندر سے پوری کی پوری ساس باہر نکل کر آ کھڑی ہوئی تھی۔ پہلے تو جیسے اس نے آزاد پھر چڑیا کے پر کھینچ لئے۔ اتنا گھونٹ کر رکھا کہ جیسے کابک میں بند کر چھوڑا ہو۔ لڑکی اتنی سادی اور بھولی تھی کہ اسے یہ سب بھی اچھا لگتا تھا ایک تو اس کے ہونٹوں پر ہر وقت ہنسی ہی کھیلتی تھی۔ پھر جب شیلا نے حکم صادر کیا کہ کوئی نہیں باہر جانا۔ اپنے دیس میں کوئی کمی نہیں ہے کیا روٹی پانی کی کمی ہے۔

بس یہی وہ گھڑی تھی جب ملک ذوالفقار کے زوال اندر زوال کی گھڑی آ گئی۔

یہ بات تو اول دن سے ملک کے جی میں تھی کہ دیکھ لینا اسے اپنے حصے کی زمین کا کوئی نہ کوئی ٹکڑا

باقاعدہ اسٹامپ اور رجسٹری کے ذریعہ خرید کر رہوں گا۔ ظاہر ہے وہ بھی اسی بڑی بوٹی سے بنا تھا۔ اپنی اس حسرت کی تکمیل کے خیال سے اس نے وہ وہ کام کیے جن کو پھڈے بازی کہا جاتا ہے۔ اور اس طرح وہ اپنی زمین کا ایک قطعہ خریدنے میں کامیاب ہوا۔ دن رات کی محنت اور خود اپنے ہاتھوں سے راج اور مزدور کا کام کر کے اس نے ورکشاپ کا ڈول ڈالا۔ قصہ پیچیدہ، طویل اور غیر دلچسپ ہے۔ دلچسپی کا امر صرف یہی ہے کہ یہ بات باجی فاخرہ کے میاں پر بڑی شاق گزری تھی اور انہوں نے خود اپنے ہی سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی کہ میں ایک نہ ایک دن ملک ذوالفقار کو اس جگہ سے بے دخل کر کے رہوں گا۔ کروں گا تو ضرور مگر ذرا ٹھہر کر۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کو چوٹ ذرا گہری لگے اس لیے اس کا کام چمک جائے اس وقت چوٹ لگاؤں۔ ایک بار بوڑھے ڈرائیور نے جوان کی یہ لاف زنیاں سن سن کر تنگ آ گیا تھا، ان کو مشورہ دینا چاہا چھوڑیں ملک جی اب اتنا وقت گزار لیا ہے۔ چھوٹا ملک بھی اسی گھر کا بیٹا ہے۔ اتنے بڑے رقبے سے اگر آٹھ دس مرلے اس کے کام آ جائیں تو آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ کی بیٹی ڈاکٹر لگی ہے۔ ایک بیٹا کینیڈا اور دوسرا نیوزی لینڈ میں بسا ہوا ہے۔ چھوٹی بیٹی آپ کی سعودی عرب میں ماسٹرنی لگی ہے۔ اب اگر یہ بھی چار پیسے کما لے گا تو آپ کا کیا حرج ہے۔

یہ سنتے ہی باجی فاخرہ کے میاں بھڑک اٹھے۔ ''رحمت علی یہ ہمارے خاندانی معاملات ہیں، تم ان باتوں میں نہ ہی بولو تو ٹھیک ہے۔ یہ ہے کہ بڑے ملک صاحب نے اس کو جب عاق کر دیا تو بس۔ اب یہ عاق ہی رہے گا نہیں تو ان کی روح بے چین ہوگی اور میں ان کو دکھ نہیں دوں گا۔

ان کی یہ باتیں سن کر تو باجی فاخرہ تنک مکدر ہو جاتیں اور کہتیں۔

''چھوڑیں ملک جی اب اس نمانے کا پیچھا چھوڑ دیں۔ دیکھیں آپ اپنے بچوں کی خیر مانگیں۔ آپ کی بڑی بیٹی وہاں زنجبار میں بے اولاد پڑی ہے کہتے ہیں کسی کالی بچی کو گود لے لیا ہے۔ چھوٹی کو آج تک بر نہیں ملا۔ عمر نکل گئی ہے۔ اور بڑے بچے کی دونوں بیٹیاں، اسے کیا کہتی ہیں بیک ورڈ ہیں۔ پاگل ہی کہتے ہیں نا ایسوں کو۔ اس سے اچھا تو چھوٹے ملک کا اقتدار ہی ہے چھ سال میں چار بچے بیٹ لیے ہیں اور کس اچھی طرح سارو پال رہی ہے۔ یہ گھوڑا سا قد نکالا ہے اور آپ کو ویسے ہی بلڈ پریشر رہتا ہے۔ اور مجھے تو یہ نگوڑا جوڑوں کا درد لے بیٹھا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اب تو مجھ سے یہ اتنی لمبی چوڑی ڈیفنس کی کوٹھی بھی نہیں سنبھلتی'' پہلے تو ان کا یہ تھا کہ ان کے شوہر ان کی داب میں رہتے تھے۔ پر ماکائی کے مرنے کے بعد اور دو بھائیوں کے باہر چلے جانے کے بعد وہ چوڑ ہونے لگے تھے۔ بڑے پا جی حج کے بعد سے اب اپنی زمینوں کے سوا کسی چیز سے کوئی سروکار رکھتے نہ تھے۔ سو اب اس کوٹھی اور زمین کے وارث اور مالک مطلق وہ اپنے آپ کو ہی سمجھتے تھے۔ اور پھر انہوں نے تو اپنے منہ پر ہاتھ پھیر کر ہی کہہ دیا تھا کہ ملک ذوالفقار کو ایک نہ ایک دن اس ورکشاپ والے ٹکڑے سے بے دخل کرتا ہے۔

وہ بارہ جنوری کا بہت سرد دن تھا جب دیوانی کے ایک اہلکار نے آ کر ملک ذوالفقار کو عدالت میں پیشی کا سمن اور ورکشاپ سے بے دخلی کا حکم پکڑایا۔ ورکشاپ میں دھکا دھک مشین چل رہی تھی۔ ورکشاپ کے

دروازے کے ساتھ لوہے کی کرسی ڈالے ملک ذوالفقار خود بیٹھا تھا، ٹین کے سپاہی کے انداز میں اکڑا ہوا۔ بڑے وقار اور متانت سے اس نے عدالت کا وہ حکم نامہ وصول کیا جس کی عدم تعمیل کی رو سے اس کی گرفتاری عمل میں آ سکتی تھی۔ کرسی سے اٹھ کر اندر گیا، تینوں کاریگروں کو فوری طور پر باہر جانے کو کہا۔ مشین بند کروائی۔ کاریگر باہر آئے تو گیٹ کو تالا لگا کر، گھر آ گیا۔

گھر میں شاشا کی سالگرہ کا اہتمام تھا۔ چھوٹے سے میز جیسے میٹر جتنے بنگلہ نما گھر کو جھنڈیوں اور غباروں سے سجایا گیا تھا۔ سارہ اوون سے وہ کیک نکال رہی تھی جو متبنّیٰ ماں ریٹا نے اسکو بیک کرنا سکھایا تھا۔ سارا گھر کیک کی خوشبو سے مہکا ہوا تھا۔ شیلا اپنے روایتی غصے کے مطابق جی بی جوڑا باندھے گیس کے ہیٹر کے پاس بیٹھنے کے باوجود سردی سے نالاں تھی۔

کیک کٹنے سے لے کر ہر رسم پورے اہتمام سے ادا ہوئی۔

رات گئے ملک نے بڑی خاموشی سے شیلا کو سمن دکھایا۔ اور اس کا چہرہ پیلا پڑنے لگا تو وہ ڈانٹ کر بولا۔ مجھے بزدلی اچھی نہیں لگتی۔ وہ یوں اکڑا ہوا بیٹھا تھا گویا کسی اسٹول پر نہیں وقت کے گھوڑے پر سوار جوگی بنا بیٹھا ہو۔

اری احمق باری تو میری اب آئی ہے، اب یہ میری کرنی دیکھیں گے۔

سارہ کے باپ کی وفات کی عین ان دنوں میں خبر آئی تھی جب اس گھرانے میں بچوں کا دودھ تک بند کر دیا گیا تھا۔ وہ کالی چائے رات کی روٹی سے کھا کر اسکول جا رہے تھے۔

باجی فاخرہ کے میاں کو ملک نسیم کی وفات سے بڑی طمانیت ملی۔ اب وہ امداد بھی بند ہوئی جس کے بل پر چھوٹا ملک پیشیاں بھگتتا تھا۔

چھوٹا ملک اتنا چپ اور خاموش تھا کہ شیلا تو شیلا، افتخار کو بھی تشویش تھی کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

ہر طرح کے کاغذات مکمل ہو لیے تو ملک نے شیلا کو بتایا کہ یہ مکان اور ورکشاپ بک گئی ہے۔ کل ہم کو یہ گھر چھوڑ دینا ہے تم سفر کی ہلکی پھلکی تیاری کر لو۔ مگر ہم جائیں گے کہاں۔

تو ملک نے سارہ کی متبنّیٰ ماں ریٹا کا خط کھول کر اس کے سامنے ڈال دیا جس میں اس نے لکھا تھا۔

''میں یہاں بہت تنہا ہوں۔ اگر تم لوگ آ سکو تو یہاں آ جاؤ ورنہ سارہ اور بچوں کو بھیج دو۔ آ کر وہ کہاں تک اپنی نا کردہ خطاؤں کی سزا بھگتیں۔''

یہ خط ریٹا نے آٹھ دس ماہ پہلے لکھا تھا۔ بس اسی دن سے ملک نے تیاری شروع کر دی تھی۔

جاتی بہار کا آخری ہفتہ تھا جب باجی فاخرہ کے میاں ملک ریاض ورکشاپ پر چسپاں بڑے سے کاغذ پر تحریر کو دیکھ کر ٹھٹکے۔ کاغذ پر لکھا تھا۔

منکہ ملک ذوالفقار ولد فلاں ولد فلاں..... اعلان کرتا ہوں کہ اگرچہ میرے نزدیک مذہب کی رو

سے اس عاق نامے کی کوئی حیثیت نہیں تھی نہ ہے، تاہم میں اب تک اس ملکیت اور زمین کا مالک تھا۔ اپنے قانون کے تحت، مسترد کرنے کے باوجود، آج اپنی اس ملکیت اس زمین اور جائداد کو خود عاق کرتا ہوں۔ اپنے تمام حقوق سے دستبردار ہو کر اس ملک کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اور اس طرح کے جانے کا نام ہی ہجرت ہے۔

ملک ریاض اس تحریر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اگرچہ وہ اب اس وقت اپنی زوجہ باجی فاخرہ کو انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں داخل کرا کے آیا تھا، تاہم اس کے چہرے پر عجب طرح کا سکون تھا۔

ختم

دو اینٹوں کی کہانی

مسعود مفتی

میں اس بات کی تو تصدیق کر سکتا ہوں کہ ۱۹۵۵ء میں گورنمنٹ کالج، لاہور کی پرانی چار دیواری از سر نو بنائی گئی تھی کیونکہ ان دنوں میں خود اس کالج میں پڑھتا تھا۔ مگر اس ساری کہانی کی تصدیق نہیں کر سکتا۔ ویسے عام تاثر یہی ہے کہ اس دیوار میں چنی ہوئی دو اینٹوں کی یہ کہانی بالکل سچ ہے۔ اب سائنس سے لبریز اکیسویں صدی میں آپ سچائی کی سند مانگیں گے مگر میرے پاس صرف وہی سند ہے جو چار صدیاں پیشتر ولیم شیکسپیئر نے اپنے ڈرامے ہملٹ میں دی تھی کہ ہمارے مبلغ علم کے علاوہ بھی کائنات کی وسعتوں میں بہت کچھ ہے۔

(THERE ARE MORE THINGS IN HEAVEN AND EARTH THAN ARE DREAMT IN YOUR PHILOSOPHY)

کالج کی یہ چار دیواری بھلے وقتوں میں بنائی گئی تھی۔ بھلے وقتوں سے مراد یہ کہ ۱۹۵۵ کا پاکستان واقعی بہت اچھا ملک تھا۔ آج کے تاریک حالات سے اتنا مختلف کہ آج کا طالبعلم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ نہ مہنگائی، نہ ڈاکے، نہ خون، نہ ماحول سے بیزاری۔ یعنی جو اب ہے، وہ تب نہ تھا۔ اور جو تب تھا، وہ اب نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھ لیں کہ جاگیرداری نظام اوپر ہی اوپر تھا۔ مگر ابھی ہمارے پاؤں کی زنجیر نہ تھا۔ اور اسے مضبوط تر کرنے والے فوجی آمروں سے ابھی قوم کی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ اس لئے وہ دن ملک کے لیے بھی بڑے بھلے تھے۔ اور یہ کالج بھی بڑا مستعلیق ادارہ تھا۔

اس کا ایک واضح ثبوت تو یہ بھی ہے کہ ۱۹۵۵ کی عمدہ تعمیر کے بعد یہ چار دیواری پینتالیس برس بعد بھی قائم ہے۔ یہ نہیں کہ ان دنوں بنوانے والوں اور بنانے والوں میں کمیشن نہیں چلتی تھی۔ مگر اس زمانے میں وہ صرف اتنی رشوت یا کمیشن لیتے تھے جیسے کوئی سیر بھر دودھ کے اوپر سے بالائی کی پتلی جھلی اتار کر چپکے سے کھا جائے۔ آج کل کی طرح نہیں تھا کہ بالائی کھا کر دودھ بھی پیا، برتن بھی سرعام نیلام کیا اور ساتھ احتساب کی خوبیوں پر لیکچر بھی دیئے گئے۔

اسی فرق کی وجہ سے چار دیواری کا کام اتنا اچھا ہوا تھا کہ بیسویں صدی مکمل ہونے تک وہ قائم تھی۔

۳۱ دسمبر۔ ۱۹۹۹ کو ساری دنیا کے ساتھ اس کالج میں بھی نئی صدی اور نئے ہزاریے کا جشن منایا گیا۔ اس شام کسی من چلے نے ترنگ میں آ کر اپنی کار کی ٹکر چار دیواری کے مین گیٹ سے مار دی۔ خوش قسمتی سے زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ لوہے کے گیٹ کا تھوڑا سا حصہ ٹیڑھا ہو گیا اور لال اینٹوں کے جس چوکور ستون میں اُس کی چولیں نصب تھیں، اس کی چند اینٹیں اکھڑ کر نیچے گر پڑیں۔

کالج کی فرض شناس انتظامیہ نے اگلے ہی دن ایک مستری کو بلایا جس نے معمولی اور چھوٹا کام ہونے کی وجہ سے ناک بھوں چڑھایا۔ پہلے تو بالکل راضی ہی نہ ہوا۔ پھر چھوٹے کام کی بڑی اجرت مانگی۔ کام سرکاری ہونے کی وجہ سے وہ فوراً قبول ہو گئی۔ اس نے پٹ سن کے تھیلے میں سے اوزار نکالے۔ انہی پرانی اینٹوں کی ناہموار سطح پر تیشی کی مسلسل دھیمی ضربیں لگائیں۔ جن سے پرانی سیمنٹ کے چھوڑے ایسے جھڑتے گئے جیسے پرائمری سکول کا صحن چھٹی کی گھنٹی کے فوراً بعد بچوں سے خالی ہو جاتا ہے۔ پھر اس نے کانڈی سے تگاری میں ریت اور سیمنٹ ملائی۔ گیلا مصالحہ جمایا اور پرانی اینٹوں کو بھگو کر، رگڑ کر اور جوڑ کر چوکور ستون دوبارہ کھڑا کر دیا۔

مستری کا کام تو بہت اچھا تھا۔ اینٹیں بھی موتیوں کی طرح جڑ گئی تھیں۔ مگر انسان کا ہنر، لیاقت اور نظر بھلا کو اکب تک کب پہنچی ہے۔ اس لئے گو مستری کی روایت ہنر مندی کے مطابق کوئی بھی غلط چیز نہ ہوئی تھی مگر دو اینٹوں کے ادل بدل ہونے کی وجہ سے ساوی اور فلکی اجزا کی ترتیب میں گڑبڑ ہو گئی۔ وہ اس طرح کہ جو اینٹ پہلے چوکور ستون کے اندر کی طرف لگی تھی وہ اب اس کے باہر کی طرف لگ گئی اور جو پہلے باہر تھی وہ اب اندر کی طرف لگ گئی۔ اس سے ستون کی ساخت، شکل اور جسامت میں تو کوئی فرق نہ پڑا۔ صرف یہ المیہ ہو گیا کہ جس اینٹ کا چہرہ پہلے کالج کی طرف تھا وہ اب باہر سڑک کی طرف ہو گیا اور دوسری اینٹ کا چہرہ باہر سڑک کی بجائے کالج کی طرف ہو گیا۔ یعنی اینٹوں کے سامنے والا پرانا نظارہ بالکل ہی بدل گیا۔

پچھلے چوالیس برس سے اندرونی اینٹ مسلسل ایک ہی منظر دیکھتی رہتی تھی۔ کسی حسینہ کی مانگ کی طرح الٹتی ہوئی خمدار سڑک کے ابھار کے بعد ایک صحن نما کشادگی، اس کے درمیان گوتھک طرزِ تعمیر کی خوبصورت عمارت، پرندوں سے سرگوشیاں کرتا ہوا کالج ہال کا فلک بوس مخروطی مینار، اودل کی سرسبز گولائیوں میں رنگا رنگ پھولوں کی کہکشاں ان میں گھومنے والے طلباء اور طالبات کی ہنستی مسکراتی پر امید جوانیاں، بشاشت سے لبریز چہچہاتے ہوئے پُر شباب چہرے اور ستاروں پر کمندیں ڈالنے والے اونچے اور سہانے خواب۔ امن، سکون اور آشتی میں ڈوبا ہوا یہ منظر اب ایک دم غائب ہو چکا تھا اور اس کی بجائے دوسرا پریشان کن منظر تھا جس میں نیو ہوسٹل (NEW HOSTEL) کے ماتھے کے نیچے ٹریفک کا بے قابو سیلاب تھا، چوراہے میں بسوں، کاروں، رکشاؤں اور لوگوں کا شور حشر تھا۔ اضطراری اور جو نیجالی رفتار کا طوفان تھا اور ہر طرف سیمابی قسم کی بے معنی حرکت ہی حرکت تھی۔

اسی طرح باہر لگی ہوئی اینٹ کا چہرہ جب چوالیس برس بعد اندر کی طرف مڑا تو اُسے یوں لگا جیسے

بھرے میلے سے منہ موڑ کر وہ قبرستان میں پہنچ گئی ہو۔

دونوں ہی اینٹیں نئے مناظر سے حیرت، اچنبھے اور مخمصے میں ڈوب گئیں۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ از حد پریشان تھیں۔ اتنی پریشان کہ قریباً نصف صدی میں پہلی دفعہ دونوں آپس میں گفتگو پر مجبور ہو گئیں۔ پہلے تو ''ہائے اللہ''، ''میں مر گئی'' اور ''یہ سب کیا ہے؟'' قسم کے ردِعمل کا تبادلہ ہوا۔ پھر کچھ سکتے، کچھ سکوت اور کچھ سوچ کے بعد باہر والی اینٹ (جو پہلے اندر تھی) پوچھنے لگی ''تم آدھی صدی تک چوراہے میں یہ طوفانی رفتار دیکھ کر پاگل نہیں ہوئیں؟''

اندر والی اینٹ (جو پہلے باہر تھی) بولی ''ہمیشہ تو یہ حال نہیں تھا۔ جب میں اس ستون میں نئی نئی نصب ہوئی تھی تو حالات بڑے مختلف تھے۔ مسلسل ٹریفک کے باوجود چوراہے کے مزاج میں ٹھہراؤ تھا۔ ٹریفک کا بہاؤ دھیما تھا اور اُس میں ہمواری تھی اور زندگی کی اپنی متوازن سر سنگیت تھی''۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' باہر والی اینٹ نے پوچھا کیونکہ مسلسل اتنے برس کالج کے اندر کے منظر میں وہ ہمیشہ ایک جیسی یکسانیت دیکھتی رہی تھی۔ اس یک رنگ تجربے کی محدود روشنی میں وہ سابقہ باہر والی اینٹ کی بات سمجھنے سے قاصر تھی جو گول باغ، نیو ہاسٹل اور ضلع کچہری کے آس پاس بسنے والی بھرپور زندگی کا نچوڑ تھی۔

''اب کیسے سمجھاؤں تمہیں؟ کس طرح تشریح کروں کہ اُس ٹھہری ہوئی متناسب زندگی کی سُر سنگیت اب شور شرابے، ہاؤ ہو، غل غپاڑے اور افراتفری میں بدل گئی ہے۔۔۔۔ دراصل اُس وقت زندگی کا ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ اپنا اپنا کام کر رہا تھا۔ مگر اب وہ نہ خود اپنا کام کرتا ہے نہ دوسروں کو اُن کا کام کرنے دیتا ہے''۔

''میری سمجھ میں نہیں آتیں تمہاری پہیلیاں''۔ نئی باہر والی نے کہا

''ٹھہرو۔ میں تمہیں دو ایک مثالوں سے سمجھاتی ہوں۔۔۔۔ یہ جو تم چوراہے کے کنارے ٹریفک پولیس والا دیکھ رہی ہو، یہ اُن دنوں چوراہے کے بیچ میں کھڑا ہو کر ہاتھ اور بازوؤں کے مربوط اشاروں سے ٹریفک کنٹرول کرتا تھا۔ مگر اب وہ چوراہے کے باہر کھڑا رہتا ہے اور ٹیکسی رکشا والوں کو تنگ کر کے اپنی جیب بھرتا رہتا ہے۔ ٹریفک کا ناخدا اب کوئی نہیں اور وہ اپنی بے لگام افراتفری یا انارکی میں لڑھکتی رہتی ہے۔ اسی طرح بسوں، کاروں اور رکشاؤں والے اُس زمانے میں اپنی بریک اور سٹیئرنگ کا جائز استعمال کرتے تھے۔ مگر اب اس کی بجائے یہ اپنے ایکسی لیٹر اور ہارن کا ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس چوراہے میں سے لڑکیوں کے رنگین آنچلوں والی اور لڑکوں کی اٹکھیلیوں والی سائیکلیں اب غائب ہو چکی ہیں۔۔۔۔ اُس زمانے میں سڑک پر آوازیں ہوتی تھیں۔ اب صرف شور ہے۔ اُس زمانے میں میرے سامنے سے گزرنے والے چہروں پر اطمینان، مسرت اور قناعت کی پھوار چمکتی تھی۔ مگر اب وہی چہرے بے اطمینانی، غیر آسودگی، تشویش، پریشانی اور نفسانفسی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ تم اپنے سامنے جو ضلع کچہری دیکھ رہی ہو، اس میں اُن دنوں انصاف ملتا تھا۔ مجسٹریٹ اور وکیل قانون کی بات کرتے تھے۔ مگر اب وہ صرف آپس میں الزام تراشی کرتے ہیں اور انصاف ناپید ہے

۔۔۔ اب میں قریباً نصف صدی پر پھیلی ہوئی لمبی فہرست میں سے تمہیں کیا کیا گنواؤں۔ اور اگر گن بھی دوں تو میری بات کہاں سمجھ سکو گی۔ جبکہ اتنا لمبا عرصہ تم کالج کے اندر ایک ہی عمر کے چہرے، ایک ہی جیسے لباس اور ایک ہی جیسی مصروفیات دیکھتی رہی ہو"۔

نئی باہر والی اینٹ سوچ میں پڑ گئی۔ "یہ جو تم نے آخری فقرہ بولا ہے نا، اس سے میں کچھ کچھ سمجھنے لگی ہوں۔۔۔ کیونکہ اندر بھی اب ہر چیز ایک جیسی نہیں تھی۔"

"وہ کیسے؟" نئی اندر والی اینٹ نے پوچھا۔

"ہوں اوں اوں... " باہر والی سوچ بھرے لہجے میں بولتی گئی۔ "بات کچھ یوں ہے کہ جب اس ستون میں لگنے کے بعد میں پہلے پہل کالج میں گھومنے والوں کو دیکھتی تھی، تو ان دنوں پڑھانے والے لگتے تھے۔ مگر اب کچھ فرق فرق لگتا ہے۔ نہ معلوم کیوں؟"

پھر وہ دونوں آپس میں اپنے اپنے سابقہ تجربات پر تبادلہ خیالات کرتی رہیں۔ مگر بات چیت زیادہ نہ چل سکی۔ کیونکہ دونوں بار بار اپنے اپنے نئے نظاروں میں کھو جاتی تھیں اور گم سم ہو کر اپنی پیشانی کی سیدھ میں دیکھنے لگتیں۔

پھر یہ انداز اُن کا معمول بن گیا۔ کئی کئی دن بات نہ ہوتی۔ کبھی کبھار ایک آدھ جملے کا تبادلہ ہو جاتا یا کبھی وقفے وقفے سے تھوڑی دیر کے لئے گفتگو جاری رہتی۔

ایک دن باہر والی اینٹ اندر والی سے پوچھنے لگی۔ "تم جو اتنے برس باہر لگی رہیں اور بھرپور زندگی کا سیلاب دیکھتی رہیں، تو کوئی ایسی چیز بھی دیکھی جو تمہیں یاد رہ گئی ہو"۔

"مجھے کچھ دیر سوچ لینے دو پھر بتاؤں گی"

اس "کچھ دیر" میں دو تین ہفتے گزر گئے۔ پھر ایک رات وہ خود ہی بول پڑی۔ "میں نے اس چوراہے سے کئی براتیں، جنازے اور سیاسی جلوس گزرتے دیکھے ہیں۔ کئی دفعہ قیدیوں کو ہتھکڑیاں لگائے ضلع کچہری میں آتے جاتے دیکھا ہے۔ اور ایسے ہر منظر کو چونک کر بڑے تجسس سے دیکھا ہے۔ مگر آہستہ آہستہ سب ذہن سے اتر جاتے ہیں۔ صرف ایک جلوس ایسا تھا جس کا تاثر میں آج تک نہیں بھول سکی"۔ اور وہ خاموش ہو گئی۔

"کیا تھا وہ جلوس؟" باہر والی اینٹ نے پوچھا۔

"۱۹۷۱ء کے آخری دن تھے۔ ڈھاکہ میں پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کے بعد بنگلہ دیش بن گیا تھا اور غم و غصے میں بھرے ہوئے لوگ جلسے جلوس کر رہے تھے۔ ایک دن نوجوان طالبعلموں کا ایک جلوس اس چوراہے سے گزرا۔ اُن کے چہروں پر ایسا کرب اور دکھ تھا جو میں آج تک نہیں بھول سکی۔۔۔ وہ بہت ہی غصے میں نعرے لگا رہے تھے"۔

"پھر کیا ہوا؟"

''کچھ نہیں ۔۔۔ کچھ بھی نہیں''

''مگر کیوں کچھ نہیں ہوا؟ ۔۔۔ اور وہ غم و غصہ کہاں گیا؟''

''اس لئے کہ یہاں کبھی بھی کچھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ نوجوان جیسے جیسے بڑے ہوتے جاتے ہیں، وہ بھی اُس نظام کا حصہ بنتے جاتے ہیں جس کے خلاف وہ ماضی میں نعرے لگایا کرتے تھے۔''

''مگر یہ عجیب بات ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے''؟

''اس لئے کہ پاکستانی اذیت پسند لوگ ہیں۔ اپنے نظام کے ہاتھوں مستقل کرب میں رہتے ہیں۔ مگر اس نظام کو بدلنے کی ہمت نہیں کرتے۔ اس کم ہمتی میں نصف صدی گزر گئی ہے''۔

یہ بات سن کر دوسری کو اتنا اچنبھا ہوا کہ اس کی سرخ سطح پر سفید شورے کے چند ذرے ابھر آئے۔ پھر دونوں خاموش ہو گئیں جیسے گہری سوچ میں ہوں۔

کئی دن اور گزر گئے

ایک دن اندر والی اینٹ نے باہر والی سے پوچھا ''تم سے کافی دنوں سے بات ہی نہیں ہوئی۔ خیریت تو ہے؟'' باہر والی بولی'' پچھلی ملاقات میں تم نے اپنی یادوں کا ذکر کیا۔ تو اس کے بعد میں بھی اپنی یادوں میں کھوئی رہی۔'' اندر والی اینٹ طنز سے ہنسی'' اب تو اندر کا منظر دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم اتنا عرصہ کیا کچھ دیکھتی رہی ہو۔ ایسی سپاٹ اور ہموار زندگی میں کیا یادیں بن سکتی ہیں''۔

اب باہر والی بھی طعن پر اتر آئی ''تم باہر کے شور، ہنگاموں اور دھول کیچڑ میں اتنی پھنسی رہی ہو کہ تمہیں زندگی کے لطیف پہلوؤں کے متعلق سوچنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ تم بھول رہی ہو کہ وقت جہاں بھی گزرے گا اور جیسے بھی گزرے گا اس گزرگاہ پر یادوں کے نقش پا بن جائینگے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آہستہ خرامی اور نرم روی میں دھول تو کبھی نہیں اٹھی۔ شور بھی نہیں ہوتا مگر نقش پا گہرا اور پکارہ جاتا ہے''۔

''مثلاً؟'' اندر والی کے سوال سے بے یقینی چھلک رہی تھی۔

''شاید تمہیں میری بات ماننے میں تامل ہے۔ اس لیے میں کوئی دلیل دے کر تمہیں بور نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن اگر کسی طرح اپنی جگہ سے حرکت کر کے باہر آسکو تو میرے چہرے پر تمہیں دو حروف کھدے ہوئے نظر آئیں گے''۔

''واقعی؟'' اندر والی حیرت سے چلائی'' کیا مطلب ہے ان حروف کا؟''

''سمجھ نہیں آتی کہ کہاں سے بات شروع کروں''۔ باہر والی کہنے لگی اور خاموش ہو گئی۔

پھر وہ کئی گھنٹے خاموش رہی۔

''دراصل تم باہر کی دنیا میں پاکستانی قوم دیکھتی رہی ہو اور میں کالج کے اندر کی دنیا میں افراد دیکھتی رہی ہوں۔ ان دونوں کی دنیا الگ الگ ہوتی ہے۔۔۔ جب ۱۹۵۵ میں مجھے اس ستون میں اندر کی طرف لگایا گیا تھا تو

میں نے انھیں پہلے ہی دن دیکھ لیا تھا۔۔۔ گیٹ کے بالکل پاس ہو، اودول کے اوپر والے کنارے پر وہ بینچ تھا
ہو
جہاں وہ روزانہ بیٹھا کرتے تھے''۔

وہ پھر خاموش ہو گئی اور لمبے وقفے بعد بولی ''لڑکا لمبے قد اور چھریرے بدن والا تھا ور لڑکی بھری بھری گداز جسم والی تھی۔ کالج کے اندر بے پردہ گھومتی تھی۔ مگر گیٹ سے باہر نکلنے لگتی تو کتابیں مجھ سے دو اینٹ اوپر اس ستون پر رکھ کر کالا برقعہ پہنتی اور پھر باہر نکل جاتی۔ ان دنوں برقعہ بتدریج غائب ہو رہا تھا اور کئی لڑکیاں کالج میں ایسا ہی پردہ کرتی تھیں۔۔۔ پھر جب سال ختم ہونے لگا اور وہ کالج چھوڑ کر جانے لگے تو لڑکے نے چاقو کی نوک سے میرے چہرے پر اس لڑکی کے اور اپنے ناموں کے پہلے حروف کندہ کر دیے۔ پھر وہ دونوں باری باری ان حروف کی نیم گہرائی میں دھیرے دھیرے انگلیاں پھیرتے رہے۔۔۔''

اینٹ کی آواز ڈوب گئی۔

''پھر کیا ہوا؟'' اندر والی نے بے صبری سے پوچھا۔

''نہ معلوم کیا ہوا۔۔۔ اور کیسے ہوا'' باہر والی دھیرے دھیرے بول رہی تھی ''مگر مجھے یوں لگا کہ میں بھی ان کی طرح زندہ ہوں، ذی روح ہوں اور محسوس کرتی ہوں۔ میرے ذرے ذرے میں گویا برقی لہریں سی دوڑنے لگیں۔۔۔ جیسے ان میں سے ایک کی رگوں کا خون میرے اندر سے ہو کر دوسرے کی رگوں میں جا رہا ہے۔۔۔۔ یہ بڑا ہی عجیب تجربہ تھا۔۔۔۔ میں تو اسے صحیح انداز میں بیان بھی نہیں کر سکتی۔۔۔۔ اور ابھی میرے جسم کا ہر ذرہ اسی سہانے وجد میں تھا کہ وہ دونوں دھیمے قدموں سے چلتے چلتے موڑ مڑ گئے۔۔۔''

''میرا خیال تھا''، اس نے بات جاری رکھی، ''کہ شاید وہ کچھ دنوں بعد پھر نظر آئیں گے۔ مگر نہیں۔۔۔ دن بیتے اور برس گزرتے گئے مگر وہ نہ آئے۔۔۔۔ ان کی جگہ دوسرے جوڑے اسی انداز میں اودول کی سرسبز ڈھلان میں نگینوں کی طرح جڑے ہوئے، بنچوں پر بیٹھے رہتے۔ مگر مجھے ان سے کوئی غرض نہ تھی۔ کیونکہ وہ میرے اندر کوئی ارتعاش پیدا نہ کرتے تھے۔۔۔۔ جب برس گزرتے گئے اور انتظار بھی زنگ آلود ہونے لگا تو شاید میں بھول ہی جاتی۔ مگر ایک دن اچانک میں نے اس لڑکی کو دیکھ لیا۔۔۔۔ اس کے ساتھ تین چار برس کا لڑکا تھا اور وڈیرہ قسم کا خاوند تھا۔ وہ تینوں کالج کے دفتر کی طرف جا رہے تھے۔ نہ جانے کیوں؟۔۔۔ پھر خاوند تو ادھر ہی رہا۔ مگر لڑکی اپنے بیٹے کے ساتھ میری طرف آتی نظر آئی۔ وہ جیسے جیسے قریب آ رہی تھی، میرے جسم کا ہر ذرہ بتدریج زیادہ کانپ رہا تھا۔۔۔ وہ آئی۔۔۔۔ رکی۔۔۔ مجھے دیکھتی رہی۔۔۔ دونوں حروف پر انگلی پھیرتی رہی۔۔۔ پھر گیلی آنکھوں اور ڈھیلے قدموں سے چلتی اسی مخصوص بنچ پر جا کر بیٹھ گئی۔۔۔

''پچھلے پینتالیس برسوں میں وہ کئی دفعہ آئی۔۔۔ کبھی دو سال بعد۔۔۔ کبھی چار سال بعد۔۔۔ کبھی اس سے بھی لمبے وقفوں کے بعد۔۔۔ ہر دفعہ اس نے مجھے سوگوار نظروں سے دیکھا۔۔۔ بلکہ ایک دفعہ تو دونوں حروف کو چوم بھی لیا۔۔۔ جس سے میرے بھی اندر ایک ناقابل بیان ہیجان بپا ہو گیا۔۔۔ نہ جانے کیوں اور کیسے

۔۔۔ حالانکہ میں سمجھتی تھی کہ اپنی پیدائش کے دوران بھٹے کی آگ نے میرا ظاہر و باطن بھسم کر دیا تھا۔ مگر یوں لگتا تھا کہ میرے مردہ جسم پر ان دو حروف " کے گھاؤ نے شاید مجھے نئی زندگی دے دی تھی۔۔۔ جو بالکل مختلف تھی اور جس کا مجھے پتہ نہ تھا۔۔۔ بلکہ کسی کو بھی پتہ نہ تھا۔۔۔"

اندر والی اینٹ نے پوچھا "اور وہ لڑکا کبھی نظر آیا؟"

"نہ۔۔ بالکل نہیں۔۔۔ اس کو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔۔ نہ معلوم آسمان کھا گیا ہے یا زمین نگل گئی ہے۔"

"دنیا بڑی وسیع ہے" اندر والی نے کہا۔

اس کے بعد دونوں خاموش ہو گئیں اور کافی دنوں تک ان کی آپس میں گفتگو نہیں ہوئی۔ دریں اثنا باہر والی اینٹ پچھلے چند ماہ میں چوراہے میں بہنے والی زندگی کے ریلے سے مانوس ہو گئی تھی۔ بلکہ بعض اوقات اندر والی اینٹ کی اُداسی دور کرنے کے لئے اسے باہر کے حالات کی جھلکیاں سناتی رہتی اور اندر والی اپنے سابقہ تجربوں کی بنا پر اُن پر تبصرے کرتی رہتی۔ یا ان پر تبصرہ وتشریح کرتی رہتی۔ مگر ایک دن اس نے محسوس کیا کہ باہر والی اینٹ پل پل میں ہل رہی ہے جیسے کوئی بہت بے کل ہو۔

"کیا بات ہے؟ تم بہت بے چین لگتی ہو" اس نے پوچھا۔

باہر والی اینٹ کی تو خوف سے جیسے گھگی بندھ رہی تھی۔ "آج میں نے اسے دیکھا ہے۔۔۔ وہ جو لمبے قد اور چھریرے بدن والا ہوتا تھا۔۔۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی۔ تین سپاہیوں اور چند لوگوں نے گھیرا ہوا تھا۔۔ ابھی میرے سامنے والے فٹ پاتھ سے گزر کر وہ سب ضلع کچہری میں گئے ہیں۔۔۔ جس سپاہی نے ہتھکڑی پکڑی ہوئی تھی وہ بلند آواز سے باقیوں کو بتا رہا تھا کہ اس پر دھوکہ دہی، غبن اور قتل کے کئی مقدمے بن گئے ہیں۔"

وہ اتنی خوفزدہ اور سراسیمہ تھی کہ اندر والی اینٹ کے کسی سوال کا بھی تسلی بخش جواب نہ دے سکتی تھی۔ مجبوراً دونوں خاموش ہو گئیں اور کئی دن خاموش رہیں۔ اسی خاموشی میں اُس برس کا اختتام ہو گیا اور ۳۱ دسمبر ۲۰۰۰ء کا دن آ گیا۔

یہ دن دونوں اینٹوں پر بہت بھاری ثابت ہوا۔

لاہور میں سردی کی لہر آئی ہوئی تھی مگر دھوپ چمکدار تھی۔ کالج میں سرمائی چھٹیاں تھیں۔ مگر دفتر کھلا تھا۔ گیٹ کے پاس ہی اوول کے پاس کنارے پر جو بنچ تھا، اس پر صبح سے سٹاف کے چند لوگوں نے قبضہ کیا ہوا تھا۔ کبھی دو ایک چلے جاتے۔ پھر دو ایک اور آ جاتے۔ اور دوپہر تک زور دار بحث ہوتی رہی کیونکہ صبح کے تمام اخبارات میں حمود الرحمان کمیشن کی رپورٹ کی تفصیلات تھیں جسے حکومت نے گذشتہ روز رازداری سے خارج کر کے بے پردہ کر دیا تھا۔

چند لمحے خاموش رہی۔۔۔ پھر دادی اماں بڑے بجھے ہوئے انداز میں کہنے لگیں ''ہاں۔ تمہیں سردی لگ جائے گی۔ چلو گاڑی میں چل کر بیٹھیں''۔ پھر جیسے انھوں نے بے دھیانی میں ہی ستون کو ویسے ہی تھپتھپا دیا اور دونوں واپس مڑنے لگے

ایک دم کچھ چٹخنے کی آواز آئی۔ اور ستون کے باہر والی اینٹ کا کچھ حصہ ٹوٹ کر دادی اماں کے قدموں میں آن گرا۔ انھوں نے ڈر کر ''اوئی اللہ'' کہا۔ اور لڑکے نے انہیں سہارا دیتے ہوئے روڑے کو پاؤں کی ٹھوکر سے دور پھینک دیا۔

''یہ کیا ہوا تھا؟'' لڑکے نے حیرت سے پوچھا۔

''ہونا کیا ہے بیٹے۔۔۔ خشک سالی ہو تو اینٹ روڑے چٹخنے لگتے ہیں۔'' اور وہ دونوں کار کی طرف چل دیے۔ آدھی رات کو وہ سال ختم ہو گیا۔۔۔ بیسویں صدی ختم ہو گئی۔۔۔ دوسرا ہزاریہ ختم ہو گیا۔ یکم جنوری ۲۰۰۱ سے وہ دونوں اینٹیں خاموش ہیں۔۔۔ بالکل چپ چاپ۔۔۔ گم سم۔۔۔ شاید اپنے صدمے سے مر گئی ہیں۔ مگر کیا اینٹیں بھی مر سکتی ہیں؟؟؟

شاید شیکسپیئر ہی کچھ بتا سکے۔۔۔ اُسے پتہ تھا کہ ہمارے مبلغ علم کے علاوہ کائنات میں اور بھی بہت کچھ ہے۔۔۔

اس بیچ پر جو زوردار بحث ہوتی رہی وہ اندر والی اینٹ (جو پہلے باہر ہوا کرتی تھی) سنتی رہی۔ اور اُسے اندازہ ہو گیا کہ دسمبر ۱۹۷۱ میں کیا ہوتا رہا۔ تب اُسے وہ جلوس یاد آیا، ان لوگوں کا کرب یاد آیا، اس کی وجہ سمجھ آئی۔ اور وہ گم سم ہو گئی۔۔۔ ایک دم گم سم۔۔۔ پاکستانی جو تھی۔

بیچ قریب ہی تھا۔ وہاں سے کسی نے کہا "یوں لگتا ہے اُس اینٹ میں سے دھواں نکل رہا ہے"۔

دوسرا غور سے دیکھ کر کہنے لگا "دھواں نہیں گرد ہے۔۔۔ بارش جو نہیں ہوئی اس دفعہ ابھی تک"

سورج کو ہلکے بادلوں نے ڈھانپ لیا کیونکہ ہوا تیز ہو رہی تھی۔

وہ پہر ڈھلنے لگی۔ ایک کار کالج کے دفتر کے سامنے آ کر رکی۔ اس میں سے ایک موٹا سا، بھدا سا گنجا بوڑھا اتر کر دفتر میں چلا گیا۔ باقی لوگ کچھ دیر تو کار کے اندر بیٹھے رہے۔ پھر ایک سفید سر اور خمیدہ کمر والی بوڑھی عورت باہر نکلی۔ اس کے ساتھ گورنمنٹ کالج کا سرخ بلیزر پہنے ایک طالبعلم لڑکا نکلا۔ بڑھیا نے اترتے ہی کالج کے گیٹ کا رخ کیا۔

"دادی اماں۔ اُدھر کیا کرنے جا رہی ہیں؟" لڑکے نے روکنے کے انداز میں پوچھا۔

بڑھیا کی آواز میں کپکپاہٹ تھی "گاڑی میں بند کیا رہتے۔ ذرا باہر کی تازہ ہوا لے لیں"۔

"اتنی سردی میں؟" لڑکے کی آواز میں حیرت تھی۔

"چلتے رہو تو سردی نہیں لگتی"۔

گیٹ کے پاس پہنچ کر بڑھیا نے پہلے آس پاس کے پھولوں کی تعریف کی۔ پھر کیاریوں کے ڈیزائن پر تبصرہ کرتے کرتے گیٹ کے چوکور ستون کے پاس آ کر رک گئی اور اُس کی سرخ اینٹوں کو دیکھنے لگی۔

"دادی اماں۔ کیا دیکھ رہی ہیں؟"

وہ خاموشی سے مگر بڑے غور سے دیکھتی رہیں۔

"دادی اماں۔ آپ کچھ ڈھونڈ رہی ہیں؟"

"نہیں بیٹے ڈھونڈنا کیا ہے۔ بس یہ دیکھ رہی تھی کہ ہمارے زمانے میں یہاں اور طرح کی اینٹیں ہوتی تھیں۔" لڑکا ہنسا۔ "دراصل دادی اماں پچھلے سال میں نے اپنی گاڑی کی ٹکر سے یہ ستون توڑ دیا تھا۔ اب تو یہ نیا بنا ہے"۔

بوڑھی عورت جیسے بے اختیاری سے چلائی "تم نے توڑ دیا تھا؟۔۔۔ تو مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

لڑکے کے قہقہے میں نوعمری کا اعتماد تھا "بھلا یہ بھی کوئی بات تھی آپ کو بتانے کی!"

خاتون سے جواب نہ بن پڑا اور وہ چپ ہو گئی۔ مگر لڑکا دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا کہ دادی اماں کے چہرے کا رنگ کیسا ہو رہا ہے۔ شاید ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے۔۔۔ غالباً سردی سے ہی آنکھوں میں پانی آ گیا ہے۔ اس لئے پیار سے کہنے لگے "دادی اماں سردی ہے نا؟"

شب مراقبہ کے اعترافات کی پانچویں کہانی

رشید امجد

خزاں کی آمد آمد تھی اور بہار چپکے چپکے اپنا سامان سمیٹ رہی تھی۔ درختوں سے گرے اکا دکا پتے پیڑوں کے نیچے چرمرانے لگے تھے۔ کنول کا تالاب خالی خالی دکھائی دے رہا تھا۔ کہیں کہیں ایک آدھ پھول، مرجھانے کی تیاریوں میں تھا۔ تالاب کی سطح پر سبز کائی کا مخملی فرش بچھتا جا رہا تھا۔ خوشبوؤں کو گئے عرصہ ہو چلا تھا۔ مرشد حسب عادت کئی دن سے غائب تھا۔ تالاب کنارے بڑی سل پر بیٹھے بیٹھے اُس نے سوچا، مرشد ہوتا تو ان بدلتے موسموں کی کچھ خبر لیتے، کون آ رہا ہے کون جا رہا ہے، اور یہ عروج و زوال کیا ہے۔ خزاں کیا ہے بہار کیا ہے؟

ابھی اُس کی سوچ کا دھارا کسی سمندر کی تلاش ہی میں تھا، کہ مرشد، جو جانے کب سے، خاموشی سے پاس آ بیٹھا تھا' بولا ____ سفر کرنا تو اتنا مشکل نہیں، لیکن سفر کی عطا کے لئے جس ظرف کی ضرورت ہے وہ کہاں سے لاؤ گے۔ وہ چونکا ____ ''تم کب آئے؟''

''میں گیا ہی کہاں تھا'' مرشد نے تبسم کیا۔

اُس نے بحث نہیں کی، کہنے لگا ____ ''سفر تو شروع کریں، ظرف خود ہی پیدا ہو جائے گا''

دونوں ان دیکھے سفر پر نکل پڑے۔

دریا کنارے دیکھا کہ ایک شخص، ایک ٹانگ پر کھڑا وظیفہ کر رہا ہے۔ مرشد بولا ____ ''یہ تلاش کم اور دکھاوا زیادہ ہے''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا ____ ''جاننے کی سچی طلب ہو تو ان کرتبوں کی ضرورت نہیں''

ان کی باتیں سن کر اُس شخص نے اپنی ٹانگیں سیدھی کیں اور غصہ سے بولا ____ ''بغیر جانے سمجھے اظہار بے وقوفی کی دلیل ہے اور بے وقوف کو کبھی کچھ نہیں ملتا''

وہ گھبرا گیا ____ اور معذرت خواہانہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور بولا ____ ''آپ سچ کہتے ہیں، کون جانتا ہے کہ کیا دکھاوا ہے اور کیا حقیقت''

مرشد کچھ نہ بولا، چپ چاپ اُن کی باتیں سنتا رہا، جب دونوں کچھ آگے نکل آئے تو کہنے لگا ــــــ

''جو دکھائی دیتا ہے، ضروری نہیں وہی سچ ہو''

''تو پھر سچ کیا ہے؟'' اُس نے پوچھا

''چلو اسے تلاش کریں'' مرشد نے جواب دیا اور وہ دونوں گھنے جنگل میں اتر گئے۔ جنگل گھنا، نیم تاریک اور دیکھنے میں سنسان تھا، لیکن جوں جوں آگے بڑھتے گئے، چیزیں بولنے لگیں، پتے اشارے کرنے لگے، درختوں نے سرگوشیاں کیں اور چرند پرند گھنی شاخوں جھاڑیوں اور اپنی اپنی کھوؤں سے نکلنے لگے۔

''جنگل بھی بولتے ہیں'' مرشد بولا ــــــ ''اگر انہیں احساس ہو کہ سننے والا موجود ہے۔''

اُسے ان چار تیتور کی کہانی یاد آئی جو سیمرغ کو تلاش کرنے نکلے تھے، اور طویل سفر کی صعوبت سہتے جب آئینہ صفات کے سامنے پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ آئینہ صفات میں انہی کا عکس موجود ہے۔ اس نے مرشد سے کہا ــــــ ''جنگل تو ہمارے اندر بھی موجود ہے اور سرگوشی بھی کرتا ہے مگر انہی کے لئے جو اس کی آواز سننا چاہتے ہیں''

''سننے کی خواہش، زندہ ہونے کی دلیل ہے'' مرشد نے کہا ــــــ ''اور زندہ وہی ہے جسے اپنے ہونے کا احساس ہے''

جنگل کے بیچ بیچ ایک تالاب تھا، جس کے آدھے حصہ میں پانی شفاف تھا۔ اُس نے مرشد سے پوچھا ــــــ یہ کیا ماجرا ہے کہ آدھا تالاب اور طرح کا ہے اور آدھا اور طرح کا''

مرشد ہنسا ــــــ ''تالاب ایک ہی ہے۔ یہ صرف ہمارے دیکھنے کا انداز ہے ــــــ کیا تم نہیں جانتے کہ سچ آدھی آنکھ سے دکھائی نہیں دیتا۔''

اُس نے سر ہلایا ــــــ واقعی صورت اشیاء معلوم ہے، حقیقت اشیاء مجہول ہے، اور یہی مقام تعجب ہے''

''تعجب بھی ایک نعمت ہے'' مرشد بولا ــــــ ''تعجب ختم ہو جائے تو آدمی پتھر ہو جاتا ہے''

وہ آگے بڑھتے کہ مقام عجب کے بعد اب مقام طلب آتا تھا۔ اور مقام طلب سے پہلے آگ روشن تھی، شعلے لمبی لمبی زبانیں نکالے شوں شوں کر رہے تھے کہ اس آگ میں جل کر ہی خرمن ہستی کو خاک ہونا تھا کہ صفات نفسانیہ میں سے کوئی صفت باقی نہ رہے ــــــ اس کے بغیر وصال ممکن نہ تھا۔

مرشد نے کہا ــــــ ''آگ عشق ہے، جل کر ہی طلب ختم ہوتی ہے اور طالب، مطلوب اور طلب کی تثلیث باقی نہیں رہتی''

وہ جھجک گیا ــــــ ''جلنا اتنا آسان نہیں''

مرشد ہنسا ــــــ ''تطہیر قلب بھی چاہتے ہو اور جلنے سے بھی ڈرتے ہو ــــــ تمہارے اندر

ہوا ___ کانوں میں رس گھولا ہوا ___ سے ابھی دنیا نہیں نکلی'' اُسے بیوی یاد آئی۔ کھلکھلاتے بچوں کی کلکاریوں نے کانوں میں رس گھولا ہوا
''آگ حسی بھی ہے اور معنوی بھی، میں حس تک ہی محدود رہنا چاہتا ہوں''

مرشد ہنسا، خوب ہنسا ___ ''تم اُس غلام کی مانند ہو جو زرِ مکاتب ادا کر چکا، مگر صرف ایک درہم ادا کرنا باقی ہے کہ آزادی ملے مگر اس ایک درہم کی ادائیگی سے ڈر رہا ہے''

اس نے اثبات میں سر ہلایا ___ ''صفات نفسانیہ میں سے ایک صفت بھی باقی رہے تو آدمی اسی صفت کا غلام بن کر رہ جاتا ہے''

مرشد نے کوئی جواب نہ دیا، اور بڑے وقار سے قدم قدم چلتا آگ کے دائرے میں داخل ہو گیا، وہ باہر بیٹھا دیر تک اس کا انتظار کرتا رہا، پھر خاموشی سے اٹھا اور اپنے آپ سے کہنے لگا ___ ''اصل شہود یہی ہے کہ شاہد و مشہود کی دوئی مٹ جائے اور اسی کی آنکھیں، اُسی کے جلوے، لیکن یہ وہ مقام ہے جو میرے نصیبوں میں نہیں، مرشد نے اُسے پا لیا'' اُس شام سیر کے بعد وہ دیر تک تالاب کنارے سل پر بیٹھا، چپ چاپ تالاب کو دیکھتا رہا، کنول مرجھا گئے تھے اور سبز کائی آہستہ آہستہ پورے تالاب پر بچھتی جا رہی تھی۔

نوحہ

عطیہ سید

وہ انوکھا دن بھی ایک عام دن کی طرح طلوع ہوا۔ عافیت صبح سات بجے اٹھی، منہ ہاتھ دھویا، ناشتہ کیا اور کپڑے بدلے۔ اس روٹین کے بعد وہ سوچنے لگی کہ کیا کیا جائے۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی جھنجھنا اٹھی۔

عافیت گھنٹی کی آواز سن کر ٹی۔ وی لاؤنج کی طرف لپکی جس کے ایک کونے میں ٹیلی فون رکھا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا، مگر اس کی توجہ ٹیلی فون پر ثبت انگلیوں کے سیاہ نشانات پر تھی۔

''ہیلو!''

''ہیلو! عافیت! میں محمودہ بول رہی ہوں''۔

''اوہ محمودہ! تم کیسی ہو؟''

''عافیت! ایک خبر ہے۔۔۔ نہایت افسوس ناک''۔

محمودہ کی زبان میں کپکپاہٹ تھی۔ پھر اس نے ہمت کر کے وہ بات کہہ ڈالی جو خود اس پر بجلی کی طرح گری تھی۔

''تمکین۔۔۔ تمکین کی۔۔۔ لاش دو بجے دوپہر کراچی سے ہوائی جہاز کے ذریعے سے لائی جارہی ہے''۔

''تمکین۔۔۔ تمکین کی لاش۔۔۔''

عافیت نے یہ الفاظ دہرائے، مگر بے سوچے سمجھے محض روبوٹ کی مانند جسے کوئی معلومات فیڈ کر دی گئی ہوں۔

''ہاں۔ تم ۴ بجے تک اس کے والدین کے ہاں پہنچ جانا''۔

''تمکین کی لاش۔۔۔''

عافیت نے میکانکی انداز میں دوبارہ ان الفاظ کی تکرار کی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کا ذہن اس خبر کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس کی توجہ اب بھی نارنجی ٹیلی فون پر ثبت انگلیوں کے سیاہ نشانات پر مرکوز تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کس محلول سے ان دھبوں کو صاف کیا جائے تا کہ ٹیلی فون کی نارنجی سطح دمک اٹھے۔۔۔۔ اور جب بالآخر اسے کمودہ کے الفاظ کا مطلب سمجھ میں آیا تو اُن کی سنگینی سے زبان گنگ ہوگئی، ذہن ماؤف ہو گیا۔ اس نے ریسیور جھٹکے سے آپریٹس پر رکھ دیا۔

گھر میں گہرا سکوت چھا گیا جیسے سمندر کی اتھاہ گہرائی میں لہروں کی حرکت رک گئی ہو۔ کھڑکی سے چمٹی بوگن ویلیا کی گھنی شاخوں میں کوئی پرندہ الاپ رہا تھا۔

''پی، پی۔۔۔۔ پی، پی''۔

کیا یہ پپیہا تھا یا اس کا تخیل؟ لیکن اس کی پرسوز آواز نے عافیت کے سکتے میں شگاف ڈال دیے۔ درد، آنسوؤں کی صورت رسنے لگا۔ دنیا اور اس کے سارے جھمیلے۔۔۔ تمام جھنجھٹ کہیں پس منظر میں چلے گئے۔۔۔ تمام سوچیں، احساسات و جذبات فیڈ آؤٹ ہو گئے۔ صرف ایک خیال ہر چیز پر چھا گیا۔۔۔ ایک تصور جو انگارہ بن کر سلگنے لگا۔

''تمکین جا چکی ہے۔۔۔۔ رخصت ہو چکی ہے۔۔۔۔ ہمیشہ کے لئے۔۔۔۔ اب وہ کبھی پلٹ کر نہ آئے گی''۔ یہ سوچ اس کے وجود کو دھیرے دھیرے بلیڈ کی طرح کاٹنے لگی۔

عافیت کو چکر سا آ گیا۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا اور اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے نزدیک رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ قیامت کی اس گھڑی اسے یوں لگا کہ اب کچھ بھی نہیں۔

''مہتاب، نہ سورج، نہ اندھیرا، نہ سویرا''

جب عافیت ۴ بجے تمکین کے والدین کے گھر پہنچی تو لوگوں کا ہجوم اور تماش بینوں کا جم غفیر جمع ہو چکا تھا۔ کسی کی زندگی دوسروں کے لئے ناٹک سے زیادہ کچھ نہیں۔۔۔ اور اس کی موت ڈرامے کے ڈراپ سین کا تمام تر تجسس اپنے اندر سمیٹے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ تمکین کی موت تو سنسنی خیز تھی، اس لئے اور بھی زیادہ توجہ کا مرکز تھی، مگر یہ توجہ کس قدر زہر آلود تھی۔ عافیت ہجوم کا سینہ چیرتی ہوئی گھر کے اندر پہنچی جہاں تمکین کے ماں باپ، بہن بھائی اور عزیز رشتہ دار نوحہ کناں تھے۔ کوئی عورت بین کر رہی تھی، کوئی مرنے والی کی خوبیاں بیان کر رہی تھی اور کوئی افسوس کا اظہار۔ عافیت اس نقار خانے میں تنہا کھڑی تھی اور اس کے ذہن میں بار بار یونانی المیوں کی سٹیج پر سیاہ ملبوس میں ماتمی کورس گانے والیوں کی تمثیل ابھر رہی تھی۔

عافیت کو غم کی اس نمائش سے۔۔۔۔ دکھ کے اس شوکیس سے۔۔۔۔ اس تھیٹریکل ماتمی کورس سے تنفر سا محسوس ہوا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ ساتھ والے کمرے کی طرف بھاگی جس میں تمکین کی سٹڈی تھی۔ وہاں قد آدم کھڑکی لان کی طرف کھلتی تھی۔ اس کھڑکی پر چمکیلے پتوں والے ربڑ پلانٹ کا سایہ تھا جس سے آگے لان کے

پرانے درخت قطار اندر قطار کھڑے تھے۔
عافیت ایک کرسی پر ڈھیر ہوگئی۔ تھوڑی دیر میں احساس ہوا کہ اس کے علاوہ کمرے میں اور خواتین بھی موجود ہیں۔ ان میں سے ایک عافیت سے مخاطب ہوئی۔
''عافیت! تمکین کی موت کا بے حد افسوس ہوا''۔ بڑی عمر کی شادی ۔۔۔۔ اور یہ انجام ۔۔۔۔'' ململ کی ساڑھی پہنے ہوئے دوسری خاتون نے لقمہ دیا۔ عافیت نے ململ کی ساڑھی والی خاتون کے لہجے کی کمینگی کو شدت سے محسوس کیا۔ اسے یاد تھا کہ اسی خاتون نے کسی زمانے میں اپنی پوسٹ کارڈ سائز تصویر چھپا دی تھی۔ اس خاتون کو کیا علم کہ تمکین اس بچگانہ حرکت پر کس قدر ہنسی تھی۔ مگر آج وہی خاتون نشتروں سے لیس تھی۔ گیند اچھالنے کے لئے یقیناً اس کے ہاتھ میں تھا۔ تمکین تو گیند واپس پھینکنے کے لئے موجود ہی نہ تھی۔ اس صورت میں کسی غیر موجود شخص کی طرف گیند اچھالنا سادیت پسندی (Sadism) کے اظہار کے سوا کیا تھا۔
''عمر بڑی تو نہیں تھی۔ یہی کوئی تیس برس کی ہوگی تمکین''۔ ایک نیک دل دراز قامت کرچین خاتون نے جواب میں کہا۔ وہ تمکین کی سکول ٹیچر تھیں۔
''کیا تمکین وگ لگاتی تھی؟'' ایک اور تیر انداز خاتون بولی۔
''مجھے معلوم نہیں''۔ آبدیدہ عافیت نے جواب دیا۔ تمکین کی سٹڈی کی الماریوں میں رکھی انگریزی ادب کی کتابیں حیرت سے ساکت تھیں۔ ایک الماری کے پٹ کھول کر میکبتھ گویا ہوا!

"------------its a tale

Told by an idiot, full of sound and fury.

Signifying nothing.'"

ایک اور الماری کے اندر سے ہملٹ نے افسوس سے چہ میگوئیاں کرتی خواتین کی طرف دیکھا اور کہا:

To be, or not to be: that is the question.'

پھر وہ بیچارگی اور بے بسی کے عالم میں کتاب کے صفحات میں روپوش ہوگیا۔
''بھئی عافیت! کیا تمکین سچ مچ وگ لگاتی تھی؟''
''مجھے کیا پتہ ۔۔۔۔'' عافیت نے تنگ کر جواب دیا۔ عافیت نے منہ موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ سبزہ پر زرد زرد دھوپ بے بسی سے لیٹی تھی۔ باہر شاید بہار کا موسم تھا۔ للی کے سرخ پھول سبز لانبے پتوں میں خون کے دھبوں کی طرح دہک رہے تھے۔
ڈرائنگ روم اور ڈرائنگ روم کے سامنے پھیلے لمبے برآمدے کے آخری سرے پر وہ خالی کمرہ، جس کی شکستہ چھت کی وجہ سے اسے کبھی استعمال نہیں کیا جاتا تھا، آج اسی میں تمکین کے سرد لاشے کو لٹا دیا گیا تھا تا کہ لوگ اس کا آخری دیدار کر سکیں۔ ماتم میں شریک خواتین قطار کی شکل میں لمبے پتلے برآمدے میں کھڑی تھیں تا کہ شکستہ

کمرے میں رکھی لاش کو دیکھ سکیں۔ عافیت بھی اسی قطار میں کھڑی اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ برآمدے کو شیشوں سے محفوظ بنا دیا گیا تھا اور جگہ جگہ کتابوں سے بھری الماریاں رکھی تھیں۔ انھی کے پاس کھڑی عافیت سوچ رہی تھی کہ سب کچھ کتنا علامتی تھا۔ کتابوں سے بھرا برآمدہ تمکین کی زندگی کا راستہ تھا جس کے آخری سرے پر ٹوٹا پھوٹا کمرہ۔۔۔ شکست و ریخت۔۔۔۔ ناگزیر موت تھی۔ تمکین برآمدے میں چلتے چلتے شکستہ کمرے تک پہنچ گئی تھی جہاں سے واپسی محال تھی۔

لوگوں کی قطار آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ بالآخر عافیت کی باری آ گئی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی اور تمکین کے سرد جسم کے سرہانے کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں تھلوں کی مانند خشک تھیں، لیکن اس کی سوچیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ تمکین کا سانولا چہرہ نیلا تھا۔

''کرشنا کو سانپ نے ڈس لیا ہے'' عافیت نے سوچا۔ پھر عافیت نے ان سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر اپنے اردگرد کے ٹھوس ماحول کی طرف واپس آنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی نظر لوٹ کر۔۔۔۔ پلٹ کر تمکین کے سوچے ہوئے چہرے کی طرف جا رہی تھی کہ اسے معلوم تھا کہ دیدار کی ساعت کے بعد وقت جدائی ہے۔۔۔۔ نہ ختم ہونے والی۔۔۔۔ بے انت۔۔۔۔ بے انجام۔۔۔۔ ابدی جدائی۔ عافیت نے موتیے کی ننھی کلیوں بھرے ہاتھ پھیلا دیے۔ تمکین کے مردہ جسم پر تنی چادر کلیوں کی بارش میں نہا گئی۔ جانے یہ ایک دوست کا اظہار محبت تھا یا کسی معرکے میں کام آنے والے جنگجو شہید کو ہدیہ عقیدت۔

عافیت صرف چند لمحے شکستہ کمرے میں نیلی لاش کے سرہانے کھڑی رہی، لیکن اسے محسوس ہوا جیسے وہ ایک صدی سے کسی اہرام میں ممی کے ساتھ بند تھی۔ کمرے میں ایسی بند سی بو پھیل رہی تھی جیسی صندوق میں رکھے کپڑوں سے اٹھتی ہے جنھیں عرصہ دراز سے ہوا نے چھوا نہ ہو۔ اس کے سر میں درد کی ہلکی ہلکی لہریں اٹھنے لگیں۔ دم گھٹنے لگا۔۔۔ کمرے میں بسا ند تھی ٹھہرے ہوئے پانیوں کی۔ وہ گھبرا کر صحن میں نکل آئی۔

باہر زیادہ تر مرد کھڑے تھے۔ ان میں سے کچھ موت کے اچانک پن سے حیرت زدہ تھے۔ بعض سوگوار تھے، اور چند ایک خالی الذہن۔ ایک تعطل کی کیفیت تھی۔ تمکین کا شوہر لوگوں سے الگ تھلگ اس جگہ کھڑا تھا جہاں بیلیں دیوار سے لپٹی تھیں۔ سانولے رنگ اور ناٹے قد کا یہ دبلا پتلا آدمی صدمے سے دوہرا ہوا جا رہا تھا۔ آنکھوں سے ساون کی جھڑی برس رہی تھی۔ وہ بار بار رومال سے چہرہ پونچھتا چلا جا رہا تھا۔ لوگ اسے نظر انداز کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ چند لوگ اسے ظالم اور دوسرے اسے مظلوم تصور کرتے تھے۔ مگر اصل میں وہ کیا تھا۔۔۔۔ ظالم یا مظلوم؟ کیا اس کے ہاتھ تمکین کے خون سے رنگے ہوئے تھے یا وہ کسی سازش کا شکار تھا؟ یہ سارے سوال بچھو کی طرح ڈس رہے تھے۔

ناٹے قد کے سانولے آدمی نے اپنے اصل سائز سے بہت بڑے بوٹ پہن رکھے تھے۔ عافیت کو وہ اپنے ناٹے قد اور بڑے بوٹوں کے سبب مضحکہ خیز دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سب سے بے خبر اپنے بڑے بڑے

ہونٹوں کی نوک پر آنسوؤں کے قطرے گرتے دیکھ رہا تھا۔ چند عورتیں اور مرد پھاٹک کے قریب کھڑے تھے۔ وہ تمکین کے شوہر کی بجائے عافیت کو ہمدردی سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک تڑنگی خاتون عافیت کی طرف بڑھی۔

''عافیت! تمہاری دوست کی بے وقت موت کا بے حد دکھ ہوا''۔

لمبی تڑنگی خاتون کے لہجے میں رحم کی ترحاہٹ نمایاں تھی، لیکن اس کے باوجود عافیت بھڑک اٹھی۔

''اب افسوس کا کیا فائدہ؟ آپ سب اس کے قتل میں برابر کے شریک ہیں۔ جب وہ مر رہی تھی تو آپ کو خبر تک نہیں تھی۔ آپ چاہتے ہیں کہ انحراف نہ ہو لڑکی پر شادی کا لیبل لگ جائے، آپ چاول کھائیں۔۔۔ شادیانے بجائیں۔ اس کے بعد کسی پر کیا بیت جائے گی۔۔۔ اس سے آپ کو کیا غرض''۔

لمبی تڑنگی خاتون ہکا بکا رہ گئی۔ وہ یوں گھبرا کر بھاگی جیسے کسی بھڑ نے کاٹ لیا ہو اور واپس اس گروہ میں شامل ہو گئی جو پھاٹک کے قریب جنازے کی رخصتی کا منتظر تھا۔ عافیت خود اپنے تند ردعمل پر حیران تھی۔ نجانے اسے کیا ہو گیا تھا کہ وہ اس قدر درشتی سے لمبی تڑنگی خاتون سے مخاطب ہوئی۔ اس کے اندر کہیں گہرائی میں غصہ پھنکارنے لگا تھا۔ اس سے پہلے اس کی زندگی پرسکون پانیوں جیسی تھی۔ جس میں کبھی کسی جذبے کی کنکری سے چھوٹی چھوٹی لہریں اٹھتی تھیں اور دائرے بنتے تھے، لیکن کبھی کوئی طوفان نہیں آتا تھا۔ تمکین کی موت نے اس کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

جنازہ رخصت ہو چکا تھا۔ عافیت سب سے آخر میں تمکین کے گھر سے نکلی۔ باہر سڑک سنسان پڑی تھی۔ لوگ بکھر چکے تھے۔ عافیت اپنی کار میں بیٹھ گئی اور چھوٹی سڑک سے بڑی سڑک پر پہنچ گئی۔ بڑی سڑک پر وہی چیختا چلاتا شور، دھاڑتا ٹریفک، اپنی اپنی دھن میں بھاگتے لوگ۔۔۔ وہی تیزی۔۔۔ وہ جنون۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ دنیا کو خبر ہی نہ تھی کہ کوئی رخصت ہو چکا تھا۔ کہانی ختم ہو چکی تھی۔۔۔ مگر زندگی جاری وساری تھی۔

عافیت گھر پہنچی تو بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ صحن میں ننھی منی بوندوں کے تسلسل سے سنبل کی جھاڑیاں نکھر سی گئیں تھیں۔ ان سے پرے گلچیں کے درخت مہک رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دھواں دھار بارش برسنے لگی۔ ''آسمان بھی رو رہا ہے۔'' عافیت نے سوچا''۔ لیکن اس ربط میں کتنی بے دردی سے پیچ دیئے۔ جوڑا کھول کر بال بکھیر دیئے۔ میز قرینے سے چنی کتابوں کو الٹ پلٹ دیا۔ وہ ننگے پاؤں قالین پر ادھر اُدھر ٹہلنے لگی جیسے کوئی شیرنی پنجرے میں۔ چکر لگاتے ہوئے اس نے پلنگ پر جست لگائی اور سلیقے سے رکھے تکیوں اور کشنوں کو توڑ موڑ کر پھینک دیا۔ سفید چادر کو ہاتھوں اور پاؤں سے مسل دیا۔ ''سلیقہ بے معنی اور قرینہ بے ضرورت ہے'' وہ بڑبڑا رہی تھی۔ آخر وہ ہانپتے ہوئے بیڈ پر گر گئی اور نمناک آنکھوں سے سوچنے لگی۔

''کیا تمکین روگ لگاتی تھی؟ کیا اس کی عمر بڑی تھی۔ کیا عورت تیس سال کی عمر میں ہی بوڑھی ہو جاتی ہے؟ کیا اس کے شوہر نے اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا یا اس نے خودکشی کی تھی؟ کیا۔۔۔ کیا۔۔۔ کیا اور کیا؟ ان سوالات کی گرد تلے تمکین کا۔۔۔ ایک انسان کا۔۔۔ ہمیشہ کے لئے چلے جانے کا المیہ اور اس کی سنگینی کس طرح دب کر رہ گئی تھی۔ سب کو اپنے تجسس کی تشفی چاہیے تھی اور تمکین۔۔۔ تمکین۔۔۔ ایک انسان۔۔۔ ایک شخص کی رخصتی کا نوحہ کون پڑھے گا؟

روزن

طاہرہ اقبال

اسماء کی بیوگی کو دیکھتے ہوئے سہاگنوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''اللہ ایسی بیوگی ہر کسی کو بخش'' اسماء کے گھر کام کرنے والی بیوہ عورت رضیہ نے بیوگی بھر حسرت اپنی آہ میں سمیٹی۔

''اللہ ایسی بیوگی پر سو سہاگنیں قربان''

رضیہ جسے بیوگی کے چوتھے روز ساس سسر نے مار کوٹ نکال باہر کیا' روٹی روزی کی مشقت کرایہ ادا نہ کر سکنے پر روز روز کی بے دری' بیمار بچوں کا دوائی کے لیے بلکنا یعنی وہی سارے لوازم جو بیوگی کا زیور ہیں' پر اسماء کو بیوگی کی اس آرائش پر رشک آنے لگتا۔ رضیہ کی بے دری پر نہیں' اسکی راند بھر بھوک پر بھی نہیں' اس کے بھوکے ننگے بچوں کی افراط پر بھی نہیں' بلکہ ان سب کی پیدا کردہ مصروفیت پر۔ بیوہ ستی بھلے نہ ہو لیکن ستی سمان مصروفیت بیوگی کے توازن کے لیے بڑی ضروری ہے۔ اسی لیے تو دور اندیش معاشرہ اسے مصروف رکھنے کو روایتی طرز عمل جاری رکھتا ہے' جب کہ اسماء کے حصے کی ساری مصروفیت سسرالی رشتہ داروں نے اپنے سر لے لی تھی۔

انعم سکول چلی جاتی' کام رضیہ کر جاتی' جو رہ جاتا وہ پڑا رہتا' آخر کس کے لیے کیا جائے۔ کام کسی رد عمل کسی اشتراک کے واسطے ہی ہوتا ہے جب اشتراک اور رد عمل ہی نہ رہے تو پھر عمل غارت' اس کا ہر کام ہر ضرورت دیور جیٹھ پوری کر جاتے اور وہ رہ جاتی فارغ کی فارغ اور فراغت کے عمل میں نہ کہیں اشتراک ہے' نہ ٹکراؤ' بس بوریت کا منفی رد عمل اور بوریت بے عملی ہے۔

رضیہ حیران ہو ہو کر کہتی۔

''باجی اتنے اچھے سسرال اللہ! آپ تو شکر کرتے کرتے نہ تھکو۔

لیکن جب محنت و کوشش کے بنا ہی نعمتیں ملنے لگیں تو بندہ ناشکرا ہو جاتا ہے۔ اسماء فی الواقع ناشکری تھی ورنہ شکر ادا کرنے کو اسے کتنے مواقع میسر تھے۔ ساس سسر بہو کی بجائے بیٹا کہہ کر پکارنے لگے تھے۔ دیور'

جیٹھ بھابھی کی بجائے بہن جی اور بھابھی ماں بلانے لگے تھے اور اسماء کو یہ باور کروا دیا تھا کہ وہ اپنی حیثیت مقام اور عمر میں ایک دم بہت بڑھ گئی ہے اور اس عظمت کو برقرار رکھنا ہی دراصل اس کی بیوگی کا جائز ردعمل ہے۔ جبکہ انعم چاچوں پھوپھیوں کے لاڈ کے ہنڈولے میں اپنی عمر سے گھٹنے لگی کہ دس سال کی عمر میں روٹی کو توتی بولنے لگی۔ اپنی عمر اور فطری احتیاجات سے آگے بڑھ جانا یا پھر پیچھے رہ جانا بندے کو ناشکرا بنا دیتا ہے' ناانصافی کا ردعمل عدم توازن ہوا کرتا ہے۔ چاہے جسمانی' چاہے ذہنی چاہے نفسیاتی' چاہے عملی۔۔۔! اسماء کو بیوگی کا سب سے بڑا نقصان تو یہ ہوا تھا کہ دن کا بیشتر وہ حصہ جو وہ بننے سنورنے میں صرف کرتی تھی۔ وہ بالکل بے کار ہو گیا' چلو معاشرے کے منفی ری ایکشن کی مصروفیت وہ حاصل بھی کرے تو فائدہ' وہ تو پورے معاشرے کی ماں تھی۔ کیونکہ بیوہ کی دو ہی حیثیتیں بنتی ہیں۔ یا ماں یا رنڈی اور یہ نازک فیصلہ بیوہ کے طرزِ عمل سے ہی ہوا کرتا ہے جس پر سماج مہر تصدیق ثبت کرتا ہے اور اس پر یہ اتھارٹی لگ گئی تھی کہ وہ ماں ہے اور ماں کے چہرہ اور جسم تو ہوتا نہیں ہوتا۔ وہ بھی فالتو ہو گیا۔ آدھ کلو سبزی ترکاری خریدنے کے لیے ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مصروفیت بھاؤ تاؤ اور چننے چھانٹنے میں صرف ہو ہی جایا کرتی تھی' بجائے اس کے کہ اسے بے گھر ہونے' کمانے' باہر کے دھکے کھانے' شریکوں عزیزوں کے طعنے سننے کی مصروفیت میسر آتی۔ اسے تقدیس کی روئی میں لپیٹ کر فراغت کی پرچھتی پر سجا دیا گیا۔ فراغت کی پراگندگی ڈسنے لگی۔ زہر باد پھیلنے لگا' تو وہ کراہنے لگی۔

''اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں کہیں نوکری کر لوں۔''

سسر کے آنسو سفید داڑھی پر ٹپکے اور اندر کہیں سفید گرتے میں جذب ہو گئے۔

''کیوں بیٹی ہم سے کوئی کوتاہی ہو گئی کیا' کوئی ایسی ضرورت رہ گئی جو ہمیں معلوم نہ ہو سکی۔۔۔''

ساس کی ہچکی بندھ گئی' جیسے ابھی ابھی سجاد کے ایکسیڈنٹ میں ہلاکت کی خبر ملی ہو۔ ''بیٹی ایسی کوئی ضرورت ہے تو مجھ سے کہہ میں جو تیری ماں ہوں۔۔۔''

اب وہ انہیں کیا بتاتی کی ضرورت ہی تو رہ گئی ہے' جسے سمجھا تو جا سکتا ہے لیکن بیان کے لیے کم از کم اس کی زبان میں ابھی کوئی ایسا لفظ ایجاد نہیں ہوا اور سوچ کی غفلت میں حقائق کی سنگینی قید ہو جایا کرتی ہے۔

چھوٹے دیور نے قہقہہ لگایا۔

''بھابھی ماں پانچ وقت کی نمازیں اور اضافی وظیفے اور تسبیحیں مسلمان عورتوں کے پاس فراغت رہنے ہی کہاں دیتے ہیں کہ وہ کچھ اور بھی کریں۔ میں تو کہتا ہوں' یہ جو مسلمان قوم ترقی کی دوڑ میں اس قدر پیچھے رہ گئی ہے تو اس میں ان کی اس مصروفیت کا بھی ہاتھ ہے۔ ان کے پاس تو فرضی عبادتوں کے بعد ہی اتنا وقت نہیں بچتا کہ فراغت کی سہولت میسر آئے۔ نفلی عبادتیں مستزاد۔''

اسماء کا جی چاہا کہہ دے اس میں عبادتوں کی نسبت' چار چار بیویوں اور معشوقاؤں کی مصروفیت بھی تو شامل ہے اور پھر زیتون' کھجور اور بروسٹ کی ہنگامی مصروفیات' وہ خود بھی تو یہی کچھ کھاتی ہے' جن کا مطالبہ ردعمل

ہوا کرتا ہے۔ ہر نوع کی غذا اپنی نوعیت کا ری ایکشن چاہتی ہے' لیکن اس کے پاس تو بے عملی ہے۔ فارغ دماغ' فارغ جسم' جس کی غذا مصروفیت ہے اور غذا کا قحط بدامنی اور لاقانونیت پیدا کرتا ہے۔ رضیہ روتی کرلاتی آئی تھی۔ یوں بیوہ کے لیے رونے کرلانے کی مصروفیت بھی کتنی رومانوی ہے۔ جیٹھ نے اس کے چار بچے چھین لیے تھے اور جو تین اس کے پاس رہ گئے تھے' وہ صبح سے بھوکے تھے اور سردی میں ٹھٹھر رہے تھے۔ اسے رضیہ پر بیوگی پھر رشک آیا۔ کیسی زبردست مصروفیت تھی' اس کے پاس' بھوکے بچوں کا پیٹ بھرنے کی مصروفیت' رشتہ داروں سے لڑنے جھگڑنے کی مصروفیت۔ اس نے بھوکے بچوں کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے کہا "آخر چاہتا کیا ہے تم سے' دینے دلانے میں کچھ ہے نہیں' خود کما کر کھلاتی ہو انہیں پھر کیوں تمہیں مارتا اور چھینتا ہے انہیں تم سے۔۔۔"

رضیہ تین نوالوں کا ایک نوالہ گال میں چھپا کر شرمائی۔

"باجی! کیا بتاؤں مطلب تو اس کا کچھ اور ہے۔ پر مجھ سے نہیں ہوتی یہ حرام کاری' کہتا ہے اس بھری جوانی میں تم پاک مریم بننے سے تو رہی۔ باہر کھیہ کھانے کی بجائے گھر میں ہی سنبھلی رہو تو بہتر' جس دن انکار کر دوں یہی حشر کرتا ہے۔ ہلکا ہو گیا ہے مردود۔"

اس بدبو ماری' کالی' موٹی' ٹھگنی عورت میں بھی ایسا کچھ ہے کہ کوئی مرد اس کے لئے پاگل کتا بن جائے۔ شاید خود عورت زاد جو بڑا نقص امن ہے۔ رضیہ پلو پر گرم سانس پھونک پھونک چہرے کے نیلوں کو ٹکور کرنے لگی۔

"باجی! آپ بڑی مقدر والی ہو۔ ایسی اچھی سسرال ملی' بہن جی' ماں جی کہتے کہتے منہ سوکھتا ہے ساروں کا' ورنہ رانڈ بیچاری تو محلے والی جیسی ہی کھی جاتی ہے۔ ہر کوئی رالیں ٹپکاتا پھرتا ہے۔ بچا ہی اور دانے لاسے سے آخر کب تک بچے' بندہ بھولن باز' پر قسم لے لو باجی! آج تک کسی سے ایک ٹکا لینا لوانا حرام۔ ان دو ہاتھوں کی محنت کا کما کر ہی بچوں کو کھلایا۔"

رضیہ نے فخر اور داد طلب انداز میں کجلیں بنا سر اوپر اٹھایا۔

اسماء نے اس بے جگری پر رضیہ کو خراج تحسین پیش کیا۔

"لو اور سنو باجی! چھوٹا دیور جو بیاہی آئی کی گود میں ساس نے بٹھایا تھا' کل وہ بازو پکڑنے اور ڈھارے میں رگیدنے لگا' لو میں نے بھی خوب ہی دھپے لگائے' حرامی بولا "تیرے دھپیوں میں بھی مزا ہے جانم۔۔۔"

"انڈین فلموں سے سیکھتے ہیں نا یہ ساری بکواس۔۔۔ برے کہیں کے۔"

رضیہ منہ پر پلو لپیٹ کر ہنسی' جیسے دیور کی برائی کا ردعمل شریری گدگدی ہو' جو کہیں ڈیلوں اور ہونٹوں کے بے جلد کے گوشت میں ہوئی ہو۔

یہ مرد بھی کتنی بڑی مصروفیت ہے' عورت کے لیے' جب سجاد زندہ تھے تو اسے فرصت کہاں ملتی تھی۔

انتظار کی مصروفیت' لڑنے جھگڑنے کی مصروفیت' روٹھنے منانے کی مصروفیت۔ بننے سنورنے کی مصروفیت پورا دن پانی بھری چھلنی کی طرح بہہ جاتا' جس دن سجاد گھر پر نہ ہوتے' تو فراغت بھرا دن چھلنی میں پڑے ہوئے روڑوں کی طرح چھن چھن بمشکل تمام ہوتا۔ جب یہ مصروفیت روٹھ گئی تو منطقی لحاظ سے اس خلاء کو پر ہونا چاہیے تھا۔ کلفتوں سے' مصائب سے' مشقت سے بھری مصروفیت کے ساتھ۔

اس کی ساس نے کہا تھا سردیوں کے چھوٹے چھوٹے دن تو بس وضو کرتے اور نمازیں پڑھتے ہی گزر جاتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دن تو گزر جاتے ہیں۔ پر یہ لمبی لمبی راتیں کیوں نہیں گزرتیں۔ یہ ساس نے نہ بتایا تھا' جس نے بیوگی کے بعد اس کے لیے پہلی شاپنگ سعودی حجاب کی کی تھی۔ کیونکہ اب یہ طے تھا۔ بیوہ کا چہرہ کسی مرد کی نگاہ سے آلودہ نہ ہو۔ ایک بال تک دکھائی نہ دے۔ ورنہ بیوہ جہنمی ہوئی کہ بیوگی کا ردعمل محض آخرت سنوارنا ہی تو رہ جاتا ہے۔ انعم بھی جلدی سونے لگی۔ حالانکہ باپ کی زندگی میں تو وہ سو کر نہ دیتی تھی اور وہ اس کے سونے کا انتظار کرتے کرتے مایوس ہو کر خود ہی سو جاتی۔ اب وہ اسے جگانا چاہتی' لیکن دن بھر کزنز کے ساتھ کھیل کود' چاچوں دادے کی لاڈ برداریاں اور دادی کے مرغن کھانوں کا آلس' سر شام ہی چڑھ جاتا' اور پتھر دھڑ والی شہزادی کی کہانی ابھی بیچ میں ہی ہوتی اور وہ سو بھی چکی ہوتی' ادھوری کہانی کی گنجلوں میں اسماء کی نیند پتھرا جاتی۔ نیند بھی تو ذہنی اور جسمانی تکان کی غذا مانگتی ہے اور فاقہ زدہ کو نیند نہیں آیا کرتی' فاقہ چاہے جسمانی ہو چاہے ذہنی' چاہے نفسیاتی بندے کو نحیف اور کمینہ بنا دیتا ہے۔ یہ بھوک بھی عجب ہے یا بے ہوش کر دیتی' یا اونگھ بھی چھین لیتی ہے۔

فارغ رہ رہ کر اسماء کے بدن میں کھلیاں پڑ گئی تھیں' جن کا اکڑاؤ رات بھر دکھن چھوڑتا' گرہیں پروئے وجود کا ہر ہر مسل گجھل بن گیا تھا۔ کوئی دو مضبوط ہاتھ زور زور سے دبا دیں۔ پنجوں پر مکیاں ماریں۔ ہتھیلی میں تیل ڈال کر بالوں کی جڑیں ہلا ہلا کر درد چن لینے والے تیل سے پورے جسم کی تیز تیز مالش کر دیں۔ اسے تو دبوانے کی بھی عادت نہ رہی تھی لیکن اب تو یہ پورا بدن سوت کی انی کی طرح گجھل گجھل ہو گیا تھا جنہیں کھولنے کے لیے ایک تار کا سرا دور تک سلجھانا پڑتا ہے۔ ورنہ سارا پشارہ بے کار۔

انعم بھی سوئی ہوئی ہوتی' ورنہ اسے ہی کہتی" ذرا دبا دو۔" وہ تکیہ بھینچتی' کمبل میں بدن کی گٹھڑی کس کس کے باندھتی' لمبے پینڈے کی تھکن عضو عضو میں سفر کرتی۔ رنگ مشین سا پینڈا بھاگتے رہو۔ بھاگتے جاؤ۔ پر کھڑے وہیں کے وہیں رہو' تھکن منہ سر سے ٹپکنے لگتی۔ بے سمت سفر بھی کتنا تھکا دیتا ہے۔ منزل کی سمت لمبا سفر بھی تھکن کو آسودہ کرتا رہتا ہے۔ اجنبی ماحول اور بے شناخت تکان نیند اڑا دیتی ہے۔ اٹھ کر ٹی وی چلاتی۔ خوبصورت اور جوان چہروں اور جسموں کا ازدحام اتنی بھیڑ' ملبوسات کی رنگا رنگی' گہرے اور شوخ رنگ' جیسے آگ کی دہک تعیشات کا نظارہ بدن میں بھڑک کیوں مچا دیتا ہے' جیسے تنور کی سطح کی گلابی دہک جل جل سرمئی ہو جاتی ہے۔ ہر چینل پر رنگوں اور جسموں کی آتش بازی' چنگاری اڑتیں' انار چھٹتے' شرلیاں پرواز بھرتیں' کسی امیر کی شادی کی آتش بازی کا سا منظر' مضطرب کرنے' دہلا دینے اور مرعوب کر دینے والا۔ اس آتش بازی کے گناوے سے کیسے کیسے مناظر گزر

جاتے جو بیوہ کے دیکھنے کے نہیں ہوتے۔ نابالغ دیکھے تو شاید سمجھ کی معذوری حیرت ہو جائے۔ کنواری دیکھے تو کچھ سہانے خوابوں کی طنابیں مزید کھنچ جائیں' لیکن بیوہ دیکھے تو وجود کی باسی ہمک' بدبو ہو کر شناخت کے زہر کو محرومی کے کرب میں بلو ڈالے' تو پھر یا بغاوت یا موت۔

یہ نفسی بندشیں کتنی ضروری ہیں بیوہ کے لیے۔ دال بھات کھانا' موٹا جھوٹا پہننا' نا آسائش زندگی جھوجنا' ٹکراؤ کی کیفیت میں رہنا' جس کا منطقی نتیجہ اندر کہیں دور تک خوف اور دہشت کی فضا کا لاگو ہونا ہے لیکن یہاں بندش لگی تو محض نمو پر' قد نہیں بڑھتا' جسم نہیں بڑھتا' دماغ نہیں بڑھتا لیکن اندرونی نمو تو جسم میں' دماغ میں' خون کی گردش کے ساتھ ساتھ جاری رہتی ہے۔ یہ جذبات' احساسات' خیالات' بیوہ کیوں نہیں ہو جاتے' ان کا شوہر کیوں نہیں مرتا بھی۔۔۔ اگر کھاد پانی ملتا رہے تو زمین کی زرخیزی بنا بیج کے بھی کئی خودرو جھاڑیاں اگا ڈالتی ہے۔ اندر کی اس زمین کا بانجھ ہونا بیوہ کے لیے ازحد ضروری ہے۔ بھٹی بنے باورچی خانے میں ساری دوپہر گزارنا' سسرال بھر کے بھانڈے کپڑے دھونا مانجھنا' گالیاں جھڑکیاں کھانا اور روتے دھوتے ایک ایک دن میں ایک ایک سال کی سیڑھیاں پھلانگتے چلے جانا۔ کتنا ضروری ہے۔ اس اندرونی نمو کو سونٹھ کرنے کے لیے وجود میں آگ آئے' بھکھرے اور آکاس بیل کی شادابی اور بڑھوتری کے لیے' لیکن یہاں تو کوئی بندش لگی ہی نہ تھی۔ باہر کا امن اندر کی بدامنی ہو جاتا ہے۔ لہو کے ہر ہر قطرے میں باغی سر ابھارنے لگتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے احتجاجی مظاہرے اور پھر آنسو گیس کی شیلنگ' لہو اور بوٹیوں کی کھائی' جس میں کتنا پھٹا وجود تڑپنے لگتا' وہ مرثیہ نما شعر کہنے لگی' جس خاندان میں عورتیں چھوڑ مرد بھی میٹرک' ایف اے سے آگے نہ بڑھے ہوں۔ سوتر منڈی کے اترتے چڑھتے نرخوں میں بڑھتی پھولتی توندیں' بھلا ادبی ذوق کسی لطیفے جیسا ہی ہوتا' جسے پتہ چلتا وہ ہنستا اور اس کی ذہنی حالت پر افسوس کا اظہار کرتا' ساس سب سے قیمتی کپڑے اسی کے لئے لانے لگی' سسر نے کوٹھی نام کر دی' جیٹھ نے نئی گاڑی تبدیل کر دی۔ دیور پھل فروٹ دوگنی مقدار میں لانے لگا۔ اندر کی بدامنی دو چند ہو گئی۔ باہر کی آسودگی اندر کی بدامنی کو انگشت دینے لگی۔ بغاوت رستے تلاشنے لگی۔

رضیہ دو دن سے نہ آئی تھی' گھر کا کام پڑا رہتا۔ پڑا رہے وجود کو تو فراغت کا دیمک لگا تھا۔ مصروفیت کی تختی کہاں سہارتا تھا' ساس کو پتہ چلا فی الفور دو دو کام والیاں بھجوا دیں' چوتھے روز بانگڑی والا لال دوپٹہ اوڑھے رضیہ آئی۔

''لو باجی کچھ نہ پوچھو' آپ بھی کہتی ہو گی کہاں مر گئی' سچ مری تو گئی میں۔ ساروں نے پکڑ دھکڑ چھوٹے دیور سے نکاح دیا۔ بتیرا روئی کرلائی۔ پر میری کون سنے باجی' رانڈ بیچاری تو بھاجی ترکاری جیسی ہی ہوتی ہے نا۔ مرضی کا گاہک تھوڑی ملتا ہے۔''

رضیہ روئے چاہے ہو گی لیکن میلے کیسلے آنسوؤں نے آنکھوں کو مل مل دھو دیا تھا۔ یوں جیسے ریت اور لیموں ملا کر مانجھے ہوئے برتن کی لشک ڈھلک پڑتی ہے۔

اندرونی نمو بیرونی بندشوں سے سر ٹکرانے لگی۔

''لیکن وہ تو ابھی بہت چھوٹا ہے۔''

''میں بھی یہی سمجھی تھی۔ باجی پر۔۔۔''

رضیہ نے لال دوپٹے میں لشکتا ہوا گوکا لپیٹا' متھنے میں ناخن ڈال کر کوکی کو کھنکھنایا' بائیں آنکھ کا کونا ذرا سا دبایا۔ ''یہ تو۔ باجی! یہ تو اپنے بڑے بھائی سے بھی بڑھ کر جوان نکلا۔''

دیوری جوانی کا نشہ رضیہ کی آنکھوں میں مدہوش ہونے لگا' زرد گالوں پر روپہلا ستارہ اور گلابی شفق مل کر جھلملانے' ایسی لو بھڑکی' جو کسی بجھے دیپ کے جلاؤ' یا گرند گلی کے چنگاؤ میں ہوتی ہے اور جب یہ لو بھڑکتی ہے تو پھر برسوں کا روٹھا حسن اور جوانی پل بھر کے لیے اپنی تمازت جھلکا جاتے ہیں۔ اسماء کا دیور پھل فروٹ گوشت سبزی سے لدا پھندا داخل ہوا۔

''بھابھی ماں یہ سودا سلف دیکھ لیجئے کچھ اور چاہیے تو حکم دیجئے۔''

نظریں احترام کے بات تلے دبری ہوتی ہوئیں۔ ترازو کا پلڑا زمین کو چھو گیا۔

رضیہ گلی سے سبک وجود کو بانکڑی والے لال مہین دوپٹے میں لپیٹے چنکی۔

''اللہ کتنی شرم ہے نظروں میں ایک ہمارا کا دیور ہوتا تو۔۔۔ نرے بے شرم۔۔۔ رہے مرد کے مرد' کوئی رشتہ' کوئی حد تو بنی ہی نہیں نا ان کے لیے۔۔۔ دیکھا جائے تو یہ اچھا بھلا جوڑ ہے' آپ کا باجی! پر ماں بن کے اس کی دلہن خود ڈھونڈ رہی ہو۔''

وہ اس کی دلہن نہ ڈھونڈے تو کیا خود اس کی دلہن۔۔۔

''توبہ اندر کی بدامنی اپنی جگہ پر لیکن بیرونی حد بندیوں کا لٹھ ذرا پیر گریز سے نکلنے نہیں دیتا' اخلاق' تعلیم' مذہب' ریت رواج کسی ایمپائر کی طرح نوبال' رن آؤٹ کا اشارہ دیتے ہر بدنظمی کو کنٹرول میں رکھتا ہے اور ایمپائر کا فیصلہ تو حتمی ہوتا ہے' جس کے خلاف احتجاج کرنے والے کو پینلٹی لگا دی جاتی ہے۔

اسماء کے دیور کے لائے ہوئے پھل فروٹ دھوتے ہوئے رضیہ نے لال دوپٹے کی سنہری گنی ماتھے پر جھکا کر بکل ماری' دیور کی بے شرمی کے حرفوں کی لال نیلی سیاہی کو چھپاتے چھپاتے دکھایا۔

''ویسے باجی مرد کی سنگت کے بنا عورت کے جینے کا سواد کوئی نہیں۔۔۔''

عورت کے جینے کا سواد نہیں ہے نا۔ پر وہ تو بیوہ ہے' جس کے حبس زدہ وجود کو سانس لینے کی ضرورت ہی نہیں رہتی کیونکہ اسے تنفس خارج سے پمپ کیا جاتا ہے۔ اندرون کا نظام تنفس تو فیل ہو جاتا ہے لیکن اس کا باغی اندرون سانس کی گنجائش کیوں مانگتا تھا۔ دیور کی دلہن کی تلاش لمبی ہو گئی۔ اسماء کو اس کا کوئی مناسب میچ ہی نہ نظر آتا' سگے بیٹے کی دلہن کی تلاش میں بھی اس قدر کوئی نہ رولتا ہوگا جتنا اسماء رل گئی تھی۔ لوگ حیران رہ گئے جیسے اس کا جوڑ دنیا میں کوئی تھا ہی نا' ملتا کہاں سے' پر دیور بڑا بے صبرا نکلا خود ہی ایک بے جوڑ سا ڈھونڈ لیا۔ اس پاجی نفس کا

کوئی معیار' کوئی اخلاق تھوڑی ہوتا ہے' بس بھوک کا ذائقہ ہوتا ہے اور بھوک کی بے صبری میں سب ایک جیسا لگتا ہے' صاف اور مزے دار' گند بھی اور مطاہر بھی' لیکن یہ خارج کا پمپ وجود کے اندرون کو بھکاری کے کشکول سا خالی خولی کیوں چھوڑ جاتا ہے۔

وہ روزے رکھنے لگی' کہ شاید بوجھل معدے میں خلا بن جائے اور ٹھہرا تنفس رواں ہو جائے' وہ رضیہ کے دیور کے دیئے ہوئے داغوں کو دیکھ کے توبہ استغفار کی تسبیح کرنے لگی۔ رضیہ تسبیح کے ورد کو بار بار جھٹک کر دیتی۔

''لو باجی میں تو ہوں ہی نصیبوں پٹی' پہلا کیا کم ظالم تھا۔ دوسرے نے تو حد ہی مکا دی' جو چار ٹیچلز کما کر لے جاتی ہوں وہ پیتوں میں لگا بار دیتا ہے اور پھر بنیان پھروں لنے لگتا ہے۔ روکوں تو یہ حالت کرتا ہے۔''

اسماء نے زخموں' سوجنوں اور نیلوں کو دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھا۔

''تو نکال باہر کر وحرامی کو' تمہیں کما کر تھوڑی کھلاتا ہے جو یہ ظلم سہتی ہو۔ توبہ استغفار یہاں تک نیلو نیل کیا ہے۔ تجھے برے نے۔۔۔''

''خیر یہ نیل تو دوسرا ہے باجی۔'' رضیہ دوسرے نیل کو پلو میں چھپا کر شرمائی اور پہلے نیلوں کی دکھن میں کراہی۔

''حرامی مار مار ادھ موا کر دیتا ہے پھر پیار بھی تو ڈھیر سا کرتا ہے' پتہ باجی اب اس کی مار پر مروں کہ پیار پر جیوں۔ باجی یہ عورت ذات بھی بڑی کتی' مرد کی ذرا سی شکار کے لیے کتنی خجل خواری سہہ جاتی ہے۔ اس نیل کی خاطر کتنے نیل اور زخم پی جاتی ہے۔ ویسے رب کو زنانی کے ساتھ یہ مرد کے پیار والی گت نہیں لگانی چاہیے تھی۔ نری کتا کھی' ناک سے اڑاؤ' ہونٹ پر' ہونٹ سے اڑاؤ آنکھ پر' آپ تو بڑی نیک پاک ہو' جتی ستی ہو۔ اپنی نماز میں دعا کیا کرو' باجی عورت کے چینڈے سے مرد والی گت نکل جائے' پھر سکھ میں آ جائے گی یہ عورت ذات یہ کتا کھی نرا جان کا عذاب اس کی گت بڑی ڈاہڈی۔

اس کی نماز میں دعا کا دورانیہ طویل ہو گیا۔ اس کو دعا کرنا تھی۔ عورت کے بدن سے مرد کی گت نکل جائے' کتا کھی سی لیچڑ' جسے ناک سے اڑاؤ تو آنکھ پر' آنکھ سے اڑاؤ تو ہونٹ پر جا بیٹھتی ہے۔۔۔ درود شریف کے ورد لمبے ہو گئے' غزلوں کی گنگناہٹ نعتوں میں تبدیل ہو گئی' آواز کا سوز میلاد کی مجالس میں کرب بھرنے لگا۔ بھرے ہوئے بادل دل کھول کر برستے' یہ روتے رلانے والی آسودگی بھی حبس موسموں کو آندھی' جھکڑ' بارش کے بعد جیسی خوش گواریت دے جاتی ہے۔

سلام اے آمنہ کے لالؐ اے محبوب سبحانی

پھر بند ٹوٹ پڑتے' ساری چھم چھم پلو بھگوتیں۔ کیسے کیسے انقباض کھلتے اور رکاوٹ جاری ہوتے' اچک اچک کر اسماء کے ہاتھ سے ہاتھ ملاتیں' جیسے کرب کے اشتراک کی بیعت اس کے ہاتھ پر کر رہی ہوں۔ ہر بندش کی ہر سیلانی پر کیسا کیسا حبس چھٹتا' سیلابی پانی اپنے ہمراہ کتنی بھل کھینچ کر لاتے' اسماء کا گلا مزید پرسوز ہو جاتا وہ

حیران رہ جاتی بظاہر خوشگوار موسموں کے اندر کتنی گھٹن بھری ہوتی ہے۔ بند بوتلوں کے کاک اٹھتے گیس کی شدت بھاپ بن باہر نکلتی' پانی کے قطروں میں تحلیل ہو جاتی۔ مدینے کی گلیوں میں بھٹکنے اور کبھی واپس نہ پلٹنے کی سمندری خواہش میں کتنے موگھوں' ٹوبوں' ٹویوں کی حسرتیں اتر جاتیں۔ لوچ اور گمبھیرتا اور بڑھتی' پتلی پتلی گل قدس کی پتیوں سے لبوں کی نزاکت پہ پوروں پر بوسے چٹاخ چٹاخ پڑتے مقدس پوریں آنکھوں سے چھوتیں' سراج المنیر کی لو میں بینائی دمکنے لگتی' کھلا کھلا مطلع' گہرا لاجوردی ہو جاتا' بھیگی بھیگی مٹی کی مہک سوندھی واشنا چھوڑتی' معتدل موسم خوشگوار ہو جاتا' رقت کھل کر باآواز ہو جاتی۔ مصروفیت تھی کہ دم لینے کی فرصت بھی نہ دیتی تھی۔

ؕ

چائلڈ سولجر

ماجد لودھی

یوسف اپنے چہرے اور گھٹنوں سے مٹی جھاڑے بغیر اور یہ دیکھے بغیر کہ اس بار اس کے بدن پر کتنی خراشیں لگی ہیں ایک بار پھر متعین راستے پر چلنا شروع ہو گیا۔ وہ صبح سے پوری کوشش کر رہا تھا کہ صحیح راستے پر چلتا رہے اور کام جلد از جلد ختم کر کے گھر واپس چلا جائے۔ نجانے کیوں وہ بار بار راستے سے بھٹک رہا تھا۔ صرف پانچ دن ہی تو باقی رہ گئے تھے۔ اس کے بعد تو وہ کبھی یہ کام نہیں کرے گا۔ ایسے ہی اس کے باپ نے پیسے پکڑ لئے۔ خود تو لنگڑا ہو کر بیٹھا ہوا ہے۔ ادھر آ کر دیکھے تو اسے پتہ چلے کہ کتنا خطرناک کام ہے۔ اس نے اپنے باپ کو خوب برا بھلا کہا۔ اس نے اپنے پیچھے آتے فوجیوں کی باتیں سننے کی کوشش کی۔ ایک امریکی فوجی جو پشتو بول اور سمجھ لیتا تھا۔ افغانی فوجی سے پشتو میں علاقے کے لوگوں کے بارے میں معلومات لے کر انگریزی زبان میں اسے باقی امریکی ساتھیوں کو بتا رہا تھا۔ یوسف کو سمجھ نہ آئی تھی کہ جب امریکی ان کے دشمن ہیں تو پھر افغانی کیوں ان کا ساتھ دیتے ہیں اور خود اس کا باپ جو امریکہ کے خلاف لڑا تھا اب اس سے ان امریکیوں کی نوکری کروا رہا تھا۔ وہ ان ہی سوچوں میں گم جا رہا تھا کہ اسے چند قدم کے فاصلے پر زمین ذرا سی اُبھری ہوئی نظر آئی۔ گو امریکیوں نے اس سلسلے میں باقاعدہ طور پر کچھ نہ بتایا تھا مگر وہ ادھر اُدھر سے سن کر اور دیکھ کر اس اُبھری ہوئی زمین سے بخوبی آشنا ہو گیا۔ اس نے رک کر اپنا ایک ہاتھ بلند کیا۔ اس امریکی فوجی نے جو سب سے بارعب اور سینئر لگ رہا تھا ہاتھ کے اشارے سے اپنے پیچھے آتے ایک افغانی کو بلایا۔ یوسف نے گنا' نو امریکی فوجی تھے اور تین افغانی۔ ایک دراز قد دو پست قد۔ وہ صبح سے کئی بار ان کی گنتی کر چکا تھا۔ اس نے نیم پلیٹ سے ایک دو کے نام پڑھنے کی بھی کوشش کی مگر سکول میں سیکھی ہوئی ٹوٹی پھوٹی انگریزی نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ تھوڑی دیر میں اس اُبھری ہوئی جگہ کے گرد گیلے چونے سے دائرہ لگایا جا چکا تھا۔ افغانی اپنا کام کرنے کے بعد ڈبہ اور برش لے کر اپنی جگہ پر چلا گیا۔ سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ رستہ ایک دم نیم ڈھلوان میں بدل گیا۔ یوسف نے دیکھا کہ اب رستے پر باریک بجری اور مٹی کی جگہ لمبی لمبی گھاس نظر آ رہی تھی۔ البتہ کہیں کہیں بڑے بڑے پتھر ضرور پڑے تھے۔ اس نے زیادہ احتیاط اور

سست روی سے چلنا شروع کر دیا۔ اسے اس کے دوست فضل نے بتایا تھا کہ گھاس میں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک چھوٹا سا کیل ہی تو ہوتا ہے اگر پاؤں اس پر پڑ گیا تو کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ہوا کا ایک یخ جھونکا آیا' یوسف کانپ کر رہ گیا۔ جرسی وہ اپنے چھوٹے بھائی کو دے آیا تھا۔ نمونیہ اس کے بھائی کی جان نہیں چھوڑ رہا تھا۔

''ذرا تیز چلو۔ دیکھو سورج ڈوبنے کو ہے۔ ابھی تو کیمپ نظر ہی نہیں آ رہا جہاں ہم نے جانا ہے۔'' اس فوجی کی آواز ہمیشہ یوسف کو دہشت زدہ کر دیتی تھی۔ اس فوجی کی شخصیت میں کچھ ایسا خاص تھا کہ یوسف اسے دیکھ کر سن کر ہمیشہ سہم جاتا تھا۔ پچھلے پورے ہفتے اس نے کوشش کی تھی کہ وہ ایک بار آنکھ بھر کر خوب اچھی طرح فوجی کو دیکھے۔ مگر جونہی یوسف کی نظر اس کی آنکھوں کی طرف جاتی تو اس کے دل کی دھڑکن بڑھ جاتی۔ فوجی آنکھیں نہیں جھپکتا تھا۔ اس کی آنکھیں نیلی اور سرد تھیں۔ یوسف جب آگے آگے چل رہا ہوتا تو اسے اس فوجی کی آنکھیں اپنی گردن پر اور ریڑھ کی ہڈی کا طواف کرتی محسوس ہوتی رہتی۔ اس فوجی کے خوف کا اس کے پاس صرف ایک ہی حل تھا اور وہ تھا آیت الکرسی۔ وہ تقریباً نویں بار آیت الکرسی پڑھ رہا تھا جب رستے میں چھوٹا سا نالا آ گیا جس پر لکڑی اور درختوں کی شاخوں کی مدد سے خستہ سا پل تعمیر کیا گیا تھا۔ سب وہاں رک گئے۔ یوسف نے پہلے نالے میں بہتے صاف شفاف پانی کو دیکھا اور پھر اس فوجی کو دیکھا۔ فوجی بھی اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''پی لو پینا ہے تو'' فوجی نے کہا۔ پھر وہ سارے آپس میں پُل کی طرف اشارہ کر کے باتیں کرنے لگ پڑے۔ یوسف نے پانی میں ہاتھ ڈالا دوسرے لمحے اسے اپنی چودہ سالہ زندگی کا ایک اور تلخ تجربہ ہوا۔ کانٹے تھے یا پھر بجلی کا کوئی جھٹکا تھا یا سانپ کا ڈنک تھا۔ یوسف کو اپنا ہاتھ نیلا ہوتا محسوس ہوا۔ ''یہ کیسے پیا جا سکتا ہے'' اس نے سوچا۔ البتہ وہ کچھ دیر پانی کو غور سے دیکھتا رہا۔ پانی اتنا صاف تھا کہ نالے کی تہہ میں تیرتے چھوٹے چھوٹے پتھر اور پانی میں اگی گھاس بہاؤ کی سمت حرکت کرتے سب نظر آ رہے تھے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ امریکی فوجی ڈبل روٹی کھا رہے تھے اور اپنے فلاسکوں سے پانی پی رہے تھے۔ تینوں افغانی روٹی پر اچار رکھ کر کھا رہے تھے۔ ان کے اصرار کے باوجود اس نے کچھ نہ کھایا۔ البتہ اس نے ایک افغانی سے چادر لے کر اوڑھ لی۔ جلد ہی پڑاؤ ختم کر دیا گیا۔ سامنے اب ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی جس کا چکر کاٹنے کے بعد وہ ایک وسیع و عریض میدان میں جا پہنچے۔ میدان کے عین درمیان میں گاڑیوں کے آنے جانے سے رستہ بن گیا تھا۔ یوسف جانتا تھا کہ اب اسے اس میدانی رستے کے بیچ میں ہی چلنا ہے۔ تاحد نظر خشک گھاس کے قطعے نظر آ رہے تھے۔ جہاں یہ میدان ختم ہوتا محسوس ہوتا تھا وہاں سے نارنجی رنگ کی چمک سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ ڈوبتے سورج میں اس پہاڑ کا عکس تھا جس کے دامن میں قائم عارضی فوجی کیمپ لگایا گیا تھا۔ یہی آج ان کی منزل تھی۔ اور بہت سے گروہ بھی علاقے بھر میں بارودی سرنگوں کی تلاش میں تھے تاکہ اس کیمپ تک فوج کی مدد کیلئے ٹینک اور دوسری فوجی اہمیت کی گاڑیاں لائی جا سکیں۔ اس دیو قامت پہاڑ اور اس کے عقب میں پھیلے چھوٹے پہاڑوں میں ہی کہیں وہ دہشت گرد چھپے ہوئے تھے۔

یوسف نے تین چار اور بارودی سرنگوں کی نشاندہی کی۔ اب وہ میدان کے درمیان پہنچ گئے تھے۔ ایک کئی گز چوڑا گڑھا ان کے سامنے تھا۔ اس میں دو فوجی گاڑیاں اوندھی پڑی تھیں۔ گاڑیاں مکمل طور پر تباہ شدہ تھیں۔ نجانے وہ کب سے اسی حالت میں پڑی تھیں مگر یوسف کو بلاوجہ ہی بارود کی بو آنے لگی۔ فوجیوں نے اس جگہ کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ اور یوسف کو ذرا سمت تبدیل کر چلنے کو کہا۔ دراز قد افغانی اب امریکی کی جگہ یوسف کے عین عقب میں آ گیا۔ یوسف بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے اس تبدیلی کو جان گیا۔ اور اپنی توجہ سامنے کی مرکوز کر کے چلتا رہا۔

''میرا نام جانتے ہو'' دراز قد افغانی نے کہا۔

''آگے چلتے رہو۔ آگے دیکھتے ہوئے جواب دو۔'' افغانی نے یوسف کو سر پیچھے موڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں جانتا'' یوسف نے کہا۔

''اتنے دن سے تو ہمارے ساتھ ہو پھر بھی نہیں جانتے۔'' افغانی نے مصنوعی غصے سے کہا۔

''مجھے نام آتا تھا پر بھول گیا ہے۔'' یوسف نے کہا۔

اسے پہلے روز سے اس افغانی کی داڑھی سے گھن آتی تھی۔ اس کی داڑھی عجیب انداز میں بکھری ہوئی تھی۔

''فراست ہے میرا نام۔''

''جی اچھا۔''

''اب یاد رہے گا ناں۔''

''جی اب نہیں بھولوں گا۔''

''ہوں ٹھیک ہے۔ تم اچھا بچہ ہے۔ اور بستی میں ٹھہرے گا تو تم جی بھر کر کھانا پینا' پیسے کی فکر نہیں کرنا وہ میں دوں گا۔''

یوسف فراست کی پوری بات نہ سن سکا' اس کی ساری توجہ اپنے سامنے بڑھتے چھلیتے ان لفظوں پر مرکوز تھی جواب چلتے پھرتے انسانوں میں ڈھل گئے تھے۔

''فراست وہ آ گئے ہیں۔ واپس آ جاؤ۔'' امریکی فوجی نے دوربین سے سامنے سے آتے ہوئے اپنے دوسرے امریکی ساتھیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ فراست نے ذرا آگے بڑھ کر یوسف کے گال کی چٹکی کاٹی اور واپس دوسرے دو افغانیوں کے ساتھ جا ملا۔ دونوں افغانیوں سے فراست نے کھسر پھسر کی۔ ایک نے کافی برہمی کا اظہار کیا جب دوسری سمت سے آنے والے کافی قریب آ گئے تو یوسف نے پہچانا کہ نیلی جیکٹ میں ملبوس سب سے آگے تو اس کا دوست فضل ہے۔ فضل نے دور ہی سے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ یوسف نے اس کو ہاتھ ہلا کر اور سر کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے فضل کا جواب دیا۔ یہ سارا راستہ تقریباً بارودی سرنگوں سے صاف تھا۔ یوسف نے دیکھا کہ فضل اس سے زیادہ رفتار سے چل رہا ہے۔ فضل کے پیچھے سات فوجی تھے لیکن وہ سارے فضل سے کافی

فاصلے پر تھے۔ یوسف اور فضل دونوں کو علم نہ تھا کہ آج دو یوں ایک دوسرے کے سامنے آجائیں گے۔ یوسف ابھی خوش ہی ہو رہا تھا کہ چلو فضل سے کچھ باتیں کر سکے گا کہ یکدم فضل رک گیا۔ تیس چالیس قدم کا فاصلہ ہونے کے باوجود یوسف کا دل دھڑ کنے لگا۔ اسے اپنے گلے میں کانٹے چبھتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ادھر فضل کے چہرے کی سرخی نیلاہٹ میں بدل گئی تھی۔ فضل کے پیچھے آتے ہوئے ایک فوجی نے اونچی آواز سے سامنے سے آتے فوجیوں کو رک جانے کے لئے کہا۔

''رک جاؤ کوئی حرکت نہ کرے۔'' یوسف کو سامنے اور پیچھے سے یہی سُنائی دیا۔ وہ جہاں تھا وہیں جامد ہو گیا۔ فضل اس سے اب صرف پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر تھا۔ یوسف نے فضل کی دائیں ٹانگ میں ہلکی ہلکی کپکپاہٹ محسوس کی۔ جلد ہی یہ کپکپاہٹ اس کے پورے بدن میں پھیل گئی۔ یوسف اب بھی ساری صورت حال کو نہ سمجھ سکا تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ فضل کی نظروں کا رخ اس کی جانب ہے۔ کیا تھا فضل کی آنکھوں میں۔ بے بسی اور التجا۔ پھر یوسف نے دیکھا کہ فضل نے کچھ بولنے کے لئے منہ کھولا۔ حکم ملنے پر اس نے بولنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ لاشعوری طور پر یوسف ایک دو قدم آگے بڑھا۔ اتنے میں فضل کے کافی پیچھے کھڑے فوجیوں میں سے ایک آگے بڑھا۔ اس نے فضل سے کچھ فاصلے پر آ کر اپنی رائفل کا رخ فضل کی ٹانگوں کی جانب کر دیا۔ جیسے تاریکی میں چراغ جلانے سے روشنی ہو جائے۔ یوسف کو سب دکھ گیا۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ کیا کر سکتا ہے اور اسے کیا کرنا چاہیے وہ اندھا دھند فضل کی جانب بھاگا۔ یوسف کو بھاگتے دیکھ کر رائفل کے ٹرائیگر پر جمی انگلی دب گئی۔ گولی فضل کے دائیں پاؤں کے قریب لگی۔ خوف سے اس نے پاؤں اٹھالیا یوسف نے فضل کی طرف بڑھتے ہوئے جذبات کی رو میں بہتے ہوئے چیخ ماری مگر پاؤں پہلے ہی اُٹھ چکا تھا۔ دھماکہ زوردار تھا۔ مٹی بھاگتے ہوئے یوسف پر بھی پڑی مگر وہ محفوظ رہا البتہ فضل کی جگہ اب جلتے ہوئے گوشت اور جلتی ہوئی ہڈیوں کا ڈھیر پڑا تھا۔

کتنی دیر تک وہ فضل کی لاش کے پاس بیٹھا روتا رہا، اسے یاد نہ رہا اسے اس وقت ہوش آیا جب دراز قد افغانی فراست نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا اور باقی سارے فوجیوں کے ہمراہ پہاڑ کے پیچھے ملحقہ گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ گاؤں میں فوج کا کیمپ لگا ہوا تھا۔ فراست یوسف کو ایک خالی خیمے میں لے گیا۔ اس نے یوسف کو بستر پر لٹا دیا اور خیمے سے باہر کھڑے کیپٹن فریٹگ سے باتیں کرنے لگ گیا۔

''دھماکے کی آواز گاؤں تک پہنچی ہے یہاں سے اب کوئی نہیں ملے گا۔ ابھی دو تین دن کا کام پڑا ہے۔ سارا علاقہ ہی سرنگوں سے بھرا پڑا ہے۔ اسے کیا نام ہے اس کا، ہاں یوسف اسے تسلی دو۔'' کیپٹن نے کہا۔

فراست کچھ نہ بولا۔ کیپٹن نے پتہ نہیں فراست کی خاموشی کا کیا مطلب لیا۔ وہ اپنے خیمے کی طرف چل پڑا پھر رکا اور پیچھے منہ کئے بغیر بولا۔

''فراست ذرا احتیاط سے۔''

فراست کی آنکھوں کی سرخی یکدم بڑھ گئی پر کیپٹن نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ دور کھڑے اس کے دو

پست قد افغانی دوستوں میں سے ایک نے گلے میں پہنے مفلر کا پلو جھٹک کر اشارہ کیا۔ فراست نے چند لمحے ان کو گھورتے ہوئے گھڑی پر وقت دیکھا۔ چھ بجنے والے تھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ شام کے سارے رنگ بکھرے پڑے تھے۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں اور دوسرے کی تین انگلیاں پھیلا کر دوستوں کو جواب دیا۔ رات تین سائے تھے جو یوسف کے خیمے میں نظر تو آئے، لڑکھڑاتے اور جھٹکے کھاتے رہے۔ اگلی صبح جب وہ خیمہ خالی تھا تو خیمے کی صفائی کے لیے آنے والے شخص نے اونچی آواز میں ماں کی گالی نکال دی۔ "ماں کے یار ذرا بھی خیال نہیں کرتے۔ یہ خون کون صاف کرے گا۔"

دور پہاڑ سے دور یوسف اس روز قدرے لڑکھڑا کر چل رہا تھا۔ آج اسے صبح سویرے ہی سنسناہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اور وہ اس کی   پر پیچھے کی جانب لگے خون کے دھبوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اتنے میں اسے ایک اور کیل زمین سے باہر نکلا نظر آیا۔ اس کے اشارے پر پیچھے سے ایک فوجی نے آکر کیل کے آس پاس چونے سے دائرے کا نشان بنا ڈالا۔ یوسف دوبارہ چل پڑا۔ ایک نئی سرنگ کی تلاش میں۔ پیچھے آنے والے فراست کی نظریں یوسف کی کمر سے نیچے کی طرف تھیں۔

حسن عباسی

آنکھیں، خواب، ساحل، سمندر، چاند اور شجر حسن عباسی کی شاعری کے بنیادی استعارے ہیں وہ فطرت سے جُڑا ہوا شاعر ہے۔ اس لیے اُس کے اشعار میں فطری مناظر جیسی دلکشی اور تازگی ملتی ہے۔ کہیں کہیں وہ ماضی کی یادوں سے اپنی غزل ترتیب دیتا ہے، اُس کی مسلسل غزلیں اس کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اظہار کا بے ساختہ پن حسن عباسی کی شاعری کا طرہ، امتیاز ہے۔ حسن عباسی حقیقی رومانی رویوں (Genuine Romantic Attitudes) کا شاعر ہے۔ ہمارے نزدیک آج کے شعری منظرنامے کا سب سے خوبصورت حوالہ حسن عباسی ہے۔

ایک شاعر کا کلام

حسن عباسی
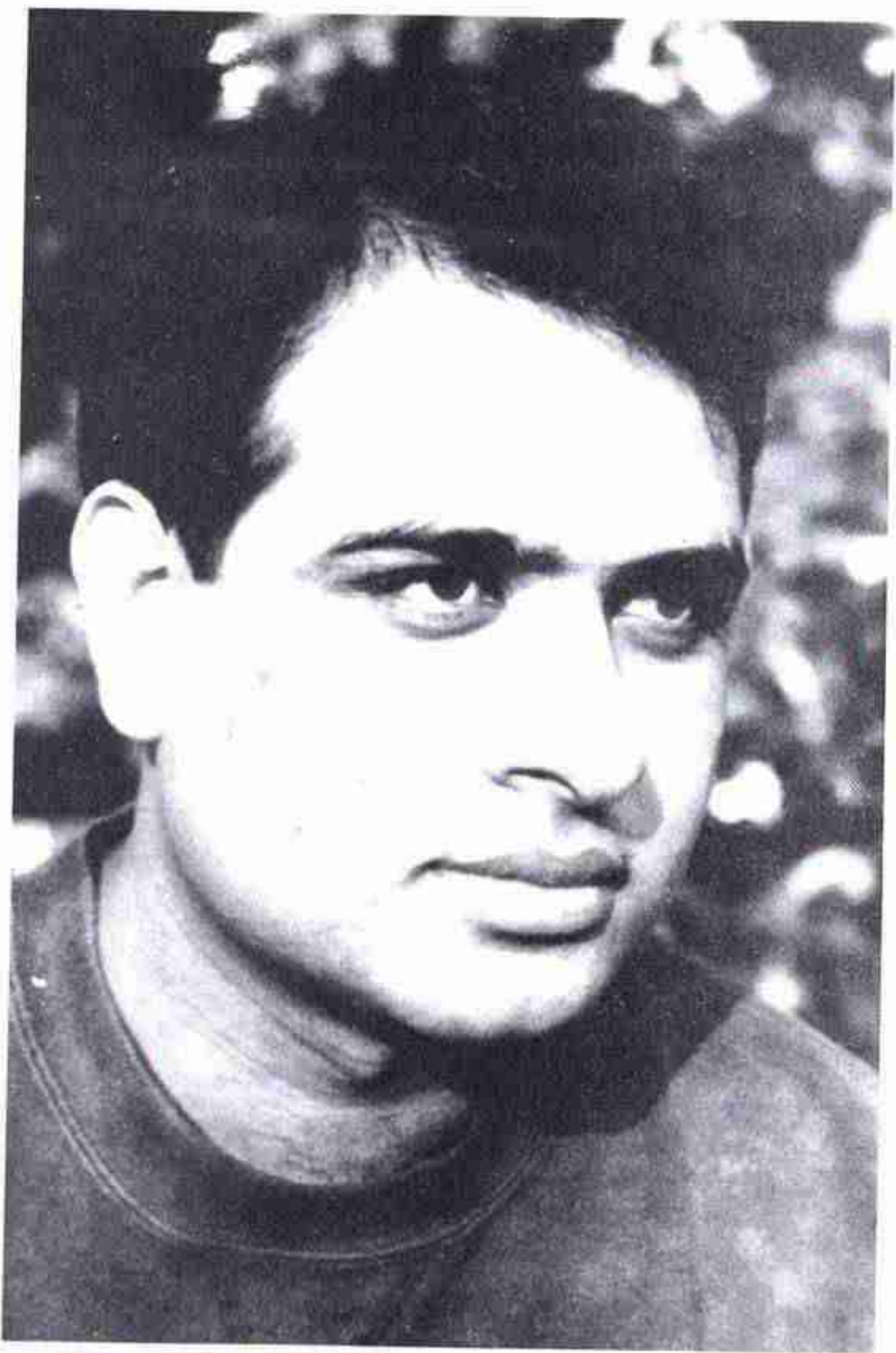
جب آئے وہ ساحل پہ کبھی گھر سے نکل کر
لہریں اسے چھوتی ہیں سمندر سے نکل کر

اس اپنی خوشی سے بہت تنگ ہوں خود بھی
آیا ہوں میں جیسے کسی پتھر سے نکل کر

بے جنگ نہیں مارا گیا صلح سے پہلے
دشمن پہ جھپٹتا تھا میں لشکر سے نکل کر

بیٹھوں گا ترے پاس کبھی حوصلہ کر کے
دیکھوں گا کسی روز تجھے ڈر سے نکل کر

ہوتی ہے ملاقات حسنؔ خواب میں جس سے
وہ شخص کہاں جاتا ہے منظر سے نکل کر

٭

جلتا ہوا اک خواب یہاں چھوڑ کے جاؤں
جنگل میں کوئی اپنا نشاں چھوڑ کے جاؤں

کچھ دیر تو آباد رہیں گے در و دیوار
آنگن میں چراغوں کا دھواں چھوڑ کے جاؤں

دل اس کا نہیں لگتا کہیں میرے علاوہ
میں تیری جدائی کو کہاں چھوڑ کے جاؤں

ممکن ہے مرے بعد اتر آئے یہاں چاند
اس شہر کی راتوں کو جواں چھوڑ کے جاؤں

لے جاتی ہے مجبوری حسنؔ گھر سے وگرنہ
کب دل مرا کہتا ہے کہ ماں چھوڑ کے جاؤں

٭

رات یہ کون مرے خواب میں آیا ہوا تھا
صبح میں وادیٔ شاداب میں آیا ہوا تھا

اک پرندے کی طرح اڑ گیا کچھ دیر ہوئی
عکس اس شخص کا تالاب میں آیا ہوا تھا

میں بھی اس کے لئے بیٹھا رہا چھت پر شب بھر
وہ بھی میرے لئے مہتاب میں آیا ہوا تھا

سرد خطے میں سلگتا ہوا جنگل تھا بدن
آگ سے نکلا تو برفاب میں آیا ہوا تھا

یہ تو صد شکر خیالوں نے ترے کھینچ لیا
میں تو حالات کے گرداب میں آیا ہوا تھا

یاد ہیں دل کو محبت کے شب و روز حسنؔ — گاؤں جیسے کوئی سیلاب میں آیا ہوا تھا

٭

شکر ہے اس کا کہ اتنا حوصلہ رکھتا ہوں میں — دوسروں کے غم بھی سینے سے لگا رکھتا ہوں میں

آج کل رہنے لگا ہے جانے کس کا انتظار — شام کو ساحل پہ اک جلتا دیا رکھتا ہوں میں

پوچھتے ہیں دوست جب کس سے محبت ہے تجھے — بے زباں ہو کے بھرم اس شخص کا رکھتا ہوں میں

چند لمحوں میں ڈبو بھی سکتا ہوں سارا جہاں — اپنی آنکھوں میں سمندر دوسرا رکھتا ہوں میں

ڈھونڈتی رہتی ہیں کرنیں قریہ قریہ کو بکو — چاندنی راتوں میں خود کو لاپتہ رکھتا ہوں میں

بارشیں آتی ہیں مجھ میں آندھیوں کے ساتھ ساتھ — دشت و دریا سے پرانا سلسلہ رکھتا ہوں میں

کون آ کر چھیڑتا ہے جانے دل کو ان دنوں — اس جگہ ہوتا نہیں ہے جس جگہ رکھتا ہوں میں

کونسا موسم ہے کوئی یہ بتا سکتا نہیں — اپنی حالت اپنے چہرے سے جدا رکھتا ہوں میں

جن کی چھاؤں میں حسنؔ گزرے میرے بچپن کے دن — ان درختوں سے ابھی تک رابطہ رکھتا ہوں میں

٭

پربت ہیں وہی سامنے جھیلیں بھی مکاں بھی — ہر سمت سے اٹھتا ہوا یادوں کا دھواں بھی

پیڑوں تلے تنہائی کے بکھرے ہوئے پتے — پتوں کے کناروں پہ اداسی کے نشاں بھی

کھلتے ہوئے پھولوں میں چھپا ہے کوئی چہرہ — وہ چہرہ جسے ڈھونڈ نہیں سکتی خزاں بھی

پگڈنڈی پہ گزرے ہوئے لمحوں کی خموشی — خاموشی میں آئندہ کی آواز نہاں بھی

اک شک سا فرشتوں کا کھلی دھوپ میں ہر سو — چھتوں پہ درودوں کی صداؤں کا گماں بھی

اڑتی نظر آتی ہیں ابابیلیں فلک پہ — وادی میں کبھی گونجنے لگتی ہے اذاں بھی

بہتے ہوئے جھرنے پہ ہیں ٹھہری ہوئی آنکھیں — ٹھہری ہوئی آنکھوں میں کئی خواب رواں بھی

اڑتے ہوئے بادل کبھی پورب کبھی پچھم
بے آسرا کچھ لوگ یہاں اور وہاں بھی

سورج کے تعاقب میں چلے آئے تھے ہم لوگ
اب جائیں کہاں یار اندھیرا ہے یہاں بھی

پہلے کچھ دیر چراغوں میں نظر آتا ہے
پھر وہ چہرہ مری آنکھوں میں نظر آتا ہے

اک زمانہ ہوا بچھڑے اسے لیکن اب بھی
راہ چلتے ہوئے لوگوں میں نظر آتا ہے

تتلیاں ورنہ کہاں ڈھونڈتیں اس کو جا کر
اس کا احساس ہے کہ پھولوں میں نظر آتا ہے

دشت و دریا کے مناظر میں ہے بکھرا بکھرا
حسن جیسا ترے وعدوں میں نظر آتا ہے

دل بھی ساتھ اس کے دھڑکتا ہو ضروری تو نہیں
ہاتھ جس کا مرے ہاتھوں میں نظر آتا ہے

یہ جو بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اندر کی گھٹن
ایسا ماحول تو باغوں میں نظر آتا ہے

جانے کیا ہے کہ سمندر ہی سمندر ہر سو
پچھلے کچھ روز سے خوابوں میں نظر آتا ہے

اور پیغام لئے پھرتی ہے ساحل کی ہوا
اضطراب اور ہی لہروں میں نظر آتا ہے

مجھ کو آغوش میں لے لیتی ہے تنہائی حسنؔ
چاند جب پیڑ کی بانہوں میں نظر آتا ہے

کرتے ہیں پرندوں کی طرح پیار مجھے بھی
آغوش میں لے لیتے ہیں اشجار مجھے بھی

کچھ ایسا دھواں دار میں گذرا تھا وہاں سے
بادل ہی سمجھتے رہے کہسار مجھے بھی

یہ شام جو بیٹھی ہے سمندر کے کنارے
اس سے کبھی ہوتا تھا سروکار مجھے بھی

صد شکر ہوئی مجھ سے ادا سنت یوسف
کھینچا ہے زلیخا نے کئی بار مجھے بھی

اب اس کے علاوہ کوئی صورت ہی نہیں تھی
ہونا پڑا دشمن کا طرفدار مجھے بھی

جو دشت میں لے آئی سدھارتھ کو محل سے
پاگل کیے رکھتی ہے وہ مہکار مجھے بھی

ان آنکھوں کی اجازت مار دے گی
مجھے اس بار ہجرت مار دے گی

ہنسی میں دکھ چھپا لیتا ہوں اپنے
کسی دن یہ سہولت مار دے گی

کبھی سوچا نہیں تھا تیرے ہوتے
کوئی تازہ محبت مار دے گی

کسی کو اپنا دشمن ہی بنا لوں
وگرنہ یہ فراغت مار دے گی

محبت کرنے سے پہلے پتہ تھا
قبیلے کی روایت مار دے گی

کسی کا ہو تو جاؤں اس کی خاطر
مگر دہری اذیت مار دے گی

حسن یہ وقت آنے پر کھلے گا
کسے کس کی ضرورت مار دے گی

٭

چوم کے ماتھا مرا روز جگائے کوئی
اٹھ کے دیکھوں تو نظر بھی نہیں آئے کوئی

پاؤں اٹھتے ہی چلے جاتے ہیں جنگل کی طرف
مجھ کو مانوس سی آواز بلائے کوئی

لوگ آتے ہیں، ٹھہرتے ہیں، چلے جاتے ہیں
ایسا لگتا ہے کہ مجھ میں ہے سرائے کوئی

بحث و تکرار مناسب نہیں خود سے ہر وقت
مجھ کو اس بات کا احساس دلائے کوئی

اپنی نظروں سے کسی روز مجھے دیر تلک
کس طرح میں نظر آتا ہوں دکھائے کوئی

ہر قدم پر مجھے لگتا ہے کہ گر جاؤں گا
حوصلہ میرا لگاتار بڑھائے کوئی

ایسے حالات میں کیا کرنا ہے میں جانتا ہوں
مجھ کو جینے کا سلیقہ نہ سکھائے کوئی

چاند کو کھڑکی کے اس پار میں کب تک دیکھوں
میرے کمرے میں دیا آ کے جلائے کوئی

خود سے میں روٹھ گیا تھا مگر اب چاہتا ہوں
کسی دن مجھ سے مری صلح کرائے کوئی

آنسو پونچھے نہ کبھی، مجھ کو تسلی ہی دے
تھام کے ہاتھ مرا پاس بٹھائے کوئی

مجھ میں اہرام بھی ہیں اور خزانے بھی حسن
دھوپ کی رتھ پہ کسی روز تو آئے کوئی

٭

جنگل جنگل ساتھ مرے شہزادی ہے
بستی بستی لشکر اور منادی ہے

پیار کے دشمن ہیں یہ تیر کماں تو کیا
ہر اک پیڑ اور پنچھی مرا امدادی ہے

ناچتے موروں سے تو لگتا ہے کہ یہاں
دل کی باتیں کرنے کی آزادی ہے

دور تلک آنکھوں میں رقصاں ہیں شعلے
سرد ہوا نے بن میں آگ لگا دی ہے

خیمے سے تم باہر آ کر دیکھو تو
چاند کے ساتھ ستارا بھی فریادی ہے

کچھ چڑیوں نے گیت وداعی گائے ہیں
اک بوڑھے برگد نے ہم کو دعا دی ہے

صبح سے پہلے جانا ہے اس دریا پار
اس دریا کے پار وفا کی وادی ہے

پتھر پتھر پر لکھا ہے پیار حسنؔ
پھولوں جیسے لوگوں کی آبادی ہے

☆

جب بارش کی بوندیں آنے لگتی ہیں
یاد کسی کی پلکیں آنے لگتی ہیں

صرف خبر سنتے ہی اس کے آنے کی
واپس میری سانسیں آنے لگتی ہیں

دیکھ نہیں سکتا میں اس کی آنکھوں کو
میرے اندر لہریں آنے لگتی ہیں

بے دھیانی کے جنگل میں جب کھو جاؤں
تیرے دھیان کی کرنیں آنے لگتی ہیں

وہ گھر لوٹ کے آئے تو دیواروں پر
پھولوں والی بیلیں آنے لگتی ہیں

کائی جم جاتی ہے اس کی یادوں کی
جب جھیلوں پر کونجیں آنے لگتی ہیں

جنگل کے اطراف سے چاند نکلتے ہیں
رونے کی آوازیں آنے لگتی ہیں

تیز ہوا سے پردے ہلتے ہیں اور پھر
میری طرف وہ بانہیں آنے لگتی ہیں

جیسے ہو جنات کا قبضہ گھر پہ حسنؔ
شام ڈھلے ہی شمعیں آنے لگتی ہیں

☆

سامنے جب وہ چاند سی صورت ہوتی ہے
میری سمندر جیسی حالت ہوتی ہے

پہلی آخری کی اس میں تفریق نہیں
یار محبت صرف محبت ہوتی ہے

ایسے ایسے صدمے جھیلے ہیں میں نے
خود کو زندہ دیکھ کے حیرت ہوتی ہے

اور کسی کے ساتھ نظر آتا ہوں میں
جس دن مجھ کو اپنی ضرورت ہوتی ہے

میرے سامنے تو میری تعریف نہ کر
مجھ کو اس سے دوست اذیت ہوتی ہے

سامنے اس کے بات نہیں کر پاتا میں
رونے میں کچھ دیر سہولت ہوتی ہے

یونہی خواب اور آنسو نہیں بن جاتا میں
ان آنکھوں کی مجھ کو اجازت ہوتی ہے

بعد میں ہو جاتا ہے اکثر پیار حسن
پہلے پہل جس شخص سے نفرت ہوتی ہے

اپنا دکھ درد بتانا بھی نہیں چاہتا میں
کچھ مگر اس سے چھپانا بھی نہیں چاہتا میں

انتقام اپنا وہاں جا کے مجھے لینا ہے
دل جہاں کوئی دکھانا بھی نہیں چاہتا میں

اس کی تصویر بھی آنکھوں میں لئے پھرتا ہوں
اور کبھی سامنے آنا بھی نہیں چاہتا میں

بات چپ رہنے سے کچھ اور بگڑ جاتی ہے
لفظ کو تیر بنانا بھی نہیں چاہتا میں

ایک ہجرت ہے کہ ہر حال میں کرنی ہے مجھے
شہر کو چھوڑ کے جانا بھی نہیں چاہتا میں

چھوٹی سی بات پہ دھڑکا ہو بچھڑ جانے کا
اتنا نزدیک تو آنا بھی نہیں چاہتا میں

اس کو مشکوک نگاہوں سے میں کیوں دیکھتا ہوں
جس کو نظروں سے گرانا بھی نہیں چاہتا میں

اب حسن ٹوٹتا جاتا ہے جدائی کا نشہ
خود کو جب ہوش میں لانا بھی نہیں چاہتا میں

شام سے پہلے کوئی حشر بپا ہوتا ہے
روز اک خوف مرے دل میں نیا ہوتا ہے

تجھ کو رخصت کروں کیسے کہ مرا دکھ ہے یہی
پھر نہیں ملتا جو اک بار جدا ہوتا ہے

کون کرتا ہے تعاقب کہ جہاں بھی جاؤں
مڑ کے دیکھوں تو کوئی پھول پڑا ہوتا ہے

جس میں نقصان ہی نقصان ہو سارا دل کا
کام وہ کرنے کا اک اپنا مزا ہوتا ہے

حوصلہ ہارنا اچھا نہیں لگتا اس کو
آنکھ بھر آئے تو وہ مجھ سے خفا ہوتا ہے

شام سے پہلے مٹا دیتا ہے کوئی جا کر
صبح دیوار پہ وہ نام لکھا ہوتا ہے

غصہ آتا ہے کسی اور پہ ہر بار حسنؔ
دل کسی اور کی باتوں سے دکھا ہوتا ہے

✻

اس لئے ان کو خام جانتا ہوں
اپنے اشکوں کے دام جانتا ہوں

اور تو کوئی خوبی مجھ میں نہیں
دکھ اٹھانے کا کام جانتا ہوں

خواہشیں ہاتھ باندھ لیتی ہیں
ایک ایسا کلام جانتا ہوں

کون ہوں اس کی کیا خبر مجھ کو
میں تو بس اپنا نام جانتا ہوں

بے سبب تو نہیں جھجک اتنی
میں تمہارا مقام جانتا ہوں

گھر پہنچنے میں دیر کیسے کروں
اپنی گلیوں کی شام جانتا ہوں

کام لیتا ہوں بھولپن سے حسنؔ
ورنہ باتیں تمام جانتا ہوں

✻

بچھڑتے وقت کی جو رسم ہے پوری ادا کی تھی
اسے رخصت کیا تھا اور پھر میں نے دعا کی تھی

ہماری زندگی ساری گئی ہے رائیگاں تو کیا
یہ کہہ کے صبر کر لیں گے یہی مرضی خدا کی تھی

یقیں آتا نہیں پر کیا کروں جب سامنے تم ہو
اچانک اس طرح آنے میں شہرت تو ہوا کی تھی

مجھے اب کس لئے ہجرت کی باتیں اچھی لگتی ہیں
مجھے تو اپنی مٹی سے محبت انتہا کی تھی

وہ اتنی تیز آندھی تھی کہ اب تک سوچتا ہوں میں
درختوں اور پرندوں نے نجانے کیا خطا کی تھی

٭

جسے سارا زمانہ چاہتا ہے
مری بانہوں میں آنا چاہتا ہے

اگر اس کو محبت ہے تو ہو گی
مجھے وہ کیوں جتانا چاہتا ہے

مری آنکھوں سے تم ہجرت نہ کرنا
سمندر تو ٹھکانا چاہتا ہے

مواقع خود ہی میں پیدا کروں گا
اگر وہ چھوڑ جانا چاہتا ہے

اسے چھوٹی سے چھوٹی بات بھی دل
نجانے کیوں بتانا چاہتا ہے

مجھے اس کی مدد کرنی پڑے گی
وہ میرا دل دکھانا چاہتا ہے

بظاہر لاتعلق رہ کے مجھ سے
تعلق وہ نبھانا چاہتا ہے

٭

جو بات خاص ہے اب اس کو عام کرتا ہوں
میں اپنی تازہ غزل تیرے نام کرتا ہوں

کبھی کبھی نظر آتا ہوں جھیل کی صورت
کبھی کبھی ترے دکھ میں قیام کرتا ہوں

میں کر رہا ہوں محبت بھی اس لئے شاید
جو کام کر نہیں سکتا وہ کام کرتا ہوں

ندی کنارے کسی نئی سنال پہ اکثر
میں ایک شام کے پہلو میں شام کرتا ہوں

ہوا کی طرح تجھے چھیڑ سکتا ہوں لیکن
تو حُسن ہے میں ترا احترام کرتا ہوں

اگر یہ زندگی کچھ ہے تو بس محبت ہے
میں اپنی بات یہیں پہ تمام کرتا ہوں

٭

کب ہے ایسا کسی زنجیر نے جانے نہ دیا
گھر سے باہر تری تصویر نے جانے نہ دیا

دشت میں تیری صدا پر میں پہنچ سکتا تھا
پشت سے پھینکے گئے تیر نے جانے نہ دیا

روز اک خواب نے پاؤں سے سفر باندھا مگر
روز اک خواب کی تعبیر نے جانے نہ دیا

جھیل کی تہہ میں کوئی چاند بلاتا تھا مجھے
پر کسی آنکھ کی تاثیر نے جانے نہ دیا

اب ترے ساتھ کسی اور جہاں میں ہوتا
ہائے افسوس کہ تقدیر نے جانے نہ دیا

پوری ہو سکتی تھی یہ آدھی ملاقات حسنؔ
خط میں لکھی ہوئی تحریر نے جانے نہ دیا

٭

کیوں جلدی تجھے ہاتھ چھڑانے کے لئے ہے
اک زخم ابھی اور دکھانے کے لئے ہے

لگتا ہے مجھے گھر کی طرح شہر تمہارا
ہر شخص یہاں دل ہی دکھانے کے لئے ہے

ہمراز کوئی میرا نہیں میرے علاوہ
اک بات مگر پھر بھی چھپانے کے لئے ہے

ہم اہل محبت کو نہیں موت کی پرواہ
یہ ساتھ کوئی ایک زمانے کے لئے ہے

آنکھوں میں اتر آئی گھنی شام تو کیا غم
ہر خواب مرے پاس جلانے کے لئے ہے

ہم اس سے اگر آنکھ چرا لیں تو الگ بات
دل اس کا بہر طور چرانے کے لئے ہے

٭

جب بھی ٹھوکر کھائی ہے
تیری یاد تو آئی ہے

سورج سچ ہی کہتا تھا
ہر پل نقل مکانی ہے

کل اک سپنا دیکھا تھا
آج اک منت مانی ہے

گھر میں کب تنہا ہوں میں
صحن میں رات کی رانی ہے

چاند کو گھر ہی لے آؤں
رات بڑی طوفانی ہے

تم نے ٹھیک کہا تھا دوست
مشکل میں آسانی ہے

ڈوب رہا ہے میرا دل
ماں کی آنکھ میں پانی ہے

اور کہیں جا کر ٹھہریں
دنیا میں ویرانی ہے

ایسے لگتا ہے جیسے
سب کی ایک کہانی ہے

منظر اچھے ہیں سارے
آنکھوں میں حیرانی ہے

دل کے بند کواڑوں میں
کوئی یاد پرانی ہے

☆

سراپا اشک ہوں میں بھی بکھر جاؤں تو بہتر ہے
جدھر جاتے ہیں یہ بادل ادھر جاؤں تو بہتر ہے

یہ دل کہتا ہے تیرے شہر میں کچھ دن ٹھہر جاؤں
مگر حالات کہتے ہیں کہ گھر جاؤں تو بہتر ہے

دلوں میں فرق آئیں گے تعلق ٹوٹ جائیں گے
جو دیکھا جو سنا اس سے مکر جاؤں تو بہتر ہے

یہاں ہے کون میرا جو مجھے سمجھائے گا آ کر
میں کوششیں کر کے خود ہی اب سنور جاؤں تو بہتر ہے

یہاں جتنے مسائل ہیں وہ سارے آگہی کے ہیں
یہاں میں ہر خبر سے بے خبر جاؤں تو بہتر ہے

حسن اچھی طرح ہر شخص مجھ پہ کھل چکا ہے جب
تعلق اپنے سارے توڑ کر جاؤں تو بہتر ہے

☆

جاؤں باہر میں کس طرح گھر سے
خوف کے سانپ لٹکے ہیں در سے

دیر تھی اک چراغ بجھنے کی
چھپ گیا چاند رات کے ڈر سے

وہ جو بچھڑا تو میری آنکھوں کی
دوستی ہو گئی سمندر سے

جب بھی رستے میں اس کی یاد آئے — بیٹھ جاتا ہوں لگ کے پتھر سے
دن گذرتے ہی ایسے لگتا ہے — بوجھ جیسے اتر گیا سر سے
اس کی یادوں کے پاس بیٹھا ہوں — اٹھ رہا ہے دھواں برابر سے
سال کے بعد ملنے آتا ہے — یہی شکوہ ہے بس دسمبر سے

☆

ساتھ تو خیر نبھانے سے گئے — یار تو منہ بھی دکھانے سے گئے
شرمساری ہے محبت میں یہی — ہم ترے بعد زمانے سے گئے
لوگ پہنچے تھے جہاں دل لے کر — ہم وہاں اور بہانے سے گئے
شہر میں آگ لگانے والے — اب تو خود کو بھی بچانے سے گئے
مر نہ جائیں کوئی تدبیر کرو — اب ہمیں دکھ بھی رلانے سے گئے
وہ نظر پھیرے تو لگتا ہے حسنؔ — جیسے ہم اپنے ٹھکانے سے گئے

☆

اداس چاند کھلے پانیوں میں چھوڑ گیا — وہ اپنا چہرہ مرے آنسوؤں میں چھوڑ گیا
ہوا کے جھونکے سے لرزی تھی ایک شاخ گل — کسی کا دھیان مجھے خوشبوؤں میں چھوڑ گیا
گلے ملے تھے محبت کی تیز دھوپ میں ہم — یہ کون اڑتے ہوئے بادلوں میں چھوڑ گیا
سفر کے پہلے پڑاؤ میں مرنے والا شخص — عجیب خوف ہمارے دلوں میں چھوڑ گیا
یہ کس نے ہم کو بنایا شکستہ مٹی سے — پھر اس کے بعد گھنی بارشوں میں چھوڑ گیا
اس اہتمام سے بکھرے ہوئے ہیں پھول حسنؔ — نشانی جیسے کوئی راستوں میں چھوڑ گیا

☆

ناریل کے پیڑ اور نیلا سمندر کیا ہوا
وہ جزیرہ وہ سر ساحل ترا گھر کیا ہوا

بادباں کھولے ہوئے وہ تتلیوں سی کشتیاں
کشتیوں میں پھول سے چہروں کا منظر کیا ہوا

دور کے اک دیس سے ہر سال آتا تھا یہاں
موسمی آبی پرندوں کا وہ لشکر کیا ہوا

کچھ دنوں سے پڑ گیا ہے ماند کیوں وادی کا حسن
جس پہ تیرا نام لکھا تھا وہ پتھر کیا ہوا

کیا ہوئی دل کی حویلی جس میں تیری یاد تھی
چاند راتوں میں کھلا کرتا تھا جو در کیا ہوا

جس طرف بھی دیکھوں میری آنکھ بھر آئے حسنؔ
یہ مجھے اس بار اپنے گاؤں آ کر کیا ہوا

٭

ہماری آنکھ کھلے کیسے آفتاب کے ساتھ
ہماری نیند جڑی ہے تمہارے خواب کے ساتھ

پھر اس کے بعد ترا چہرہ ساتھ ساتھ رہا
میں اپنے گھر سے تو نکلا تھا ماہتاب کے ساتھ

مرا خیال ہے خوشبو میں ڈھل گیا وہ شخص
کہ اب نظر نہیں آتا کسی گلاب کے ساتھ

سنا رہا تھا کہانی کوئی محبت کی
کسی کی آنکھ بھی بہتی رہی چناب کے ساتھ

شکستگی کا سبب صرف تیرا ہجر نہیں
عذاب اور بھی کافی ہیں اس عذاب کے ساتھ

تعلق اس کا مرے ساتھ صرف اتنا ہے
کہ ایک پھول کا ہوتا ہے جو کتاب کے ساتھ

٭

گھر سے میری طرح وحشت میں نکل آیا ہے
چاند شاید تری چاہت میں نکل آیا ہے

دیکھ پایا نہیں چہرہ میرے ہاتھوں میں ترا
شاخ سے پھول رقابت میں نکل آیا ہے

میں تجھے بھول چکا ہوں یہ یقیں ہے مجھ کو
آنکھ سے اشک ندامت میں نکل آیا ہے
آپ مجھ سے یونہی ناراض ہوئے بیٹھے ہیں
لب سے شکوہ تو محبت میں نکل آیا ہے

٭

آنکھوں کے آس پاس سمندر نہیں رہا
شاید میں پہلے والی جگہ پر نہیں رہا
دیکھا گیا ہوں چاندنی راتوں کو صحن میں
گھر سے تمام عمر تو باہر نہیں رہا
آنکھیں تو خیر پہلے سے ہجرت پسند تھیں
کچھ دن سے دل بھی سینے کے اندر نہیں رہا
اب تو دیئے بھی اپنے بجھاتے ہیں لوگ خود
اتنا بھی اعتماد ہوا پر نہیں رہا
وہ شہر چھوڑ کر بھی ابھی تک وہیں ہوں میں
دل رہ گیا ہے میرا مگر گھر نہیں رہا
یہ گاؤں خالی کرنا پڑے گا ابھی ہمیں
سیلاب اور کنارہ برابر نہیں رہا
روٹھا رہا میں جس کے لئے نیند سے حسنؔ
وہ چاند میرے واسطے شب بھر نہیں رہا

٭

میں غلط تھا تو مجھے سمجھانے والا کون تھا
دوست اور دشمن مرا میرے علاوہ کون تھا
دیکھ کر تجھ کو خیال آتا ہے رہ رہ کر مجھے
اس جہاں سے پہلے میرے ساتھ تجھ سا کون تھا
خود ہی تھوڑی دور جا کر لوٹ آیا اپنے پاس
جو مجھے آواز دیتا مجھ میں ایسا کون تھا
رات بیٹھے بیٹھے مجھ کو آیا تھا کس کا خیال
لہر کی مانند میرے دل سے گزرا کون تھا
عمر بھر دریا کنارے ہی رہا ہوں میں اگر
دشت میں وہ مارا مارا پھرنے والا کون تھا
اس لئے بھی دکھ نہیں ہے چھوڑ آنے کا حسنؔ
گھر تو اپنا تھا مگر اس گھر میں اپنا کون تھا

٭

جانے والے کو بھلایا جائے — کوئی آنسو نہ بہایا جائے

عین ممکن ہے پلٹ آؤں میں — میرے شانوں کو ہلایا جائے

ڈوب جائیں نہ کہیں ہم دونوں — ہاتھ سے ہاتھ چھڑایا جائے

ایسے اترا ہے مرے دل سے وہ — جیسے دیوار سے سایہ جائے

آخری سانس لئے بیٹھا ہوں — مجھ کو باتوں میں لگایا جائے

شہر سے اب بھی محبت ہے ہمیں — ہم کو کچھ اور ستایا جائے

ہو گئیں حسن سے خالی آنکھیں — چاند کو ڈھونڈ کے لایا جائے

آندھی جس کی ہو طرفدار حسنؔ — وہ دیا خود ہی بجھایا جائے

٭

چاند تم سے شکائتیں ہیں بہت

O

(۱)

چاند تم ہو بہت ہی آوارہ
کتنی راتیں نظر نہیں آتے
پھرتے رہتے ہو جا بجا یونہی
پر کبھی میرے گھر نہیں آتے
چاند تم دور دور رہتے ہو
چاند تم سے شکائتیں ہیں بہت

(۲)

کس محبت میں زخم کھائے ہیں
دل پہ اتنے جو داغ رکھتے ہو
یہ کہانی کبھی سناتے نہیں
آسماں پر دماغ رکھتے ہو
چاند تم بولتے نہیں ہم سے
چاند تم سے شکائتیں ہیں بہت

(۳)

چاند تم ایک سے نہیں رہتے
شکل اور راستے بدلتے ہو
چاند تم رات کو تن تنہا
ایسے ویسوں کے ساتھ چلتے ہو
اک نظر دیکھتے نہیں ہم کو
چاند تم سے شکائتیں ہیں بہت

(۴)

چاند جب بھی ملے کوئی موقع

چھپتے رہتے ہو ایسے چپکے سے
پیڑ اور بادلوں کے پیچھے تم
حسن گھٹا ہو جیسے دیکھے سے
ہاتھ آتے نہیں کسی صورت
چاند تم سے شکایتیں ہیں بہت

(۵)

میری آنکھوں میں کچھ کمی ہے کیا
جھیل میں دیکھتے ہو عکس اپنا
آئینے میں اتار کر تم کو
کوئی تعبیر کرنا ہے سپنا
خواب کیا ہیں یہ جانتے ہی نہیں
چاند تم سے شکایتیں ہیں بہت

(۶)

روشنی مستعار ہے پھر بھی
جانے کس بات کی بڑائی ہے
ہم سے ملتے ہو اجنبی کی طرح
جبکہ بچپن سے آشنائی ہے
چاند تم سے گلہ نہیں کوئی
چاند تم سے شکایتیں ہیں بہت

☆

اجنبی شہر میں نامکمل نظم

O

یہ تیرا شہر کتنا خوبصورت ہے
نظر جس سمت اٹھ جائے پلٹ کر پھر نہیں آتی
یہ پربت اور ان کی گود میں سوئی ہوئی گلیاں
کھلونوں کی طرح بکھرے ہوئے ننھے مکاں ہر سو
مکانوں کی چھتوں پر دھوپ کی چادر
ہے کیسا خواب سا منظر
یہ تیرا شہر کتنا خوبصورت ہے
یہ بچوں کی طرح اک دوسرے سے کھیلتے بادل
یہ وقفے وقفے سے ہوتی ہوئی بارش
یہ بارش میں ازل سے بھیگتے پتھر
ہے کیسا خواب سا منظر
یہ تیرا شہر کتنا خوبصورت ہے

یہ پیڑوں کا گھنا سایہ
یہ سائے میں اُگی بیلیں
اُگی بیلوں پہ کھلتے پھولوں کی خوشبو
مگر ان سب سے بڑھ کر یہ کہ رہتی ہے یہاں پر تو
یہاں سے کس طرح جاؤں
قدم جب بھی اٹھاتا ہوں
تو ''خط'' وہ یاد آتا ہے کہ جس میں تو نے لکھا تھا
''کہ میرے شہر جب آنا
اگر تم نظم لکھنا تو
مری آنکھیں بہت ہی خوبصورت ہیں
انہیں مت بھول جانا' ہاں۔''
مگر تجھ کو خبر ہی کیا
کہ تیرے شہر میں پھرتا رہا ہوں آج سارا دن
نجانے کتنے چہروں میں تری آنکھوں کو ڈھونڈا ہے
یہ تیرا شہر کتنا خوبصورت ہے
یہاں سے کس طرح جاؤں
کہ میری نامکمل نظم کو بس تیری آنکھوں کی ضرورت ہے
☆

فن و شخصیت

صدیق سالک (مرحوم) کی ''تادمِ تحریر''
(ایک صدارتی تقریر)

احمد ندیم قاسمی

میں آغاز کلام ہی میں ''تادمِ تحریر'' کے مصنف صدیق سالک کو مشورہ دوں گا کہ جب اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت آئے تو اس کے دریچۂ چہارم میں کسی کتاب کی تقریب رونمائی کے صاحب صدر کی ایک ریڈی میڈ تقریر بھی شامل کر دی جائے' کیونکہ اس طرح کی تقریبوں کے صدر صاحبان کی حالت زار اس لحاظ سے دیدنی اور شنیدنی ہوتی ہے کہ جب ان کے کچھ کہنے کی باری آتی ہے تو ان سے پہلے جن حضرات نے تقریریں کر رکھی ہوتی ہیں انہوں نے وہ سب کچھ بہت تفصیل سے کہہ دیا ہوتا ہے جو صاحب صدر کہنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس وقت میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ مجھ سے پہلے چھ ناقدین کرام اور ادبائے طناز نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے' اس میں اپنے کسی نئے ''ارشاد'' کا اضافہ کیسے کروں۔ بہرحال جب مجھے ''تادمِ تحریر'' کی تقریب رونمائی کی عزت بخشی گئی ہے تو کچھ نہ کچھ تو عرض کرنا ہی ہوگا۔ میں اسی بہانے معذرت بھی کر سکتا تھا مگر اخباروں کے ادبی ایڈیشنوں سے خوف آتا ہے۔

''تادمِ تحریر'' پڑھنے کے بعد میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ غنیمت ہے اس دور میں بھی کوئی ادیب مسکرانے کی توفیق رکھتا ہے اور ہنسنے ہنسانے کی جسارت پر قادر ہے۔ کسی کی پسلیاں چھوئے بغیر اس کو گدگدا دینا بہت مشکل کام بھی ہے اور نیک کام بھی۔ مشکل کام اس لئے کہ مزاح لکھنے تو بیسیوں ہیں مگر مزاح تخلیق کرنے پر چند ہی لوگوں کو قدرت حاصل ہوتی ہے۔ اور نیک کام اس لئے کہ کسی کو محظوظ کرنا' کسی کے دل و دماغ میں شگفتگی بھر دینا' کسی ازلی جبڑا بند کو اپنا جبڑا کھول دینے پر مجبور کر دینا بھی نیکیوں کی بے شمار اقسام میں سے ایک اہم قسم ہے۔ شرط یہ ہے کہ یہ سب کچھ مثبت ہو' منفی نہ ہو' کسی کی تضحیک نہ کی جائے' کسی کی فاختہ نہ اڑائی جائے' محض بہ سلسلۂ انتقام کسی خاص فرد کی دلآزاری نہ کی جائے۔ صدیق سالک نے مزاح تخلیق کرنے کا مشکل کام بھی بڑی بے ساختگی سے انجام دیا ہے اور اس مزاح کا مجموعی تاثر بھی مثبت ہے۔۔۔ شگفتگی اور خیر آفرینی کا تاثر۔

مجھے "نادم تحریر" کے انداز ترتیب سے اتفاق نہیں ہے۔ اس میں چار دریچے ہیں مگر جس دریچے کو دریچۂ اول ہونا چاہیے تھا' اسے دریچۂ سوم کا درجہ دیا گیا ہے۔ دریچۂ چہارم کو دریچۂ سوم قرار دینا چاہیے تھا۔ دریچۂ اول دراصل دریچۂ چہارم ہے۔ صرف دریچۂ دوم صحیح معنوں میں دریچۂ دوم ہے۔

دریچۂ سوم میں مصنف نے اپنی پرانی مزاحیہ تحریریں جمع کی ہیں مگر وہ اتنی تر و تازہ ہیں اور ان میں پطرس بخاری کی قائم کردہ روایت کو اتنے سلیقے سے برتا گیا ہے کہ انہیں کتاب کے نصف آخر میں لا ڈالنا میری نظر میں زیادتی ہے کیونکہ یہی حصہ تو کتاب کا نصف بہتر ہے۔ جس حصے میں "بوڑھوں کی یونین" اور "بابا خیرا" جیسے مضامین موجود ہوں' وہ ذرا بہتر سلوک کا مستحق تھا۔ یہ مصنف کے ماضی کے مضامین سہی مگر ماضی ہمیشہ تو کمزور نہیں ہوتا اور ہم مسلمان تو اب تک اپنے ماضی ہی سے کسب توانائی کر رہے ہیں۔

دریچۂ 'دوم' جو اپنے متعینہ مقام پر بج رہا ہے' مغربی ممالک' عرب ممالک اور چین کے سفرناموں پر مشتمل ہے (یاد رہے کہ خود مصنف نے ان سفرناموں کو سفرناچوں کا نام دینا پسند کیا ہے) مصنف نے معذرت کی ہے کہ ان تحریروں میں قارئین کو ان مقامات کی جغرافیائی اور تاریخی معلومات نہیں ملیں گی مگر یہ معلومات تو ہم جغرافیہ اور تاریخ کی کتابوں سے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں سفرنامہ نگاری کا اسلوب سراسر منقلب ہو چکا ہے۔ محمد خالد اختر' مستنصر حسین تارڑ' محمد کاظم' عطاء الحق قاسمی' ابن انشاء' حسین شاہد' اشفاق احمد' ذوالفقار تابش' محمد اختر ممونکا اور دوسرے کئی اہل قلم نے سفرنامے کو وہی کچھ بنا دیا ہے جو سفرنامے کو ہونا چاہیے اور صدیق سالک چاہیں یا نہ چاہیں' وہ جدید سفرنامہ نگاروں کی اس فہرست میں اسی دریچۂ دوم کی برکت سے شامل ہو چکے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ شگفتگی اظہار ان کا وصف خاص ہے اور اس لحاظ سے وہ بیشتر ابن انشاء کے اور کسی حد تک عطا الحق قاسمی کے زیادہ قریب ہیں۔ نہایت پرلطف اور خوب صورت بات یہ ہے کہ وہ نیویارک' ہوانا' پیرس اور لندن وغیرہ میں بھی اپنے "پنڈ" اور اپنی "پنڈی" کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے اور یوں ان سفرناموں میں بڑے التزام کے ساتھ "قومی فضائی رابطہ" برقرار رکھتے ہیں۔

کتاب کا دریچۂ چہارم "ریڈی میڈ تقریروں" پر کھلتا ہے اور میں اسی دریچے کے حوالے سے کتابوں کی رونمائی کی ریڈی میڈ صدارتی تقریر کی تجویز پیش کر چکا ہوں۔ ویسے بھی ان ریڈی میڈ تقریروں کا میدان اتنا وسیع ہے کہ اگر صدیق سالک چاہیں تو "ریڈی میڈ تقریریں" کے نام سے الگ کتاب تصنیف کر سکتے ہیں۔ انہیں شاید معلوم نہیں کہ ابھی چند برس پہلے مجھے اپنے محلے میں ایک اینٹ کی ایک بلند دیوار پر کھڑا کر دیا گیا تھا اور وہاں اپنا توازن برقرار رکھنے کی کشمکش کے دوران میں مجھ سے بجلی کے ٹرانسفارمر کا افتتاح' افتتاحی تقریر سمیت' کرایا گیا تھا اور میں سر کے بل گرتے گرتے بچا تھا۔ اگر پریس فوٹوگرافر تصویر نہ اتار رہا ہوتا تو میں یقیناً دیوار پر سے گر جاتا۔ پھر جب ٹرانسفارمر کے حوالے سے افتتاحی تقریر ہو سکتی ہے تو ہر قسم کی تقریر ہو سکتی ہے۔ اس دریچے کی آٹھوں تقریریں نہایت درجہ پرلطف ہیں اس لئے جی چاہتا ہے کہ کاش ان کی تعداد آٹھ کی بجائے کم سے کم سا ٹھ تو

ہوتی۔

اب رہ گیا دریچۂ اول جس کو میری رائے میں دریچۂ چہارم ہونا چاہیے تھا کیونکہ صدیق سالک ''مارشل لا'' پر لکھنے کے بعد ''بابا خیرا'' تک نہیں پہنچے بلکہ ''بابا خیرا'' پر لکھنے کے بعد ''مارشل لا'' تک پہنچے ہیں۔ یہ یقیناً مزاحیہ بلکہ طنزیہ مضامین ہیں مگر ان کی نوعیت سیاسی ہے اور سیاست پر پابندی کے ان دنوں میں صدیق سالک اگر سیاسی موضوعات کو چھیڑ سکتے ہیں تو یہ ان کی اپنی سہولت اور صوابدید ہے' مگر میں' اس تقریب کا صدر ہونے کے باوجود ایسا نہیں کر سکتا۔ جمہوریت' اقتدار اور آئین کے بارے میں صدیق سالک نے اپنے ہلکے پھلکے مگر طرار انداز میں جو کچھ کہا ہے اس کے بعض حصوں سے مجھے اختلاف' اور بعض سے شدید اختلاف ہے مگر میں اس کا اظہار کروں گا تو ''سیاسی'' ہو جاؤں گا۔ چنانچہ یہی عرض کرنے پر اکتفا کروں گا کہ بعض حصوں سے اختلاف کے باوجود میں محظوظ یقیناً ہوا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ صدیق سالک جو کچھ کہتے ہیں کسی تعصب سے نہیں کہتے' اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں۔ اس حصے میں مصنف پر مزاح سے زیادہ طنز حاوی ہو گیا ہے۔ طنز نگاری بہت دشوار صنف اظہار ہے کیونکہ اس میں نوک خنجر سے گدگدایا جاتا ہے اور اکثر صورتوں میں قاری کے مجروح ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ مگر صدیق سالک نے یہ اہتمام یقیناً کیا ہے کہ ان کی نوک خنجر کسی کو چبھے نہیں' بس مس کرتی ہوئی اور چھیڑتی ہوئی گزر جائے۔ اس اہتمام نے دریچۂ اول کے چھ مضامین کو بہت حد تک بچا لیا ہے ورنہ ان کی وجہ سے بہت نازک مسائل کا آغاز ہو سکتا تھا۔

اس دور میں جب اردو مزاح روزناموں کے فکاہی کالموں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے ''تادمِ تحریر'' نے مزاح نویسی کا ایک نیا دریچہ کھول دیا ہے جس کے دم سے ادب کی دنیا میں بہت سی روشنی اور بہت سی تازہ ہوا بھر گئی ہے۔ شفیق الرحمٰن' مشتاق احمد یوسفی' محمد خالد اختر' ابن انشا' عطاء الحق قاسمی اور کرنل محمد خان کے بعد صدیق سالک نے اردو مزاح نویسی کا بھرم ایک بار پھر قائم کر دیا ہے اور ''تادمِ تحریر'' کی اشاعت نے اردو مزاح میں امکانات کے نئے دریچے وا کر دیئے ہیں۔

۱۴ نومبر ۱۹۸۱ء

☆

پروفیسر اشفاق علی خان

اشفاق احمد

اشفاق علی خان مرحوم کے حوالے سے بہت ساری باتیں دل و دماغ میں محفوظ ہیں لیکن ان باتوں کو یہاں تفصیل سے بیان کرنے کا موقعہ نہیں ہے۔ میں انکی خدمت میں سلام پیش کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں اور یہ بتانے کے لئے حاضر ہوا ہوں کہ پروفیسر اشفاق علی خان سے میرا پہلا تعلق تو ایک دوست کی حیثیت سے تھا، ہم چار بندے تھے جن میں سے ایک پروفیسر اشفاق علی خان، دوسرے قدرت اللہ شہاب اور تیسرے مسعود کھدر پوش تھے۔ ان تینوں دوستوں کے بیچ میں، بالکل جیسے شامل باجہ ہوتا ہے' ان کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ ان دنوں مسعود کھدر پوش نے ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا کہ اذان پنجابی میں دی جانی چاہئے چنانچہ میں جہانگیر کے مقبرے پر اذان دیا کرتا تھا" اللہ وڈا، اللہ وڈا"۔ لوگ بڑے حیران ہو کر دیکھتے تھے۔ لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کا یہ ایک ذریعہ تھا۔ پروفیسر اشفاق علی منع کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یار یہ تو واہیات آدمی ہے تم کس کے پیچھے لگے ہوئے ہو۔ پھر عجیب اتفاق یہ ہوا خواتین و حضرات کہ میں اشفاق علی خان مرحوم کا شاگرد بن گیا" بخاری صاحب نے اہتمام کیا کہ گورنمنٹ کالج میں اردو کی کلاسوں کا اجراء کیا جائے' صوفی صاحب نے اصرار کیا کہ ایم۔ اے میں داخلہ لو' میں نے کہا جی بی اے کر لیا ہے' بہت بڑی ڈگری ہوتی ہے۔ بہر حال ان کے تقاضے پر ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا اس زمانے میں ایم۔ اے اردو کا باقاعدہ نصاب نہیں تھا۔ بخاری صاحب نے ریسرچ کی اور ظلم یہ کیا کہ تنقید کی ساری کتابیں انگریزی کی لگا دیں۔ آئی۔ اے۔ رچرڈز کی Principles of Criticism ای۔ ایم فاسٹر کی Aspects of the Novel اور یہ پڑھانے کے لئے سارے استاد انگریزی کے تھے۔ اوپر جا کر پروفیسر سراج سے پڑھتے نچلی منزل پر پروفیسر اشفاق علی خان کی کلاس پڑھتے تھے۔ اشفاق علی خان کو جو کتاب پڑھانی تھی وہ تھی ارسطو کی بوطیقا۔ حرام ہے ہمیں کچھ پتا چلے کہ بوطیقا کیا ہے اور اس کا کیا کرنا ہے۔ باوجود اس کے کہ ان سے میرے دوستانہ تعلقات تھے، کلاس روم میں میں ان کا ادب و احترام کرتا تھا اور وہ بھی ایک اچھے استاد کی طرح ہمیں پڑھاتے تھے۔

ایک دفعہ کینیڈا میں کوئی صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ آپ گورنمنٹ کالج کے طالب علم بڑے متعصب ہوتے ہیں' جہاں بیٹھتے ہیں گورنمنٹ کالج کی باتیں شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں ٹورنٹو میں آپ پانچ بیٹھے لوگ گورنمنٹ کالج کے اکٹھے ہو کر پھر گورنمنٹ کالج کی باتیں کر رہے ہیں' کچھ یہاں کی بات کریں، میموں کی بات کریں۔ آخر گورنمنٹ کالج میں ایسی کیا بات ہے؟ میں نے کہا یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی بابرکت خطہ زمین پر کوئی ادارہ قائم ہوتا ہے۔ زمین کی بھی بڑی برکت ہوتی ہے۔ مولانا قاسم ایک دفعہ ریل گاڑی کے انتظار میں پلیٹ فارم پر کھڑے تھے۔ گاڑی آنے میں ابھی دیر تھی نزدیک ہی ایک بنچ دیکھا تو اس پر بیٹھ گئے لیکن پھر کچھ دیر بعد اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ لگتا ہے یہاں پر کچھ دیر پہلے کوئی باکمال بزرگ بیٹھ کر گیا ہے جس کی وجہ سے میرا قلب چالو ہو گیا ہے۔ سو خواتین و حضرات بعض جگہیں ایسی ہوتی ہیں جہاں قلب چالو ہو جاتا ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور بھی ایک ایسا خوش قسمت خطہ زمین ہے کہ جہاں جو بھی علم حاصل کرنے آیا اس کا ذہن بھی چالو ہو گیا اور اس کا قلب بھی چالو ہو گیا۔ میرے چھوٹے اکثر مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ آپ کو جو اساتذہ پڑھایا کرتے تھے (اور جن میں پروفیسر اشفاق علی خان کا درجہ واقعی بہت بلند ہے) وہ اصل مضمون پڑھانے کی بجائے ادھر ادھر کی بہت ساری باتیں کیا کرتے تھے۔ مثلاً پروفیسر اشفاق علی خان ہمیں بوطیقا پڑھانے کی بجائے یہ سمجھاتے تھے کہ پاکستان میں سٹیل مل کا قیام انتہائی ناگزیر ہے۔ یہ ان کی دکھتی ہوئی رگ تھی۔ اٹھنا بیٹھنا' خواب دیکھنا، رونا پیٹنا، رنج و غم، سود و زیاں وہ سب سٹیل مل کے لئے تھا۔ وہ کہتے تھے جب تک پاکستان میں سٹیل مل نہیں لگے گی ہم مسلمان نہیں ہو سکتے۔ ہم یہ سب کچھ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ تو یہ گورنمنٹ کالج کے بیشتر اساتذہ کا وطیرہ رہا ہے کہ یہاں ٹیچر کم رہے ہیں گرو زیادہ رہے ہیں اور خواتین و حضرات گرو کی تعلیم میں اور ٹیچر کی تعلیم میں بڑا فرق ہے جبھی آپ دیکھیں گے کہ گورنمنٹ کالج کے طالب علم میں اپنے پروفیسر کی کوئی نہ کوئی خصوصیت یا جھلک ضرور موجود ہے۔ چاہے ہلکی یا زیادہ لیکن موجود ضرور ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ٹیچر جب پڑھاتا ہے تو وہ صرف انفارمیشن عطا کرتا ہے۔ اس کے اور سٹوڈنٹ کے درمیان ایک خلیج ہوتی ہے۔ وہ روسٹرم پر کھڑا ہوتا ہے۔ سٹوڈنٹ اس کے کچھ فاصلے پر ہوتا ہے۔ ٹیچر انفارمیشن عطا کرتا ہے جنہیں سٹوڈنٹ اپنے نوٹس میں لکھ لیتا ہے، اور ٹیچر کلاس پڑھا کر چلا جاتا ہے۔ پروفیسر اشفاق علی خان کا رشتہ تھا گرو اور چیلے کا رشتہ جو ہمیں نصیب ہوا (اور اللہ کا شکر ہے کہ ہم اس کالج میں پڑھے) وہ رشتہ یہ ہوتا ہے کہ گرو اپنے چیلے کے Physically قریب ہوتا ہے۔ وہ اس کے Touch میں آ سکتا ہے۔ اس سے بات کر سکتا ہے۔ گرو اس کے قریب کھڑا ہو کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ سکتا ہے' اس سے ہاتھ ملا سکتا ہے۔ سب سے اہم بات گرو اور چیلے کی تعلیم میں یہ ہوتی ہے کہ جب چیلا حوصلہ مند ہو کر تقویت پا جاتا ہے تو وہ آہستہ آہستہ گرو کے قریب آ کر اور حوصلہ پا چکنے کے بعد گرو کی چھوٹی، چیچی انگلی کھا جاتا ہے۔ گرو اسے کچھ نہیں کہتا۔ اپنی چار انگلیاں لے کر گھر چلا جاتا ہے۔ وقت گزرنے کے بعد چیلہ دوسری انگلی کھانا چاہتا ہے اور گرو اسے کھانے دیتا ہے۔ آہستہ آہستہ خواتین و

حضرات سارے کا سارا گرو چیلے کے اندر اتر جاتا ہے۔ اور اس کے رگ و پے میں سرایت کر کے ویسے ہی دوڑنے لگتا ہے جیسے اس کا گرو۔

تو گورنمنٹ کالج، باوصف اس کے کہ ایک ایسا ادارہ ہے جہاں باقاعدہ طور پر اس بات کو نہیں سکھایا گیا، اس میں بیشتر ایسے گرو آئے جو اپنے چیلوں کو اپنی ذات اپنا تشخص اور اپنی Entity عطا کر گئے اور پروفیسر اشفاق علی خان یقینی طور پر گورنمنٹ کالج کے چند اہم گروؤں میں سے ایک تھے۔ ان کی وفات پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ ایسے لوگوں کا ہونا غنیمت تھا۔ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ آپ کے اندر inculcate کر رہے ہیں' پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ اپنا خون آپ کی رگوں میں اتار رہے ہیں، لیکن یہ سب کچھ ہو رہا ہوتا تھا۔ ہم ان کے بڑے دین دار ہیں اور شکر گزار ہیں۔ اللہ نے ان کو جس طرح یہاں آسانیاں عطا کی تھیں وہاں بھی آسانیاں عطا کرے۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ وہاں بیٹھ کر بھی، کسی نہ کسی طور، اس درسگاہ کے آنے والے سٹوڈنٹس کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔

(یہ مضمون پروفیسر اشفاق علی خان مرحوم کی یاد میں منعقدہ ریفرنس میں پڑھا گیا جو ۱۱ جون ۲۰۰۱ء کو بخاری آڈیٹوریم گورنمنٹ کالج لاہور میں منعقد ہوا)

ٹ

محمد سلیم الرحمٰن کی "نظمیں"

سہیل احمد خان

جی ہاں، دو شاعر ہیں ایک سلیم الرحمٰن اور دوسرے محمد سلیم الرحمٰن۔ سلیم الرحمٰن کا مجموعہ "شام کی دہلیز" کے نام سے شائع ہوا تھا اور ساٹھ کی دہائی کی "نئی شاعری" کی بحثوں میں اس کا حوالہ آتا رہا۔ اب سلیم الرحمٰن برسوں سے ملک سے باہر ہیں اور اس مجموعے کے بعد ان کی بہت کم نظمیں رسائل میں نظر آئیں۔ ادھر ہمارے محمد سلیم الرحمٰن جو ہومر کی اوڈیسی کے مترجم اور "سویرا" کے مدیر ہیں۔ باوقار تسلسل کے ساتھ ۱۹۵۷ء سے مختلف رسائل میں بطور نظم گو اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہے ہیں تاہم ان کی نظموں کا مجموعہ اب "قوسین" لاہور نے "نظمیں" کے نام سے شائع کیا ہے۔ عمدہ کاغذ اور دیدہ زیب کمپوزنگ سے سجا ہوا ۲۰۸ صفحات کا یہ مجموعہ سلیم صاحب کی چوالیس برس (۱۹۵۷ء تا ۲۰۰۱ء) کی شاعری کا ارمغان ہے جس میں ان کی سوا سو سے کچھ زائد نظمیں جو بقول ان کے "خواب کی سی بے اختیاری" میں کہیں سے ملی ہیں اردو نظم کے قاری کو اپنے بھید سے آشنا ہونے کی دعوت دے رہی ہیں۔

یہ کام اتنا آسان نہیں کہ ہمارے جائزہ نگار فہرست ساز یا رسائل کے صحافیانہ تبصرے لکھنے والوں کی رسمی تنقید ادا کر سکے۔ یہ مجموعہ قدم قدم پر تامل کا طلبگار ہے۔ یہ ایسی شاعری نہیں کہ آپ دوڑتے ہوئے شاعر کی دنیا سے گزر جائیں یہاں تو رک رک کر لفظوں پر، آہنگ پر، ہیئتوں پر اور موضوعات پر غور کرنا ہوگا۔ مگر یہ کام اس لئے ضروری ہے کہ پچھلے چوالیس برس کی شاعری میں اس سطح کی ہنرمندی بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ اس طرح یہ مجموعہ ایک اہم شاعر ہی سے تعارف نہیں کراتا بلکہ اپنے عصر کے شاعروں کی ازسرنو درجہ بندی کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے۔

ہر جدید شاعر کا اپنا الگ جہان ہے (جس کا رقبہ چھوٹا یا بڑا ہو سکتا ہے) جس سے آشنائی کے لئے اس شاعر کے خلقی مزاج اور اس کی حسیت سے واقف ہونا ضروری ہے۔ محمد سلیم الرحمٰن کی شاعری میں جو چیز سب سے پہلے چونکاتی ہے وہ "نظم" کا مخصوص تصور ہے۔ جدید نظم کے بارے میں بیشتر مروجہ تصورات بہت کچے ہیں، مثلاً

کچھ لوگوں کے نزدیک جدید نظم صرف آزاد نظم ہوتی ہے۔ جدید شاعروں نے نئے زمانے کے موضوعات اور افکار کو نظم کے سانچے میں سمونے کے لئے ہیئتوں کی تلاش کے لئے بڑی کاوش کی ہے۔

محمد سلیم الرحمٰن کی ابتدائی نظمیں دیکھیں تو احساس ہوتا ہے کہ شاعر اردو شاعری کی روایت سے قدرے بے نیاز ہے اور جدید اردو شاعری کے بڑے نمائندوں سے بھی ایک فاصلے پر کھڑا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ شاعر نے یورپی شاعری (مگر اس کی بھی قدیم اصناف شعر مثلاً ویلےنل Villanelle) کا مطالعہ کر رکھا ہے اور اپنے احساسات کو ان ہیئتوں میں مرتب کر رہا ہے۔ ان نظموں کی فضا بھی از منہ وسطیٰ کی اس شاعری سے ملتی ہے جس میں گڈریوں، باغبانوں اور ان کے ساتھ فطرت کا ذکر ہوتا تھا۔

پندرہ چاند اور چودہ سورج ڈوب چکیں تب میں دیکھوں گی
باغ میں اپنے من موہن کو آموں کی رکھوالی کرتے
پیار کو اپنے اب کی دفعہ میں آنکھوں آنکھوں میں کہہ دوں گی

کیا یہ لہجہ میرا جی اور ان کے معاصرین کے گیتوں سے مختلف نہیں؟ (یہ بھی یاد کریں کہ گلزار کے ایک مشہور فلمی گیت میں چاند کی راتوں کی تعداد اس نظم کے ربع صدی سے بھی زیادہ عرصے کے بعد کی بات ہے)۔ محمد سلیم الرحمٰن نے یورپی شاعری کے اس اثر کے تحت نظم کا اصل مفہوم سمجھا ہے۔ ہر نظم کسی بے ترتیبی کو کسی ترتیب میں لانے کی کوشش ہے اور اس کے لئے ریاضت اور ہنر کی ضرورت ہے۔ یوں شاعر MAKER بنتا ہے۔ ''میکر'' کے لئے میں صناعی کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہتا کہ اب ہمارے ہاں بالعموم صناعی ترکیب سازی یا صفات کے بے دریغ استعمال کا مترادف سمجھا جا رہا۔ میری مراد شاعر کی اس کاری گری سے ہے جو مواد کو تراش خراش کے بعد ایک سانچے میں ڈھالتی ہے۔ محمد سلیم الرحمٰن کی ہر نظم ایک طرز یا ''پیٹرن'' میں ڈھلتی ہے۔ یہ ہیئت سازی ذات یا عصر کے انتشار پر ایک ترتیب منڈھ دیتی ہے۔ ان کے معاصرین میں ان جیسی ریاضت کی مثالیں کم ہی ملیں گی۔ ہاں، بیسویں صدی کے بڑے مغربی شاعروں میں ایزرا پاؤنڈ کی ابتدائی شاعری ضرور یاد آنی چاہئے۔ پاؤنڈ کے اس دور میں پرانے اطالوی شعراء اور پروونس کی شاعری سے ہیئتوں کا شعور حاصل کیا گیا' ان میں نئے احساسات کو سمویا گیا۔ ناقدین کے بقول اس ہنر نے ایک نسل کو شاعری سکھائی۔

محمد سلیم الرحمٰن کے ہاں ہیئت کی تلاش کا یہ سفر صرف نئی ترتیب ہی کا نام نہیں۔ اس ترتیب کے لئے مناسب ڈکشن کی تلاش میں بھی وہ سرگرم رہے۔ جو لفظ بھی استعمال کیا جائے اس ترتیب کو توڑتا ہوا نہ لگے۔ وہ نظم کے دوسرے لفظوں کے ساتھ گھل مل جائے اور ابھرتے ہوئے آہنگ کا حصہ بن جائے۔ نظم کے تصور میں وہ اردو نظم کی روایت سے پار جانے کی کوشش کرتے ہیں مگر ان کی لفظیات میں اردو کے لہجوں کا بھرپور شعور موجود ہے بلکہ ایسے دیسی لفظ بھی انہیں محبوب ہیں جو عام طور پر معاصر شاعری میں استعمال نہیں ہوتے۔

دھوئیں کی طرح فاصلوں اور اندھیروں میں گم ہونے والو' نئے بن کے پیاسو

تمہارے وطن کی مہکتی شیاروں' پھلوں سے لدی باڑیوں اور بنوں میں
عجب رنگ تھے اور بے نام بوٹے' بچپن اور اُبج کے اچھوتے خزانے

ایک دلچسپ چیز یہ بھی کہ محمد سلیم الرحمن نے نثری نظم کے موجودہ اُبال سے کہیں پہلے ۱۹۶۲ء سے نثری نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں احساسات کے مختلف قطعوں کو پیراگراف کی حدود میں لانے کی سعی ہے۔ ان کا گداز پرتاثیر ہے۔

ذرا سی دیر جو جھما جھم مینہ برسا تو تپتی ہوئی زمین میں ٹھنڈک پھیل گئی۔ زمین گہرے گہرے سانس لے رہی ہے اور مٹی سے سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی ہے۔ زمین، گہری زمین، گھنی زمین! میں تجھ سے پوچھتا ہوں۔ تجھے کچھ ان دل جلوں کی بھی خبر ہے جو نیچے سو رہے ہیں، جو مٹی اور نیستی میں مل رہے ہیں! انہیں بھی کچھ ٹھنڈک پہنچی، انہیں بھی پتہ چلا کہ آج مینہ برسا ہے، دھنک نکلی ہے اور یہاں ہوا اور ہرے کھیتوں میں کوئی انہیں یاد کرتا گزر رہا ہے؟

آسمان کتنا خوش نما ہے اور تم اندھیروں اور گھٹن میں شاید اپنے نام بھی بھول چکے ہو۔

محمد سلیم الرحمن کی ابتدائی شاعری میں قصباتی مناظر زیادہ ہیں لیکن انسانی زندگی سے زیادہ فطرت کے مظاہر انہیں اپنی طرف بلاتے ہیں۔ بارش کا طلسم، مولسری کے پھول، چمپئی صبح۔ ہرے غرقاب کھیتوں پر بچھی ہوئی ویرانی۔ پانی کا دبے پاؤں چڑھنا اور غراتا۔ شاعر کی آنکھ سیر بین کی طرح مناظر کو کھینچتی ہے۔ اوقات اور مناظر کو یکجا کر دیا گیا ہے

درختوں سے رسنے لگا عنبریں گوند، بن میں کھلے پھول اور مور ناچے
نئے بیل بوٹوں کی رُت کا چڑھا چاند، کھیتوں میں سرسوں نے سونا بکھیرا
زمینوں کے سوئے ہوئے رنگ اور حوصلے چیت کی دھوپ کھا کھا کے جاگے
چلیں پھر سے پن چکیاں اور نہریں' چنگلیں اُڑیں، چہچہائے پرندے

منظروں کو کھینچتی شاعر کی ذات، حیرانی اور استغراق سے آشنا ضرور ہوتی ہے تاہم ان نظموں میں کوئی خارجہ پیکر ایسا نہیں جو ذات کی سنگلاخ چٹانوں کو پگھلا سکے۔ ابتدائی شاعری میں سلیم صاحب کا رشتہ گرد و پیش کے مشاہدے کے باوجود کچھ ایسا ہے جیسے شاعر تیوری چڑھائے تک رہا ہو مگر آگے چل کر چیزوں سے بلکہ انسانی دنیا سے کچھ قربت کا احساس ہوتا ہے جس نے ان کی عشقیہ لہجے کی چند نظموں کو بھی سرشار کیا ہے اور مناظر کی دید کے بھی نئے پہلو سامنے آئے ہیں ایک ''نظم بے گانگی'' ملاحظہ ہو

آدھی رات ادھر، آدھی اُدھر
مدھم بلب کی روشنی میں
میرے بستر پر ایک چیونٹی چل رہی ہے۔

ننھی ساتھی

تمہاری دنیا میں اس وقت دن ہے یا رات؟

تمہاری دنیا میں وقت ہے بھی یا نہیں،

مجھے تو کچھ پتا نہیں۔

کہنے کو ہم ایک ہی دنیا کے رہنے والے ہیں۔

یا وہ نظم جس میں ایک مایوس دوست کی ہمت اس مثال سے بڑھائی گئی ہے کہ ناکارہ کلاک بھی دن رات میں دو بار صحیح وقت بتاتا ہے۔ ۱۹۷۵ء کے بعد کی نظموں میں یادِ رفتگاں، بچپن کے بھولے بسرے دنوں، مناظر اور ذات کے اندر بپا کشاکش کے ساتھ ساتھ انسانی اجتماع کے بعض رجحانات کا محاکمہ بھی ہے "ایک بگٹٹ شہر کے آگے پیچھے" اور "ظالم بادشاہوں کے لئے نظم" "ایک بڑے پچھتاوے کے کنارے" جیسی نظموں میں یہ احساس کھل کر سامنے آتا ہے جبکہ بعض دوسری نظموں میں کسی زیریں لہر کی طرح۔ "ظالم بادشاہوں کے لئے نظم" میں تو شاعر اندرونی ارتعاش سے پھٹتا ہوا لگتا ہے اور غصے کو دبانے والا شاعر گالیاں دینے سے بھی گریزاں نہیں مگر اس نظم کی اصل خصوصیت بھی یہ غصیلا لہجہ نہیں۔ اس میں مخصوص وضع کے انسانوں کی نفسیات کی پوری تصویر ہے۔ آمر کی خود پسندی، اُس کے پشیماں خواب، اُس کا تشدد، سب کچھ اس نظم میں پرو دیا گیا ہے۔ آمر کی نفسیات کا ایسا مکمل مطالعہ جدید اُردو نظم میں راشد کی ایک دو نظموں کے علاوہ مشکل ہی سے ملے گا۔

چاقوؤں کی جس شفق میں

تم کسی چقماق کی مانند چمکے

وہ تمہاری آستینوں اور تمہاری کھیتیوں میں

آگ بن کر لہلہائی

اس تمہارے ایندھنوں اور پھانسیوں کے

شہر نا پرساں میں نومولود چہرے

جن کے کانوں میں اذانوں کے بجائے

کولھوؤں کی چرچراہٹ

محمد سلیم الرحمٰن جیسے شاعروں کی شاعری کے آہنگ سے آشنا ہونے کے لئے تربیت یافتہ کانوں اور اس کی معنویت تک پہنچنے کے لئے تربیت یافتہ قاری کی ضرورت ہے مگر ایسے قاری اب کتنے ہیں؟ مدرسین کی بے روح شرحوں، ادبی رسائل اور اخبارات کے ادبی صفحات تک میں ادب کے ذکر کے بجائے ادیبوں کی سالگرہ کی تقریبات اور آم پارٹیوں کا ذکر زیادہ ملتا ہے۔ پھر بھی یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ محمد سلیم الرحمٰن پاکستان میں اُردو نظم کے واقعی ہنر مند شاعر ہیں اور ان کی کتاب اس وقت بھی اہم شمار ہوگی جب کچے جذبوں کو ادھ کچرے اسلوب میں بیان کرنے والوں کی مقبولیت جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گی۔

سلیم اختر اور نفسیاتی تنقید

ڈاکٹر گل سرین حلیجی

شعبہ اردو، انقرہ یونیورسٹی

ڈاکٹر سلیم اختر اردو ادب کے ایک مایہ ناز ادیب ہیں۔ معاصر ادبی تاریخ میں انھیں بطور افسانہ نگار، ادبی مورخ، نفسیاتی نقاد اور ماہر اقبالیات ایک اہم مقام ملا ہے۔ انھوں نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر کئی ادبی ایوارڈ اور انعام وصول کیے ہیں۔ ان کی کتاب ادب اور لاشعور کو ۱۹۷۶ء میں داؤد ادبی انعام ملا۔ ۱۹۸۲ء میں انھیں پاکستان رائٹرز گلڈ انعام برائے تنقید دیا گیا۔ یہ انعام ان کی کتاب اقبال اور ہمارے ادبی رویے پر ملا۔ ۱۹۸۹ء میں وہ رسالہ نقوش ادبی ایوارڈ کے مستحق قرار پائے۔ ۱۹۹۳ء میں انھیں نیاز فتح پوری ایوارڈ ملا۔ ڈاکٹر سلیم اختر پاکستان میں منعقد ہونے والے درجن سے زائد اہم سیمیناروں میں اعلیٰ درجے کے مقالے پیش کرنے کے علاوہ غالب سیمینار غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی ۱۹۸۸ء اور بزم اردو قطر سیمینار دوحہ ۱۹۸۹ء میں بھی پاکستان کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ تنقید، اقبالیات، نفسیات، طنز و مزاح اور فکشن (ناولٹ و افسانے) کے حوالے سے ان کی پچاس سے زائد کتابیں قارئین کے علمی ذوق سے داد وصول کر چکی ہیں۔ ان دنوں ہندوستان، ڈنمارک اور سویڈن کے سفر ناموں کے ابواب کئی رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کی بدولت وہ اردو کے اہم سفر نامہ نگاروں میں بھی شامل ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے نفسیاتی مطالعوں پر مشتمل اپنی آپ بیتی کے کئی حصے بھی مختلف رسالوں اور کتابوں میں چھپوائے ہیں۔ ایسی شخصیت کو کسی ایک مختصر مضموں میں سمیٹنا ناممکن ہے تاہم میری کوشش ہوگی کہ میں ان کی ادبی شخصیت کے نمایاں حوالے اس مضمون کے وسیلے سے قارئین کے سامنے لاسکوں۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی تحریروں میں اختصار اور جامعیت کی خوبیاں موجود ہیں۔ ایجاز و اختصار سے مدعا بیان کرنا آسان کام نہیں ہے لیکن جب ہم سلیم اختر کے اسلوب پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ اس میدان کے شہسوار نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر نوع کی تحریروں میں روانی اور ہمواری کا خاصا احساس ہوتا ہے۔ وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں سادگی اور پرکاری سے کہتے ہیں۔ ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین بھی خشک اور بے جان نہیں ہیں۔ ان

کی اس خوبی کی بنا پر قارئین انہیں بہت پسند کرتے ہیں۔ ان کی مشہور زمانہ کتاب ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' ہی کو لے لیجئے اس کے اسلوب کی دلچسپی، اور نثر کی شگفتگی اور روانی کی بدولت مختصر مدت میں اس کے کئی ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک چکے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر خود کہتے ہیں:

میں بنیادی طور پر ایسا انسان ہوں جو ہمیشہ جدت اور تنوع کی تلاش میں رہتا ہے۔ اسی شوق کے تحت میں نے خاصا متنوع مطالعہ کیا ہے''(۱)

ڈاکٹر طاہر تونسوی سلیم ڈاکٹر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اردو ادب میں سوائے احمد ندیم قاسمی کے بہت کم لکھنے والے ایسے ہیں جنہوں نے اپنی تخلیقی جہتوں کا ایک ہی معیار قائم رکھا ہے ادب کی اس میلہ نما منڈی میں ڈاکٹر سلیم اختر وہ واحد ادیب ہیں۔ جنہوں نے تنقید بھی اول درجے کی لکھی ہے تاریخ بھی اول درجے کی تحریر کی ہے اور افسانے بھی اول درجے کے تخلیق کیے ہیں''(۲)

ڈاکٹر سلیم اختر ۱۱ مارچ ۱۹۳۴ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبدالحمید ہے۔ سلیم اختر نے ابتدائی تعلیم لاہور، پونا اور انبالہ میں پائی۔ جب پاکستان بنا وہ ساتویں جماعت کے طالب علم تھے۔ انہیں راولپنڈی میں مسلم ہائی اسکول اصغر مال اور پھر فیض الاسلام ہائی اسکول میں پڑھنے کا بھی موقع ملا۔ انہوں نے ۱۹۵۱ میں پی ایچ ڈی کی۔ ان کے تحقیقی مقالے کا موضوع ''نفسیاتی تنقید'' تھا۔

گورنمنٹ کالج لاہور سے متعلق ڈاکٹر سلیم اختر کی ایک شاگرد سروش ان کی ملازمت کے بارے میں لکھتی ہیں ''۵ جنوری ۱۹۶۲ء کو ان کی تقرری بطور لیکچرار ایمرسن کالج ملتان میں ہوئی۔ آٹھ سال کا طویل عرصہ گزارنے کے بعد ان کا تبادلہ فروری ۱۹۷۰ء میں گورنمنٹ کالج وحدت روڈ لاہور میں ہو گیا۔ جون ۱۹۷۲ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۷۴ء میں ان کی ترقی بطور اسسٹنٹ پروفیسر کے ہوئی۔ ۱۰ مارچ ۱۹۹۴ء میں ریٹائرمنٹ (بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر) کے بعد سے تا حال اسی کالج میں اعزازی پروفیسر کے طور پر ایم اے اردو کے طلبہ کو پڑھا رہے ہیں''(۳)

ڈاکٹر سلیم اختر بین الاقوامی سطح پر پہچانے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں ان پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا گیا ہے۔ یہ تحقیقی و تنقیدی مقالہ ڈاکٹر جلیل اشرف نے لکھا ہے۔ رانچی یونیورسٹی رانچی ہندوستان نے ان پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی۔ پاکستان کی کئی یونیورسٹیوں میں ان کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں پر ایم اے کی سطح کے کئی مقالے لکھے گئے ہیں۔ سعیدہ بانو نے اردو کے دو نفسیاتی نقاد کے عنوان سے ۱۹۸۷ء میں بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے لیے ایم۔ اے اردو کا مقالہ تحریر کیا۔ اس میں ایک نفسیاتی نقاد ڈاکٹر سلیم اختر تھے۔ اسی یونیورسٹی کے لیے یاسمین اشرف نے ۱۹۹۱ء میں ''اردو افسانہ میں ڈاکٹر سلیم اختر کا مقام'' کے عنوان سے ایم۔ اے اردو کا

تھیسس لکھا۔ گزشتہ دنوں ہندوستان سے پاک و ہند کے مشہور ادیبوں اور نقادوں کی تصاویر پر مبنی ایک کیلنڈر میں بھی ڈاکٹر صاحب کی تصویر نمایاں طور پر شائع ہوئی ہے۔ رسالہ الفاظ کراچی نے ڈاکٹر سلیم اختر نمبر شائع کیا۔ علاوہ ازیں پاک و ہند کے کئی معروف ادبی جریدوں میں سلیم اختر کے حوالے سے علیحدہ گوشے چھپے۔ ان میں سے چند رسالوں کے نام یہ ہیں: سیپ کراچی۔ ماہ نو لاہور۔ عصری ادب دہلی۔ فنون لاہور۔ بیسویں صدی دہلی۔ افکار کراچی۔ نقوش لاہور۔ تخلیق لاہور۔ (۴)

یہاں ڈاکٹر صاحب پر لکھی جانے والی دو کتابوں کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔ پہلی کتاب ''ہمسفر جگنوؤں کا'' ہے۔ اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر طاہر تونسوی ہیں۔ یہ پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر سلیم اختر کے ادبی اور تنقیدی فکر کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے متعدد گوشوں کو سامنے لاتی ہے۔ دوسری کتاب ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تحقیقی بصیرت اور ڈاکٹر سلیم اختر سے ان کی شاگردانہ عقیدت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اسے انھوں نے ''ڈاکٹر سلیم اختر'' شخصیت و تخلیقی شخصیت'' کے نام سے مرتب کیا ہے اور اس کے ناشر ... پبلشرز لاہور ہیں۔ ۲۰۷ صفحات پر مشتمل یہ کتاب برصغیر کے نامور ادیبوں اور نقادوں کے مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت اور فن کے حوالے سے وقتاً فوقتاً قلم بند کیے ہیں۔ انتظار حسین، مسعود اشعر، منصور قیصر، رحیم گل، ڈاکٹر آغا سہیل، لطیف الزماں، عطاء الحق قاسمی، مشکور حسین یاد، مرزا ادیب، جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، احمد ندیم قاسمی، نظیر صدیقی، ڈاکٹر اے بی اشرف ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی اور بہت سے دوسرے ادیبوں نے ڈاکٹر صاحب کے فکر و فن کے بہت سے گوشوں کو منور کیا ہے۔ اس کتاب کے ذیلی حصے ''شخصیت کی جہات''، ''فکر نو کی میزان'' ''کوزہ میں دریا''، ''زاویہ نگاہ''، ''نقطہ نظر''، ''انفس و آفاق''، ''ہم سفر''، ''باتوں میں گلوں کی خوشبو''، ''فن کا کمال'' اور ''آئینہ'' کے نام سے ہے۔ اس کتاب میں ۵۷ مختلف عنوانات کے تحت ڈاکٹر سلیم اختر کی ذاتی، ادبی اور فنی زندگی کو مختلف زاویوں سے بے نقاب کیا گیا ہے۔ (۵)

ڈاکٹر سلیم اختر کی اولین ادبی تخلیق ایمان دار مصور کے عنوان سے چھپی۔ (۶) ان کا اولین تنقیدی مضمون ''نازک مزاج شاعر۔۔۔میر'' کے عنوان سے چھپا۔ (۷)

ڈاکٹر سلیم اختر خود کو نفسیاتی نقاد اور ادیب کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ انھوں نے فرائڈ کی نفسیات کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ ان کی تنقیدی کتاب میں لاشعوری مطالعوں اور تحلیل نفسی سے خصوصی کام لیا گیا ہے۔ ایڈلر کا ''احساس کمتری'' کا نظریہ ہو یا میکڈوگال کا ''نظریہ جبلت'' ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے کئی افسانوں اور مضامین میں ان کا خوب استعمال کیا ہے۔ البتہ یونگ کے اجتماعی شعور اور سارتر کے وجودی نفسیاتی نظریات پر ان کی زیادہ توجہ نہیں رہی۔ انہوں نے علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی جیسے شاعروں کے نفسیاتی مطالعے کر کے اپنی نفسیاتی باریک بینی کا عمدہ مظاہرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد معروف نے اپنے مضمون ''ادب اور لاشعور''، ڈاکٹر احسان الحق نے ''نفسیاتی

تنقید''، جگن ناتھ آزاد نے ''ایک نفسیاتی دبستان کا سرخیل'' کے عنوانات سے لکھے جانے والے اپنے مضامین میں ڈاکٹر سلیم اختر کے نفسیات سے گہرے تعلق کو واضح کیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر سے قبل اردو میں حسن عسکری، حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر محمد حسن، سلیم احمد اور ریاض احمد کو نفسیاتی تنقید کا پیرو قرار دیا جا سکتا ہے۔

آپ بیتی کے حوالے سے لکھے گئے ایک مضمون ''میں'' میں وہ خود لکھتے ہیں : کالج میں میں فلسفہ کا طالب علم تھا اور تصوف پر کتابیں پڑھتا تھا۔ تصوف کا توڑ فرائڈ نے کیا جب کہ فلسفہ پڑھنے کی خواہش بھی بعد کے نفسیاتی مطالعے میں دب کر رہ گئی۔ (۸)

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ تحلیل نفسی کے مطالعے نے نہ صرف انھیں نیوراتی ہونے سے بچایا بلکہ ان کے لیے دوسروں کی نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی مسائل کی تفہیم کے راستے کھل گئے۔ یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر کی اولین کتاب نگاہ اور نقطے کے بیشتر مضامین ان کی نفسیاتی اپروچ کا پرتو لیے ہوئے ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۶۸ء میں طبع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں جہاں منٹو اور غالب کے خطوط کا نفسیاتی جائزہ لیا گیا ہے۔ وہاں انھوں نے نذیر احمد کے ابن الوقت اور اکبر الہ آبادی کی شاعری پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ''زیوس سے امیر حمزہ تک''، ریختی شاعری میں زنانہ پن کی مثال اور ''مرزا رسوا کا نظریہ'' ناول'' اس کتاب کے دیگر اہم مضامین ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے کہ ''میں نے تنقید میں نفسیات کو صراحت کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس لیے تنقید کو نفسیاتی چیستان بنانے کی کوشش نہیں کی۔ بعض تخلیقات یا تخلیق کاروں کا نفسیات کی روشنی میں نئے انداز سے مطالعہ کیا گیا ہے تو اس سے نئے پن کی سنسنی خیزی مقصود نہیں بلکہ صداقت کی تلاش ہے۔ (۹)

سلیم اختر کی دیگر تنقیدی کتابوں میں باغ و بہار کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۲۸ء، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ ۱۹۸۱ء، تنقیدی دبستان ۱۹۷۳ء، افسانہ حقیقت سے علامت تک ۱۹۷۶ء، ادب اور لاشعور ۱۹۸۶ء، تخلیق اور لاشعوری محرکات ۱۹۸۳ء، ادب اور کلچر ۱۹۸۴ء، شعور اور لاشعور کا شاعر غالب ۱۹۸۷ء، نفسیاتی تنقید ۱۹۸۶ء، پاکستان میں اردو ادب سال بہ سال ۱۹۸۸ء، تخلیق۔ تخلیقی شخصیت اور تنقید ۱۹۸۹ء، داستان اور ناول ۱۹۹۱ء، افسانہ اور افسانہ نگار ۱۹۹۱ء، اردو اصطلاح سازی ۱۹۹۳ء ہاتھ ہمارے قلم ہوئے ۱۹۹۵ء شامل ہیں۔

پاکستان میں اقبالیات کا موضوع خاصا حساس ہے۔ اقبال کو انتہائی محترم شاعر اور انسان سمجھا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں کسی قسم کی منفی رائے کو قبول نہیں کیا جاتا ہے تو اُس کی زندگی کے مثبت اور منفی دونوں پہلو سامنے لائے جاتے ہیں۔ اقبالیات کے سلسلے میں اس پس منظر میں محتاط رہنے ہی میں عافیت سمجھی جاتی ہے۔ انتظار حسین نے ڈاکٹر سلیم اختر کا ایک انٹرویو روزنامہ مشرق لاہور کے لیے اسی کی دہائی میں لیا تھا۔ اس میں سلیم اختر نے صاف صاف کہا تھا کہ انھوں نے اقبال کو حکیم الامت سمجھ کر ان کا تنقیدی مطالعہ نہیں کیا بلکہ ایک عام آدمی اور انسان کے طور دیکھا ہے۔ انتظار حسین بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ اقبال کے سلسلے میں یہ زاویہ (اقبال کا نفسیاتی مطالعہ) نیا ہے۔ (۱۰)

اقبالیات کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر کی تصانیف کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ اقبال کا نفسیاتی مطالعہ ۱۹۷۷ء[۱۱]، اقبال کا ادبی نصب العین ۱۹۷۷ء، اقبالیات کے نقوش ۱۹۷۷ء، فکر اقبال کے منور گوشے ۱۹۷۷ء، اقبال ممدوح عالم ۱۹۷۸ء، اقبال شعاع صد رنگ ۱۹۷۹ء، اقبال اور ہمارے فکری رویے ۱۹۸۲ء، ایران میں اقبال شناسی کی روایت ۱۹۸۳ء، اقبال شناسی کے زاویے ۱۹۸۵ء اور اقبال شناسی اور فنون ۱۹۸۷ء ان میں سے کچھ کتابیں مرتبہ اور مترجمہ ہیں اور کچھ مصنفہ۔ ''اقبال کا نفسیاتی مطالعہ'' ان کی وہ اہم تصنیف ہے جس سے اقبال کی نفسی زندگی کو ان کے کلام کے حوالوں سے سمجھا گیا ہے۔ ماہر اقبالیات پروفیسر محمد عثمان کا کہنا ہے کہ کتاب، اقبال کا نفسیاتی مطالعہ کا ''مابہ الامتیاز یہ ہے اس میں شاعرانہ محاسن اور افکار و تصورات سے زیادہ علامہ کے ذہنی مطالعہ اور نفسی تجزیے کی طرف غالباً پہلی مرتبہ باضابطہ اور سنجیدہ کوشش کے نشان ملتے ہیں۔''[۱۲]

اس کتاب میں اقبال کی ابتدائی عشقیہ شاعری کا باریک بینی سے تجزیہ کیا گیا ہے اور ان کے شعور اور لاشعور کے پس منظر میں ان کی جذباتی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو محتاط اشاروں میں سامنے لایا گیا ہے۔ موضوع کی نزاکت نے ڈاکٹر سلیم اختر کو خاصا محتاط رکھا ہے۔ اس کتاب میں اقبال اور عطیہ بیگم کے حساس موضوع کو بھی چھیڑا گیا ہے۔ اقبال کی حسن پرستی بھی موضوع بحث بنی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر اپنے ایک اور مضمون ''اقبال کا مثالی انسان: نفسیاتی تناظر'' میں لکھتے ہیں: ''مثالی انسان کی خواہش، تمنا اور اس کی تشکیل و تجسیم میں ''بزرگ دانش مند'' کا آرکی ٹائپ (یونگین تصور) خاص طرح کی رنگ آمیزی کرتا ہے۔ چنانچہ مرد مومن کسی مسلمان ہی کے لیے مثالی ثابت ہو سکتا ہے۔''[۱۳]

نفسیاتی تنقید کے پس منظر میں ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب ''افسانہ حقیقت سے علامت تک'' کو ڈاکٹر احسن فاروقی اور وقار عظیم نے بہت اہم گردانا ہے۔ اس کتاب میں ''اردو کا پہلا جنسی افسانہ نگار''، ''افسانوی تکنیک کا نفسیاتی مطالعہ''، ''نفسیاتی افسانہ''، ''اردو افسانہ میں عورت''، ''احمد ندیم قاسمی کے افسانے''، ''کیا آج سعادت حسن منٹو کی ضرورت ہے''، اور بہت سے دوسرے مضامین شامل ہیں۔ محمد علی صدیقی نے اس کتاب کی تنقیدی دیانت کو پسند کیا ہے کہ ''یہ صحت مند اختلاف کی دعوت دیتی ہے''۔[۱۴]

ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب ''ادب اور لاشعور'' کا عنوان اس بات کا گواہ ہے کہ اس میں فرائڈ اور یونگ کی نفسیاتی دریافتوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب جہاں ادب کے مختلف نظریات کو زیر بحث لا کر اس میں اصول، مسرت اور اصول، حقیقت کی اہمیت کو نمایاں کرتی ہے وہاں اس کے شعوری اور لاشعوری محرکات کی روشنی میں ادب اور تخلیقی شعور، ادب اور نرگسیت، تخلیق اور غیر معمولی پن یا ابنارمل رویوں کو بھی بنیادی حوالہ قرار دیتی ہے۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر نے غزل کی تخلیق میں شامل نفسیاتی رجحانات اور انشائیے کے مزاج کی نسوانیت کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اردو تنقید کو جو نفسیاتی گہرائی دی ہے۔ اس کا اعتراف بہت سے نقادوں نے کیا ہے۔

''ادب اور کلچر''، شعور اور لاشعور کا شاعر غالب'' اور ''جوش کا نفسیاتی مطالعہ'' جیسی اپنی کتابوں میں ڈاکٹر سلیم اختر نے جدید نفسیاتی نظریات کی روشنی میں ادبی تخلیقات اور ادبی شخصیات کی تفہیم کی ہے اور غالب اور جوش کی ادبی تحریروں کے نفسیاتی کوائف کے بارے میں اپنی ادبی معروضات پیش کرتے ہوئے قارئین کو دعوت فکر دی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کو اگرچہ اس بات پر شدید اصرار ہے کہ انہیں نفسیاتی نقاد کہا جائے تاہم جب ہم اُن کی تنقیدی کتب کا مجموعی جائزہ لیتے ہیں تو لامحالہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگرچہ انہوں نے اپنی تنقید کا محور و مرکز نفسیاتی مطالعوں کو بنا رکھا ہے پھر بھی ان کے زیر بحث آنے والے بیشتر نقادوں نے ان کی تنقیدی حدود کو وسیع قرار دیا ہے۔

اس پس منظر میں ہمیں ان کی کتاب ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کو بھی جانچنا چاہیے۔ اس کتاب میں اگرچہ بقول، طاہر تونسوی ''سلیم اختر نے بعض شاعروں کا نفسیاتی زاویئے سے مطالعہ کیا ہے۔ اور یوں وہ تاریخ میں بھی نفسیات کو لے آئے ہیں۔ (۱۵) تاہم اس میں مختلف ادبی عہدوں اور تحریکوں کے پس منظر میں کارفرما سماجی، فکری، اخلاقی اور معاشی حوالوں کو بھی بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید پر طائرانہ نظر ڈالنے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ادب اور معاشرے میں ٹیبوز کو ناپسند کرتے ہیں۔ انھیں مردہ روایات اور توہمات سے بھی رغبت نہیں ہے۔ وہ اظہار و ابلاغ کی راہ میں حائل سنسرشپ کے بھی سخت خلاف ہیں۔ انہیں آزاد فکر اور بے باک اظہار کے وتیرے پسند ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر اپنا نفسیاتی تجزیہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ اپنی آپ بیتی کے ایک باب میں وہ لکھتے ہیں: ''کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری شخصیت دولخت ہے۔ میں بیک وقت دو جذباتی دھاروں میں ہوتا ہوں۔ دو کشتیوں میں سوار ہوتا ہوں۔ نہ صرف اس میں کامیاب رہتا ہوں۔ بلکہ میری شخصیت ان میں سے کسی ایک کے بھی رنگ میں نہیں رنگی جاتی۔ ہمیشہ اپنا رنگ ہی برقرار رکھا۔''(۱۶)

حواشی

۱۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر سلیم اختر: شخصیت و تخلیقی شخصیت، گورا پبلشرز لاہور، ۱۹۹۵ء ص ۵۲۸
۲۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، ہمسفر جگنوؤں کا۔ شان ہند پبلی کیشنز نئی دہلی، ۱۹۹۲ء ص ۲۱
۳۔ سروش نگار۔ ڈاکٹر سلیم اختر۔ مضمون مطبوعہ مجلّہ راوی گورنمنٹ کالج لاہور ۱۹۹۵ء ص ۳۱
۴۔ بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر کوائف نامہ ڈاکٹر سلیم اختر: شخصیت و تخلیقی شخصیت ص۔ ۷۔
۵۔ دیکھیے ڈاکٹر سلیم اختر: شخصیت و تخلیقی شخصیت ص ۷ تا ۱۰
۶۔ مطبوعہ رسالہ تعلیم و تربیت فروری ۱۹۴۶ء، بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر: شخصیت و تخلیقی شخصیت ص ۶۹۳۔

۷۔ مطبوعہ سدا بہار لاہور ۱۹۴۸ء، بحوالہ ایضاً ص ۶۹۴

۸۔ بحوالہ ایضاً ص ۶۲۔

۹۔ ڈاکٹر سلیم اختر، نگاہ اور نقطے، مطبوعہ ۱۹۶۸ ناشرین لاہور ص ۸۔

۱۰۔ بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر: شخصیت و تخلیقی شخصیت ص ۴۵۔

۱۱۔ مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۷۷ء طبع دوم ۱۹۸۷ء۔

۱۲۔ بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر: شخصیت و تخلیقی شخصیت ص ۲۴۷

۱۳۔ مضمون از سلیم اختر اقبال کا مثالی انسان: نفسیاتی تناظر'' صحیفہ لاہور،

۱۴۔ ایضاً ص ۱۶۹

۱۵۔ نشان جگر سوختہ، ڈاکٹر سلیم اختر سہ ماہی معاصر لاہور جنوری تا جون ۲۰۰۲، ادارہ معاصر لاہور ص ۸۔۳

خورشید رضوی کی غزل: مجموعی مگر ادھورا تاثر

خالد اقبال یاسر

پچھلے دنوں سڑک پر آگے نکلتے ہوئے ٹرک کے پیچھے لکھا ہوا ایک شعر نظر پڑا۔

کب نکلتا ہے کوئی دل میں اتر جانے کے بعد
اس گلی کی دوسری جانب کوئی رستا نہیں

(شاخِ تنہا)

شعر کے ساتھ شاعر کا نام بھی لکھا تھا۔ خورشید رضوی۔ عام طور پر ایسا ہوتا نہیں کہ ایسی جگہوں پر مقبول عام شعروں کے ساتھ شاعر کا نام بھی لکھا ہو۔ شعر کی مقبولیت پر تو نہیں شاعر کے نام کے التزام پر حیرانی ہوئی کہ ایسا تو ٹی وی پر بھی نہیں ہوتا کہ غزل کے ساتھ شاعر کا نام بھی سکرین پر آ رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ خورشید رضوی کے اس شعر کو مقبولیت از خود حاصل ہوئی ہے ورنہ خورشید رضوی تو نام و نمود سے دور بھاگتا ہے۔ خواہشوں سے بچتا ہے اسی لیے وہ قناعت کے اصول پر ابتدا ہی سے کاربند ہے۔

مآلِ کار قناعت ہے سو ابھی سے سہی
وگرنہ طولِ تمنا کی انتہا بھی نہیں

(شاخِ تنہا)

اچھے دنوں کی آس تو خورشید رضوی کو بھی ہے مگر وہ جائز و ناجائز توقعات اور آئندہ کے حسین خوابوں کی سولی پر اپنے آپ کو چڑھانے کی بجائے چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں خوش رہنا چاہتا ہے جو اسے بہت عزیز ہیں۔ فراق گورکھپوری نے بھی اسی مضمون سے ملتا جلتا ایک شعر کہہ رکھا ہے۔

دکھاتے ہیں ستارے ایک بہتر زندگی کے خواب
نہ دیکھ ان کی طرف یہ چھین لیں گے سب خوشی تیری

(غزل)

اسے گوشہ نشینی، گمنامی اور تنہائی عزیز ہے۔ اسے ادراک حاصل ہے کہ زندگی خوف زیاں، خواہش سود اور نام و نمود کیلئے ہے مگر یہ بھی طے ہے کہ ۔ نام و نمود سب کی ہے منزل آخریں فنا (امکان) کہ وہ عام زندگی کو آسان

اور پیچیدگیوں سے مبرّیٰ دیکھتا ہے۔

چلو خورشید اتر جائیں پسِ کہسارِ گمنامی
کہ ہم کو خوش نہیں آئی فضا افلاکِ شہرت کی

(ڈوبتے سورج کا خودکلامیہ۔ سرابوں کے صدف)

O

یہ دور وہ ہے کہ بیٹھے رہو چراغ تلے
سبھی کو بزم میں دیکھو مگر دکھائی نہ دو

(شاخِ تنہا)

لیکن اپنی وہبی تخلیقی صلاحیت کو جلا دینے، فنی باریکیوں پر گرفت اور لفظ و معنی کی نزاکتوں پر عبور کے ضمن میں خورشید رضوی نے قناعت سے کبھی کام نہیں لیا۔ وہ زبان و بیان ہی کی نہیں خیال کی قطعی صحت کا بھی قائل ہے اور اس بارے میں کاملیت پسندی اس کے مزاج کا حصہ ہے مگر ایسا بھی نہیں کہ اس کی قطعیت اس کی تخلیقیت کو متاثر کرنے لگے۔ لفظیات، تخلیقی ترفع، تلفظ، صرف ونحو اور معانی آفرینی کے اعتبار سے وہ اس عہد کے ان معدودے چند شاعروں میں شامل ہے جن کی غزلیں اور نظمیں کلاسیکی شعراء کے ساتھ ساتھ ثانوی، اعلیٰ ثانوی اور ڈگری کی سطح کے اردو زبان وادب کے نصاب میں داخل ہونے کے قابل ہیں۔ یہ جو اس کے شعر مقبول ہونے لگے ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کے جذبات کی شدت اس کے منطقی اور تجزیاتی اندازِ نظر سے مغلوب نہیں ہوئی۔ وہ دماغ سے کام لیتا ہے مگر اس کے دل کا کام بہرحال دل ہی کرتا ہے اور اس کے شعروں میں اپنی جولانیاں دکھاتا رہتا ہے۔

جب کبھی دل کو یہ سمجھاؤں کہ تو میرا نہیں
کوئی مجھ میں چیخ اٹھتا ہے نہیں ایسا نہیں

O

وہ ترا پل بھر کا ملنا پھر بچھڑنے کے لیے
دل کی مٹھی میں ہے اس لمحے کا جگنو آج بھی

(شاخِ تنہا)

خورشید رضوی اقبال کی طرح دل پر عقل کی پاسبانی کا قائل تو ہے مگر اسے شاعری کیلئے کبھی کبھی ذرا سے ذرا سا زیادہ تنہا بھی چھوڑ دیتا ہے۔

آدمی دل کے سویدا سے عبارت ہے فقط
ایک ہی پتھر پہ قائم یہ عمارت ہے فقط

(شاخِ تنہا)

یہاں عظمت، نفاست، سربلندی کے مقابل اور باوصف جسم کی عمارت کے ایک ہی پتھر یعنی دل پر قائم ہونے پر زور دے کر انسانی جسم میں دل کی اہمیت اجاگر کرنا مقصود ہے ورنہ خورشید کا دل سوز و گداز سے بھرا ہے۔ دل اس کی شاعری کا بنیادی حوالہ معلوم ہوتا ہے۔ مجھے شبہ ہوتا ہے کہ یہ مصرعہ لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں، اسی خورشید کے بارے میں ہے۔ لگتا ہے خورشید رضوی نے میر کی یہ بات پلے باندھ رکھی ہے ۔

تک دل کے نسخے ہی کو کیا کر مطالعہ

اس درس گہ میں حرف ہمارا ہے اک کتاب

وہ اہل دل بھی ہے اور اہل نظر بھی مگر عقل کی بات بھی دل کے حوالے سے آگے بڑھانا پسند کرتا ہے۔ دل کی گواہی پر دیوار گرانا بھی جانتا ہے، مہتاب دل افروز کو بام حسیں سے زیادہ تہِ دل میں روشن دیکھنا چاہتا ہے۔ اندوہ جدائی، شوق دیدار، ساعد سیمیں کا دھیان دل ہی میں سر اٹھاتے ہیں، وہ چاند کے دل کے سویدا تک اترنے اور کسی کو وہاں بسانے کی آرزو رکھتا ہے چاہے کوئی رگ جاں کاٹتے ہوئے تہِ دل میں اترے۔

اس کی غزلوں میں دل کی کارفرمائی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس کی ان غزلوں کی ردیف ہی میں دل آتا ہے:

- کھلی ہوئی ترے غم کی کتاب دل میں ہے (شاخ تنہا)
- وہ اک لمحہ جو تھا اب عمر بھر در پیش ہے دل کو (سرابوں کے صدف)
- بن گئی پھر وہی تصویر پرانی دل پر (رائیگاں)
- چھپا ہے کون یہ تلوار کا دھنی دل میں (سرابوں کے صدف)
- ایک آہٹ کو ترستے رہے زینے دل کے (سرابوں کے صدف)
- اور اس کے بیچوں بیچ ڈولتا مکاں دل کا (سرابوں کے صدف)

اس کی کچھ نظموں کے عنوانات بھی جبین دل کے اسی خم کی طرف اشارہ کرتے ہیں جیسے دل کو جانے /چل اے دل آسماں پر چل/ دل تو اب یہ چاہتا ہے/ تہِ دل/ دل بجھتا ہے/ وغیرہ

خورشید رضوی کو دل کا حوالہ کس قدر عزیز ہے، اس کا اندازہ اس کے اس مصرعے سے بھی ہوتا ہے۔ مجھ کو پیہم دل کے گہرے سلسلوں پر سوچنا (سرابوں کے صدف)۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے چار مجموعوں کی لگ بھگ چالیس غزلوں کے مطلعوں میں دل کا لفظ یا علامت برتی گئی ہے اور ان تمام غزلوں کے سوا سے زیادہ شعروں میں خورشید رضوی نے دل کے ذریعے یا دل سے خطاب کیا ہے۔ دل بھی وہ جو ایک شاعر کا دل ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر بھر آنے والا، دوسروں کے غموں کو محسوس کرنے والا۔

دل پر اثر وہ حرف سادہ

افسون و طلسم سے زیادہ

(سرابوں کے صدف)

'شاخِ تنہا' میں مجید امجد کے نام انتساب اور اس کے اس شعر کا حوالہ بھی خورشید رضوی کی مزاج آشنائی کے لیے کارآمد ہے ۔

اپنے جی میں جی مگر اس یاد سے غافل نہ جی
جو کسی کے دل میں زندہ ہے ترے دل کیلئے

دل اور عاشقی کا تعلق گہرا ہے۔خورشید کے ہاں تنہائی کی خواہش اور دوسروں سے الگ بیٹھنے کی رسم کی پیروی عاشقی ہی سے مربوط ہے۔میر کے ہاں جذبہ عشق کی تہذیب اور عاشقی کے ادب آداب جن شعروں میں بیان ہوئے ہیں،خورشید رضوی کی شاعری پڑھ کر میر کے وہ شعر یاد آتے ہیں جیسے ۔

دور بیٹھا غبارِ میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

خورشید رضوی کہتے ہیں ۔

اے دل!
رونمائی سے تری ڈرتا ہوں میں

(امکان)

وہ عشق کو عبادت گردانتا ہے سوداگری نہیں اور اس بارے میں جزا کی تمنا کا بھی مکلف نہیں ہوتا ۔

خرد سے دور غمِ تند خو میں اچھے تھے
اسی جنوں میں اسی ہاؤ ہو میں اچھے تھے

(شاخِ تنہا)

محبت کی تشنگی اور طلب اس کے اندر ہمہ وقت موجزن رہتی ہے اور وہ اسے زندگی کی سب سے ضروری جسمانی لذت اور روحانی سرور دونوں طرح قبول کرتا ہے۔وہ عشق کو توفیق گردانتا ہے گناہ نہیں مگر جسمانی لذت سے اوپر اٹھنا بھی اسے آتا ہے ۔

جی چاہتا ہے پھر سے ملیں اور دلوں میں
کچھ اور تعلق ہو محبت کے علاوہ

O

آ کبھی لمس کو یکسر نظر انداز کریں
آنکھ سے آنکھ ملا خون میں بہنے دے مجھے

(امکان)

نظر بظاہر اوپر لکھے دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ بھی sensousness کی انتہا ہے مگر یہ انتہا وہ ہے

جہاں طبیعیات مابعد الطبیعیات کی حدوں میں داخل ہو جاتی ہے اور جسمانی تجربہ روحانی سرشاری میں بدل جاتا ہے۔
عشق اور دل کی یہ واردات میں شاخ تنہا سے اس کے چوتھے مجموعے امکان تک پھیلی ہوئی ہیں ۔

دل وہ پاگل ہے کہ ہو جائے گا غرقاب وہیں
جھیل کی تہ میں اگر عکس قمر پیدا ہو

O

خون سے لکھتا ہوں اور لفظ میں ٹھہراتا ہوں
پھر بھی عکس دل بیتاب کہاں پاتا ہوں

لیکن اتنا ہے کہ اب اسی دل میں حقیقت پسندی بھی نقب لگا لیتی ہے۔

کام پڑے رہ گئے
دل میں گڑے رہ گئے

O

لب پہ تبسم ہے کیوں
دل میں گلے کس لیے
مانگنے لگتا ہے دل
غم کے صلے کس لیے

O

اے گردش دہر اب تو خوش ہو
پابند رواج ہو گئے ہم

(امکان)

مگر اس نقب زنی کا غم بھی اپنی جگہ ہے۔

دل کا دکھ اور سوچ کے دھارے
اب تک ہیں بیکار

O

جذبے کی کوئی شکل بنانی ہی پڑے گی
سونے میں مجھے کھوٹ ملانی ہی پڑے گی

(امکان)

میر کا کہنا تھا۔

ہم کو تو روزگار نے بے بال و پر کیا

خورشید رضوی کے خوابوں کو بھی اندوہِ معاش نے زیروزبر کر رکھا ہے۔

دل میں اک خواب حسین ذہن میں اندوہِ معاش
اور دروازے پہ ایام کی پیہم دستک

(امکان)

خورشید کی زندگی بھی ۔ تصویر کی مانند گی در ہی سے گزری (میر)
اس کیفیت کی عکاس اس کی ایک پوری غزل ہے جس کا ایک مصرعہ ہے۔
مگر وہ تیری نگاہوں کی التجا کہ نہیں
یا پھر وہ غزل جس کا مطلع ہے۔

یہی ہے عشق کہ سر دو مگر دہائی نہ دو
وفورِ جذب سے ٹوٹو مگر سنائی نہ دو

(شاخِ تنہا)

دل کا ذکر اب اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے مبادا آپ یہ سمجھنے لگیں کہ خورشید رضوی محض دل اور دل کی کیفیات ہی کا اسیر ہے وہ چاہے یہ کہتا رہے کہ۔

نہیں گوہر دل کی کوئی نظیر
سمندر جنوں نے کھنگالے بہت

(امکان)

مگر وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ وادیِ جنوں کے پُر پیچ راستوں کے لیے فرزانگی بھی درکار ہوتی ہے اس لیے وہ جیسے اپنے آپ کو صلاح دیتا ہے۔

کچھ بے حسی بھی چاہیے بہرِ سکونِ دل
ہر لرزشِ صبا کے کہے پر نہ جایئے

(شاخِ تنہا)

دل سے الگ بھی خورشید نے بے شمار مضامین باندھ رکھے ہیں مگر ایک مختصر مضمون میں اس کی شاعری کے سارے مضامین سمیٹنا ممکن نہیں۔

ترے ہجر، تیرے خیال، تیرے وصال میں
کسی آئنے میں، میں سب کا سب نہیں آ سکا

(امکان)

ہمارے ناقدین خاص طور پر سہل ممتنع میں ناصر کاظمی کو میر سے بے حد متاثر خیال کرتے ہیں۔ ان کے اس

خیال ہے اس اختلاف کے ساتھ ساتھ کہ اگلا عہد اور نسلوں کا فرق خود ہی اپنے عہد کے شاعر کو پرانے شاعروں سے کچھ نہ کچھ مختلف ضرور کرتا ہے۔ مجھے خورشید رضوی کو بھی اس تاثر سے بچاتا ہے کہ وہ میر سے متاثر ہیں۔ حالانکہ میرے ذہن میں اس کا یہ شعر بھی آرہا ہے۔

زباں سے میں بھی لگایا کیا بہت پیوند
کسی طرح مرے دل کی شکستگی نہ گئی
(امکان)

مگر دیکھیے کہ اسلوب کے بچنے سے اثر سے قطع نظر یہ شعر سراسر خورشید کے اپنے مزاج کا عکاس ہے کہ وہ کسی اور کے رنج میں گریہ کناں نہیں۔ وہ فقط اپنے غموں میں اپنی آنکھیں نم کرتا ہے۔

ہوئے رنگ اور لفظ گرد سفر
رہا بس تو اک دیدۂ نم رہا
(امکان)

میرا تو یہ خیال ہے کہ خورشید رضوی کے تجربوں کے زاویے سمجھنے کی ابھی تک کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہوئی حالانکہ اس کی تخلیقی فکر کے رنگ نمایاں کر کے دیکھنے اور دکھانے کی اس عہد اور اس عمر کے کسی دوسرے شاعر سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ ناقدین نے اس کے قد و قامت کے مطابق اس کی قدر افزائی سے گریز کیا ہے۔ لیکن مجھے نظر آتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ اس کے کمال فن کے قائل ہوتے جا رہے ہیں اگرچہ اس تاخیر میں اس کا اپنا مزاج بھی ملوث ہے۔

مجھے رونق بزم سمجھا گیا
مگر بزم میں میں بہت کم رہا
(امکان)

وہ سرگودھا ہی کو ایک عرصے تک گوشۂ عافیت سمجھتا رہا اور پھر اسلام آباد کی تنہائیوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

ہم تلاش لعل بے ہمتا میں اب نکلے کہ جب
شام کے پرتو سے پتھر ارغوانی ہو گئے
(شاخ تنہا)

لاہور میں قیام اس کی دیرینہ خواہش تھی جو ایک بے درد شہر چاہے ہوتا رہے مگر بالآخر اپنے نئے باسیوں کو قبول کرنے لگتا ہے۔
اس قبولیت کے لیے ثابت قدمی اور اسی طرح کی درویشانہ بیگانگی کے ساتھ فن سے عاشقانہ لگن درکار

ہے، جو خورشید رضوی میں اپنی انتہا پر ہے۔

خورشید کے غم انمول ہیں۔ اسے پتھروں میں سے ارغوانی گوہر کھنگالنا آتا ہے، وہ اپنی بات اسلوب سے کہتا ہے اسی لیے اس کے شعر خوشبو کی طرح مٹھی سے نکل کر ارد گرد پھیلتے چلے گئے ہیں۔

جیسے عنقا کہاں ہم اے میرؔ!
شہروں میں اشتہار سا ہے کچھ

اور پھر خورشید رضوی نے میر کی طرح نہیں اس سے جدا غزل بھی نئے انداز کی کہی جس طرح میر نے دوسروں سے الگ اسلوب نکالا۔

غزل میرؔ نے بھی کہی اور ڈھنگ

خورشید کی شاعری میں اس کے آنسوؤں کی نمی دیرپا تھی اور دیرپا ہے، یہاں پھر میرؔ کا شعر کام آ رہا ہے۔

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

خورشید رضوی اردو شاعری کی ساری کلاسیکی روایت کا امین ہے۔ میر، مصحفی، غالب، اقبال اور یگانہ سے لے کر وہ مجید امجد، ن۔م۔ راشد، میرا جی اور یہاں تک کہ شکیب جلالی اور ناصر کاظمی کو اپنے حافظے کا حصہ بناتا ہے مگر ان کی تقلید سے گریز کرتا ہے۔

زہراب ہوں میں یا قند ہوں میں
یا دونوں کا پیوند ہوں میں

(امکان)

وہ اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے اپنے آپ کو سمجھاتا رہتا ہے۔

دیکھتے ہو نہ اسلوب کی بات (میر)

خورشید کی تخلیقی فکر اس کی اپنی ہے۔ وہ نت نئی کیفیتوں کو غزل کے شعروں میں ڈھالتا ہے۔ جو اس کی اپنی بھی ہیں اور معاشرے کی سماجی اور نفسیاتی کشمکش کی آئینہ دار بھی ہیں۔ اس کی تنہائی عملی نہیں ذہنی ہے۔ ارد گرد کے مسائل کی سنگینی، وحشت آفرینی اور ہیجان انگیزی اس کا اپنا مسئلہ ہے جو ہمارے عہد کی معاشرت سے ہم آہنگ ہو کر ایک اور طرح کی رومانیت ترتیب دے رہا ہے۔

شاخِ تنہا کے اس شعر۔

مصالحت بھی نہیں ہے سرشت میں اپنی
مگر کسی سے تصادم کا حوصلہ بھی نہیں

کے بعد 'امکان' تک پہنچتے پہنچتے اس نے۔

بات پہ اپنی اڑے
اور اڑے رہ گئے

اور ـ

ہر ایک نیند میں ڈوبے ہوئے شبستاں تک
بلا سے کوئی نہ جاگے مگر اذاں گئی ہے

کی طرح اڑ جانے اور اذان دینے کا حوصلہ بہم کر لیا ہے اور وہ ـ اک معمہ ہے مری ذات عجیب / مری اصل ذات کا مرکز و اسرِ جاں کو خود پہ بھی نہ کھلنے کا رنج / مگر مجھی میں مجھ سے بہت بڑا / وہ تلاطم بحر میں گہر جیسے احساسات سے گزر آیا ہے ـ

آئینے میں اک شخص ہے کم تر کوئی مجھ سا

(سرابوں کے صدف)

اسے یاد نہیں بلکہ اپنی ذات کے باطن کے اس اندھے سفر نے اس کے دل میں رائیگانی کا درد بھی سا لگا دیا ہے ـ

یہ مری متاعِ گراں ہوا میں بکھر گئی
مجھے اپنے سوزِ نہاں کا ڈھب نہیں آ سکا

(امکان)

اگرچہ اس کی ساری شاعری ہی اس کی ذات کا پرتو ہے مگر یہ غزل خاص طور پر اسے سمجھنے کے لیے پڑھنا چاہیے ـ

لینے نہیں دیتا کسی کروٹ مجھے آرام
اک شخص بنیا مرے اندر کوئی مجھ سا

(سرابوں کے صدف)

اس کے ایک مجموعے کا نام ہی رائیگاں ہے مگر اوپر درج شعر بتاتا ہے کہ وہ رائیگاں نہیں رہنا چاہتا۔ اسی لیے وہ اپنی رائیگانی کے اس احساس کو لایعنیت کی حدوں تک نہیں لے جاتا۔ اس کے باطن میں موجود توازن مایوسیوں کے اندھیروں میں بھی روشنی کی کرن کی طرح جگمگاتا رہتا ہے اور وہ فطرت کی سرمستیوں میں پناہ ڈھونڈ لیتا ہے ـ

رائگاں وسعتِ ویراں میں یہ کھلتے ہوئے پھول
ان کو دیکھوں تو یہ دیتے ہیں سہارا مجھ کو

(رائیگاں)

میری توجہ خورشید رضوی کی غزل پر مرکوز ہے اس لیے اس کی معنی آفریں نظمیں مجھ سے اوجھل رہ گئی ہیں جو خورشید کی مستقل فکری اور یکساں مزاجی ہی کی عکاس ہیں مگر دراصل علیحدہ تفصیلی مطالعے کی متقاضی ہیں مگر اس کی نظموں سے اتنا پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے رنج و غم کا مداوا فطرت کے مظاہر میں ڈھونڈتا ہے اور دنیا کی کشاکش سے دور ان کے ہمراہ زندگی بسر کرنے کو اپنی خوش قسمتی تصور کرتا ہے کہ قدرت کی ان نعمتوں کا فیض ہر کسی کے لیے عام ہے۔ اس کی غزلوں کے بہت سے اشعار آلام کا بیان اور بہت سی نظمیں ان آلائشوں اور الجھنوں کے علاج کا نسخہ ہیں (ایک مثال ۔شہر خواب) مگر وہ نسخہ نہیں جو ڈاکٹر لکھتا ہے بلکہ وہ جو ایک شاعر ہی لکھ سکتا ہے جیسے فیض نے نسخہ ہائے وفا لکھے ہیں۔ وہ انسانی معمولات کو لغو یا بے کار سمجھتے ہوئے بھی اپنی ذہنی تنہائی اور اپنے ذاتی اخلاق اور طبعی رجحانات کے حوالے سے گنجلک انسانی زندگی کو بامعنی اور ذمہ دار بنانا چاہتا ہے۔ یتیمی، ماں سے محبت، ستم ہائے روزگار اور قول و فعل کی یکسوئی سے لے کر اپنے آس پاس کو زندگی بسر کرنے کے قابل بنانے کی خواہش تک، فکشن اور شاعری کے فرق کو چھوڑ کر، کامیو اور خورشید رضوی میں بہت کچھ مشترک ہے۔ چاہے زمانہ تفریق کے قابل نہ ہو مگر دونوں حسن عمل کو حسن عمل اور کار ۔۔۔۔ گناہ سمجھتے ہیں۔ خورشید کی اپنی زندگی چاہے معاشرے کی کم نصیبی اور لاگا کات مقابلے کے سبب لایعنی ہو جائے مگر وہ اپنے شعروں سے معاشرے کی فلاح، اس کے ناقص جذبوں کی تہذیب اور رشتوں کے احترام کی روایات کو از سرِ نو زندہ کرتا ہے جیسا کہ میر کا کہنا تھا۔

پاس ناموس عشق تھا ورنہ
دل نے صدمے بڑے اٹھائے تھے

موجودہ دور میں ہی نہیں ہمیشہ ہی سے بزعم خود اپنے اپنے منفرد اسالیب کے ان موجدوں اور خاتموں کے درمیان، جن کی عزت اور شہرت کی عمر ان کے دنیاوی منصبوں تک ہے، خورشید ایک بے نیاز بنجارے کی طرح اپنے اکتارے پر نت نئی تانیں اڑاتا چلا جاتا ہے اور رستے میں ہر سننے والے کو مسحور کرتا جاتا ہے۔ اس کے حسن کردار کے ساتھ علم و فضل، معاملہ فہمی اور بین الاقوامی ہی نہیں کائناتی سطح کے تفکر سے آج کی حکومتیں استفادہ کر سکتی ہیں مگر انہیں اس کی توفیق نہیں اور خورشید کو ان کی قربت کی اپنے لیے تمنا نہیں۔ میں ہمیشہ حیران ہوتا ہوں کہ ہندوستان میں تو امرتا پریتم، حیات اللہ انصاری اور شبانہ اعظمی جیسی شخصیات ایوان بالا میں ادب اور ثقافت کی نمائندگی کرتی ہیں مگر پاکستان میں ادب اور ثقافت کے نام پر کون سے 'نابغے' ایوان بالا میں پہنچتے ہیں اور سرکاری، ادبی اور ثقافتی اداروں کی سربراہی کیسے کیسے از کار رفتہ اور صرف شہرت اور دنیاوی جاہ کے بھوکوں کے سپرد ہے۔

خورشید کا احساس رائیگانی، غالب کی طرح آخر آخر ہر لباس میں ننگ وجود ہونے کے خیال، الف و دانش کے غلط ہونے کے صدمے، عبادت کے ثواب سے عاری ہونے کے رنج کے باعث دنیا و دین کو دُردِ تہِ ساغر غفلت سمجھنے کے مرحلے تک نہیں پہنچتا بلکہ وہ غالب ہی کی طرح اپنے آپ پر قابو بھی پا لیتا ہے۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سی کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

خورشید کو در اصل اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان اور اپنے مسائل کے حل کی خدا سے امید مایوسی سے بچاتی ہے۔ وہ اس اقدار ناشناس معاشرے میں ناموس عشق کو سنبھالے، اور کجئی تیغ کے سامنے بوالہوسی بھول کر اپنا سینہ سپر کیے ہوئے ہے۔ صافی طینت کی ناموس کے خیال میں اپنے اکیلے ہونے کے احساس سے ان کی شاعری عبارت ہے۔ اسی وجہ سے اس نے دل کو عجب نسخہ تصوف سمجھ کر فقر اختیار کیا ہے۔

سوچو تو ہیں فقیر کو آزادیاں بہت
دنیا میں یہ نصیب کہاں بادشاہ کے

(امکان)

ورنہ ان کا حال تو یہ تھا کہ

جیسی شوریدہ سری مجھ میں رہی اک عمر
ویسی شوریدہ سری جوئے کہستان میں نہ تھی

(امکان)

جوئے کہستان کی اس اک عمر کی شوریدہ سری اب معاشرے میں مثبت تبدیلی کی شدید خواہش میں بدل چکی ہے۔

بول کچھ بول کہ دیوار میں در پیدا ہو

O

آ پہنچا ہے وہ وقت کہ خورشید سر بزم
جو دل میں چھپا رکھا ہے وہ راز نکالے

(امکان)

وسند کو اپنے ذہن کا ہمزاد، موت کو ہر غم کا تریاق جاننے والا اور موت کے بوڑھے معلم سے کتاب زندگی پڑھنے والا، صفحہ زیست پر الٹتے ورق کی تصویر (سرابوں کے صدف) اب تہ دل، 'انقلاب' اور 'ہوک' (امکان) جیسی نظمیں لکھنے لگا ہے۔ یہ نظمیں فیض کی انقلابی شاعری کی طرح نعرہ نہیں بلکہ باطنی اور تخلیقی رفعتوں سے متصف ہیں مگر ہمارے نمائشی درسی یا فیشنی نقادوں کو پہلے ہی سے مقبول عام شاعروں کی مبالغہ آمیز مدح سرائی کا سہارا لینے سے فرصت ملے تو انہیں ایسی سچی شاعری اور ایک سچے شاعر کی دریافت کی توفیق ہو، جو ان کی توجہ کا منتظر نہیں اور انہیں کوئی دنیاوی فائدہ پہنچانے کی قدرت بھی نہیں رکھتا۔

اوج معیارِ سخن کا ہے یہی عالم تو پھر
رفتہ رفتہ لب پہ مہرِ خامشی لگ جائے گی

(شاخِ تنہا)

لیکن شکر ہے کہ اس نے لب پر مہرِ خامشی لگانے سے گریز ہے اور ستائش، نمود اور نمائش کا قائل ہوئے بغیر اب وہ کسی ارفع مقصد کے لیے نمایاں ہونے کو برا نہیں جانتا۔

ہم نمائش کے تو قائل نہیں لیکن خورشید
خود کو پنہاں بھی زمانے سے نہ کر، پیدا ہو

مئے پنہاں کبھی پیمانے سے باہر بھی دمک
اے غمِ دل! کبھی آنکھوں میں بھی ایک آدھ جھلک

اور یہ سب کچھ اس کے باوجود نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ۔

ہے کوئی شے مرے اعماق کے اندر روشن
جس طرح حجرہ، تاریک میں سونے کی ڈلک

(امکان)

'پیدا ہو' ردیف کی ساری غزل ہی شاعر کی اس جاں فزا خواہش کی غماز ہے جو عرصے سے اس کے دل کے نہاں خانے میں کروٹیں لیتی رہی ہے اور شعروں کے پردے میں بھی اپنی جھلک کسی اور زاویے سے دکھاتی رہی ہے۔

خورشید رضوی نے ابتداء میں بیان کردہ مقبول شعر کے علاوہ بھی اتنے جاوداں شعر کہہ رکھے ہیں جو اس دور کے اور اس عمر کے دوسرے شاعروں کے ہاں کمیاب ہیں۔ طوالت کے خیال سے انھیں میں یہاں سنا نہیں رہا۔ اس کے لیے آپ کو اس کے چاروں مجموعے تفصیل سے پڑھنے ہوں گے کہ ان مجموعوں کا ہر ہر صفحہ ایسے ہی لعل ہائے بے بہا سے فروزاں ہے۔

خورشید رضوی کے علم وفضل اور شعری صلاحیتوں کا اعتراف تاخیر ہی سے سہی اب کیا جانے لگا ہے اگرچہ متاعِ ہنر پھیر کر لے جانے کی بجائے اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے ابھی وہ مزید انتظار کا صبر اور حوصلہ رکھتا ہے۔

تم بعدِ مرگ بھی اگر آؤ تو مرحبا
بازو سرِ صلیب کشادہ رکھیں گے ہم

(شاخِ تنہا)

لیکن پھر بھی میرے خیال میں اس کا یہ احساس سچا ہے کہ وہ خود ابھی تک اپنی وہبی صلاحیتوں کی وسعتوں کو عبور نہیں کر سکا ہے۔

بپا دل میں پیہم یہ ماتم رہا
مجھے اپنے امکان کا غم رہا

(امکان)

یہ بات غور کرنے کی ہے کہ امکان کا یہ غم انفرادی تو ہے ہی بنی نوع انسان کا تو نہیں ہے یا پھر اس انسان کا جس نے ایک زوال یافتہ معاشرے میں جنم لیا اور وہ معاشرہ اس سے وہ فیض حاصل نہیں کر سکا جس کا مقدور اسے حاصل تھا۔

مجھ سے محروم رہا میرا زمانہ خورشید
مجھ کو دیکھا نہ کسی نے مجھے جانا خورشید

مٹھی میں دبائے گوہر خاص، اند کیجیے۔ سمندروں کے اس غواص کو جاننے کے لیے شاخ تنہا ہمراہوں کے صدف، رائیگاں اور امکان کی غواصی کام آسکتی ہے جنہیں خورشید نے خود اپنی تاب کہا ہے۔

ڈھونڈنا ہے تو مجھے ڈھونڈ سخن میں میرے
تاب خورشید حقیقت ہے فسانہ خورشید

(امکان)

احمد فراز اور میں

عطاء الحق قاسمی

میں جب کسی نقاد کی زبانی یہ جملہ سنتا ہوں کہ احمد فراز ٹین ایجرز کا شاعر ہے تو اس کی سب سے زیادہ خوشی مجھے ہوتی ہے۔ یار لوگ تو بڑھاپے میں دوسری شادی صرف یہ جملہ سننے کے لئے کر بیٹھتے ہیں کہ "کڑیو رستہ دیو، منڈا آ ریا جے" چنانچہ احمد فراز کو پسند کرنے سے اگر ٹین ایجرز کی صف میں شامل ہوا جا سکتا ہے تو اس سے سستا نسخہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں جب آج صبح گھر سے نکلا تو رستے میں ایک ٹین ایجر سے ملاقات ہوئی، وہ احمد فراز کا بہت بڑا دیوانہ ہے۔ اس نے مجھے اپنی آٹو گراف بک دی اور کہا کہ فراز صاحب سے ملاقات ہو تو ان سے میرے لئے آٹو گراف حاصل کریں۔ یہ "ٹین ایجر" 76 سال کا ہے۔ اور یونیورسٹی سے لٹریچر کے فل پروفیسر کے طور پر ریٹائر ہوا ہے۔ بائی دی وے، اگر محبت پر صرف ٹین ایجرز کا حق ہے اور اس کے بعد یہ قابل دست اندازی پولیس جرم ہے، نیز محبت کرنے والے اگر صرف 2004ء میں ملیں گے، اس کے بعد کی دنیا اس بنیادی جذبے سے محروم ہو جائے گی تو احمد فراز کی شاعری کا مستقبل یقیناً خطرے میں ہے، انہیں ابھی سے کسی "مٹے بجھے" شاعر کی تقلید میں محبت کی بجائے نفرت کی شاعری کی پریکٹس شروع کر دینا چاہیے!

اگر آپ میری ان باتوں کو تعریفی کلمات سمجھ رہے ہیں تو یقین جانیں میں یہ کلمات اپنے سینے پر پتھر رکھ کر کہہ رہا ہوں، کیونکہ میں احمد فراز سے بہت بہتر شاعر ہوں مگر یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ مہدی حسن نے احمد فراز کی غزلیں گائیں تو مہدی حسن کی عزت میں اضافہ ہوا اور ان "مقوی" غزلوں سے اس کی صحت بھی بہتر ہو گئی جبکہ اس نے میری صرف ایک غزل گائی اور کوما میں چلا گیا۔ وہ ابھی تک بستر پر پڑا اس وقت کو کوستا ہے جب اس نے میری غزل گانے کی ہامی بھری تھی۔ خواتین و حضرات اگر آپ کئی روز تک مسلسل دیکھتے رہیں مگر شرط یہ ہے کہ زیادہ غور سے نہ دیکھیں تو ایک نہ ایک دن آپ اس نتیجے پر ضرور پہنچیں گے کہ میں شکل و صورت میں بھی احمد فراز سے کہیں بہتر ہوں مگر احمد فراز کا شعر ہے اور کافی حد تک صحیح ہے کہ

اور فراز چاہئیں کتنی محبتیں تجھے
ماؤں نے تیرے نام پر بچوں کا نام رکھ دیا

کاش ان ماؤں نے یہ فیصلہ کرنے سے قبل ادھر ادھر اور بھی نگاہ ڈالی ہوتی یا جنگ اخبار میں میری تصویر دیکھ کر کسی سے ''سیکنڈ اوپی نین'' (SECOND OPINION) ہی لے لی ہوتی تو آج انہیں یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا کہ فراز کو حاصل نہ کر سکنے کی صورت میں ان کی بقیہ ساری عمر ''فراز پتر، فراز پتر'' کہتے گذر رہی ہے۔

اب اگر احمد فراز کے عشق کا ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو مجھے بادل نخواستہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ احمد فراز کو دنیا کے ہر شہر میں پری جمال لوگ اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں، جیسا کہ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں فراز شاعری اور شکل وصورت میں مجھ سے ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتے چنانچہ میرے ہوتے ہوئے ان کے گرد اگرد مہ وشوں کا ہجوم ہوتا ہے تو اس کا باعث کوئی اور چیز ہے، میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ سید گھرانے کے اس فرد کے پاس کوئی خاندانی تعویذ ہے جس کے زیر اثر سنگدل محبوب موم ہو کر قدموں میں آن گرتے ہیں۔ جبکہ میرے دوست کالے خاں کا خیال ہے کہ فراز کالا علم جانتے ہیں واللہ اعلم بالصواب۔ میں نے انہیں ایک دفعہ از راہ ہمدردی خواجہ اسلام کی کتاب ''حسن پرستوں کا انجام'' پڑھنے کو دی تھی اور یہ پیشکش بھی کی تھی کہ اگر یہ رونگٹے کھڑے کر دینے والی کتاب پڑھ کر آپ توبہ تائب کر لیں اور حسیناؤں کو میری طرف ریفر کر دیں تو نہ صرف یہ کہ آپ روز حشر جہنم کی آگ سے بچ جائیں گے بلکہ آپ کو اس خاکسار کے خلوص پر بھی یقین آجائے گا جو آپ کو جہنم کی آگ سے بچانے کی خاطر خود اس آگ میں جلنے کے لئے تیار ہے مگر افسوس فراز نے اپنے دوست کی اس عظیم قربانی کی قدر نہیں کی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ میں جو فراز کو اپنا دوست سمجھتا تھا' غلط سمجھتا تھا، کسی شاعر نے سچ کہا ہے۔

تم تکلف کو ہی اخلاص سمجھتے ہو فراز
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

یہ ساری دل جلانے والی باتیں اپنی جگہ لیکن فراز کو ایسا کا Due تو دینا ہی چاہیے، مثلاً'' یہ کہ میں نے فراز سے بہتر کمپنی آج تک نہیں دیکھی، انہیں بات سے بات نکالنے کا فن آتا ہے اور دوران گفتگو پھلجڑیاں چھوڑنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ جملے بازی بھی فراز پر ختم ہے۔ ایک مشاعرے میں ابوالاثر حفیظ جالندھری نے اپنا کلام سنانے سے پہلے حاضرین کو مخاطب کیا اور کہا ''حضرات! ممکن ہے میری زندگی کا یہ آخری مشاعرہ ہو!'' فراز سٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے' فوراً بولے ''چھوڑیں حفیظ صاحب، آپ ہر دفعہ بس یہ بات کہہ چھوڑتے ہیں!'' اسی طرح بہت عرصہ قبل کراچی میں ترنم نام کی ایک بچی قتل ہوئی اور اس سلسلے میں پولیس نے کافی پکڑ دھکڑ کی، انہی دنوں ایک مشاعرے میں ایک صاحب خاصے برے ترنم سے اپنی غزل پڑھ رہے تھے۔ فراز نے اسٹیج سے انہیں مخاطب کیا اور کہا'' قبلہ تحت اللفظ میں پڑھیں ورنہ ترنم کیس میں پکڑے جائیں گے۔''

میں نے عہدے اور منصب کے حصول کے لئے بڑے بڑے سور ماؤں کو بکری ہوتے دیکھا ہے لیکن اس سلسلے میں اگر کسی نے کردار کا مظاہرہ کیا ہے تو وہ ابلیس کے بعد احمد فراز ہیں، ابلیس گریڈ بائیس کا فرشتہ تھا مگر

اس انا پرست نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اس نافرمانی کی پاداش میں اسے اس کے منصب سے الگ کر دیا گیا۔ احمد فراز بھی اپنی ابتدائے ملازمت سے آج تک سجدے کے خواہشمند کتنے ہی لوگوں کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے انکار کر چکا ہے اور اس کی سزا ابھی بھگت چکا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اپنے گریڈ بائیس کو بچانے کے لئے موصوف اب کسی سے پنگا نہیں لیں گے لیکن یہ کھرا اور سچا آدمی آج بھی جھوٹ سن کر خاموش نہیں رہ سکتا۔ خواتین وحضرات میں نے ابھی ''پنگا'' کا لفظ استعمال کیا تھا، میں نے ایک سردار جی سے اس کا مطلب پوچھا تھا، انہوں نے کہا کہ پنگے کا مطلب تو انہیں بھی معلوم نہیں لیکن لیتا ہر کوئی ہے، تاہم جس نوع کا پنگا احمد فراز لیتے ہیں، کم از کم شاعروں میں تو مجھے کوئی ایسا دلیر شخص نظر نہیں آتا جو اس ضمن میں فراز کی تقلید کر سکے۔ دو چار ماہ پیشتر میرے ساتھ جہاز میں دوران سفر انہوں نے ایک مرکزی وزیر کی بت ''لائی'' تھی۔ اسی طرح جہاز میں اپنے ہم نشست ایک فائیو اسٹار جنرل کے ساتھ بھی انہوں نے کچھ اس نوع کی جملے بازی کی کہ اسے پسینہ آ گیا تھا جبکہ میں کسی جنرل تو کیا، کسی جنرل مرچنٹ سے بھی پنگا لینے کی نہیں سوچ سکتا کہ وہ اس کے بعد ادھار دینا بند کر دے گا! انہیں گریڈ بائیس کی نوکری کی کتنی پرواہ ہے، اس کا اندازہ مجھے اس وقت بھی ہوا جب میں تھائی لینڈ میں پاکستان کا سفیر تھا، جب میں نے انہیں وہاں مشاعرے میں مدعو کیا، گریڈ بائیس کے افسروں کی بیرون پاکستان رخصت وزیر اعظم منظور کرتے ہیں۔ ان کی آمد میں ایک دن رہ گیا اور پرائم منسٹر ہاؤس سے چھٹی کی منظوری نہ آئی تو ان کا فون آیا کہ کیا کیا جائے؟ میں نے کہا بہر صورت آیا جائے۔ چنانچہ موصوف اپنی نوکری کی پرواہ کئے بغیر اپنے ایک دوست کی دلداری کے لئے، بغیر این او سی لیے کے جہاز میں سوار ہو گئے۔ جس دن یہ واپس پاکستان روانہ ہوئے، اس دن ۱۱، اکتوبر تھا، اگلے دن یعنی ۱۲، اکتوبر ۹۹، کو قوم کے وسیع تر مفاد میں ''انہی کے گریڈ کے ایک افسر نے وزیر اعظم کو برطرف کر کے جیل بھیج دیا چنانچہ یہ ان کی خوش قسمتی اور قوم کی بد قسمتی تھی کہ جس حکومت سے انہوں نے این او سی لینا تھا، اس کا اپنا این او سی ایکسپائر ہو گیا تھا۔

آخر میں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ یہ مضمون کم از کم پچیس صفحے کا بن رہا تھا، میں نے اچانک یہ بریک اسی لئے لگائی ہے کہ اب سنجیدہ باتیں شروع ہونے والی ہیں اور تقریب کے منتظمین نے مجھے تحریری ہدایات کی تھی کہ خبردار کوئی سنجیدہ بات نہ ہونے پائے، لہٰذا میں اپنی صرف اس خوش قسمتی کا ذکر کروں گا کہ میں نے فراز کو دیکھا ہے، ان سے ملا ہوں اور ان کے ساتھ سفر کیا ہے۔ میرے پوتے پڑپوتے اپنے بچوں کو فخر سے بتایا کریں گے کہ تمہارے سگو دادا فراز کے دوستوں میں شامل تھا، میرے نزدیک فراز صرف ایک بہت بڑا شاعر ہی نہیں، ہمارے عہد کے بہت سے بے ضمیر اور بے غیرت شاعروں کے گناہوں کا کفارہ بھی ہے، ابھی میں نے اپنے پوتوں پڑپوتوں کا ذکر کیا تھا، سو چلتے چلتے بتاتا چلوں کہ جب میری پوتی نایاب پیدا ہوئی تو ایک دوست نے مجھے دادا بننے کی مبارک یاد دی۔ میں نے کہا خیر مبارک، مگر ایک افسوس بھی تو کرو۔ بولا وہ کیا میں نے کہا یہی کہ اب میں ایک دادی کا شوہر ہوں! اور دوسری طرف یہ احمد فراز، ماؤں نے جس کے نام پر بچوں کے نام رکھ دیئے!

ضیاء الحق قاسمی

عطاء الحق قاسمی

برادر بزرگ ضیاء الحق قاسمی' جنرل ضیاء الحق کے ہم نام ہیں اور اس نام کی مماثلت کے صدقے میں میں بہت دفعہ عتاب شاہی سے بچا ہوں' بھائی جان کا نام لے لے کر میں صدر ضیاء الحق پر تنقید کرتا تھا اور پھر ٹیلی فون پر بھائی جان ضیاء الحق سے معافی مانگ لیتا تھا۔ جب کہ میرے کچھ کالم نگار بھائی اگر کبھی غلطی سے اس طرح کا کالم لکھ بیٹھتے تو براہ راست صدر ضیاء الحق سے معافی کے طلب گار ہو جاتے تھے۔

خواتین و حضرات! آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ میں ضیاء صاحب پر تو کوئی بات کر نہیں رہا اور یوں وقت کا ضیاع کر رہا ہوں تو بات دراصل یہ ہے کہ آج کل بھائیوں کے بارے میں کلمہ خیر کہنے کا رواج نہیں رہا۔ چنانچہ آپ دیکھ لیں کہ سندھ' پنجاب' سرحد' بلوچستان ایک دوسرے کے منہ کا نوالا چھیننے کے چکر میں ہیں اور پس پردہ کوئی اور ہے جو سب کچھ ہڑپ کر جانے کے چکر میں ہے۔ ہم سب نے حقیقی مرکز سے منہ موڑ لیا ہے اور اپنے اپنے قبلہ حاجات بنا لئے ہیں۔ ایک لاہوریا حج کرنے گیا تو بیمار پڑ گیا اس نے خانہ کعبہ میں بیٹھ کر اپنے والد کو خط لکھا کہ میں سخت بیمار پڑ گیا ہوں آپ داتا دربار جا کر میرے لئے دعا کریں۔ داتا صاحب تو بہر حال مقرب الٰہی ہیں۔ ہم ایڑیاں اٹھا اٹھا کر جن ان داتاؤں کی طرف دیکھتے ہیں انہیں تو ہمارا وجود ہی اچھا نہیں لگتا' مگر ہم ہیں کہ ان کے آستانے پر اپنے ماتھے رگڑتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں اقبالؒ کے بتائے ہوئے صرف اس ایک سجدے کی ضرورت ہے۔ جس کے بعد انسان ہزار سجدوں سے نجات پا جاتا ہے۔

برادر بزرگ کے حوالے سے گفتگو کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے کہ موصوف ضد کے بہت پکے ہیں ان کے دل کی تین شریانیں بند ہو چکی ہیں' بلڈ پریشر دو سو سے نیچے نہیں آتا لیکن جب کبھی میرے پاس لاہور آتے ہیں ان کی پہلی فرمائش یہ ہوتی ہے کہ سری پائے کھلاؤ' اگر ان کی یہ ضد پوری نہ کی جائے تو پایوں کی تلاش میں خودکشی چوک چلے جائیں گے۔ انہیں دل کا حملہ اسی سلسلہ میں ہوا تھا۔ اہل قلم کانفرنس میں شرکت کے لئے اسلام آباد جانے سے پہلے لاہور میری طرف رکے' اسی روز میری طرف آنے سے پہلے ریلوے سٹیشن پر اترتے ہی انہوں

نے پایوں کا چسکہ پورا کر لیا تھا۔ مگر پہنچتے ہی ہارٹ اٹیک ہوا۔ میں انہیں اتفاق اسپتال لے گیا وہاں مسلسل نگہداشت کے وارڈ میں زیر علاج تھے کہ تیسرے دن موصوف نے عملے کی نظر بچا کر ناک پر سے آکسیجن ماسک اتارا اور لفٹ خراب ہونے کی وجہ سے دو منزلیں سیڑھیوں کے ذریعے اتر کر نیچے گئے وہاں سے دو سو گز پیدل چل کر سگریٹ کی دکان تک پہنچے' دو سگریٹ خریدے جو وہیں کھڑے کھڑے پھونک ڈالے اور پھر یہ سارا راستہ دوبارہ طے کر کے اپنے کمرے میں پہنچے اور ماسک منہ پر چڑھا کر بستر پر لیٹ گئے لیکن یہ سب کچھ کرنے کے بعد ڈر گئے چنانچہ ڈاکٹر کو بغیر کچھ بتائے معائنے کے لئے بلوایا ڈاکٹر نے ٹونٹیاں وغیرہ لگا کر اچھی طرح معائنہ کیا اور پھر ایک لمبا سانس لے کر کہا" قاسمی صاحب! جتنے آپ آج ٹھیک ہیں اس سے پہلے کبھی نہیں تھے۔ بس پرہیز اسی طرح جاری رکھیں۔ چنانچہ اس دن کے بعد سے جب طبیعت ذرا زیادہ خراب ہو جاتی ہے گولڈ لیف کے تین پیکٹ پیتے ہیں ماشاءاللہ عام دنوں میں بھی ڈٹ کر کھاتے ہیں۔ چھ چھ منزلیں سیڑھیوں کے ذریعے طے کرتے ہیں اور اگر مشاعرہ ہو تو بارہ منزلیں بھی دوڑ کر طے کر جاتے ہیں۔ خدا کی قدرت کاملہ پر جتنا یقین بھائی جان کو ہے اور بھائی جان کو دیکھ کر جتنا یقین مجھ میں پیدا ہوا ہے اتنا کسی اور میں ذرا کم کم ہی ہو گا۔ برادرم کی ایک خوبی جو ہر ایک کو حیران کر دیتی ہے' وہ ان کی جنون کی حد تک اپنے کام سے وابستگی ہے۔ وہ کچھ عرصے سے شاعری کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے اٹھارہ گھنٹے شعر کہتے ہیں باقی چھ گھنٹے مشاعروں میں بسر کرتے ہیں۔ واشنگٹن میں مجھے ایک پاکستانی ملا جو دن اور رات چوبیس گھنٹوں میں مسلسل کام کرتا تھا' اس کی چھ چھ گھنٹے ڈیوٹی پر مشتمل چار ملازمتیں تھیں جن میں سے ایک پاکستانی سفارت خانے میں بھی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم راؤنڈ دی کلاک کام کرتے ہو آخر سوتے کس وقت ہو؟ اس نے سگریٹ کا ایک کش لگایا اور کہا" جب پاکستانی سفارت خانے میں ڈیوٹی پر ہوتا ہوں" یہی سوال مجھے کسی دن بھائی جان سے بھی پوچھنا ہے کہ آپ سوتے کس وقت ہیں! غالباً اس وقت جب دوسرے شعراء کلام سنا رہے ہوتے ہیں۔

بھائی جان کے بارے میں آپ کو بتانے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ وہ بہت جذباتی واقع ہوئے ہیں جب کسی پر مہربان ہوتے ہیں تو اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں اور جب خلاف ہوتے ہیں تو پھر اس کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتے لیکن جس طرح چاند ایک مہینے میں اپنے کمال اور زوال کے دن پورے کر لیتا ہے اسی طرح بھائی جان کے ممدوح اور ہدف بھی ایک مہینے کے اندر اندر بھائی جان کی محبت اور ناراضگی کے مزے پوری طرح چکھ لیتے ہیں۔ لیکن میں لاہور بیٹھے بیٹھے ایک بات کی گواہی دے سکتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ ان کی محبت دائمی اور ناراضگی عارضی ہوتی ہے اس کا اندازہ مجھے ان سے فون پر گفتگو کے دوران ہوتا ہے۔ جب وہ سب ناراضگیاں بھول بھال کر اپنے کسی ہدف کے بارے میں کہتے ہیں' "نہیں یار مجھے غلط فہمی ہوئی تھی' وہ تو بڑا شاندار آدمی ہے" کسی زمانے میں محب مکرم مشفق خواجہ سے الجھ پڑے تھے مگر آج ان کا دل خواجہ صاحب کی طرف سے آئینے کی طرح صاف ہے۔ سچی محبت اور سچی نفرت میں انسان ضیاء الحق قاسمی ہوتا ہے اور جھوٹی محبت

اور جھوٹی نفرت میں انور سدید بن جاتا ہے اور بہادر شاہ ظفر نے کہا ہے ''ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے...... آگے کیا پڑھنا ہے پورا شعر تو آپ کو آتا ہی ہوگا۔

برادر بزرگ سے خواتین و حضرات! مجھے ایک گلہ بھی ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے میری مارکیٹ بہت خراب کی ہے۔ دوستوں میں بیٹھ کر ہنسنے بولنے کا میں بھی شوقین ہوں' محفل آرائی کی عادت مجھ میں بھی ہے لیکن میرا جو دوست ایک دفعہ بھائی صاحب سے مل لیتا ہے وہ ملاقات پر پہلا فقرہ یہ کہتا ہے کہ ''یار تم کچھ بھی نہیں ہو تمہارے بھائی تو بہت مجلسی آدمی ہیں'' اور اب آپ کو دل کی بات بتاؤں میں یہ ریمارکس سن کر اندر سے کھلکھلا اٹھتا ہوں خدا کرے ان کی یہ شادابیاں سدا قائم و دائم رہیں۔

باقی رہا معاملہ برادر بزرگ کی ادبی فتوحات کا تو ان کامیابیوں نے تو کل عالم کو حیران کیا ہوا ہے' صرف پانچ سات برس پہلے کی بات ہے کہ ایک روز برادرم سو کر اٹھے تو فر فر شعر کہہ رہے تھے۔ نک سک سے پوری طرح درست' زبان و بیان کی خوبیوں سے مکمل طور پر آراستہ پھر میں نے دیکھا کہ انہوں نے مشاعروں میں جانا شروع کر دیا ہے' پھر ایک دن پتہ چلا کہ انہوں نے کمپیئرنگ شروع کر دی ہے اور پھر یہ خبر ملی کہ اس میدان میں بھی انہوں نے بڑوں بڑوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ایک دن اطلاع ملی کہ وہ اخبار میں کالم لکھنا شروع ہو گئے ہیں اور پھر ''ضیا پاشیاں'' کے نام سے ان کے کالموں کا مجموعہ بھی شائع ہو گیا۔ پھر ایک دن انہوں نے بتایا کہ وہ معروف شخصیات کے منظوم خاکے لکھنے لگے ہیں اور چند مہینوں بعد خبر ملی کہ خاکے نہ صرف یہ کہ مکمل ہو گئے ہیں بلکہ ''چھیڑ خانیاں'' کے نام سے کتابی صورت میں بھی آ گئے ہیں۔ چارلی نامی ایک شخص نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ مائیکل جیکسن نے اسے خط لکھا ہے کہ چھٹیاں اس کے پاس آ کر گزارو۔ دوستوں نے اسے گپ سمجھا مگر چند دنوں بعد انہوں نے دیکھا کہ مائیکل جیکسن راستے میں چارلی کو اچانک ملا تو گلے شکوے کرنے لگا کہ تم نے میرے خط کا جواب ہی نہیں دیا۔ دوست یہ دیکھ کر بہت متاثر ہوئے پھر ایک دن چارلی نے انہیں بتایا کہ میڈونا نے اسے اپنی سالگرہ کا کارڈ بھیجا ہے' دوستوں نے اس پر بھی یقین نہیں کیا مگر کچھ دنوں بعد جب چارلی اپنے دوستوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا' میڈونا وہاں پہنچ گئی اور گلے شکوے شروع کر دیئے کہ تم سالگرہ پر نہیں آئے' ایک روز چارلی نے دوستوں کو بتایا کہ ویٹیکن سٹی میں پوپ کی رسم تاجپوشی منعقد ہو رہی ہے اور پوپ نے بہت اصرار سے اسے بلایا ہے' دوستوں نے کہا کہ فلمی دنیا کے حوالے سے تو ہم نے مان لیا کہ تم بہت مقبول شخصیت ہو لیکن اب تم پوپ سے بھی اپنے تعلقات گانٹھ رہے ہو' کچھ خدا کا خوف کرو۔ چارلی نے کہا مجھے پہلے ہی علم تھا کہ تم اسے گپ سمجھو گے چنانچہ میں نے پوپ سے تمہارے لئے بھی دعوت نامے منگوائے ہیں لہٰذا تم بھی میرے ساتھ ویٹیکن سٹی چلو۔ ویٹیکن سٹی میں پوپ کے دیدار کے لئے لاکھوں عقیدت مند جمع تھے۔ دوستوں نے دیکھا کہ تھوڑی دیر بعد چارلی غائب ہو گیا اور پھر جھروکے پر نظر پڑی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ پوپ چارلی کی بغل میں ہاتھ دیئے جھروکے میں نمودار ہو رہا ہے۔ اس بلیک جوک کی پنچ لائن یہ ہے کہ ایک نن جھروکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوسری

نن سے کہہ رہی ہے کہ سامنے جھروکے میں نیلے سوٹ والا تو چارلی ہے مگر اس کے ساتھ کون ہے؟ اپنے بھائی جان ضیاء الحق قاسمی کی کامیابیاں بھی کچھ اسی نوعیت کی ہیں۔ یہ دیکھتے ہی دیکھتے طنز و مزاح کی دنیا میں جس طرح چھا گئے ہیں ان کے پیش نظر میرا بھی جی کچھ اسی قسم کے سوال کرنے کو چاہتا ہے کہ طنز و مزاح کی سکرین پر یہ وجیہہ و جمیل شخص تو ضیاء الحق قاسمی ہے مگر ان کے مقابل دوسرا کون ہے؟ تاہم یہ سوال میں ازراہ تفنن بھی نہیں کروں گا کہ بھائی صاحب کو آگے بڑھانے میں ان کے سینئر ساتھیوں نے جو کردار ادا کیا ہے اس کی مثالیں آج کے دور میں ذرا کم کم ملتی ہیں۔

میرا جی تو چاہتا ہے کہ میں ''ضیاء پاشیاں'' اور ''چھیڑ خانیاں'' کے بارے میں اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کروں مگر جناب والا میرا یہ پرابلم ہے کہ میں نقاد نہیں ہوں' شریف آدمی ہوں البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ منظوم خاکہ نگار ضیاء الحق قاسمی نے مجھے حیران کیا اور کالم نگار ضیاء الحق قاسمی نے مجھے پریشان کیا' پریشان اس لئے کہ میں بھی کالم نگاری کا ٹھیلا لگاتا ہوں اور انہوں نے میرے سامنے اپنا ٹھیلا لگالیا ہے۔ ویسے مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ اتنے کم عرصے میں اتنے خوبصورت کالم لکھنا شروع کردیں گے۔ میں نے جب ''ضیاء پاشیوں'' کا مطالعہ شروع کیا تو ایسے تیکھے جملے پڑھنے کو ملے جو کسی بھی کالم کی جان ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کالم نگار ضیاء الحق قاسمی کو کشاکش روزگار سے فرصت ملے تو وہ میدان پر میدان مارتے چلیں۔ اس کے باوجود انہوں نے اس فیلڈ میں جو کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ بہت کم لوگوں کا مقدر بنتی ہیں۔

اور جہاں تک ''چھیڑ خانیاں'' کا تعلق ہے میرے نزدیک ضیاء صاحب کا یہ کارنامہ تاریخ ادب میں ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گا کہ اردو ادب میں اس نوع کی یہ پہلی کتاب ہے۔ ضیاء صاحب نے ۸۹ شخصیات کے یہ منظوم خاکے اس ایک ماہ میں مکمل کئے جب درد دل حد سے سوا تھا اور ڈاکٹر نے انہیں مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا چنانچہ جب یہ کتاب مکمل ہوئی تو ان کے دل کو قرار آ گیا۔ فولادی عزم رکھنے والا یہ شخص بیماری کو ہر دفعہ اسی طرح شکست دیتا ہے۔

اور آخر میں ایک اہم بات اور وہ یہ کہ برادر بزرگ نے طنز و مزاح کو اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے وائرس کی طرح پورے ملک میں پھیلا دیا ہے۔ اب مزاح نگار شاعروں کی ایک پوری کھیپ تیار ہوگئی ہے۔ جو اندرون ملک اور بیرون ملک غم زدہ چہروں پر مسکراہٹیں بکھیر رہی ہیں اور برادر بزرگ نے اس صنف ادب کو ایک تحریک کی شکل دی ہے اور ماہنامہ ''ظرافت'' اور ماہنامہ ''خاکے اور کارٹون'' کو اس تحریک کا ترجمان بنایا ہے۔ ان کا ایک کمال یہ ہے کہ وہ خواتین کو بھی طنز و مزاح کی طرف راغب کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ حالانکہ خواتین کو لطیفہ سنا کر اس لطیفے کا مطلب سمجھانا اور پھر پچھتانا پڑتا ہے ویسے طنز و مزاح کی اس تحریک میں میں نے کچھ ایسی خواتین بھی دیکھی ہیں جنہیں دیکھ کر اس تحریک میں شامل ہونے کو جی مچلنے لگتا ہے۔ اداکارہ بندیا نے ایک دفعہ اپنے ایک اخباری بیان میں کہا کہ وہ مظلوم ہیں اور وزیر اعظم سے درخواست کی کہ وہ ان کے سر پر ہاتھ

رکھیں۔ میں نے کالم میں وزیراعظم سے بندیا کی سفارش کی اور لکھا کہ وہ جب کبھی تشریف لائیں بندیا کے سر پر ہاتھ ضرور رکھیں۔ اور اگر ان کی مصروفیات انہیں اس کی اجازت نہ دیں تو وہ شہباز شریف کی ڈیوٹی لگائیں کہ وہ جا کر بندیا کے سر پر ہاتھ رکھیں اور اگر شہباز شریف بھی مصروف ہوں تو اس نیک کام کے لئے شیخ رشید سے کہا جائے وہ خوشی سے یہ خدمت بجالائیں گے اور بالفرض اگر شیخ رشید بھی اس کام کے لئے وقت نہ نکال سکیں تو مجھے حکم دیا جائے میں کسی دن جا کر بندیا کے سر پر ہاتھ رکھ آؤں گا۔ میں طنز و مزاح کی تحریک کے ضمن میں اپنا دست تعاون برادر بزرگ ضیاء الحق قاسمی کی طرف بڑھاتا ہوں اور یہ پیش کش کرتا ہوں کہ اس طرح کے مواقع پر اگر کبھی وہ مصروف ہوں تو مجھے حکم دیا کریں کسی مناسب سے سر پر میں بھی ہاتھ رکھ دیا کروں گا' آخر چھوٹے بھائی کس لئے ہوتے ہیں؟

ٹ

نظمیں

۱۸ مئی ۲۰۰۱ء

O

ڈاکٹر وزیر آغا

آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا
میں پروا کا اک جھونکا تھا
پیپل کے نٹ کھٹ پتوں کو چھیڑ رہا تھا
تالی کی آواز سے ڈر کر
شاخوں سے اڑتی چڑیوں پر
بن سوچے ہنستا جاتا تھا!
پھر دیکھا تو جھونکا ایک بگولا بن کر
زہریلی خوشیوں کے چکر کاٹ رہا تھا!
دیکھتے دیکھتے
تیز بگولے کا رخ جیسے اندر کی جانب کو مڑا تھا
اور بگولا اک سرکش گرداب کی صورت
اپنی واحد آنکھ کے اندر اتر گیا تھا!
آج مگر میں
اندر کی تہہ دار مسافت طے کر کے
بالآخر اپنی آنکھ سے باہر ٹپک پڑا ہوں
باہر کے بے انت جہاں کے گرد
بڑی تیزی سے جیسے گھوم گیا ہوں
یوں لگتا ہے
کسی عظیم طواف کا دھارا بن کر
مجھ آنسو نے اس برہمانڈ[1] کو گھیر لیا ہے!!

[1] The Cosmic egg

(یہ نظم ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی اناسیویں سالگرہ کے موقع پر کہی)

☆☆

نگہبان

○

ضیاء جالندھری

عنکبوت کو خبر نہ تھی
کہ جس دہانِ غار پر
وہ اپنے ریشمی مہین تار سے
لطیف چادرِ حجاب تاننے میں محو ہے
وہ کردگار کے پیام کا امین ہے
مجھے یقین ہے
کہ وہ بچانے والا ہاتھ
آج بھی اسی طرح نگاہ دارِ دین ہے
حیات دشت کارزار ہے
کہاں کہاں نہ وقت نے ہمیں
طرح طرح کی آزمائشوں میں مبتلا کیا
ہمیں تمام تلخیاں، تمام رنج یاد ہیں
مگر کسے خبر کہ دستِ بے نشاں نے
ہم کو کون کون سے عذاب سے بچا لیا
سو آج پھر انہی کے نام پر اٹھو
کہ جن کی ذات کے طفیل
تارِ عنکبوت معجزے کی طرح محترم ہوا
اٹھو کہ نصرت و ظفر
کڑے دنوں کی ابتلا میں کوششوں کا نام ہے
تمہیں خبر نہ ہو مگر
تمہارے ساتھ دستِ غیب رحمت تمام ہے

آخر کب تک

○

سید مشکور حسین یادؔ

کب تک ہم تلوار کی دھار پہ چلتے رہیں گے
کب تک ہم اپنا یہ خون ناحق
اپنے منہ پر ملتے رہیں گے
کب تک ہم اس بے ہودہ محتاط فضا میں
اپنی سانسیں روکے اپنے سینے پھلائے
بزعم خویش سنبھلتے رہیں گے
کوئی بتائے
آخر کب تک ہم
''صبر کرو اور حوصلہ رکھو'' جیسی
بے رحم و سفاک نصیحت پہ
محوِ عمل رہیں گے
کوئی تو ہم کو آگے بڑھ کر للکارے
ہم جس کی للکار پہ
براہِ راست بلا تامل
ظلم و ستم پر ٹوٹ پڑیں
درد و الم کا خاتمہ کر دیں

٭

خنزیر سفید

O

سید مشکور حسین یادؔ

امن عالم کے گلے میں ڈالے تحریر سفید
قتل و غارت پر اتر آیا ہے خنزیر سفید

پیپ سے گندے خیالوں سے بھرا ہے اس کا مغز
ناک سے اس کی نہ کیسے پھوٹے نکسیر سفید

جب بھی دیکھا خوں میں آلودہ ہی دیکھا اسے
تھوتھنی اس کی نہ دیکھی مثل شمشیر سفید

کالی سوچوں سے اٹھا کرتی ہیں کالی آندھیاں
کالے کالے خواب کب دیتے ہیں تعبیر سفید

اس کا بھی تاریخ ہی اب تو کرے گی فیصلہ
وہ شکاری ہے کہ کالوں کا ہے نخچیر سفید

جھوٹ سے مکر و ریا سے بے طرح لبریز ہے
میڈیا اس کا نہ ہو کس طرح تشہیر سفید

کیسے دیکھے وہ کسی منظر کو اصلی روپ میں
اس کی آنکھوں میں پڑا ہے زر کا شہتیر سفید

جھوٹ اندھا ہے سفید اندھا تبھی تو دوستو
اندھے پن کی اس کے ہاتھ آئی ہے جاگیر سفید

مو قلم میں اس کے زر سے آیا ہے سارا یہ زور
وہ سیاہی سے بنا لیتا ہے تصویر سفید

اس نے اپنے دوغلے پن کی لگا دی اس پر چھاپ
یادؔ ورنہ آتے ہیں سب لے کے تقدیر سفید

☆

ایک نظم کیا کر سکتی ہے

O

اصغر ندیم سید

اتنے بہت سے انسان
اور ان کے اتنے بہت سے خواب
کیسے ایک نظم میں سما سکتے ہیں
بہت سی بھوک اور بہت سی خوراک جو ضائع ہو جاتی ہے
کیسے ایک نظم میں آ سکتے ہیں
بہت سے نظریے اور بہت سے افکار
کیسے ایک نظم میں آ سکتے ہیں
اتنے بہت سے جھوٹ اور اتنے بہت سے سچ
کیسے ایک نظم سنبھال سکتی ہے
اتنے بہت سے خوف اور اتنی بہت سی خوشی
ایک ساتھ کیسے میری نظم میں آ سکتے ہیں
اتنی بہت سی قرار دادیں اور اتنی بہت سی خفیہ دستاویزات
کیسے ایک نظم میں چھپ سکتی ہیں
اتنے بہت سے جھگڑے اور اتنی بہت سی محبتیں
ایک نظم میں نہیں آ سکتیں
کہ نظم تو پرندے کی اڑان جیسی ہوتی ہے
کہ نظم تو ایک قیدی کی تنہائی جیسی ہوتی ہے
لیکن کبھی کبھی ایک نظم اتنی طاقتور
ہو جاتی ہے
کہ ایک ظالم بادشاہ کے سامنے ڈٹ جاتی ہے
خود نہیں مرتی
اسے مار دیتی ہے

میں قصہ گو زمانوں کا

O

یونس متین

ہاں
سرائے میں بہت رونق تھی اس دن
قافلے اک ایک کر کے آ رہے تھے
شام ڈھلتی جا رہی تھی
مختلف اقوام کے تاجر تھکے ماندے پڑاؤ کر رہے تھے
رنگ عماموں کے 'دستاروں کی دہشت بڑھ رہی تھی
ہاں سرائے میں بہت رونق تھی اس دن
دور تک اونٹوں کا اور گھوڑوں کا ایک انبوہ تھا
زادِ سفر بکھرے پڑے تھے
لوگ محو کار ہنگامہ بپا تھا
گرد اڑاتی جا رہی تھی
شام ڈھلتی جا رہی تھی
ہاں سرائے میں بہت رونق تھی اس دن
اور پھر وقتِ غروب ایک قافلہ اترا
سرائے جگمگا اٹھی
کسی کی پالکی بالکل مرے پہلو میں آ کر رک گئی تھی
ایک خوشبو
میں جسے بغداد کی گلیوں میں کھو آیا تھا
پھر سے آ رہی تھی
اک دیا دیوار کے اندر کہیں جلنے لگا تھا
مشعلیں ہر سمت روشن ہو چکی تھیں
شب نقاب رُخ الٹ کر صحن کی تاریکیوں میں کھو چکی تھی
لوگ سارے قصہ گو کے منتظر تھے
قصہ گو آیا....
جہاندیدہ وحیانی انگلیوں سے منتشر دستار کی تہذیب کرتا

قصہ گو آیا......
سبھی لوگوں کی نظریں قصہ گو کی سمت اٹھیں
اور سر فرش زمیں پھیلی کھجوروں کی چٹائی میں تجسس جاگ اٹھا
تو قصہ گو کہنے لگا
لوگو......
یہاں سے دور مشرق کی طرف اک ملک تھا
اس ملک کے سب لوگ بہرے اور گونگے تھے
مگر حیرت کہ وہ سب دیکھ سکتے تھے
کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتے تھے
ظلم ہوتا
ظلم کی ترویج کرتے ہاتھ
ہاتھوں میں گریبانوں کے بکھرے تار
ظالم کی یہاں تکریم ہوتی تھی
کٹے ہاتھوں کے قاضی
جبہ و دستار کی خاطر سر ممبر ترازو کو اُلٹ دیتے
ہر اک معبد کی دیواروں پہ انسانی لہو کے نقش روشن تھے
وہ اکثر بات اپنی راگ درباری میں کرتے تھے
عجب اس ملک کی رسمیں تھیں
مر جائیں تو جسموں کو نہیں' روحوں کو دفناتے
وہ گونگے لوگ تھے
میں قصہ گو تھا
ہاں میں قصہ گو زمانوں کا
مرے ہونٹوں سے جھڑتے لفظ قرنوں کے نمائندہ
میں سنگ حرم سے بادیدہ تصویریں بناتا ہوں
میں زنجیریں ہلاتا ہوں
سنو لوگو......
جہاں' جس ملک میں بھی ظلم کا آتش فشاں پھٹتا ہے
میرے اشک بہتے ہیں'
پھر اک دن یوں ہوا

میں گوش و لب سے ماورا لوگوں کی خاطر
نطق کا مژدہ سماعت کی خبر لایا
مگر اُس روز سارے شہر کے جتنے بھی دروازے تھے
مجھ پر بند تھے
بارِ امانت الاماں
در حیرتم بارِ امانت الاماں
پھر وقت نے دیکھا
کہ نیلا آسمان اس شہر کے
اس شہر کے کھنڈرات کے قصے
زمانے کو سنانے کے لئے بے چین رہتا ہے
سرائے کے معزز میہمانو!
ظلم کی کھیتی میں اُگنے والے پھولوں میں کبھی خوشبو نہیں ہوتی
فقط اک آگ ہوتی ہے
فقط اک آگ!
اور اس آگ کا مذہب جلانا ہے

سرائے سو چکی ہے
مشعلیں سب بجھ چکی ہیں
صحن میں پھیلی کھجوروں کی چٹائی پر ہزاروں سائے
محوِ استراحت
آنے والے کل کے سپنے دیکھتے ہیں
آنے والا کل
کہ جب میں سو رہا ہوں گا
تمہارا قافلہ بھی جا چکا ہوگا
تمہاری پالکی میری سرائے سے بہت ہی دور
مشرق کی طرف اک ملک کی جانب روانہ ہو چکی ہوگی ——''

☆

ضمیر کو لوری

O

جاوید انور

گھروں کے آس پاس بھی' گھروں میں بھی

نہ سائے ہیں' نہ دھوپ ہے' نہ سوگ ہے' نہ گالیاں

بس ایک بے حسی ہے' جس کی شہر کے آخری مکین تک رسائی ہے

وبائی ہے کہ لوگ اپنے سورجوں کو

بے کفن سپردِ خاک کر رہے ہیں' اور رو نہیں رہے

تھیٹروں میں شور ہے نہ خامشی

نہ ہیر ہے نہ جوئے شیر ہے نہ شعرِ میر ہے

مگر نوائے وقت ہو کہ جنگ ہو' نیوز ہو کہ ڈان ہو

پیالہ ہائے شاعرِ خودی سجے ہیں دور تک

شراب ہے نشہ نہیں

پتہ نہیں یہ رات ہے کہ دن ہے

لوگ جاگتے نہیں پہ سو نہیں رہے

امام اپنی امتوں کے داغ دھو نہیں رہے

قیامتیں ہیں اور آپ ہیں خداؤں کے نواح میں

خودی بنے ہوئے ہیں' اپنے خلیہ ہائے خون کو

چراغ کر رہے ہیں اور چراغ کا دفاع کر رہے ہیں آپ

اک پھٹی قمیض سے

حضور دیکھیے کہ جنگ درمیانِ دامن و چراغ بھی' ہوا بھی ہے

سپاہِ کج کلاہ کی زرہ کو زنگ لگ چکا ہے

کمان کو انگیٹھیاں نگل چکی ہیں' آپ بھی لحاف میں پڑے رہو

خواب میں اذان دو

ضمیر خان

اس نگر میں جاگنا فضول ہے

☆

ہوا اشارے کی منتظر ہے

O

اشرف جاوید

یہ کون ہے؟
جو نواحِ قریۂ دار میں
اک درِ مقفل پہ دستکیں جگمگا رہا ہے
اترتے لمحوں کی رہگزر میں
دیا' ستارا' چراغ' جگنو لئے کھڑا ہے
سروں کو نغمہ بنا رہا ہے
نہ جانے کس کو بلا رہا ہے
یہ کون ہے؟
جو فصیلِ بے مہر کے کلس پر
قلم کا پرچم سجا رہا ہے
سخن کی تانیں اڑا رہا ہے
یہ کون ہے؟
جس نے غم کی چادر لپیٹ لی ہے
یہ کون ہے؟
جس نے اشک خوشبو بنا لیے ہیں
یہ کون ہے؟
جو بہار کے انتظار میں ہے
حصارِ لمس خمار میں ہے
اسے بتاؤ!
غبارِ شب میں
بہار کا رتھ نہیں اترتا
فصیلِ بے مہر کے کلس پر
سخن کا پرچم نہیں ٹھہرتا

اسے بتاؤ!
ابھی تو مرگِ گلِ سحر کا یہ زخم تازہ ہے
نوحہ نغمے میں ڈھل بھی جائے
تو ماتم و گریہ کی فضائیں نہیں بدلتیں
اسے بتاؤ!
چراغِ حرفِ ہنر بھی مفہوم کی ضیا سے تہی پڑا ہے
تمام پیغام جس کے دستِ آہنی میں بھنچے ہوئے ہیں
ہوا، اشارے کی منتظر ہے
مگر ہمارے تو ہاتھ شانوں سے کٹ چکے ہیں
دیا، ستارا، چراغ، جگنو
بہار کا انتظار، خوشبو
یہ سب کے سب راکھ ہو چکے ہیں
کنارِ دریا علم پڑے ہیں
اسے بتاؤ!
یہ راکھ اٹھائے
علم بنائے
دیا جلائے......!
دیا جلائے
سحر ستارے کی منتظر ہے
ہوا، اشارے کی منتظر ہے

ورثہ

O

اشرف جاوید

الٰہی! کیسی بستی ہے؟

جہاں ہم ہیں

وہاں سورج نکلتا ہے

مگر سورج سے پہلے لوگ اپنی خوابگاہوں سے

گئے دن کی تھکن اوڑھے نکلتے ہیں

ابھی کل کی سحر آنکھوں میں ہوتی ہے

اذانوں کے جلو میں قافلہ سالار چلتے ہیں

نہ سمتوں کا تعین ہے

نہ رستوں پر تیقن ہے

خود اپنی آہٹیں تاروں پر خوف پر مضراب بجتی ہیں

کہیں باب سماعت

نغمۂ آشوب کی دستک پہ کھلتا ہے

لرزتے ہاتھ جلتے خواب بجھتے ہیں

لب اظہار پر وہ لفظ کھلتے ہیں

جنہیں معنی سے کچھ مطلب نہیں ہوتا
سبھی آنکھوں کے جھرنوں سے نکلتا پانی کھاری ہے
زباں پر جھوٹ کے سب ذائقوں کے رنگ پکے ہیں
ہتھیلی پر رچی مہندی میں سورج ڈوب جاتا ہے
یہ کیسا زہر لمحہ سینہ سینہ رقص کرتا ہے
مری بستی کا' ہر بچہ
ہر اک بوڑھا محبت بھول بیٹھا ہے
لہو تحریر بنتا ہے
ادھورے غم مزاج خاک سے نا آشنا موسم
ہم آلودہ ہوا' آلودہ تر رشتے' سسکتے خواب' کھاری پانی'
بنجر پن' یہ سب کیا ہے؟
نئی نسلوں کا ورثہ ہے کہ ہم خوئے محبت بھول بیٹھے ہیں

☆

ہمارے عہد کا گوتم

O

مسعود احمد

گلوبل دائرے میں
سب ٹکے سب مجبور لوگوں کو
سسکتی فاختاؤں کو
بھٹکتی آتماؤں کو

زمیں زیرِ زمیں پھیلے ہوئے حشرات کو
کیڑوں مکوڑوں کو
خزاں کی گود میں بکھرے ہوئے ان زرد پتوں کو

چرندوں کو پرندوں کو
مکینوں کو مکانوں کو

پہاڑوں کی چٹانوں کو
زمینوں آسمانوں کو

سمندر در سمندر کشتیوں کو بادبانوں کو

ہمارے عہد کے گوتم نے یہ پیغام بھیجا ہے

کہ وہ اک سپر پاور ہے
زمیں سے چاند تک پھیلی ہوئی اُس کی حکومت ہے

ہواؤں پر فضاؤں پر
بہت آگے خلاؤں پر
اُسی کی حکمرانی ہے

بساطِ ارض پر سارے کے سارے اُس کے مہرے ہیں
جہاں چاہے جدھر چاہے وہ ان کو کھیل سکتا ہے
اگر جاں کی اماں مطلوب ہے تو جاننا ہوگا
بلا چون و چرا ویسے کا ویسا ماننا ہوگا
جو اس کے منہ سے نکلے گا

ہمارے عہد کا گوتم وہی فرمان دیتا ہے
جو اُس کے حق میں بہتر ہو
جو اُس کے حق میں بہتر ہے
مقدر ہے وہی مجبور اور مقہور لوگوں کا
نحیف و ناتواں لوگو!
کسی نے دم نکالا تو دوبارہ دم نہیں لے گا
ہمارے عہد کے گوتم سے تو تاتار اور منگول بھی چہرہ چھپاتے ہیں
کسی میں کب یہ ہمت تھی
وہ بستی بستیوں کو اس طرح تاراج کر دیتا
زمانے سے اٹھا دیتا
وہ زندہ سانس لیتے شہر ہستی سے مٹا دیتا
پھر ان زیتون کے پیڑوں کو شعلوں سے ہوا دیتا
ہمارے عہد کا گوتم
جو تنہا سپر پاور ہے
پھر اس کے پاس اب یہ ڈھال ہے نائن الیون کی
وہ جس کی آڑ لے کر کچھ بھی کر سکتا ہے دنیا میں
جب اس کے پاس لاٹھی ہے تو ہر اک بھینس اس کی ہے
وہ سب کو ہانک سکتا ہے
بجز اپنے گریباں کے کہیں بھی جھانک سکتا ہے
کسی بھی پھول کو کالر میں اپنے ٹانک سکتا ہے
اماں کی دعویداری آشتی کی پاسداری میں
وہی اک ابرہہ باقی بچا ہے عصر حاضر میں
وہ جس کے ہاتھیوں کی فوج ہر سو دندناتی ہے
قضا کے گیت گاتی ہے
فلک کو خوں رلاتی ہے
گلوبل دائرے میں بیٹھ کر اس ابرہہ نے پھر
دہائی دی ہے اس کے ہاتھیوں پہ خوف طاری ہے

اسے اور اس کے لشکر کو ابابیلوں سے خطرہ ہے
یہ اس کے ہاتھیوں کی پیشقدمی روک سکتے ہیں
اسے بھی ٹوک سکتے ہیں
لہٰذا ان کی ننھی منی چونچیں توڑ دی جائیں
ہمیشہ سے یہ ہاتھی کنکروں سے خوف کھاتے ہیں
ابابیلوں کا لشکر دیکھتے ہی بھاگ جاتے ہیں
سپر پاور ہے لیکن پھر بھی اس گوتم کو خدشہ ہے
ابابیلوں کی جانب سے اسے گھمبیر خطرہ ہے
فضا میں ہی انہیں برباد کر دینا ضروری ہے
گلوبل دائرے میں بیکس و مجبور لوگوں پر
بڑی مشکل کی ساعت ہے
غرور بادشاہی ہے مقابل کیکلا ہی ہے
ادھر صدیاں ہوئیں تاریخ کا دھارا بتاتا ہے
کلام پاک کا یہ آخری پارہ بتاتا ہے
ابابیلوں کی فطرت میں ہے حق گوئی و بیباکی
وہ اپنے کنکروں کے ساتھ حق کا ساتھ دیتے ہیں
وہ ہر سچائی کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دیتے ہیں
گلوبل دائرے میں سب یہ پنچوں کو اجازت ہے
وہ اپنے آپ کوئی فیصلہ چوپال میں کر لیں
وہ جس میں ابرہہ نہ ابرہہ کی فوج شامل ہو
ابابیلوں کو لے کر کشمکش پھیلی ہے ذہنوں میں
تناؤ ہی تناؤ ہے
دباؤ ہی دباؤ ہے!
رگوں میں سنسنی ہے خوف کی آہٹ ہے پاؤں میں
نہایت ہو کا عالم ہے عجب سی بے یقینی ہے
سرکتی سرزمیں کے ساتھ لپٹی بے زمینی ہے
بدکتے جا رہے ہیں لوگ اب اپنے ہی سائے سے

دلوں میں کیا اچانک یہ سرایت کرنے والا ہے
ابابیلوں کے ہاتھوں سے یہ لشکر مرنے والا ہے
مگر یہ شرط ہے کہ خوف کا چولا اتار دو تم
اگر یہ حوصلہ تم میں نہیں تو جان لینا پھر
ہمارے عہد کا گوتم

بڑا مکار ہے عیار ہے اور سپر پاور ہے
یہ شاطر بھیڑیا ہے بھیڑ کے جامے میں رہتا ہے
یہ اپنے دائرے کے بے کس و مجبور لوگوں کو
اچانک چیر سکتا ہے
اچانک پھاڑ سکتا ہے
وہ سب کی گردنوں میں اپنے پنجے گاڑ سکتا ہے
گلوبل دائرے میں سب کے سب مجبور لوگوں کو
سسکتی فاختاؤں کو بھٹکتی آتماؤں کو
زمین زیرِ زمیں پھیلے ہوئے حشرات کو
کیڑوں مکوڑوں کو
خزاں کی گود میں بکھرے ہوئے ان زرد پتوں کو
چرندوں کو پرندوں کو پہاڑوں کو چٹانوں کو
سمندر در سمندر کشتیوں کے بادبانوں کو
ہمارے عہد کے گوتم نے یہ پیغام بھیجا ہے
کہ وہ اک سپر پاور ہے
زمیں سے چاند تک پھیلی ہوئی اس کی حکومت ہے

☆

ہم تو پیڑ ہیں راہوں کے

O

گلشن کھنہ

ہم تو پیڑ ہیں راہوں کے!
ویرانوں میں رہتے ہیں
تنہا تنہا دکھ موسم کے سہتے ہیں
کون ہمیں پہچانے گا؟
کون یہاں دکھ درد ہمارے جانے گا؟
ہم کہ ہیں اپنے حال میں گم
گردش ماہ و سال میں گم
سورج نکلے گا تو دھوپ اوڑھیں گے ہم
پھر دن بھر کے تپتے بدن کو ستانے
بانہیں ڈال کے چاندنی شیتل بانہوں میں
پل دو پل سو لیں گے ہم
چاند بھی جس دم ڈھل جائے گا
ڈوب جائیں گے ساگر میں اندھیاروں کے
ہم تو پیڑ ہیں راہوں کے!
آئے گی جب دھوم مچاتی پُروائی
ہوا کی تال پہ تالی بجا کے
ناچیں گے پتے
ہم بھی ان کے رقص میں شامل ہو جائیں گے
لیکن جب کہرے کی اجلی چادر پھیلے گی
ہم اپنی ذات کے گہرے جنگل میں کھو جائیں گے
دور بہت ہو جائیں گے
ایسے میں پھر کون ہمیں پہچانے گا؟
کون یہاں دکھ درد ہمارے جانے گا؟
ہم تو پیڑ ہیں راہوں کے!

٭

Weather Forecast

O

سعود عثمانی

ملک بدن میں آج قیامت کی گرمی تھی

گرمی کی چڑھتی لہروں نے چند دنوں سے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے
آج بھی شدت کی گرمی تھی
آج تو سورج آسمان کے وسط میں آ کر ٹھہر گیا تھا

ملک کے بالائی حصوں میں تپش کی صورت جوں کی توں ہے
بلکہ اک گونہ افزوں ہے
شہر دماغ کھلا تھا
لیکن اس بازار میں آج بھی گرمی کا سودا تھا
آج تو اس حدت کی شدت کھولاؤ کے درجے سے اک درجہ کم تھی

آنکھوں کے تپتے صحراسے پوروں کے جلتے ساحل تک
ریتیلا سکہ چلتا تھا اور بگولوں کی موجیں تھیں
لیکن سب سے زیادہ گرمی
شہر دل میں پڑی کہ جہاں پر حد حرارت اپنے ابال تک آ پہنچی ہے
شہر دل میں آج قیامت کی گرمی تھی
اس بستی کے سارے ساکن دن چڑھتے ہی اپنے گھروں میں بیٹھ رہے تھے
قریہ قریہ گرد اڑتی تھی اور ہوا کے پر جلتے تھے
راہیں آبلہ پا لگتی تھیں

لیکن لوگوں کو مژدہ ہو

بارش والا اک ہمدرد شنا سا موسم
چیکے سے اقلیم جہاں تک آ پہنچا ہے
جلتی چکراتی سانسوں کا اک خاموش دباؤ ہے جو پورے جسم میں پھیل رہا ہے
غم کی نم آلود ہوائیں
اور دکھ کے بار آور بادل
کچھ ہی دیر میں سر پر ہوں گے
آئندہ چوبیس گھنٹوں میں
ایک تسلسل سے اور پھر وقفے وقفے سے
تیز اور ہلکی بارش ہوگی
دست دعا کی جڑواں جھیلیں بھر جائیں گی
لیکن آنکھیں
اور سب ملحق زیریں خطے زیر آب آنے کا ڈر ہے
بھرائی مرطوب فضا میں غم کا تناسب بڑھ جائے گا

کشت سخن کے دہقانوں کو خوشخبری ہو
اس بارش کے اچھے اثر مرتب ہوں گے
فصل اشک میں فصل حرف نمو پاتی ہے

☆

نظم

O

عامر سہیل

ہوا!

کھوکھلے

قہقہوں کے

کفن

مت اڑا

وقت

کن سانحوں

کے

تصرف میں

ہے

تو نہیں جانتی!

عمر

کن زاویوں کی

تھکی

صف میں ہے

تو نہیں جانتی!

ہم

یہ معبود لمحوں کے

دربند ہیں

ہم

کہ متروک نسلوں

کے

فرزند ہیں!

تمہارے لئے!

O

عامر سہیل

(۱)

مجھ سے زیادہ کسی نے
تمہیں یاد نہیں کیا
سلائیوں سے ماپ ماپ کے
بنے گئے جسموں کے ہجوم
سے گزرتے ہوئے
لکڑی کے بوسیدہ بینچوں پہ
بھلا دیئے گئے وعدوں کی
خراشوں کی اکارت گئی ہزیمتوں میں
برستے مینہ میں
کسی گھاٹ پر شروع ہجر کی
سسکیوں سے بندھی ہچکیوں میں—
مجھ سے زیادہ کسی نے تمہیں
یاد نہیں کیا

(۲)

جب اہل علم کی گردنیں
مونج کی رسیوں سے
سیاہ پڑی جا رہی تھیں
مجھ سے زیادہ کسی نے تمہیں
یاد نہیں کیا!
جب کتابوں، بیڑیوں اور سولیوں
میں فرق روا نہیں رکھا گیا

عام تعطیل میں
مجرموں کا معافی دیے جانے والے
دنوں کی تفصیل کی تاویل میں
جب ایک شخص کروڑہا لوگوں سے
معافی کا خواستگار تھا
جب ایک ٹی وی چینل پر کوئی
میزبان کسی ملک کی وہ
تاریخ دہرا رہا تھا جو
کبھی لکھی نہیں گئی!
مجھ سے زیادہ کسی نے تمہیں
یاد نہیں کیا
خون سے لتھڑی چپلوں
آنسوؤں سے تر قمیضوں
اور پسینے سے بھری شیروانیوں
کی تحقیر کے نواح سے
کہنہ گرد سے زرد پڑتیں
غلام گردشوں میں۔ عجز کی گھنٹیوں
کے بلاوے سے بندھے..... درباری
پہناوے کے امین۔ جب شاعروں کو
نظمیں لکھنے سے روک رہے تھے.....
مجھ سے زیادہ کسی نے تمہیں یاد نہیں کیا!

نظم

○

ارشد جاوید

کن یزیدوں میں گھر گئے ہیں ہم
شام آئی ہے کربلا میں ہمیں
خیمۂ صبر سے نکلتے ہیں
آنسوؤں کو تو حینت رکھا ہے
یہ ہی اندوختہ گرہ میں تھا
کربلا میری' میں ہی وارث ہوں
نوکِ خنجر سے میرے زخموں کو
چھیڑتے ہو کہ حال کیسا ہے
کون جائے فرات پر سوچو
کوئی عباس بھی نہیں ہے یہاں
مشکیزہ جان بھی تو چھلنی ہے
کس سے سر کا علم کرو گے طلب؟
بوند بوند خواہشوں کو ترسے ہیں
کوئی سورج نکل نہیں سکتا
یہ منادی کرادی حاکم نے
نذر گزراؤ تم زبانوں کی
اور گروی رکھو ضمیروں کو
خلعتیں بانٹنے کا موسم ہے
کن یزیدوں میں گھر گئے ہیں ہم

☆☆

برف کا شہر

O

عامر بن علی

یہ شہر تو ہے برف کا
باسی ہیں اس کے موم کے
صدیاں ہوئیں اس کو بسے
لیکن یہ جس دن سے بنا
تاریکیوں میں غرق ہے
خاموشیوں کا راج ہے
اس شہر کے ہر اک طرف
اس شہر کے اے باسیو
اک بات تو میری سنو
تم تو بنے ہو موم سے
گھیرے میں تم ہو برف کے
سوچو جو تم سے ہو سکے
تاریکیوں کو چیرتا
سورج کہیں سے آ گیا
تو کیا بنے گا شہر کا..........؟

سچ کہتا ہے

O

ڈاکٹر فوزیہ چودھری

وہ کہتا ہے تیرے بن میں
جیون کی اک اوگھٹ گھاٹی سے گزر رہا ہوں
من کی آگ سے کھیل رہا ہوں
جانے وہ اپنے ان لفظوں میں
کتنی دور تک سچا ہے

O

میں یہ کل سے سوچ رہی ہوں
اس کی بات کے سارے پہلو
دھیان میں میرے
پل پل اس کے
بدلتے لہجے آ جاتے ہیں

O

سوچ رہی ہوں
لفظ جو اس کے پاس پڑے ہیں
گیلی مٹی کے لوندے ہیں
جن کو وہ جب چاہے اپنے
لہجے کے اک چاک پہ رکھ کر
گول گھما کر
رنگ لگا کر
میرے سامنے رکھ دیتا ہے

O

سوچ رہی ہوں
ہو سکتا ہے

اب کی بار وہ سچ کہتا ہو!
شاید سب سے وہ سچا ہو!

٭

اذنِ حق

O

ڈاکٹر فوزیہ چودھری

غریبِ شہر ہوں میں' نہ چھیڑو مجھے
کہ آج شہرِ تمنا کے بام و در سارے
اداس لمحوں میں یوں بس رہے ہیں اب جیسے
پیا کی یاد میں جلتی ہوئی کوئی برہن
مجھے نہ چھیڑو'
کہ میں آج بھی پیادہ پا!
امیرِ شہر سے اک حرف'
اذن کی خاطر
ایک ایسے راستے پہ گامزن ہوں جواب تک
بے انت مسافت کی تہہ میں دفن صدیوں سے
اذنِ حق کے لئے ترستا ہے

٭

ابھی وہ وقت آنا ہے!

O

ڈاکٹر فوزیہ چودھری

ابھی وہ وقت آنا ہے!
جدائی کے کسی تابوت میں جب آخری گرہیں لگانا ہے
خوشی کے چوکھٹے میں خوش نما منظر سجانا ہے
غموں کی تیرگی میں نور کا جھپکا لگانا ہے
اداسی کی کھلی بانہوں میں مجھ کو بھول جانا ہے
گئے وقتوں کے دھندلے خواب سے آنکھیں سجانا ہے
جہاں کے ان کہے قصوں سے افسانے بنانا ہے
ابھی وہ وقت آنا ہے!
خوشی میں تیرتے لمحوں کو جب ساتھی بنانا ہے
تخیل کے سنہری زاویوں میں گل سجانا ہے
مجھے تیرے تصور میں کبھی کچھ بھول جانا ہے
جہاں کے اس بھرے میلے سے اب خود کو اٹھانا ہے
مجھے جلتے ہوئے بھی چین کی بنسی بجانا ہے
خودی کے قید خانے سے ابھی پنچھی اڑانا ہے
اور اس کو بھول جانے کی ابھی ہمت بندھانا ہے
ابھی وہ وقت آنا ہے!

☆☆

بازدید

O

ڈاکٹر فوزیہ چودھری

گمان لمس رفتہ کی
اگر پہچان ہے کچھ بھی
تو آ نکلو میری جاں
تم انہی گم گشتہ رستوں پر
کہ جن کی جستجو اب تک
زیاں کی آبرو ٹھہری
چلے آؤ! جو فرصت ہو'
کسی دن تم کو آنے کی
انہی سنسان راہوں'
رائیگانی کے جزیروں میں
جہاں پر زندگی اب تک
بھٹکتی' ٹمٹماتی روشنی کی منتظر بیٹھی
شکستہ پا' تھکی ہاری
تمھیں واپس بلاتی ہے
امیدوں آرزوؤں کے کئی آنگن سجاتی ہے
چلے آؤ! کسی دن اس طرف بھی'
تم چلے آؤ!

موسم کتنا اچھا ہے

O

ڈاکٹر فوزیہ چودھری

دور دیہاتی قصبے میں
لُو برساتی دوپہروں میں
چاروں اور سناٹا ہے
ایئر کنڈیشنر کی خنک ہوا ہے
سیٹلائٹ پہ فلم رواں ہے
بوجھل نیند سے آنکھیں ہیں
ٹیلی فون کی گھنٹی پر ـــــ!
''موسم کتنا اچھا ہے''

☆

گوشۂ فیض احمد فیض

فیض اور علم کی جستجو

حمید اختر

ہماری ادبی تاریخ میں ہم عصر شعراء کے درمیان مقابلہ بپا کرنے کی رسم ایک نہایت غیر ادبی قسم کی روایت ہے۔ مگر یہ روایت اس وقت سے چلی آ رہی ہے جب بڑے شاعروں کے شاگردوں کا ایک گروہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا تھا جو اپنے استاد کے مقام، مرتبے کو اس طرح کے مقابلوں کے ذریعے بلند کرنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا اور یہ کام اس طرح کیا جاتا کہ اس کوشش کے نتیجے میں ان کا ممدوح ہی سب سے بڑا شاعر نظر آتا۔ یہ پرانے زمانے کی بات ہے۔ آج کے بدلے ہوئے حالات میں اس روایت نے کچھ دوسری صورت اختیار کر لی ہے اور شعر و ادب سے تعلق رکھنے والے لوگ اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اب بھی جوش، جگر، فراق، حفیظ، فیض اور ندیم قاسمی صاحب کے بارے میں ان کے حلقہ احباب کی طرف سے اپنے اپنے ممدوح کو بڑا شاعر ثابت کرنے کی سعی رائیگاں کا عمل جاری ہے۔

راقم الحروف کا شعری تنقید سے دور کا رابطہ بھی نہیں ہے تاہم خوش قسمتی سے مجھے اس عہد کے تقریباً سارے شاعروں کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا ہے۔ جوش، فیض، مجاز، احمد ندیم قاسمی، حفیظ جالندھری، ساحر، مجروح، علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی کے ساتھ برسوں پر محیط گہرے روابط کی روشنی میں شخصی قربت اور ان کی شعری تخلیقات کی بنیاد پر میری پختہ رائے ہے کہ ان شعراء کے درمیان مقابلہ کرنے یا ان میں سے کسی کو چھوٹا اور کسی کو بڑا شاعر ثابت کرنے کی کوشش نہایت غلط بات ہے۔ اس لیے کہ ہر شخص کو اپنی شخصیت کا عکس اس کی تخلیقات میں نمایاں نظر آتا ہے اور چونکہ ہر آدمی کی انفرادیت خالص ذاتی چیز ہوتی ہے اس لیے ہر فرد کی شخصی خصوصیات ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہوتی ہیں۔ شخصیت کی تشکیل میں شاعر کا خاندان، وہ مخصوص دور جس میں اس کا بچپن گزرا، اس کی تعلیم، تربیت، اساتذہ کی عملی حیثیت، ذاتی تجربوں، محرومیوں اور عملی رویوں کے عمل، معنی سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور یہ سب چیزیں کسی دو اشخاص کو بیک وقت یکساں طور پر میسر نہیں آتیں اس لیے شعرا کا، خواہ وہ ہم عصر کیوں نہ ہوں، آپس میں مقابلہ کرنا ہرگز پسندیدہ فعل نہیں ہے۔

اس مسئلے نے ان دنوں ہمارے ذہن میں اس لیے بھی سر اٹھایا کہ فیض احمد فیض کے انتقال کے تقریباً سترہ برس بعد ادب میں فیض کے ادبی مقام و مرتبے کے تعین کے سلسلے میں مختلف قسم کی کاوشیں دیکھنے میں آ رہی ہیں۔ بظاہر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے اور اس کی وجہ بھی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ بقول جناب شاداب ردولوی کے "فیض نے غزل کی مروجہ شعریات کو توڑا اور اپنی نرم لے کے باوجود، اسے روایات کی گھٹن سے نکال کر تازگی، فرحت اور دلکشی سے آشنا کیا لیکن ابھی ان کی "کنٹری بیوشن" کی اہمیت کا پورا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اس لیے کہ ہر فن کار اپنے عہد کے مروجہ اصولوں کو توڑتا ان سے بغاوت کرتا ہے، اس کی صحیح قدر کا یقین، خود اس کے عہد میں مشکل ہوتا ہے۔ اس پودے کی کونپلیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خود نکلتی آتی ہیں اور نئے نئے گوشے روشنی سے آشنا ہوتے جاتے ہیں۔"

سو اگر فیض کی رحلت کے سترہ اٹھارہ برس بعد ان کے تخلیقی جوہر یا ان کی شعری فتوحات کے بارے میں بحث جاری ہے تو اس پر کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہئے، البتہ اس کوشش میں ان کا دوسرے شعراء سے مقابلہ کرنا کوئی مناسب بات نہیں ہے۔ یہ بات بتانے کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ حال ہی میں اردو کے ایک بھارتی نقاد نے عصر حاضر کے باشعور شاعر کا انتخاب کرنے کے سلسلے میں جوش اور فیض کے بارے میں ایک مقالہ لکھا اور ان دونوں کے درمیان مقابلہ کرتے ہوئے فیصلہ بھی صادر کر دیا کہ ان میں عصری شعور زیادہ ہے۔ جس پر برصغیر کے ادبی حلقوں میں بحث اب تک جاری ہے اور کچھ لوگ اس دوڑ میں حفیظ جالندھری کو شامل کرنے کی تجویز پیش کر رہے ہیں۔ شاعروں کے درمیان اس نوع کا "مقابلہ حسن" ہماری رائے میں ہرگز پسندیدہ نہیں ہے۔ ہر شاعر کو اس کی تخلیقات کی روشنی میں اس کی شخصیت کے مطالعہ کے ساتھ پرکھنا چاہیے۔

فیض کے ساتھ برسوں کی رفاقت اور ان سے قرب کی وجہ سے مجھے ان کی علم دوستی اور حصول علم کے لیے ان کی کاوشوں کا اندازہ تھا مگر حال ہی میں ایک مضمون کے مطالعہ کے بعد مجھے یہ فیصلہ کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کہ فیض کی شخصیت کی تشکیل میں اور ان کے شعری مقام و مرتبے کی بلندی میں سب سے زیادہ دخل ان کے علمی پس منظر کا ہے۔ یہ مضمون جناب احمد حسین صاحب کا ہے جو اگرچہ ایک مقامی پرچے میں ابھی اپریل کے مہینے میں شائع ہوا ہے لیکن اس میں اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ یہ فیض کی رحلت کے وقت لکھا گیا تھا۔ جناب احمد حسین کا تعلق گوجرانوالہ کے ایک علمی خانوادے سے ہے اور وہ درس نظامیہ کے فارغ التحصیل ہیں، نیز پرانے علوم سے رغبت رکھنے والوں میں شامل ہیں۔ انہوں نے اپنے متذکرہ مضمون میں لگ بھگ ۱۹۵۰ء کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ وہ کسی کام کے سلسلے میں مولانا نور الحق کے ہمراہ کچھ لوگوں سے ملاقات کے لیے گئے اور وہاں انہوں نے چند پڑھے لکھے لوگوں کو کسی علمی بحث میں مصروف پایا۔ مقالہ نگار کے بیان کے مطابق اس گروپ میں انگریزی لباس میں ملبوس ایک صاحب بھی بیٹھے تھے جو بعد میں معلوم ہوا کہ فیض احمد فیض تھے۔ ایک موقعہ پر بحث میں حصہ لیتے ہوئے فیض نے کہا کہ "خبر صادق کی تعریف بڑی واضح ہے یعنی جو واقعہ کے عین مطابق ہو۔"

جناب احمد حسین کا کہنا ہے کہ وہ یہ تعریف سن کر اس لیے حیران ہوئے کہ یہی تعریف علامہ سعد الدین نے اپنی مشہور زمانہ کتاب المطول میں لکھی تھی۔ مجلس برخواست ہونے کے بعد احمد حسین نے فیض صاحب کو جب یہ بات بتائی تو ان کے بیان کے مطابق فیض صاحب نے انہیں اس موضوع پر، جس میں خبر صادق کی تعریف کے علاوہ قرآن شریف کی سورہ المنافقون کی شرح بھی شامل ہے، دیگر کتابوں، مثلاً المختصر المعانی، المفصل، الفتاح اور مطول کی شرح وحواشی کے حوالوں سے اس مسئلہ کی وضاحت بھی کی۔

احمد حسین صاحب کا کہنا ہے کہ اس ابتدائی اتفاقی ملاقات کے بعد فیض صاحب سے ان کی دوستی ہو گئی اور وہ (یعنی فیض) ان کی بہت قدر کرنے لگے۔ ان کی یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ راقم نے برسوں پر محیط فیض سے ذاتی مراسم کے دوران ہمیشہ یہ محسوس کیا فیض نہ صرف خود علم کے متلاشیوں میں تھے اور عمر بھر حصول علم کے لیے کوشاں رہے بلکہ وہ اہل قلم کی قدر بھی ہر ممکن حد تک کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک مثال پیش کروں تو نا مناسب نہ ہوگا۔ جس زمانے میں الطاف گوہر مرحوم ایوب خاں کے نفس ناطقہ بنے ہوئے تھے اور ملک کے جمہوریت پسند حلقے میں بشمول مقتدر ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے گروہ کے خلاف محاذ قائم کیے ہوئے تھے، فیض صاحب سے الطاف گوہر کے تعلقات ویسے ہی دوستانہ تھے جیسے اس دور سے پہلے تھے۔ اس پر انکے دوستوں نے اعتراض کیا تو فیض کا جواب تھا ''بھئی وہ کچھ بھی کرتا ہے مگر لائق آدمی ہے، اس میں کسی کو شبہ نہ ہونا چاہئے اور ہم ہر لائق آدمی کی قدر کرتے ہیں۔''

احمد حسین صاحب نے اپنے مضمون میں آگے چل کر لکھا ہے کہ پہلی ملاقات اور تعارف کے بعد جب انہوں نے فیض سے کہا کہ ''میں آپ کی شاعری کا تو معترف تھا ہی مگر آج آپ نے جس علمیت کا اظہار کیا ہے اس نے میری کیفیت ہی بدل دی'' فیض نے اس کا جو جواب دیا وہ بھی قابل غور ہے۔ انہوں نے کہا ''شاعری خداوند تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ اس میں میرا ذاتی کمال کوئی نہیں البتہ دوسرے علم و ادب کے حصول کے لیے میں نے خود محنت کی ہے اور یہی میری دولت ہے۔ جناب احمد حسین احمد نے اپنی اس ابتدائی ملاقات کے اختتام پر ہونے والی گفتگو کا حوالہ بھی دیا ہے کہ رخصت ہوتے وقت فیض نے انہیں (گوجرانوالہ سے) کثرت کے ساتھ لاہور آنے اور اہل علم کی مجالس میں بار بار حاضری دینے کا مشورہ دیا۔ احمد صاحب نے اپنی غربت کو جب اس مشورے پر عمل پیرا ہونے کے راستے کی رکاوٹ بتایا تو فیض نے عربی زبان کا ایک مشہور قطعہ سنایا جس کا ترجمہ یہ ہے:

''سبحان کی فصاحت، ابن مقلد کا خط، لقمان کی حکمت اور ابراہیم ادھم کا زہد، یہ تمام خوبیاں اگر ایک آدمی میں جمع ہو جائیں اور وہ سخت مفلس ہو تو اس کی محنت ایک درہم سے زیادہ نہیں ہوتی۔'' یہ قطعہ سنا کر فیض نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے صاف ستھرے کپڑے پہننے اور وقار سے زندگی گزارنے کی تلقین کی۔ اس پر جناب احمد حسین نے فیض کے سنائے ہوئے قطعے کے جواب میں قطعہ انہیں سنایا تو وہ ان کی علمیت پر اتنے خوش ہوئے کہ انہیں سینے سے لگایا اور اس کے بعد یہ اتفاقی ملاقات جانبین میں ساری زندگی پر محیط ہو گئی۔ جو قطعہ انہوں نے

جواب میں سنایا اس کا ترجمہ یہ ہے۔

''قارون کے خزانے، ہرمزکی نعمتیں، مریدوں کی شان وشوکت، ستاروں کی بلندی، سلیمان کا ملک، فرشتوں کی غذا، فرعون کے حیلے اگر یہ سب کچھ ایک شخص میں جمع ہو جائیں اور وہ جاہل ہو تو اس کی قدر، قیمت ایک شلجم کے برابر بھی نہیں۔''

یہ سرگزشت جو جناب احمد حسین احمد نے قلم بند کی ہے، اب سے نصف صدی قبل کے واقعات پر محیط ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فیض ابتدائی علمی مشاغل کی حدوں سے گزر کر صحافت وسیاست کے خارزار میں قدم رکھ رہے تھے اور نت نئے تجربات سے آشنا ہو رہے تھے۔ ان کے پہلے شعری مجموعے نقش فریادی کی اشاعت قیام پاکستان سے چند برس قبل ہو چکی تھی۔ اس کے بعد وہ تین چار برس فوج کی ملازمت میں رہے اور وہاں سے فراغت کے بعد کوچہ صحافت میں وارد ہوئے۔ یہ تو صحیح ہے کہ آج کے مقابلے میں، اس زمانے میں ادب وصحافت کا تعلق بہت قریبی تھا اور اپنے وقت کے انتہائی نامور ادیب اور شاعران دونوں شعبوں میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، چراغ حسن حسرت، سالک اور مرتضٰی احمد خاں میکش کے علاوہ اور بھی بہت سے شعراء داد سخن دینے کے ساتھ ساتھ صحافتی ذمہ داریاں بھی نبھا رہے تھے مگر یہ بھی ایک نا قابل تردید حقیقت ہے کہ ان میں سے بیشتر کا تعلق اردو اخبارات سے تھا اور وہ بھی زیادہ تر کالم نویسی تک محدود تھا۔ ان کے موضوعات بھی عام طور سے ادبی ہوتے تھے، ان میں سے ایک دو ہی ایسے حضرات تھے جو اداریہ نویسی کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔ مگر فیض کو ایک نئے انگریزی اخبار کی ادارت کے فرائض سنبھالنا پڑے اور اس حیثیت میں انہوں نے اس نئے اخبار کا معیار انتہائی بلندیوں تک پہنچایا، اس کامیابی کی وجہ بھی فیض کا علم ہی ہے۔ وہ جب اس اخبار کے مدیر ہوئے اور بالکل ایک نئے میدان میں سرگرمیوں کا آغاز کیا تو اس کوچے میں نووارد ہونے کے باوجود صحافت کے بنیادی نظریے اور اصول کا علم رکھتے تھے اور جناب سعد الدین کی خبر صادق کی تعریف سے نہ صرف بخوبی آگاہ تھے بلکہ اس پر کامیابی سے عمل پیرا بھی رہے۔ پاکستان ٹائمز اور امروز میں جن لوگوں نے ان کے ساتھ کام کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اپنی ادارتی ذمہ داریوں کے دوران میں، جو برسوں پر پھیلی ہوئی ہیں، فیض نے ہمیشہ خبر کی اس تعریف کو پیش نظر رکھا اور اس پورے عرصے میں کسی قسم کی بے اصولی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ صحافی نہ ہوتے ہوئے، مگر صحافیانہ علوم سے واقفیت کی بناء پر، انہوں نے پرچے کا بلند معیار قائم کیا، کمال کے یادگار اداریے لکھے اور اپنے اخبار کو اتنی اہمیت دلائی کہ اس کا حوالہ دیتے ہوئے امریکی جریدے ''ٹائم'' نے اس اخبار کو ایشیا کا سب سے معتبر اور ''بیسٹ ایڈیڈ'' اخبار کا تمغہ دیا۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فیض کی شخصیت کی تشکیل میں ان کے علم کا غالباً سب سے زیادہ حصہ ہے۔ یہ علم محض کتابی ہی نہیں تھا، عملی طور پر بھی انہوں نے عمر بھر اس کے حصول کی کوشش جاری رکھی۔ ادب کی کلاسیکی روایات پر مطالعہ کے زور سے عبور حاصل کیا۔ ابتدائی زندگی کا بیشتر حصہ اردو، فارسی اور عربی کے کلاسیکی شعراء کے

مطالعہ میں گزرا، پھر صحافت اور سیاست کے میدان میں حصول علم کی کاوش جاری رہی اور نظریاتی اور عملی طور سے ان شعبوں سے متعلق سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ ٹریڈ یونین تحریک سے ان کا گہرا تعلق رہا اور وہ پوسٹ مینوں کی کل پاکستان یونین کی صدر بھی رہے۔ بین الاقوامی حالات سے آگاہی نے بھی ان کی شخصیت کی تکمیل میں حصہ لیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سامراجی نوآبادیوں میں آزادی کی تحریکیں بھی ان کے سامنے تھیں۔ ایران، افریقہ اور فلسطین کے عوام کی جدوجہد پر ان کی شعری تخلیقات ان کے سیاسی شعور کی آئینہ دار ہیں۔ ایک پرانا مقولہ ہے کہ فوج یا جیل میں کچھ وقت گزارے بغیر آدمی مکمل انسان نہیں بنتا۔ فیض نے یہ دونوں مراحل طے کر کے اپنی ذات کی تکمیل کی۔ چار سال فوج میں رہے اور پانچ سال (شاید اس سے بھی زیادہ) جیل میں بھی گزارے۔ اس کے بعد جلاوطنی کے کرب سے آشنا ہوئے اور یہ سارے تجربے ان کے کلام میں موجود ہیں اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان سب تحریروں، حوادث اور بادیہ پیمائیوں نے ایک ایسی ہمہ جہت، باخبر اور زمانے کے دکھ درد سے آشنا شخصیت کی تشکیل کی کہ جب اس شخصیت نے معاشرے کے تجربات اپنے رنگ میں ڈھال کر واپس کئے تو اس کی بات دل میں اترنے کی صلاحیت سے مالامال تھی۔

نقادانِ فن اگر فیض کی شعری جہات کے بارے میں اب تک کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ فیض کے کلام کی کئی ایسی جہات ہیں جن پر کام ہونا باقی ہے۔ ان کی شاعری میں شعری خوبیوں کے ساتھ ساتھ گزشتہ صدی کی ملکی تاریخ کی بڑی اہم جھلکیاں موجود ہیں جن کی ایک اپنی اہمیت ہے۔ ڈاکٹر شاداب نے بجا طور سے کہا ہے کہ "اگر کلام فیض کو دیکھیں تو اس کے یہاں کلاسیکیت تو نہیں، کلاسیکی تہذیب کے اثرات لفظیات کی شکل میں ضرور نظر آئیں گے۔" فیض نے زندہ موضوعات پر طبع آزمائی کرتے وقت شاعری کے کلاسیکی لہجے سے کام لیا اور پرانے الفاظ کو نئے معانی دئے جو کوئی بڑا شاعر ہی کر سکتا ہے اور اس کی اس خوبی کے متعلق اہل علم سوچتے اور لکھتے رہیں گے۔ جس طرح میر، غالب اور اقبال کی شاعری کے بارے میں تحقیق وتفسیر کا سلسلہ اب تک جاری ہے، فیض پر بھی کام ہوتا رہے گا اور ان کے علم اور کلام کی بہت سی نئی جہات سامنے آتی رہیں گی۔ لیکن جو بات میں زور دے کر کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس کام میں دوسرے شعراء سے فیض کے مقابلے کی کوششیں ہرگز پسندیدہ نہیں ہیں۔ فیض، اس کی زندگی، سوچ وفکر، اس کی شاعری، اس کی شخصیت، سب کچھ خالصتاً اس کا ہے اور اس کا جائزہ اس حیثیت میں لیا جانا چاہیے۔ فیض ہی کی نہیں ہر شاعر کی اپنی شخصیت ہوتی ہے، جس کا عکس اس کے کلام میں موجود ہوتا ہے۔ فیض کی شخصیت کی تشکیل میں مختلف علوم سے فیض کے اکتساب کا بڑا دخل ہے اور اس ضمن میں جو مواقع انہیں ملے وہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہو سکے، یہی وجہ ہے کہ ان کے ہم عصروں میں بھی کوئی دوسرا شاعر ان کی آواز، لہجے، غنائیت اور گھلاوٹ تک نہیں پہنچ سکا۔

فیض کا جرمِ وفا

محمد حنیف رامے

فیض احمد فیض ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو ''راولپنڈی سازش کیس'' میں قید ہوئے اور چار سال تک سرگودھا، لائل پور (فیصل آباد)، حیدر آباد، لاہور، منٹگمری (ساہیوال)، مچھ (بلوچستان) اور حیدر آباد کے جیل خانوں میں رہے۔
فیض صاحب اس سازش میں کس حد تک شریک تھے یہ جاننے کے لیے حسن ظہیر کی کتاب "The Rawalpindi Conspiracy Case 1951" کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس ''سازش'' کے حوالے سے فیض صاحب پر غداری کا دھبا تو لگا ہی تھا، ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی اور عوام دوستی نے اس دھبے میں مزید کالک بھر دی۔ پھر جوں جوں پاکستان کے حکمران طبقے نے امریکہ کی اطاعت کا رخ اختیار کیا اس کالک میں اضافہ ہوتا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد شائع ہونے والی نظم صبح آزادی ۱۹۴۷ء کے ابتدائی مصرعوں کو فیضؔ کی وطن دشمنی کی مثال بنا کر خوب اچھالا گیا:

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

مگر اس نظم کے آخری مصرعوں کو یاد رکھنے کی زحمت نہ کی گئی۔

ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

۱۹۵۱ء کی بات چھوڑیے۔ کیا آج قیام پاکستان کے ۵۴ سال بعد بھی کوئی دردمند واقف حال سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہے کہ اس ملک کے چودہ کروڑ عوام کے لیے گرانیِ شب میں کمی آ گئی ہے یا دیدہ و دل کی نجات ہو گئی ہے اور ہم نے وہ منزل پا لی ہے جس کی نشاندہی قائداعظم محمد علی جناح نے کی تھی۔ اور تو اور، کیا خود قائداعظم کی روح پاکستان کے موجودہ حالات پر خون کے آنسو نہ روتی ہوگی۔

آخر کوئی وجہ تو ہوگی کہ جب پاکستان کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے قائداعظم نے لاہور سے ایک انگریزی روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' جاری کرنے کی ضرورت سمجھی تو اس اخبار کی ادارت کے لیے فیض احمد فیض کا انتخاب کیا گیا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ انتخاب صرف میاں افتخار الدین کا نہیں تھا جو اس اخبار کے مالک تھے بلکہ اس میں قائداعظم کی رضا بھی شامل تھی۔ یہ انتخاب نہ صرف ہر طرح سے موزوں تھا بلکہ اس کے لیے فیض سے بہتر کوئی اور شخص نہ ہوسکتا تھا۔ اس لیے کہ فیض صرف انگریزی دان نہ تھے، ان کی سوچ اقبال کی طرح مشرقی اور مغربی علوم کا خوبصورت مرکب تھی اور جہاں انہیں عالمی تحریکوں کا گہرا شعور تھا وہاں وہ مسلمانوں کے تہذیبی ورثے اور ثقافت کے شناور اور دور حاضر میں ان کی ضرورتوں اور امنگوں کے ترجمان بھی تھے۔

''زنداں نامہ'' کے دیباچے میں میجر محمد اسحاق کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

> ''حیدر آباد (جیل) میں ان (فیض) کا درس و تدریس کا سلسلہ عجب متنوع قسم کا تھا۔ کوئی قرآن مجید کا درس لے رہا ہے تو کوئی صوفیائے کرام کی تصانیف فتوح الغیب، کشف المحجوب، احیا العلوم وغیرہ کے رموز و نکات سمجھ رہا ہے۔ کوئی انگریزی اور یورپین ادب کی الجھنیں پیش کر رہا ہے تو کسی نے مارکسی جدلیاتی فلسفے پر بحث شروع کر رکھی ہے۔''

اصل میں ساری مصیبت اس ''مارکسی جدلیاتی فلسفے'' ہی نے کھڑی کی تھی۔ جس کسی نے غریبوں اور مظلوموں کے حق میں آواز اٹھائی یا یہ صدا دی کہ:

اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اچھالے جائیں گے

یاروں نے اس پر کمیونسٹ لہٰذا بے دین ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا۔ جنھوں نے سرسید احمد خان اور علامہ محمد اقبال جیسے اسلام کے عظیم مفکروں اور خدمت گاروں کو کفر کی سندیں پکڑا دیں، وہ فیضؔ کو کیوں کر بخش دیتے۔ چنانچہ ان پر بھی:

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری	تنہا پسِ زنداں، کبھی رسوا سرِ بازار
گرجے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر	کڑکے ہیں بہت اہلِ حکم برسرِ دربار
چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام	چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت

اس طرزِ ملامت نے اُس فیض کو غدارِ وطن بنا کر پیش کیا جس کی رگ رگ میں وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ لیکن وطن کے بارے میں فیض صاحب کا اپنا نقطۂ نظر تھا۔ انہیں پاکستان کی زمین، اس کے پہاڑوں اور میدانوں سے کچھ کم محبت نہیں تھی لیکن وہ پاکستان کے کروڑوں عوام کو پاکستان کا اصل سرمایہ افتخار سمجھتے تھے اور اس سلسلے میں ان کے احساس نے غم جاناں کو غم دوراں کی شکل دے دی تھی۔

جب وہ کہتے ہیں کہ ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اب وہ اپنی

محبت سے بالا ہو کر اس خلق خدا کی محبت میں گرفتار ہو چکے ہیں جو ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم میں جکڑی ہے اور جس کے خاک میں لتھڑے ہوئے، خون میں نہلائے ہوئے جسم جا بجا کوچہ و بازار میں بک رہے ہیں۔ وہ فیض جس نے

عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی　　یاس و حرمان کے، دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا　　سرد آہوں کے، رخ زرد کے معنی سیکھے

وہ اگر پاکستان کے بے کسوں کے آنسوؤں میں اپنے آنسو ملا کر رہ جاتا تو شاید کسی کو اعتراض نہ ہوتا لیکن جب اس نے ان بے کسوں کو اکسانا شروع کر دیا کہ:

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے

تو پھر فیض کو پابند سلاسل کیے بغیر چارہ نہ رہا اور ایسا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اس پر غداریٔ وطن کی تہمت لگا دی جاتی۔ فیض صاحب نے اپنی بے گناہی پر ایک بہت پہلو دار شعر کہہ دیا ہے:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

لیکن یہ تو ازل سے بے گناہوں کی تقدیر ہے۔ آخر یوسف علیہ السلام کس جرم کی پاداش میں قید ہوئے تھے اگر انہوں نے زلیخا بی بی کی بات مان لی ہوتی تو ہمارے مولوی غلام رسول صاحب کو یہ لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آتی۔

اک دن یوسفؑ بندی خانے، غماں ستایا ہویا

یہ صورت حال تو پیدا ہی اس لیے ہوئی کہ یوسفؑ نے گناہ نہ کیا۔ بے گناہوں کا جرم تو ہوتا ہی معصومیت ہے اور اکثر پر اسی جرم کا الزام لگتا ہے جس سے انہوں نے اجتناب برتا ہوتا ہے۔ سزا سنانے سے پہلے ''اک بار سوئے دامن یوسف'' دیکھ لینے کی زحمت کون کرتا ہے۔ فیض کو چونکہ وطن سے محبت تھی اس لیے ان پر یہی الزام پھبتا تھا کہ وہ وطن دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔

مگر اب موقع ہے کہ ہم فیض کی اپنے وطن سے دوستی یا دشمنی کا فیصلہ کر سکیں اور اندازہ کریں کہ اصل محب وطن کون تھا، فیض یا ان کا محاسبہ کرنے والے۔ جب ان کی نظم صبح آزادی کے حوالے سے انہیں شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا تو انہوں نے کہا:

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے　　جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
اک طرز تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک　　اک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

حقیقت یہی ہے کہ فیض کے محتسبوں نے وطن کے بے کس و مظلوم عوام کی حالت پر تغافل ہی کو اپنا شعار بنائے رکھا اور فیض صاحب مسلسل خلق خدا کے حق میں عرض تمنا کرتے رہے۔ البتہ یہ عرض تمنا اب آہستہ

آہستہ شورشِ بربط و نے میں بدلنے لگی:

یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک، اس خوں میں حرارت ہے جب تک
اس دل میں صداقت ہے جب تک، اس نطق میں طاقت ہے جب تک
ان طوق و سلاسل کو ہم تم، سکھلائیں گے شورشِ بربط و نے
وہ شورش جس کے آگے زبوں، ہنگامۂ طبلِ قیصر و کے

فیض پاکستان کے ایک بہت بڑے اخبار کا ایڈیٹر تھا، حالت حاضرہ پر اس کے متواتر نظر رہتی تھی۔ ملک میں جو اچھا برا ہو رہا تھا وہ اس سے لمحہ بہ لمحہ باخبر رہتا تھا۔ اگر اس نے ''صبح آزادی'' میں ''داغ داغ اجالے'' کا حوالہ دیا تھا تو اپنی نظم ''اگست ۱۹۵۲ء'' میں یہ بھی تو کہا تھا:

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں ۔۔۔ گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں
ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں مگر ۔۔۔ کچھ کچھ سحر کے رنگ پر افشاں ہوئے تو ہیں

یہ نظم دلیل تھی کہ فیض مایوس نہیں امید کا شاعر ہے اور اس کی امید اہل وطن سے وابستہ ہے لیکن ان کے نکتہ چینوں کو تو اس دلیل کی تلاش تھی جو فیض کو باغی ثابت کر سکے اور پھر ان کی اپنی امید تو وطن سے باہر کی سرمایہ دارانہ طاقتوں سے وابستہ تھی۔ وہ فیض کی اس ادا سے تنگ تھے کہ وہ وطن کے ستم کیشوں کو یہ ترغیب کیوں دیتا ہے کہ وہ بیدادگر سے شکوہ بیداد کریں اور پنجہ صیاد کو لہو سے رنگین کر دیں۔ انہیں فیض سے شکایت تھی کہ وہ اس رسم کہن کو کیوں توڑنا چاہتا ہے کہ زبردستوں کے سامنے ''کوئی نہ سر اٹھا کے چلے۔''

لیکن فیض کی شاعری اور زندگی کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ زیردستوں کو سر اٹھا کر چلنے کی راہ پر ڈال دیا جائے۔ قید و بند کی صعوبتوں اور اہل وطن سے جبری دوری نے کبھی اس کے حوصلے پست نہ ہونے دیئے۔ ۱۹۵۵ء میں قید سے رہائی کے بعد بھی وہ وطن پر چھائی ہوئی شام کے منحوس سکون کو توڑنے کی امید لگائے رہا۔

آس اس لیے ہے کہ یہ جادو ٹوٹے ۔۔۔ چپ کی زنجیر کٹے، وقت کا دامن چھوٹے
دے کوئی سنکھ دہائی، کوئی پائل بولے ۔۔۔ کوئی بت جاگے، کوئی سانولی گھونگھٹ کھولے

لیکن ہوا کیا؟ نہ کسی سنکھ نے دہائی دی، نہ کوئی پائل بولی، نہ کوئی بت جاگا، نہ کسی سانولی نے گھونگھٹ کھولا۔ الٹا ملک میں مارشل لاء لگ گیا اور فیض کو بازار میں پابجولاں پھرایا۔ لاہور جیل میں گیارہ فروری ۱۹۵۸ء کو اس نے کہا۔

چشمِ نم، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشقِ پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پابجولاں چلو

فیض کا قصور کیا تھا، اس کی کتاب سرِ وادیِ سینا کے دیباچے میں اس کے روسی مترجم الیگزانڈر سرکوف

کی زبانی سنئے:

''۱۹۵۸ء کے موسم خزاں کے بعد تاشقند میں افرو ایشیائی ادیبوں کا مشہور اجلاس ہوا جس میں فیضؔ نے ایک مقتدر قائد کی حیثیت سے شرکت کی.... فیضؔ کے لیے وہ نسبتاً اداسی کا زمانہ تھا۔ پاکستان میں حکومت کا تختہ الٹ کر غیر جمہوری طاقتوں نے اقتدار سنبھال لیا تھا..... ہماری گفتگو کا رخ نظموں سے ہٹ کر اس وقت کی سیاست کی طرف ہو گیا۔

''تو پھر مستقبل قریب میں آپ کا کیا ارادہ ہے؟''

''اپنے وطن واپس چلا جاؤں گا۔''

''لیکن آپ جانتے ہیں کہ اب وہاں......''

''ظاہر ہے کہ اس صورت میں تو مجھے وطن ہی واپس جانا چاہیے۔''

''تو پھر جیل یقینی ہے......''

''...... کسی بڑے مقصد کی خاطر انسان کو جیل بھی جانا پڑے تو ضرور جانا چاہیے۔''

اور فیض صاحب جیل چلے گئے۔ فیض صاحب کا قصور وطن سے محبت تھی لیکن وہ بڑا مقصد کیا تھا جس کی خاطر وہ دوبارہ جیل گئے۔ اسے کوئی نام دیا جا سکتا ہے تو ''جرم وفا'' کا...... ''وطن سے جرم وفا'' کا جب انہوں نے یہ قسم کھائی کہ:

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

تو پھر انہیں یہ بھی کہنا پڑا۔

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

مگر دوسری طرف اہل ہوس بھی چپکے نہیں بیٹھے تھے۔ انہوں نے ایوان ہوس میں حشر کے سامان کھڑے کر دیے اور تاریخ کے ذمے یہ کام لگا دیا۔

اب جرم وفا دیکھیے کس کس پہ ہے ثابت
وہ سارے خطا کار سر دار کھڑے ہیں

آج تاریخ اپنا فیصلہ دے چکی ہے۔ فیضؔ کے محتسب خطا کار ثابت ہو چکے ہیں اور فیضؔ خدا، تاریخ اور پاکستان کے عوام کی عدالت سے سرخرو نکلے ہیں اور وطن اور اہل وطن کے ساتھ ان کا ''جرم وفا'' پاکستان کے بچے بچے پر آشکار ہو چکا ہے اور وہ بظاہر فوت ہو جانے کے باوجود روز بروز زندہ سے زندہ تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جنہیں یاد کرنے والے موجود ہوں وہ مرا نہیں کرتے۔

فیض کا نظریۂ شعر اور ان کا تخلیقی رویہ

ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری

''شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے۔ اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر۔ اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جدو جہد چاہتے ہیں...... مجھے کہنا صرف یہ تھا کہ حیات انسانی کی اجتماعی جدو جہد کا ادراک اور اس جدو جہد میں حسب توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔ یہ تقاضا ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اس لئے طالب فن کے مجاہدے کا کوئی نروان نہیں۔ اس کا فن ایک دائمی کوشش ہے اور مستقل کاوش۔ اس کوشش میں کامرانی یا ناکامی تو اپنی اپنی توفیق و استطاعت پر ہے، لیکن کوشش میں مصروف رہنا بہر طور ممکن بھی ہے اور لازم بھی۔''

فیض احمد فیض (۱۹۱۱ء تا ۱۹۸۴ء) کا یہ بیان ان کے دوسرے شعری مجموعے، ''دست صبا'' کے ''ابتدائیہ'' کا حصہ ہے جو ۱۹۵۲ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ اس بیان کو فیض کے تخلیقی رویے کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ ان کی شاعری کا کم و بیش نوے فیصد حصہ اسی نظریہ شعر کا عملی اظہار ہے جس کی نشاندہی اس بیان میں کی گئی ہے۔ یہ نظریہ شعر ''تری مورتی'' کے روپ میں سامنے آیا ہے۔ یعنی اس کے تین رخ ہیں۔ پہلا رخ اس دیدۂ بینا سے متعلق ہے جو شاعر اور تخلیق کار کو گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلے کا مشاہدہ کرنے کے قابل بناتا ہے۔ یوں تو قطرے میں دجلہ دیکھنے کی بات غالب کے اس شعر سے مستعار لی گئی ہے:

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل بچوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

لیکن فرق یہ ہے کہ فیض کا زاویہ نگاہ غالب کے برعکس عمودی کے بجائے افقی جہت رکھتا ہے۔ غالب تصوف کی وحدت الوجودی فکر کے موید و علمبردار ہوئے اور قطرے میں دجلے، جزو میں کل یا کثرت میں وحدت کا

مشاہدہ کرنے پر اصرار کرتے ہیں تاکہ کم نظری کی وجہ سے مخلوق اور خالق کے مابین محسوس ہونے والے فصل کا شائبہ یا دوئی کی بو تک بھی برقرار نہ رہ سکے۔ اگرچہ یہ فکر بھی وسیع المشربی اور بے تعصب انسان دوستی کی طرف راہنمائی کرتی ہے تاہم اس کی اساس روحانی اور جہت عمودی ہے۔ نیز اس میں مرکزیت مخلوق کو نہیں، خالق کو حاصل ہے۔ برخلاف اس کے فیض کا موضوعِ سخن خالق نہیں، محض مخلوق ہے۔ ان کی فکر سے جس اجتماعی طرزِ احساس کا سراغ ملتا ہے، اس کی اساس مادی اور جہت افقی ہے۔ بطور اجتماعیت کے علمبردار وہ فرد کی داخلی دنیا اور جذباتی واردات کو بھی کوئی خاص اہمیت دینے پر آمادہ نہیں ہیں۔ انہیں تو افراد کے توسط سے اجتماعی زندگی کا مشاہدہ کرنے پر اصرار ہے۔ بالفاظ دیگر مضطرب قطروں کے آئینے میں دجلہ کا مشاہدہ کرنا ہی فیض کا مطمحِ نظر ہے اور روشناس خلق ہوئے بغیر اس مرحلے کو طے کرنے کا کوئی امکان نہیں۔

زیرِ بحث نظریہ شعر کے دوسرے رخ کا تعلق اس فنی دسترس سے ہے جس کی بدولت شاعر اور تخلیق کار دوسروں کو بھی اپنے مشاہدے میں شریک کر لیتا ہے۔ فیض کے نزدیک مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلے کو دیکھنا ہی کافی نہیں، دکھانا بھی ضروری ہے اور اس کے لئے فنی دسترس کا ہونا ناگزیر ہے۔ یہ فنی دسترس ہی تو ہے جو فن کو کھردری تشہیر یا پراپیگنڈا (Propaganda) کی پست سطح پر گرنے سے بچاتی ہے۔ اکثر ترقی پسند شاعروں کے برعکس فیض اس رمز سے پورے طور پر آگاہ تھے اور اسی وجہ سے انہیں اپنے بہت سے ہم خیال شاعروں پر یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کی شاعری پراپیگنڈا کی عملی تکذیب ہے۔ زندگی کے دجلے کو دیکھنے کے بعد اسے دوسروں کو دکھانے کا عمل سماجی حقیقت نگاری (Realism) کی تعریف میں آتا ہے جسے بالعموم میکسم گورکی کے الفاظ میں "بغیر کسی رنگ و روغن کے آدمیوں اور ان کی زندگی کا سچا بیان" سمجھنے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود میکسم گورکی بھی حقیقت نگاری کے اس بے کیف صحافیانہ تصور پر عمل پیرا نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ اعلیٰ درجے کا تخلیقی اظہار فنی و تکنیکی عناصر کو بضرورت بروئے کار لائے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ خاص طور پر مشاہدے کے فراہم کردہ خاکوں میں متخیلہ کے رنگ بھرے بغیر پُر تاثیر اور دیرپا سماجی حقیقت نگاری کا تصور کرنا بھی محال ہے۔ فیض اسی نقطہ نظر کے حامل ہیں۔

فیض کے نظریہ شعر کی ترکی مورتی کا تیسرا رخ زندگی کے دجلے کے بہاؤ میں شاعر اور تخلیق کار کے اپنے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت سے دخل انداز ہونے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فیض نہ تو تخلیقی اظہار کو بیکار کا مشغلہ سمجھتے ہیں اور نہ فن برائے فن کے تصور کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک فن مقصود بالذات نہیں اعلیٰ مقاصد کے حصول کا وسیلہ ہے۔ گویا وہ فن برائے زندگی کے تصور کو درست سمجھتے ہیں اور ان کا نقطہ نظر مقصدی اور افادی ہے۔ اسی چیز کو ہم فیض کی انقلاب پسندی سے تعبیر کر سکتے ہیں کیونکہ نقطہ نظر مقصدی اور افادی ہے۔ اسی چیز کو ہم فیض کی انقلاب پسندی سے تعبیر کر سکتے ہیں کیونکہ زندگی کے دجلے کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کا رخ موڑنے کے لئے کوشاں ہونے کے مترادف ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ دریا کا رخ موڑنے کی ضرورت

وقتاً فوقتاً پیش آتی رہتی ہے کیونکہ وہ بہاؤ کیلئے غلط اور خطرناک سمت اختیار کرتا رہتا ہے۔ اس لحاظ سے شعر اور فن حیات انسانی کی اجتماعی جدو جہد کے ادراک اور اس جدو جہد میں حسب توفیق شرکت کی دائمی کوشش اور مستقل کاوش ہے۔ یہ ایک ایسا مجاہدہ ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

جیسا کہ ابتداء میں بھی اشارہ کیا گیا' فیض کی شاعری کا کم وبیش نوے فیصد حصہ ان کے اسی نظریہ شعر کا عملی اظہار ہے۔ لیکن یہ نظریہ شعر یک بہ یک وجود میں نہیں آگیا بلکہ اس تک پہنچنے میں فیض نے کچھ وقت لیا ہے۔ چنانچہ "دلے بفروختم جانے خریدم" کے مرحلے میں داخل ہونے سے پہلے کی شاعری ایک ایسے تخلیقی رویے کی آئینہ دار ہے جس کی مذکورہ نظریہ شعر کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں ہے۔ یہ وہ شاعری ہے جو فیض کے اولین مجموعہ کلام "نقش فریادی" (۱۹۴۱ء) کے پہلے حصے میں شامل ہے۔ اس میں "خدا وہ وقت نہ لائے" سے لے کر "میرے ندیم" تک کی نظمیں آجاتی ہیں۔ جو ۲۹۔۱۹۲۸ء سے ۳۵۔۱۹۳۴ء کے دوران میں لکھی گئیں۔ کم وبیش یہ سب کی سب نظمیں ایک ہی ذہنی اور جذباتی واردات کی آئینہ دار ہیں جسے رومانوی طرز احساس کے سوا کسی اور تخلیقی رویے سے تعبیر کرنا مشکل ہے۔ ان نظموں کی تخلیق کا ایک محرک تو بقول فیض "وہ حادثہ ہے جو اس عمر میں اکثر نوجوان دلوں پر گزر جایا کرتا ہے" جبکہ دوسرا بڑا محرک وہ رومانویت (Romanticism) ہے جو فیض کے لڑکپن اور آغاز شباب کے دور میں اردو ادب پر غالب ترین رجحان کے طور پر چھائی ہوئی تھی اور انہی کے بقول "نثر ونظم میں بیشتر سنجیدہ فکر ومشاہدہ کی بجائے کچھ رنگ رلیاں منانے کا سا انداز" موجود تھا۔ شاعری میں یہ رومانوی رجحان بعض ابتدائی مراحل سے گزر کر جوش ملیح آبادی' حفیظ جالندھری اور خاص طور پر اختر شیرانی کے ہاں بہت واضح ہو کر سامنے آگیا تھا۔ اس رجحان سے ہر نوآموز شاعر کی طرح فیض نے بھی شعوری اور لاشعوری طور پر خاصا اثر قبول کیا۔ گویا انہیں اپنے داخلی جذبات محبت کے تخلیقی اظہار کیلئے خارجی تائید حاصل ہوگئی۔

چنانچہ "نقش فریادی" کی مذکورہ نظموں میں "ابتدائے عشق کا تحیر" بھی ہے اور رومانوی طرز احساس کی لذت اندوزی بھی۔ لیکن "حیات انسانی کی اجتماعی جدو جہد کے ادراک" کا سراغ ان نظموں میں نہیں ملتا۔ یہ تو بس اپنی ہی ذات میں گم رہنے کا ثمر ہیں۔ گویا اس رویے کا حاصل:

فیض ہوتا رہے جو ہوتا ہے
شعر لکھتے رہا کرو بیٹھے

(غزل۔ نقش فریادی)

یہ رویہ تلخ سماجی حقائق کی طرف متوجہ ہونے سے روکتا اور حسن پرستی کی طرف رغبت دلاتا ہے۔ شروع شروع میں فیض اسی رویے کا شکار رہے۔ لیکن انہیں جلد ہی اس امر کا احساس ہونے لگا کہ جہاد تیغ وتبر کے ساتھ ہی نہیں قرطاس وقلم کے ساتھ بھی کیا جا سکتا ہے اور یوں وہ شاعری کو مجاہدہ تصور کرنے لگے۔ اگرچہ بعد میں بھی کبھی کبھار ان کے ہاں رومانوی طرز احساس اپنی جھلک دکھاتا رہا لیکن ایک تو اس کی نوعیت تبدیل ہوگئی اور دوسرے

اس کی عمومی حیثیت ختم ہو کر رہ گئی۔

فیض کے نقطۂ نظر میں رونما ہوتی ہوئی تبدیلی کا اشارہ ''نقش فریادی'' کے پہلے حصے کی آخری نظم ہی سے ملنا شروع ہو جاتا ہے، جس میں رومان پسند واحد متکلم کو اپنی آرزوؤں کے سو جانے کا احساس ہوا ہے:

خیال و شعر کی دنیا میں جان تھی جن سے — فضائے فکر و عمل ارغوان تھی جن سے

وہ جن کے نور سے شاداب تھے مہ و انجم — جنونِ عشق کی ہمت جوان تھی جن سے

وہ آرزوئیں کہاں سو گئی ہیں میرے ندیم

(میرے ندیم۔ نقش فریادی)

''نقش فریادی'' کے دوسرے حصے میں یہ تبدیلی بہت نمایاں ہو گئی ہے:

آؤ کہ آج ختم ہوئی داستانِ عشق

اب ختم عاشقی کے فسانے سنائیں ہم

(مرگ سوز محبت۔ نقش فریادی)

اس ضمن میں ''موضوع سخن'' کے زیر عنوان لکھی گئی نظم بطور خاص دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ رومان سے حقیقت کی طرف مراجعت کا واضح اشارہ ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس میں ان شاعروں کو ہجو ملیح کا نشانہ بنایا گیا ہے جن کے اعصاب پر عورت سوار ہے، حالانکہ سماجی زندگی کے تلخ مسائل ان کی نگاہوں کے بالکل سامنے ہیں۔

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے — آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے؟

موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں — ہم پہ کیا گزرے گی، اجداد پہ کیا گزری ہے؟

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق — کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے؟

یہ حسیں کھیت، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا — کس لئے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے؟

یہ ہر اک سمت پراسرار کڑی دیواریں — جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ

یہ بھی ہیں، ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے — لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ

ہائے اس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط — آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے

اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں

طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

(موضوع سخن۔ نقش فریادی)

سوال یہ ہے کہ فیض رومانوی طرز احساس کو چھوڑ کر سماجی حقیقت نگاری کی طرف کیسے متوجہ ہوئے؟ اس سوال کا جواب ان خارجی محرکات میں تلاش کرنا چاہیے جنہوں نے فیض کو عمرانی شعور عطا کر کے ان کے تخلیقی رویے کی تشکیل نو میں بنیادی کردار ادا کیا۔ یہ درست ہے کہ اس ضمن میں فیض کی اس ذہنی ساخت کا بھی دخل ہے

جس کے باعث انھوں نے خارجی محرکات کے اثرات قبول کیے' تاہم اس سے ان محرکات کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔
بہر حال فیض کا عہد طفلی اور دور شباب تاریخ انسانی میں اس اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس زمانے میں علاقائی سطح سے لے کر عالمی سطح تک انسانی شعور کی بیداری کے سبب باطل کے خلاف حق' ظالم کے خلاف مظلوم' غلامی کے خلاف آزادی' بدامنی کے خلاف امن اور ہر طرح کے استحصالی طبقوں کے خلاف استحصال زدہ طبقوں نے علم بغاوت بلند کرنے کا رویہ اپنا رکھا تھا۔ اس دور میں طبقاتی کشمکش اور اس کا شعور عام ہو رہا تھا۔ یہ وہی دور ہے جب دنیا بھر کے غلام ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی استعماری طاقتوں' بالخصوص برطانوی سامراج کے خلاف آزادی کی تحریکیں بڑے زور و شور کے ساتھ چل رہی تھیں۔ اس زمانے میں ہندوستان سمیت تیسری دنیا کے بیشتر ممالک معاشی مسائل اور قحط سالی جیسے کٹھن مرحلوں سے گزر رہے تھے۔ بھوک ننگ اور افلاس نے عام آدمی کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ Hungry man is an angry man اس کے مصداق حالات کے مارے ہوئے لوگ رد عمل پر مجبور سے ہو گئے تھے۔ عالمی سطح پر اس رد عمل کی بہت بڑی مثال انقلاب روس (۱۹۱۷ء) تھا اسی زمانے میں چند ہی برس کے وقفے کے ساتھ دو عالمی جنگیں (۱۹۱۴ء اور ۱۹۳۹ء) رونما ہوئیں جن کے اثرات پوری دنیا کو بھگتنے پڑے۔ لیکن یہ بھی ہوا کہ جنگوں نے انسانیت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ان حالات نے ادب وفن کی سمت نمائی میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ انفرادی کوششوں سے قطع نظر' اس ضمن میں ترقی پسند تحریک کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اردو ادب میں اس تحریک کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ اپنی ذہنی مطابقت کے باعث فیض آغاز ہی میں اس تحریک کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ ان کی یہ وابستگی تازیست برقرار رہی۔ چنانچہ دونوں ایک دوسرے کی پہچان کا حوالہ ہیں۔

فیض کا عمومی تخلیقی رویہ جس نظریہ شعر کی اساس پر استوار ہے' وہ بہت حد تک ترقی پسند تحریک کے دستور العمل کی بازگشت ہے۔ اس تحریک کیساتھ وابستگی نے انھیں ان کے اپنے ہی الفاظ میں یہ شعور دیا کہ "اپنی ذات کو باقی دنیا سے الگ کر کے سوچنا اول تو ممکن ہی نہیں' اس لئے کہ اس میں بہر حال گردو پیش کے بھی تجربات شامل ہوتے ہیں اور اگر ایسا ممکن ہو بھی تو انتہائی غیر سود مند فعل ہے کہ ایک انسانی فرد کی ذات اپنی سب محبتوں اور کدورتوں' مسرتوں اور رنجشوں کے باوجود بہت ہی چھوٹی سی' بہت ہی محدود اور حقیر شے ہے۔ اس کی وسعت کا پیمانہ تو باقی عالم موجودات سے اس کے ذہنی اور جذباتی رشتے ہیں۔ خاص طور سے انسانی برادری کے مشترکہ دکھ درد کے رشتے۔ چنانچہ غم جاناں اور غم دوراں تو ایک ہی تجربے کے دو پہلو ہیں۔" چنانچہ فیض نے بہت جلد یہ فیصلہ کر لیا کہ

کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں — بعد میں سب تدبیریں سوچیں
بعد میں سکھ کے سپنے دیکھیں — سپنوں کی تعبیریں سوچیں
ہم نے مانا جنگ کڑی ہے — سر پھوٹیں گے' خون بہے گا

ہم نہ رہیں، غم بھی نہ رہے گا   خون میں غم بھی بہہ جائیں گے

(سوچ۔ نقش فریادی)

یہی وجہ ہے کہ ''نقش فریادی'' کے دوسرے حصے کی پہلی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' سے لے کر آخری مجموعۂ کلام ''غبار ایام'' (۱۹۸۲ء) میں شامل شعر پاروں میں بعض استثنائی صورتوں کے ساتھ اسی نقطۂ نظر کا عملی اظہار ہوا ہے۔ اسی نقطۂ نظر کی مربوط صورت ان کا نظریۂ شعر ہے جو ان کے تخلیقی رویے کی اساس ہے۔ یہاں چند نظموں کے اقتباسات بلا تبصرہ درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

''کر تین شبیں زباں سہی، آزاد کچھ تو ہو   دشنام، نالہ، ہاؤ ہو، فریاد کچھ تو ہو

چیخے ہے درد، اے دلِ برباد کچھ تو ہو

بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو   بولو کہ روزِ عدل کی بنیاد کچھ تو ہو

(بنیاد کچھ تو ہو۔ زنداں نامہ)

میرے آبا، کہ تھے نامحرم طوق و زنجیر   وہ مضامیں جو ادا کرتا ہے اب میرا قلم

نوکِ شمشیر پہ لکھتے تھے بہ نوکِ شمشیر   روشنائی سے جو میں کرتا ہوں کاغذ پہ رقم

سنگ و صحرا پہ وہ کرتے تھے لہو سے تحریر

(بہ نوکِ شمشیر۔ سرِ وادیِ سینا)

آج ہر موجِ ہوا سے ہے سوالی خلقت   لا کوئی نغمہ، کوئی صوت، تری عمر دراز

نوحہ، غم ہی سہی، شورِ شہادت ہی سہی   صورِ محشر ہی سہی، بانگِ قیامت ہی سہی

(آج اک حرف کو پھر ڈھونڈتا پھرتا ہے خیال۔ شامِ شہریاراں)

سب سے اوجھل ہوئے حکمِ حاکم پہ ہم   قید خانے سہے، تازیانے سہے

لوگ سنتے رہے سازِ دل کی صدا   اپنے نغمے سلاخوں سے چھنتے رہے

خونچکاں دہر کا خونچکاں آئنہ   دکھ بھری خلق کا دکھ بھرا دل ہیں ہم

طبعِ شاعر ہے جنگاہِ عدل و ستم   منصفِ خیر و شر، حق و باطل ہیں ہم

(شاعر لوگ۔ مرے دل میرے مسافر)

مختصر یہ کہ فیض نے تخلیقی اظہار کو مجاہدے اور جہاد کے درجے تک پہنچانے کی آرزو کی ہے۔ لیکن ان کی بڑائی اس امر میں مضمر ہے کہ انہوں نے اس آرزو کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اجتماعی مقصدیت کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ فن کی آبرو بھی قائم رکھی ہے۔

چند یادداشتیں

سلیمہ ہاشمی

شاعر فیض احمد فیض اور میرے ابا فیض احمد فیض میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ ابا جیسے گھر کے باہر تھے ویسے ہی گھر کے اندر تھے۔ ان کا ظاہر و باطن ایک سا تھا۔ ظاہر ہے ان کا کردار ایک روایتی باپ کا نہ تھا۔ ان کے سامنے ایک واضح نصب العین تھا، جس کے حصول کے لئے وہ عمر بھر لڑتے رہے۔ اس لحاظ سے ہماری بھی کچھ ذمہ داریاں تھیں جن سے ہمیں بچپن ہی میں باور کروا دیا گیا تھا۔ میں آٹھ سال کی تھی جب ابا جیل چلے گئے۔ آٹھ سے تیرہ سال کا عرصہ کسی بھی لڑکی کی شخصیت سازی میں اہم ترین ہوتا ہے۔ میں اس عرصے میں ان کے قرب سے محروم رہی۔ اس بات کا احساس ابا کو بڑی شدت سے تھا۔ بعد ازاں جب انہیں بیروت جلا وطن ہونا پڑا تو بڑے دکھ سے کہنے لگے کہ میں نے تمہارا بچپن مس کر دیا اور اب تمہارے بچوں کا بچپن بھی مس کر دوں گا۔ اس پر ہم نے ان کے پاس بیروت منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

ہمارے گھر میں اماں کا کردار تھانیدار کا تھا جبکہ ابا کی جانب سے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ جب بھی مجھے سکول نہ جانے کا بہانہ بنانا ہوتا میں مسکین سی صورت بنائے ان کے پاس کھڑی ہو جاتی اور بناوٹی لہجے میں کہتی کہ پیٹ میں درد ہے۔ وہ سب جانتے بوجھتے مان جاتے۔ انہوں نے ہمیشہ گھر میں دوستانہ ماحول رکھا۔ ہمیں شرارتیں کرنے کی کھلی چھٹی تھی۔ ایک دفعہ یکم اپریل کو میں نے دادی کا برقعہ پہنا۔ ضرورت مند کا بھیس بنائے ابا کے پاس گئی اور آواز بدل کر کہا کہ میرا خاوند جیل میں ہے کچھ مدد کر دیجئے۔ میں خوب جانتی تھی کہ گھر میں پیسے نہیں ہیں۔ لیکن ابا چیک بک لے آئے۔ تب جا کر میں نے نقاب الٹا تو وہ بھونچکے رہ گئے۔ بعض لوگوں کو تکلیف تھی کہ یہ شاعر ہے، غریبوں کی بات کرتا ہے پھر بھی اس کے گھر میں وقت پر کھانا ملتا ہے۔ وہ یہ بات فراموش کر دیتے تھے کہ ہمیں عزت کی روٹی دینے کے لئے اماں نے ساری عمر کام کیا اور ابا کو مالی دباؤ سے حتی الوسع بچائے رکھا۔

اماں کے ان پر سیاسی و نظریاتی اثرات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ابا کی پوزیشن کو سمجھتے ہوئے

بھی ان کے راستے کی رکاوٹ نہ بنیں بلکہ ان کے لیے نظریاتی تقویت کا باعث بنی رہیں۔

ابا کی زندگی کے معمولات سادہ تھے۔ صبح سویرے اٹھنا اور سب سے پہلے اخبار پڑھنا اگر ملازمت کا سلسلہ چل رہا ہوتا تو ٹھیک وقت کا دفتر کا ایک پلندہ ہوتا اور وہ۔ خط و کتابت بہت زیادہ ہوتی تھی۔ انہیں ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھنا ہوتا تھا۔ تقریبات میں بھی حصہ لیتے تھے۔

اکثر ترقی پسندوں سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔ مجھے یاد ہے کہ احمد ندیم قاسمی کا ہمارے گھر اکثر آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ترقی پسند تحریک کا دور عروج تو میرے سن شعور کو پہنچنے سے پہلے کا ہے لیکن اماں بتاتی ہیں کہ بڑے زوردار اجلاس ہوتے تھے۔ جو ترقی پسند بھارت چلے گئے ان سے بھی ابا کے روابط تھے۔

ابا نے دیگر ادبی مشاہیر کی طرح کبھی اپنا دھڑا بنانے کی شعوری کوشش نہ کی۔ اگرچہ ان کے گرد عقیدت مندوں کا ایک جمگھٹا لگا رہتا تھا لیکن فیض کا فیض سب کے لئے تھا۔ وہ کسی کی دل شکنی نہیں کر سکتے تھے۔ جو کوئی کتاب کا فلیپ لکھنے آیا لکھ دیا۔ ساقی فاروقی جیسے ان کے نقاد بھی بلا جھجک ان سے ملنے آتے اور اپنے ساتھ لے جاتے۔ البتہ بعض لوگوں سے انہیں بے حد پیار تھا۔ مثلاً آئی۔ اے رحمان آخری وقت میں ان کی سیاسی بصیرت پر بہت بھروسا کرتے تھے۔ عبد اللہ ملک اور حمید اختر سے بھی ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ سب سے بڑھ کر انہیں اپنے استاد صوفی تبسم سے عقیدت تھی۔ جب بھی کچھ لکھتے ان کو ضرور سناتے۔ کبھی وہ کہتے "فیض اے ٹھیک نئیں" بس پھر کیا تھا شعر کاٹ دیا جاتا۔

پطرس بخاری نہ صرف ان کے استاد تھے بلکہ ان کے آئیڈیل بھی تھے اور اس بات کا وہ برملا اعتراف کرتے تھے۔ ان کی شخصیت سازی میں بخاری صاحب کا بڑا ہاتھ تھا جیسا کہ متعدد حوالوں سے ثابت بھی ہے۔ وہ بلاشبہ ڈاکٹر تاثیر کے قرب سے بھی فیضیاب ہوئے۔

حساسیت ان کی طبیعت پر غالب تھی۔ مگر میں نے کبھی انہیں اپنے اوپر ہونے والی تنقید سے دلبرداشتہ ہوتے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ پر امید رہتے تھے اور یہ عنصر ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ دنیاوی عزت کو وہ خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ایوب دور میں جب سرکاری اعزازات دینے کا سلسلہ شروع ہوا تو الطاف گوہر اس کے نگران تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ابا کو اعزاز ملنا چاہیے مگر اندیشہ تھا کہ اگر انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو حکومت کی سبکی ہوگی۔ گاہے بگاہے ابا سے پوچھتے "فیض صاحب اگر آپ کو سرکاری تمغہ دیا جائے تو آپ قبول کر لیں گے؟" ابا کا جواب یہی ہوتا تھا "دے کر دیکھ لیں!" ان کی زندگی میں یہ ہمت کوئی حکومت نہ کر سکی۔

ابا منکسر المزاج تھے۔ جب "نسخہ ہائے وفا" چھپ کر آیا تو ابا نے گھر آتے ہی پہلی کاپی اماں کو تھمائی اور کتاب کو نظروں میں تولتے ہوئے کہا۔ "Not much for a life time" آخری دنوں میں جب وہ ہسپتال میں تھے تو میری بیٹی میرا نے انہیں ایک نظم لکھ بھیجی۔ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ اب میری نواسی لکھنے لگی ہے مجھے مزید لکھنے کی ضرورت نہیں۔

میرے خیال میں ان کی سب سے بڑی Achievement ان کی اپنی زندگی تھی۔ ایک با مقصد اور اصولوں سے مزین زندگی انہوں نے بھرپور گزاری اتنی بھرپور جتنا کوئی تصور کر سکتا ہے۔

فیض کی ''میزان''

(فیض کے تنقیدی نظریات ایک نظر میں)

ڈاکٹر محمد خان اشرف

فیض احمد فیض بیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے کے اردو ادب کی سب سے توانا آواز ہیں۔ ایسے دور میں جب اس کا امکان تھا کہ نئے دور کے نئے تصورات و خیالات اور تحریکات کے اظہار کے لیے اردو شاعری کی روایت اور اسلوب اپنے عجز کا اعتراف کر لیں گے انہوں نے اپنے تخلیقی میلان اور جذبہ اظہار کے ذریعے ثابت کر دیا کہ غزل اور اردو شاعری کا اسلوب اور روایت اس دور کے تیزی سے بدلتے اور بڑھتے ہوئے دانشورانہ، سیاسی و اقتصادی تصورات کے انسانی و شاعرانہ اظہار پر بھی قادر ہے۔ اس طرح سے انہوں نے اقبال کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ترقی پسند تحریک اور شاعری میں ان کا مقام اب مسلمہ ہے۔ لیکن ان کے تنقیدی نظریات کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ زیر نظر مضمون اس کمی کو پورا کرنے کی طرف پہلا قدم ہے جس میں ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ''میزان'' میں پیش کردہ تنقیدی نظریات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

''میزان'' فیض احمد فیض کے ادبی و تنقیدی مضامین اور مکالمات کا مجموعہ ہے۔ اسے ۱۹۶۵ء میں ''لاہور اکیڈیمی، ۲۰۵، سرکلر روڈ'' نے لاہور سے شائع کیا۔ ۲۵۲ صفحات کی اس کتاب میں کل ۳۱ مضامین ہیں جن کی تدوین و اشاعت میں ''جناب احمد ندیم قاسمی اور جناب ڈاکٹر وحید قریشی کی امداد و اعانت''(۱) انہیں حاصل تھی۔ فیض صاحب کے اپنے بیان کے مطابق یہ مضامین ان ''باتوں'' کا مجموعہ ہیں جو وہ ریڈیو پر اور مختلف محفلوں میں ادبی مسائل پر کرتے رہے۔(۲) ان میں سے بیشتر اشاعت سے کوئی پچیس برس پہلے جوانی کے دنوں میں لکھے گئے تھے۔''(۳) اور گو وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ''بہت سی باتیں جو اس وقت بالکل نئی تھیں اب پامال نظر آتی ہیں اور بہت سے مسائل جو ان دنوں بالکل سادہ معلوم ہوتے تھے اب کافی پیچیدہ نظر آتے ہیں چنانچہ اب جو دیکھتا ہوں تو ان تحریروں میں جگہ جگہ ترمیم و وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔''(۴) اس کے باوجود وہ کہتے ہیں:

''لیکن میں نے رد و بدل مناسب نہیں سمجھا، اول اس لیے کہ بنیادی طور سے ان تنقیدی عقائد سے اب بھی اتفاق ہے اور دوم اس لیے کہ ہمارے ادب کے ایک خاص دور اور اس دور کے ایک مکتب فکر کی عکاسی کے لیے ان مضامین کی موجودہ صورت شاید زیادہ موزوں ہو۔''(۵)

مندرجہ بالا اقتباس میں فیض صاحب نے اپنے اور اپنے عہد کے مطالعے کے لیے ان دونوں باتوں کی نشان دہی کر دی ہے جو ''ترقی پسند تنقید'' اور فیض صاحب کے اپنے تنقیدی نظریات کے مطالعے کی بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ یعنی یہ مضامین ان کے پختہ تنقیدی نظریات و عقائد کا اظہار ہیں اور ان کا اس نقطہ نظر سے جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ ان کے خیال میں ان کے عہد کے مکتب نظر یعنی ترقی پسند تحریک کے نظریات کے بھی ترجمان ہیں۔

میزان کو مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔نظریہ ۲۔مسائل ۳۔متقدمین ۴۔معاصرین

ان چار حصوں میں شامل مضامین کے دامن خاصے وسیع ہیں۔

''نظریہ'' میں ''ادب کا ترقی پسند نظریہ'' سے موضوع اور طرز ادا'' تک شامل ہیں۔ ''مسائل'' کا حصہ ''پاکستانی تہذیب کے مسئلے'' سے شروع ہو کر ''فلم اور ثقافت'' تک محیط ہے۔ ''متقدمین'' نظیر اور حالی سے شروع ہو کر ''پریم چند'' تک آتا ہے اور فیض، اقبال کو بھی معاصرین میں شمار کرتے ہیں اور جوش، مجاز، سیف الدین سیف، میرا جی کے فن سے لے کر خدیجہ مستور کے افسانوں تک اظہار خیال کرتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر مضامین کو تنقیدی مطالعوں سے زیادہ تعارف اور ریویو کی صف میں رکھا جا سکتا ہے جو ترقی پسندی کے نظریہ کے پیش نظر جلدی میں لکھے گئے۔ لہٰذا ان کا مطالعہ فیض صاحب کے اوپر درج کردہ دونوں حوالوں سے ضروری ہے یعنی فیض صاحب کا تنقیدی نظریہ جو ترقی پسندی کے عہد اور مکتب فکر کی عکاسی کرتا ہے۔

''میزان'' کے پہلے مضمون ''ادب کا ترقی پسند نظریہ'' (میزان ص ۱۱-۲۴) میں فیض نے اپنے تنقیدی نظریے کو وضاحت سے بیان کیا ہے اور اس نظریے پر وہ تمام عمر قائم رہے لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جائزہ تفصیل سے لیا جائے۔

مضمون کے آغاز ہی میں فیض یہ واضح کر دیتے ہیں کہ:

''آج کل ترقی پسند اور رجعت پسند کا چرچا ہے لیکن حسب معمول ابھی تک ان الفاظ کی بھی مکمل وضاحت نہیں ہوئی... میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے ہوا سے لڑنے کی بجائے تحقیق و انصاف سے کام لیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ ترقی پسند ادب کوئی ایسا ہجوبہ نہیں ہے نہ اس نظریہ میں کوئی ایسی بات ہے جس سے جہاد کرنا مذہبی فریضہ تصور کیا جائے۔''(۶)

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ مضمون فیض نے اپنے عہد کی اس سرگرم بحث کے دوران لکھا جب

ترقی پسند اپنے تمام مخالفین کو جن میں مذہبی علماء سے لے کر قدامت پسند، سیکولر خالص ادب کے حامی اور لبرل تصورات کے حامل بھی لوگ شامل تھے، ''رجعت پسند'' قرار دیتے تھے اور ان کے مخالفین ان پر اس نظریاتی سبک دستی کا الزام لگاتے تھے کہ ''ترقی پسند'' اصل میں ترقی کے لبادے میں ملبوس'' ''کمیونسٹ'' اور اشتراکیت کے حامی ہیں۔ فیض نے اپنے اس مضمون کے آغاز میں ''تحقیق'' اور ''انصاف'' کی شرط عائد کی ہے لہٰذا دیکھتے ہیں کہ وہ اس سے کام لے کر اس نظریاتی بحث میں کہاں تک وضاحت پیدا کرتے ہیں۔

فیض صاحب ترقی پسندی کے مندرجہ ذیل معانی قرار دیتے ہیں۔

''ظاہری طور پر ترقی پسند ادب سے ایسی تحریریں مراد ہیں جو (۱) سماجی ترقی میں مدد دیں (۲) ادب کے فنی معیار پر پوری اتریں۔''(۷)

ترقی پسند ادب کے ان دو مقاصد میں سے اول کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ادب سے سماجی ترقی میں مدد چاہیں تو اس ترقی سے ہمیں بیشتر کلچر یا تہذیب کی ترقی مراد لینی چاہیے...... کلچر سے اقدار کا وہ نظام مراد ہے جس کے مطابق کوئی سماج اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔''(۸)

فیض یہاں پر کلچر کی تعریف سے انفرادی زندگی کو خارج کر دیتے ہیں اگرچہ حسن اور خیر کا تصور بنیادی طور پر انفرادی ہے اور فنون، خاص کر شاعری وغیرہ انفرادی اظہار کا ذریعہ ہیں۔

اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے وہ مزید لکھتے ہیں:

''کلچر ہماری زندگی کا ایک کونہ ہے، اس لیے اس کی نوعیت، اس کی ترقی اور تنزل بھی انہی قوتوں کے قبضہ میں ہے جو سماج پر حکمرانی کرتی ہیں۔ یہ قوتیں سیاسی اور اقتصادی قوتیں ہیں۔ بس کسی ملک کا کلچر اس کے سماجی اور اقتصادی نظام پر منحصر ہے۔''(۹)

پہلے اقتباس میں فیض صاحب نے انفرادی زندگی کو کلچر سے خارج کر دیا تھا۔ یہاں انہوں نے اس کو صرف ''سیاسی اور اقتصادی نظام پر ہی منحصر'' کر دیا ہے۔ کسی سماج کے کلچر اور سیاسی و اقتصادی نظام کے درمیان تعلق ایک بحث طلب مسئلہ ہے لیکن یہ بات تو واضح ہے کہ سیاسی و اقتصادی نظام بدلنے سے کلچر نہیں بدل جاتا۔ فیض صاحب ایک کل کو جزو کے تابع کر رہے ہیں اور منطقی اعتبار سے دلیل محل نظر ہے۔

اسی دلیل کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے فیض صاحب لکھتے ہیں:

''ترقی پسند ادب ایسی تحریروں سے عبارت ہے جن سے سماج کے سیاسی اور اقتصادی ماحول میں ایسی ترغیبات شامل ہوں جن سے کلچر ترقی کرے۔''(۱۰)

اب یہاں فیض صاحب نے ادب کے لیے لازم کر دیا کہ وہ ''سماج کے سیاسی و اقتصادی ماحول'' کو متاثر کرے لیکن یہ اثر کس قسم کا ہو؟ اور سیاسی و اقتصادی ماحول کو متاثر کرنے سے کیا مراد ہے؟

وہ سماج اور اقدار کی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''بعض اقدار بنیادی اور اہم ہوتی ہیں بعض فروعی اور نسبتاً غیر اہم۔''(۱۱)

''وہ اقدار بنیادی اور اہم ہیں جن کے حصول پر دوسری بہت سی اقدار کے حصول کا انحصار ہے۔ مثلاً ہم پیٹ بھرنے کو ایک خاص قسم کا کوٹ پہننے سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔''(۱۲)

وہ مزید لکھتے ہیں:

''ہم ایک چیز کو قدر کیوں دیتے ہیں اور اسے کسی دوسری چیز سے عزیز اور اہم کیوں سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ اس چیز کے حصول سے ہماری کسی خواہش اور جذبہ کی تسکین ہوتی ہے۔''(۱۳)

لہٰذا وہ نتیجہ نکالتے ہیں:

''بنیادی اور اہم اقدار وہ ہیں جو بنیادی اور اہم خواہشات کو تسکین دیتی ہیں۔''(۱۴)

یہاں پر فیض کی دلیل کا بنیادی رخ اور اس کے ساتھ ہی اس کا تضاد واضح ہو جاتا ہے۔ وہ بنیادی خواہشات و ضروریات کو اجتماعی سماجی اقدار قرار دیتے ہیں۔ اول تو بنیادی خواہشات اور ضروریات بھی انفرادی ہوتی ہیں اور اس انفرادیت کو وہ پہلے ہی رد کر چکے ہیں، دوسرے سماجی اقدار اور بنیادی ضروریات میں بہت فرق ہے۔ ضروریات اور خواہشات تو حیوانات بھی رکھتے ہیں۔ بھوک، پیاس، جنسی خواہشات وغیرہ جو انفرادی ہوتی ہیں۔ سماجی اقدار انسانوں کے سماج میں رہنے اور زندگی کو برتنے کے وہ بنیادی اصول و تصورات ہیں جو انسان اپنی کواہشات و ضروریات پر قابو پانے کے بعد اور ان کو اعلیٰ رخ دینے کے لیے اختیار کرتا ہے۔ ان میں عدل، نیکی، خیر، حسن، توازن، معاشرتی بہبود، اجتماعی بہبود کے تصورات شامل ہیں جن کے پیش نظر لوگ اپنی زندگیاں اجتماعی طور پر بسر کرتے ہیں۔ لیکن فیض صاحب کلچر کی ترقی کو صرف ان کی ضروریات اور خواہشات کی تسکین تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ اس نظریے کی مجبوری ہے جس کی وضاحت وہ کر رہے ہیں۔ اس طرز فکر کو بڑھاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

''ہر وہ سماج جس میں دولت اور ذرائع پیداوار کسی محدود طبقے کے ہاتھ میں ہوں زندگی کی باقی آسائشوں کی طرح اپنا مروجہ کلچر بھی اسی ایک طبقے کے حوالے کر دیتا ہے۔''(۱۵)

لہٰذا وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔

''ترقی پسند ادب کا پہلا اور آخری مقصد بنیادی سماجی مسائل کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ ان مسائل میں غالباً طبقاتی کشمکش اور دنیوی آسائشوں کی تقسیم سب سے زیادہ اہم ہیں۔''(۱۶)

فیض صاحب یہاں پر ترقی پسند ادب کا پہلا اور آخری مقصد بیان کر رہے ہیں جو دراصل اشتراکی نظام اور کمیونسٹ پارٹی کا ہی مینی فیسٹو ہے یعنی طبقاتی کش مکش میں حصہ لے کر سیاسی و اقتصادی نظام پر قابو حاصل کر لینا تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی بنیادی ضرورتوں اور خواہشوں کی تکمیل کی جا سکے اور یہی ان کے نزدیک کلچر کی ترقی ہے۔ لہٰذا یہاں بھی ہم اشتراکیت کی اسی بنیادی فکر اور منطقی تقاضوں کو دیکھتے ہیں جس نے بیسویں صدی

کی سیاسی وصحافتی فکر اور ادب کو شدید متاثر کیا ہے۔ اس طرز فکر کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس نے الفاظ و تراکیب کے معانی ومفہوم ہی بدل دیئے ہیں اس میں موضوعی معانی اور معروضی معانی میں بہت اختلاف ہے۔ جہاں عوامی جمہوریت سے مراد کمیونسٹ پارٹی کی حکومت ،عوامی حکومت سے مراد ایک واحد پارٹی کی حکومت ،نظریاتی تطہیر سے مراد مخالفین اور مخالفت رکھنے والوں کا قلع قمع ،کلچر سے مراد بنیادی ضروریات وخواہشات ہے اور شاعر کا کام اس مخصوص طرز فکر کو فروغ دینا ہے۔

اپنی تنقید میں فیض صاحب نے بھی یہی رجحان روا رکھا ہے۔ فرق یہ ہے کہ انہوں نے اس کی منطقی اور تحقیقی توضیح کرنے کی کوشش کی ہے جس سے اس فکر کی یک رخی واضح ہوگئی ہے۔

حوالہ جات

(۱) میزان ،لاہور اکیڈمی ،لاہور ۱۹۶۵ء صفحہ ۸

(۲) ایضاً صفحہ ۷

(۳) ایضاً

(۴) ایضاً

(۵) ایضاً صفحہ ۸

(۶) فیض احمد فیض ،مضمون ''ادب کا ترقی پسند نظریہ'' مشمولہ میزان ،لاہور اکیڈمی لاہور، ۱۹۶۵ء ص ۱۲

(۷) ایضاً

(۸) ایضاً

(۹) ایضاً صفحہ ۱۲۔۱۳

(۱۰) ایضاً صفحہ ۱۳

(۱۱) ایضاً صفحہ ۱۴

(۱۲) ایضاً

(۱۳) ایضاً

(۱۴) ایضاً صفحہ ۱۴۔۱۵

(۱۵) ایضاً صفحہ ۱۵

(۱۶) ایضاً صفحہ ۱۶

آپ بیتی

نشانِ جگر سوختہ
(آپ بیتی :7)

ڈاکٹر سلیم اختر

چو بر جی میں:

یونیورسٹی لائبریری میں اگرچہ سامان دل بستگی موجود تھا مگر میری بے چین طبیعت نے مجھے جلے پاؤں کی بلی (یا پھر بلا) بنا رکھا تھا' میرے لئے تو ٹک کر بیٹھنا محال تھا' ٹک کر ملازمت کیسے کر سکتا تھا' چنانچہ میں نے عمر کے تقاضے کے مطابق ضرورت رشتہ کے اشتہارات کے برعکس ملازمت کے اشتہارات دیکھنے شروع کر دیئے۔

پنجاب پبلک لائبریری میں ''لائبریری اسسٹنٹ'' کی پوسٹ نکلی' درخواست دی اور مجھے لے لیا گیا ۱۲۰ روپے کے سکیل میں (اس زمانہ میں بی اے بی ٹی سکول ٹیچر بھی اسی سکیل میں بھرتی ہوتے تھے)۔ میں نے پہلی مرتبہ اپنی روایت کے برعکس زیادہ تنخواہ والی ملازمت حاصل کی۔ یہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔

لائبریری سائنس کے ہمارے دونوں اساتذہ کا تعلق بھی اسی لائبریری سے تھا۔ خواجہ نور الٰہی لائبریرین جبکہ شیخ ظہور احمد ڈپٹی لائبریرین تھے۔ خواجہ نور الٰہی مہربان استاد تھے' ان کے ساتھ کام کیا تو انہیں بے حد مشفق پایا۔ ظہور صاحب جب رفیق کار بنے تو وہ بہت اچھے دوست ثابت ہوئے۔

اب پنجاب پبلک لائبریری کا جغرافیہ خاصا تبدیل ہو چکا ہے' اس زمانہ میں دو منزلہ مین بلڈنگ اور اونچی کرسی پر چار برجوں والی قدیم تاریخی عمارت تھی' عہد شاہ جہان کے مشہور ماہر تعمیرات علم الدین انصاری کی یہ بارہ دری بھی شاہانہ تجمل کی حامل ہوگی مگر اب اس میں پرانے جرائد و اخبارات کے علاوہ مصوری وغیرہ پر کتب تھیں۔ اردو' فارسی' عربی' کتابوں کا جداگانہ شعبہ تھا' بیت القرآن بعد میں بنایا گیا۔ اسی ''چو برجی'' کے مین گیٹ کے پاس میری میز کرسی سجا دی گئی۔

ایک دن خواجہ نور الٰہی مجھے بارہ دری کے اوپر والے حصہ میں لے گئے' جہاں سینکڑوں کی تعداد میں سرکاری رپورٹوں' گزیٹیئرز' سرویز کے ساتھ ساتھ ہندی' سنسکرت اور گورمکھی کی کتابیں چاروں طرف بکھری پڑی

تھیں۔ ساتھ ہی پنجابی کی کتابیں بھی نظر آئیں اور انیسویں صدی کی بعض اردو کتب بھی جو موٹے قلم سے خاکی کاغذ پر چھاپی گئی تھیں۔

خواجہ صاحب نے کہا یہ بڑی نایاب سرکاری رپورٹیں اور کتابیں ہیں' تم ان سب کو classify کر کے باضابطہ طور پر ان کی bibliography بنا ڈالو تو یہ بہت اہم کام ہوگا اور لائبریری کا ریکارڈ بھی مکمل ہو کر اپ ٹو ڈیٹ ہو جائے گا۔ سب کام سمجھا کر کہنے لگے ''اگر روز کی بیس رپورٹیں بھی classify کر لو گے تو میں سمجھوں گا تم نے بہت کام کر لیا۔''

لائبریری سائنس کے طلبہ کے لئے classification سب سے مشکل ثابت ہوتی ہے۔ یعنی بلحاظ موضوع کتاب پر وہ نمبر لگانا جس کے مطابق کتاب شیلف میں رکھی جاتی ہے۔ دنیا کے بیشتر ممالک کی لائبریریوں میں رائج امریکی ڈیوئی ڈیسی مل سسٹم میں تمام علوم کو دس بنیادی شعبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور پھر لاتعداد موضوعات کی تقسیم در تقسیم کے سلسلے' طلبہ بالعموم نمبر رٹتے تھے مگر میں نے جب طریق کار کی اساس سمجھ لی تو پھر کسی بھی کتاب کا نمبر تلاش کرنے میں کبھی دقت یا الجھن نہ ہوئی' (classification کے بعد مجھے ریفرنس کا پرچہ پسند تھا) لہٰذا یہ دلچسپی کام میں مددگار ثابت ہوئی۔ جلد ہی میں کام کی باریکیاں سمجھ گیا۔ کچھ دنوں تک خواجہ صاحب میرے کام کی نگرانی کرتے اور سرکاری رپورٹوں کی classification چیک کرتے رہے' جلد ہی انہیں مجھ پر اعتماد ہو گیا اور انہوں نے جانچ بند کر دی۔ کام آسان نہ تھا مگر میں دو گھنٹے میں بیس پچیس رپورٹیں classify کر لیتا اور پھر فراغت۔ سال بھر کے اندر اندر میں نے رپورٹوں کا کام مکمل کر کے ان کی bibliography مدون کر کے ٹائپ کرا دی' خواجہ صاحب بہت خوش ہوئے۔

خواجہ نور الٰہی کی رہائش مین بلڈنگ کی بالائی منزل پر تھی' ان کی آٹھ برس کی ایک لڑکی' جس کے پاؤں میں خرابی تھی' مجھ سے بہت مانوس تھی۔

خواجہ صاحب کی بڑی بیٹی کی شادی صلاح الدین محمود سے ہوئی' لائبریری میں برات آئی۔ ہم سب نے شرکت کی' بعد میں جب صلاح الدین محمود سے دوستی ہو گئی تو ایک مرتبہ میں ان کے گھر گیا۔ ان کی بیگم سے چھوٹی بہن کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ آپریشن کے بعد اس کا پاؤں ٹھیک ہو گیا تھا اور (غالباً) بنک میں جاب کر لی تھی مگر زیادہ عمر نہ پائی۔

خواجہ صاحب کا فالج سے انتقال ہوا۔

ناکام نفسیاتی تجربہ:

میرے پاس پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں واقف بنی لڑکیوں کا میلہ لگا رہتا' چائے کے دور چلتے' کوئی ساقی گری کرتی' کوئی باتیں' جی لگا رہتا اور بقول ایک دوست ہاف سیٹ چائے پر رومانس کی گاڑی چلتی۔

دو قبول صورت لڑکیوں کے ساتھ ایک خاصی ناقبول صورت لڑکی بھی آتی۔ جو عموماً خاموش رہتی؛ وہ دونوں ہی چہکتی رہتیں جبکہ یہ خاموش لبوں اور بولتی آنکھوں سے شوخ بیبیوں کو تکا کرتی۔ میں نے سوچا احساس کمتری کی شکار اس لڑکی میں خود اعتمادی پیدا کرنی چاہیے لہذا اس میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی ٹھانی' چنانچہ بطور خاص اس پر زیادہ توجہ دینے لگا۔ میں نے کہا تم ان کے ساتھ کیوں آتی ہو' اکیلی آیا کرو' اس کے لئے چائے کے ساتھ پیسٹری وغیرہ بھی منگا لیتا۔ اس نفسیاتی تدبیر کاری کا فوری اور خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس کے لباس' گفتگو اور انداز و اطوار میں واضح تبدیلیاں نظر آنے لگیں' چہکنے بلکہ مٹکنے لگی۔ یقیناً اس میں خود اعتمادی پیدا ہو رہی تھی پھر وہ اتنی خود اعتماد ہو گئی کہ مجھ پر حکم چلانے اور اعتراضات کرنے لگی' یہ نہ کرو' اس سے نہ ملو۔ ایسے کپڑے نہ پہنو' میں خوش دلی سے برداشت کرتا رہا حتی کہ رعب جھاڑنا شروع کر دیا اور---- اور پھر ایک دن' مجھے اپنے گھر لے چلو!

بڑی مشکل سے جان چھڑائی اور آئندہ کے لئے توبہ کی کہ اب کسی بے اعتماد لڑکی میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے نفسیاتی تجربہ نہ کروں گا۔ ''نیک پروین'' افسانہ لکھا تو یہ لڑکی یاد آئی۔

خسارہ کی زندگی:

ہم دوست باغ میں بیٹھے تھے کہ میں نے ایم اے اردو کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ردعمل غیر متوقع تھا۔ ایک دوست بولا

''سامنے کھڑا ہو جا''

میں اٹھ کر جا کھڑا ہوا

''کان پکڑ!''

میں نے کان پکڑ لئے (اپنے)

''اٹھک بیٹھک لگا''

میں نے حکم کی تعمیل کی

''پھر نام لے گا ایم اے اردو کا؟''

''لوں گا''

دراصل میں اپنے اسلوب حیات سے خود ہی تنگ آ چکا تھا۔ میں نے ماضی کی سٹاک ٹیکنگ کی تو اندازہ ہوا کہ ۴۶ سالہ زندگی ہر لحاظ سے بے مقصد زندگی تھی' آوارہ گردی' ہوٹلنگ' فلرٹیشن' فلمیں' ان سب کھیل تماشوں میں مزہ تو تھا لیکن ہر مزے کی بھی حد ہوتی ہے اور سمجھ داری اسی میں ہے کہ بروقت اندازہ ہو جائے کہ میں اب حد عبور کرنے کو ہوں' میں پاگل سہی مگر احمق نہ تھا' سو اب یہ احساس کھانے لگا کہ میں خسارے کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ ایک وقت تھا جب میں اپنی تنوع پسندی کو سراہتا تھا' سراہتا کیا اسے طرۂ امتیاز گردانتا تھا مگر تنوع پسندی

برائے مقصد ہونے کے برعکس مقصد حیات ٹھہرے تو یہ مریضانہ رویہ کی مظہر بھی ہو سکتی ہے اور نفسیات کا مطالعہ یہی احساس کرا رہا تھا کہ بے معنویت رومانی اور بے مقصدیت چارمنگ سہی مگر ان کا نقطہ عروج ذہن و اعصاب کے لئے خطرہ کا سرخ نشان بھی بن سکتا ہے۔

میری آوارہ گردی خارج کے برعکس باطنی لینڈ سکیپ کی تھی۔ باطنی آوارہ گردی کے نفسی تقاضوں سے عہدہ برآ ہی کے لئے صوفی جیسی پرسکون شخصیت چاہیے ادھر میں---حالت اب انتظار کی سی ہے--- کی زندہ تصویر--- میں کہ اپنے پھیلاؤ ہی میں سمٹ چکا تھا اب اپنے حصار سے باہر نکلنے کا خواہش مند تھا مگر کیسے؟ گنبد بے در کا اسیر گنبد بادر کا خواہش مند تھا مگر گنبد بادر کہاں؟

اس عہد خلفشار میں اگر کسی چیز نے مجھے ابنارمل نہ بننے دیا تو وہ تھی کتاب! میں ساری ساری رات پڑھتا رہتا کہ لفظ ڈوبتے کے لئے تنکے کا سہارا ثابت ہو رہے تھے۔ مجھے شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اگر یہی لیل و نہار رہے تو مستقبل عہد زیاں میں بسر ہوگا۔ غالباً اس مرتبہ بھی اسی نادیدہ ہاتھ نے انگلی پکڑ کر نئی سمت اور نئی منزل کی راہ سجھائی۔ ایم اے اردو کا ارادہ کر لیا۔

ایم اے اردو کا امتحان دینے کا ارادہ کرنے اور امتحان دینے کے درمیان متعدد مراحل ہوتے ہیں۔ یہ سب کیسے طے ہوں' میں نے سبھی قابل ذکر بلکہ بیشتر ناقابل ذکر ادیب بھی پڑھ رکھے تھے مگر متعین نصاب کے مخصوص تقاضوں کے مطابق تیاری جداگانہ بات بلکہ جداگانہ مشکل تھی۔

حنیف رامے صاحب سے بات کی تو انہوں نے ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کے نام تعارفی رقعہ لکھ دیا اور کہا ''یہ اورینٹل کالج کے پروفیسر ہیں' ضرور راہنمائی کریں گے۔''

میں تعارفی رقعہ لے کر سمن آباد والے مکان میں شام کو ان سے ملا' کچھ اس طرح کی گفتگو ہوئی!

''مگر آپ ایم اے اردو کیسے کریں گے''

''جی! مجھے لکھنے پڑھنے کا شوق ہے' تنقیدی اور نفسیاتی نوعیت کے مضامین بھی لکھ چکا ہوں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے کیونکہ اکثر لڑکے تو درست اردو بھی نہیں لکھ سکتے۔''

''میں تو بچپن سے لکھ رہا ہوں۔''

''چلیں یوں کرتے ہیں میں کسی اچھے طالب علم سے آپ کو اپنے نوٹس لے دوں گا۔''

''یہ تو بہت ہی اچھا ہوگا۔''

''بلکہ وقار عظیم صاحب کے نوٹس بھی لے دوں گا۔''

''یہ تو اور بھی اچھا ہوگا۔''

''مگر---مگر لڑکے تو اپنے نوٹس نہ دیں گے۔''

''یہ تو ہے۔''

''تو یہ کرتے ہیں کہ آپ خاموشی سے میری کلاس میں آ کر بیٹھ جایا کیجئے۔''

''ٹھیک ہے۔''

''بلکہ میں وقار صاحب اور دوسرے اساتذہ سے بھی کہہ دوں گا۔ یوں آپ سب کی کلاسیں اٹینڈ کر سکیں گے۔''

''یہ تو بہت ہی اچھا ہو گا۔''

''لیکن سید صاحب (مراد ڈاکٹر سید عبداللہ) کو معلوم ہوا تو وہ ناراض ہو جائیں گے اچھا یوں کرتے ہیں......''

میں اس دائرہ در دائرہ کی گفتگو کی بھول بھلیوں میں ایسا الجھا کہ اٹھ کر آیا تو سمجھ نہ پایا کہ اس گفتگو کا حاصل کیا رہا؟ رائے صاحب کو بتایا تو انہوں نے ایک اور تعارفی رقعہ وقار عظیم صاحب کے نام لکھ دیا مگر میں ان سے نہ ملا' سوچا بے منت غیر ہی کام کرنا چاہیے اور بازار جا کر گذشتہ پانچ برس کے پرچوں کا سیٹ خریدا۔ بغور تقابلی مطالعہ کیا تو اندازہ ہوا کہ کچھ سوالات ہر برس کسی نہ کسی صورت میں آتے ہی ہیں جیسے باغ و بہار اور فسانہ عجائب/سحر البیان اور گلزار نسیم/ انیس اور دبیر کا تقابلی مطالعہ۔ غالب کے خطوط اور میر' غالب اور اقبال کے بارے میں بالعموم دہرائے جانے والے سوالات۔ فکشن کے پرچے میں جو نام شامل تھے ان سب کے ناول اور افسانے میں نے پڑھ رکھے تھے' تنقید البتہ ٹیڑھی کھیر تھی' واضح رہے کہ آج کے مقابلہ میں اس زمانہ میں تنقید کے پرچہ میں دوگنا زیادہ ناقدین اور متعدد افسانوں کا مطالعہ شامل تھا لیکن انگریزی پڑھنے کی سہولت حاصل تھی اس لئے میں نہ گھبرایا' یوں بے استاد خود ہی پڑھا' سمجھا' لکھا اور ۱۹۶۱ء میں سیکنڈ ڈویژن میں امتحان پاس کر لیا--- احسان ناخدا کے اٹھائے مری بلا.....

فرسٹ ڈویژن نہ آنے کی وجہ ایک تو میری بدخطی (ساتویں یعنی ایسے (essay) کے پرچہ کی پیشانی پر یہ نوٹ درج تھا: خوش خطی کا خاص خیال رکھیں) اور دوسری وجہ...... یہ دوسری وجہ تفصیل طلب ہے کہ میری مختصر ترین جذباتی زندگی کا یہ طویل ترین باب ہے۔ ایسا باب جو نصف سے زائد زندگی پر محیط ہے' اسے باب الفت کا نام دیا جا سکتا ہے۔

باب الفت:

اگرچہ سعیدہ میری زندگی میں اچانک داخل ہوئی مگر پھر بھی اس طرح نہیں جسے رومانی افسانوں کا ''حسین موڑ'' قرار دیا جاتا ہو' اسے یوں سمجھ لیجئے کہ اگرچہ انبالہ' راولپنڈی اور لاہور میں دونوں گھرانے آباد رہے تھے مگر متوازی خطوط کی مانند' سعیدہ کا بھائی رشید عالم انبالہ میں میرا ہم جماعت تھا' راولپنڈی میں البتہ تعلق کی ایک صورت یوں بنی کہ چھوٹی بہن شمیم اور سعیدہ کی چھوٹی بہن زہرہ سکول میں ہم جماعت تھیں مگر بڑوں کا میل ملاپ

نہ تھا اس کی صورت پیدا ہوئی اور عجب انداز میں۔

میں نے آپا جی کے بارے میں جو لکھا اس میں ان کی بڑھی ہوئی مذہبیت کا بطور خاص ذکر نہ کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے وظائف' دم درود اور دعا کی خاصی شہرت تھی اور عقیدت مند عورتوں کا ایک حلقہ تشکیل پا چکا تھا' مجھ ناہنجار کی ماں تھیں لہٰذا صاحب کرامات تو نہ تھیں لیکن میں متعدد ایسے امور/ واقعات/ حوادث/ سانحات کا چشم دید ہوں جہاں ان کی دعا نے ڈوبتی نیا پار لگائی۔ میں زمانۂ طالب علمی میں اچھا خاصا باغی سوشلسٹ تھا لہٰذا میں نے ان باتوں کو کبھی اہمیت نہ دی' وہ مجھے جب نماز روزہ کے معاملہ میں ٹوکتیں یا یہ کہتیں کہ ہر کام کے ارادہ سے پہلے انشاء اللہ کہا کرو تو میں خاصا چڑ تا۔

سعیدہ کے والد شیخ علی محمد کی منڈی میں دکان تھی جو کسی وجہ سے سیل کر دی گئی۔ ظاہر ہے سارے گھر والوں نے بے حد پریشان ہونا تھا۔ دونوں گھروں میں کام کرنے والی ملازمہ مشترک تھی۔ اس نے سعیدہ کی امی کو میری والدہ کے بارے میں بتایا۔ یوں وہ ہمارے گھر آئیں۔ پریشانی بیان کی' آپا جی نے دعا کی اور دکان کا معاملہ بخیر وخوبی حسب منشا طے پا گیا۔ یوں دونوں گھروں میں رابطہ کا آغاز ہوا۔ سعیدہ کی والدہ ہمیشہ آپا جی کی معتقد رہیں۔

اب جب آپا جی کی شخصیت کے اس پہلو کا ذکر ہو رہا ہے تو یہ بھی عرض کر دوں کہ جب لاہور آ گئے تو یہاں بھی ان کی عقیدت مند عورتوں کی کمی نہ رہی اور دعا سے وہ لوگوں کی خدمت کرتی رہیں۔ وہ روحانیت کے کس مقام پر تھیں میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن ان کی مستقبل بینی کا میں بھی قائل تھا۔

لاہور میں بھی دونوں گھرانوں میں تعلق رہا جس سے میں بے خبر تھا کہ میری زندگی میں گھر کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے:

میں لکھ چکا ہوں کہ "اس" سے قطع تعلق کا بے حد شدید جذباتی ردعمل ہوا' میں نے خود سے یہ پیمان باندھا کہ اب کسی لڑکی کو اتنے نزدیک نہ آنے دوں گا کہ پینگ چڑھ جائے اور پھر اعصابی مسئلہ بن جائے کہ اب مجھ میں مزید ڈپریسڈ ہونے کی سکت نہ رہی تھی' اس کا حل یہ تلاش کیا گیا کہ زن جوئی کے بجائے زن گریزی کا رویہ اپنایا جائے-- اس نتیجہ پر پہنچ کر میں پرسکون ہو گیا لیکن ــــــ اور یہ "لیکن" بہت بڑی ہے-- فلک در چہ خیال؟

سعیدہ سے پہلی مرتبہ ملنے پر جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے-- جیسا احساس ہوا۔ میری جلتی شخصیت کے لئے اس نے خنک شبنم کا کام کیا۔ میرے پُر تناؤ اعصاب جیسے ملائم اور آسودہ ہو گئے۔ میں اپنی دانست میں زن گریزی کی پختہ زمین پر مضبوطی سے قدم جمائے خود کو مستحکم محسوس کر رہا تھا۔ اچانک میں نے قدموں تلے سے

زمین کھسکتی محسوس کی۔ میں نے ساری عمر خود کو غیر جذباتی بنائے رکھنے کے لئے جو تپسیا کی تھی' وہ بھنگ ہوگئی' نہ میں وشوامتر تھا اور نہ وہ مینکا مگر' حال میرا بھی کچھ ایسا ہی ہوا کہ میں ایک پختہ کار جوان سے ایک ٹین ایجر بن کر رہ گیا اور وہ تمام حماقتیں کیں جن کا میں مذاق اڑایا کرتا تھا۔ فارغ ہوتا تو طرح طرح اس کا نام اپنی بدخطی کے مختلف اسالیب میں لکھتا رہتا' فون کی گھنٹی بجتی تو یہ سوچ کر کہ یہ اس کا فون ہوگا جسم میں عجیب مگر لذیذ لہر دوڑ جاتی' اعصاب پر عجیب سرشاری سی طاری رہتی' قیس نہ تھا مجنوں بھی نہ تھا مگر پھر بھی کچھ تھا۔

میں بائرن کا یہ قول بھی بھول گیا کہ محبت دو احمقوں کے درمیان غلط فہمی ہے اور یہ بھی کہ میں شادی کے خلاف رہا ہوں' میں گھر کی ذمہ داریاں اٹھانے کا اہل نہیں اور یہ بھی کہ مجھے بچے ناپسند ہیں بس مجھے تو یہ پرسکون احساس تھا کہ میری جلتی پیشانی پر مسیحا نے ٹھنڈا ہاتھ دھر دیا ہے اور تنے اعصاب اب پرسکون ہیں' بیمار کو قرار ہے! ہر چند کہ بیمار کو یہ علم بھی نہ تھا کہ مرض کیا ہے؟

دونوں گھروں میں میل ملاپ تھا۔ سعیدہ کو آپا جی بہت پسند کرتی تھیں' لیکن جب میں نے شادی کی بات کی تو پورے گھر نے سخت مخالفت کی' میرے لئے منفی ردعمل ناقابل فہم تھا ایک تو اس لئے کہ آٹھویں جماعت سے ہی میں اپنے معاملات میں بالعموم خود مختار رہا تھا' دوسرے اس لئے بھی کہ پہلے سارے گھر نے میری شادی کی رٹ لگا رکھی تھی' جب میں تیار ہوگیا تو سارا گھر مخالفت پر آمادہ ہوگیا (ادھر گھر والوں کا رویہ بھی منفی تھا' یہ معاملہ ڈیڑھ دو برس کے قریب چلا اور اس ضمن میں جو جو رکاوٹیں آئیں' کیسی کیسی پریشانیاں' گھر میں کتنے جھگڑے' اگر ان سب کا مفصل احوال قلم بند کروں تو اچھی خاصی پاکستانی فلم تیار ہوسکتی ہے البتہ ہم نے شملہ پہاڑی پر چڑھ کر گانے نہ گائے۔ ایک تو اس لئے کہ سعیدہ گا نہیں سکتی اور دوسرے اس لئے بھی کہ پاکستانی پولیس نے فحش حرکات کے الزام میں دھر لینا تھا۔

مذاکرات:

میں نے سعیدہ کے والد کو خط لکھا کہ میں ایک اہم مسئلہ کے بارے میں گفتگو کرنے کے لئے آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے گھر کے بجائے انارکلی کی ایک دکان میں ملنے کا پیغام بھجوایا۔ جیسے ہی میں وہاں پہنچا دو تین اور دکاندار بھی آ گئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سب معتبرین مجھے آنکنے کے لئے بلائے گئے ہیں۔ بڑے میاں میری توقع سے زیادہ تیز ثابت ہو رہے تھے۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ کو میرا خط ملا۔''

''بالکل نہیں۔''

''آپ سے کسی نے کوئی بات نہیں کی۔''

''نہیں تو۔''

میری کسی بات کا معقول جواب نہ مل رہا تھا۔ دائرہ میں گھومتی بے نتیجہ گفتگو سے میں تنگ آ گیا اور جب انہوں نے پوچھا۔

''تم آخر چاہتے کیا ہو؟''

تو میں نے ترت جواب دیا ''میں اور سعیدہ شادی کرنا چاہتے ہیں'' فلموں میں جب ایسا مکالمہ آ جائے تو پس منظر میں آرکسٹرا کی تیز جھنکار سنائی دیتی ہے مگر میرے اس بے باکانہ جواب نے سب کو ٹھنڈا کر دیا۔

اگلے ہفتہ ان کے ایک رشتہ دار کے گھر مذاکرات کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس مرتبہ خاندان کے تمام بزرگ مرد اور خواتین جمع تھیں۔ سلیم اختر vs برادری۔

مجھے اعتراف ہے کہ نہ میں بولڈ اینڈ بیوٹی فل تھا اور نہ ہی اس قسم کے ماحول اور مذاکرات سے عہدہ برائی کے لئے بے حد مضبوط اعصاب تھے مگر میں ان کے گھر جا پہنچا' نہ میکدہ' نہ ساقی' مکالمات کے خالی ساغر گردش میں رہے۔ قبلہ کسی طرح مان ہی نہ رہے تھے حتیٰ کہ میرے ضبط کا ساغر چھلک گیا اور میں نے غصہ سے کہا۔

''آپ کچھ بھی کر لیں' میں یہ شادی کر کے رہوں گا۔''

اس پر ہونے والا سسر کچھ بولا' جواب میں داماد بننے کا امیدوار بھی کچھ بولا۔ خاصی تلخ گفتگو ہوئی۔ میں غصہ میں بھرا وہاں سے اٹھ آیا۔ میں تنہا ہی یہ سب مذاکرات کر رہا تھا' میرے گھر والے بے خبر رہے ابتداً ادھر کی بڑی بوڑھیوں نے مجھے بے حد پسند کیا اور بتدریج میرے ووٹ بنک میں اضافہ ہوتا گیا اس حد تک کہ ایک دن دو بڑوں کی ''سمٹ'' طے پا گئی۔ کچھ اس طرح کی بات چیت ہوئی:

''کیا حال ہے شیخ صاحب!''

''آپ کیسے ہیں قاضی صاحب۔''

''یہ سلیم اختر کیا کرتا پھر رہا ہے۔''

''پتہ نہیں ادھر اپنی چھوکری کی بھی کچھ سمجھ نہیں آتی۔''

''سلیم کا بھی یہی حال ہے کوئی کام ٹک کر نہیں کر سکتا۔''

''اچھا؟ سعیدہ زبان کی بہت تیز ہے۔''

''سلیم بھی خاصا تیز مزاج ہے۔''

''دونوں کیسے نباہ کریں گے۔''

''یہ شادی نہیں چلے گی۔''

''یہ شادی نہیں ہونی چاہیے۔''

''یہ شادی نہیں ہو سکتی۔''

دونوں بزرگ تو مطمئن ہو گئے مگر مجھے آگ لگ گئی۔ جیسے جیسے رکاوٹیں بڑھ رہی تھیں ویسے ویسے ہی میری ضد (یا پھر جنون) میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بعد میں میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ شاید یہ مخالفت کے مقابلہ میں میری ضد ہی تھی جس نے نیا پار لگا دی۔ اس کا بھی امکان تھا کہ اگر دونوں گھر والے ہنسی خوشی مان جاتے تو عشق کا انار چلنے کے بجائے پھلجھڑی میں تبدیل ہو جاتا۔

برگردن راوی:

ایک دن ملی تو سخت پریشان

''کیا ہوا؟''

''انہوں نے تعویذ کرا دیے ہیں۔''

اس کی ایک کزن نے بتایا کہ تمہارے تکیہ کے نیچے تعویذ رکھے ہیں۔ واقعی تکیہ میں سے تعویذ برآمد ہوئے۔ میں نے تو قہقہہ لگایا اور کہا لاؤ میں ابھی ان تعویذوں کے پرزے کر دیتا ہوں۔ یہ تعویذ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے مگر وہ خاصی خوفزدہ تھی۔ چنانچہ ان معاملات میں تجربہ کار ایک عورت اندرون شہر کسی اور تعویذ والے کے پاس لے گئی جس نے بتایا کہ یہ ضرر رساں تعویذ ہیں۔ اس نے ان کے توڑ کے لئے اپنے پاس سے تعویذ دیے اور کہا کہ یہ مضر تعویذ راوی میں پھینک آؤ۔ میرا ان چیزوں پر اعتقاد نہ تھا ویسے بھی جسے عشق کا تیر کاری لگے وہ بھلا تعویذوں سے کیا ڈرے' لیکن اس کا خوف دیکھتے ہوئے میں نے تعویذ لے لیا اور چلا سائیکل پر سوئے راوی! پل کے درمیان رکا' جیب سے تعویذ نکالا اور اسے نیچے پھینک دیا۔ تعویذ کا کاغذ جیسے سلو موشن میں آہستہ آہستہ ڈولتا ہوا نیچے جا رہا تھا۔ میں کھڑا دیکھتا رہا۔ وہ آواز پیدا کئے بغیر پانی پر جا گرا اب بلائیں دریا برد!

راوی نے بہت کچھ سمیٹا ہو گا مگر ایسا تعویذ نہیں!

ہرڈل ریس:

ادھر یہ کھچڑی پک رہی تھی ادھر میں ایم اے اردو کی تیاری بھی کر رہا تھا۔ ایسے حالات میں تو ویسے ہی انسان کی مت ماری جاتی ہے۔ ایم اے اردو کی تیاری کیا خاک ہوتی' ویسے بھی میرا مستقبل ایم اے اردو سے وابستہ نہ تھا۔ نوٹس تیار کرنے کے بجائے' بے کلی دور کرنے کے لئے اسے لمبے لمبے خط لکھتا بعض پوسٹ کر دیتا بعض پھاڑ کر پھینک دیتا' ان دنوں وہ گلبرگ کے ایک سکول میں ٹیچر تھی۔ چھٹی سے پہلے میں گیٹ کے آگے موجود ہوتا۔ ملاقات کی صورت بنتی تو ٹھیک ورنہ بے مقصد گھومتا رہتا۔ شام ہو جاتی۔ گھر جانے کو جی نہ چاہتا تو یوں ہی بلا مقصد بس سٹاپ پر بیٹھا رہتا۔ گھر والوں سے بول چال تقریباً بند تھی۔ میں خارجی اور داخلی دو محاذوں پر تنہا لڑ رہا تھا۔

سال بھر کے بے نتیجہ مذاکرات اور مسلسل مخالفتوں کی بنا پر میں اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ نکاح کے جو دو بول ہیں یہ بزرگوں کی موجودگی میں نہ پڑھے جا سکیں گے لہٰذا عدالت میں نکاح کی ٹھانی' ناصر کا ایک دوست مجسٹریٹ تھا اس سے ملا۔ اسے جب یہ معلوم ہوا کہ لڑکی بالغ' تعلیم یافتہ اور سرکاری ملازم ہے تو اس نے کہا پھر تو کوئی وقت ہی نہیں جب ارادہ ہو میرے پاس آ جانا میں قانونی طریقے سے یوں شادی کراؤں گا کہ کوئی کچھ نہ کر سکے گا۔

اب تک میں نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا اس سے کم از کم اتنا تو واضح ہو گیا ہو گا کہ میں اگر کچھ کرنے کی ٹھان لوں تو پھر نتائج کی پرواہ کئے بغیر -- بے خطر کود پڑتا ہوں لیکن عدالت کی شادی سے میں یوں باز رہا کہ ایسی شادیوں کے بہت بڑے سکینڈلز بن جاتے ہیں اور سکینڈلز کے معاملہ میں لوگوں کی یادداشت غضب کی ہوتی ہے۔ نسیم کی شادی ہو چکی تھی۔ شمیم اور روبینہ کی ہونی تھی' میں نے سوچا اگر میری عدالتی شادی کے سکینڈلز کی زد میں نسیم آ گئی یا دونوں بہنوں کی شادی میں کھنڈت پڑ گئی تو ابا جی اور آپا جی کے لئے یہ بہت بڑا صدمہ ہو گا اور میں کبھی بھی خود کو معاف نہ کر سکوں گا۔ میں نے من مانی کرنی تھی لیکن اتنا خود غرض بھی نہ تھا کہ ابا جی اور آپا جی کو ناقابل برداشت اذیت دیتا' برا بیٹا سہی مگر خود غرض اور کمینہ نہ تھا۔ گھر والوں سے محبت کی اور والدین کی عزت بھی کی لیکن اپنے مخصوص ابنارمل انداز میں' اس لئے عدالت کی شادی سے باز رہا۔ یہ تھے وہ اعصابی تناؤ والے حالات اور کشیدہ ماحول جس میں میں نے ایم اے اردو کا امتحان دیا' پاس ہوا اور دسمبر ۱۹۶۱ء میں ایمرسن کالج ملتان میں تقرری کے لئے اپائنٹمنٹ لیٹر ملا۔

بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے

ان دنوں میں میر کے اس شعر کی عملی تشریح پیش کر رہا تھا۔ ملتان سے اتوار کی صبح کو ٹرین پر سوار ہوتا' دوپہر کے دو تین گھنٹے سعیدہ کے ساتھ گزارتا اور سہ پہر کی گاڑی پر سوار ہو کر رات کو ملتان واپس آ جاتا۔ نیا شہر' نیا ماحول' نیا انداز زیست اپنی جگہ مگر بے تابی دل اپنی جگہ' لاہور آ نہ پاتا تو لمبے لمبے خطوط جذباتی تموج کے لئے سکون آور ثابت ہوتے' شاعر ہوتا تو ایک عدد مثنوی ''قہر عشق'' لکھ چکا ہوتا۔

محبت کرنا یا محبت ہو جانا۔ اس میں کوئی کمال نہیں لیکن مقصود کو پانے میں اور وہ بھی ہمارے معاشرہ میں' رکاوٹوں کے جو ہفت خواں طے کرنا پڑتے ہیں ان کے باعث محبوبہ ایسی ٹرافی میں تبدیل ہو جاتی ہے جسے بہت کم خوش نصیب ہنڈرڈ میٹر سپرنٹ میں حاصل کر لیتے ہوں گے اکثریت کے لئے تو یہ میراتھن بن جاتی ہے جبکہ میں ان معدودے چند میں سے تھا جن کے لئے یہ ہرڈل ریس ثابت ہو رہی تھی اور کیسی ہرڈل ریس؟ رکاوٹوں پر رکاوٹیں' پریشانیوں پر پریشانیاں' مجھ کمزور اعصاب والے میں کہاں سے اتنی اعصابی توانائی آ گئی کہ ہر محاذ پر تنہا ہی نبرد آزما رہا۔ میں آج بھی حیرت زدہ ہو جاتا ہوں۔ ایک رکاوٹ کے بعد دوسری' ایک مسئلہ کے بعد دوسرا مسئلہ!

بہار کی چھٹیوں میں گھر آیا تو بزرگوں کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں غیر متوقع طور پر شادی طے پا گئی' غالباً دونوں گھرانوں نے سوچا کہ انہیں دفع کرو' اگر یہ خود ہی ڈوبنے پر تلے بیٹھے ہیں تو ہم انہیں کیوں منع کریں' اس قضیہ کی وجہ سے سال ڈیڑھ سال سے دونوں گھروں میں تناؤ کا ماحول پیدا ہو چکا تھا اسے بھی تو کسی طرح ختم کرنا تھا۔

بزرگوار مان تو گئے مگر دودھ کے ساتھ مینگنیوں والی مثل کو درست ثابت کر دیا۔ آپ نے Prenuptal contract کا سنا ہوگا۔ جب جیکولین نے اوناسس سے شادی کی تو قبل نکاح معاہدہ کی بہت شہرت ہوئی تھی۔ بس مجھ سے بھی سعیدہ کے والد ایک شرائط نامہ پر دستخط کے خواہاں تھے۔ شرائط کیا تھیں' یوں سمجھ لیجئے کہ مرچنٹ آف وینس کے شائلاک کی مانند ایک پونڈ گوشت کا ٹکڑا نہ مانگا۔ ایسا شرائط نامہ جس پر کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس دستخط نہ کر سکے اور نہ کسی عزیز کو اسے تسلیم کرنے کا مشورہ دے سکے۔

میں بدک گیا۔ سعیدہ نے شرائط نامہ سن کر صرف اتنا کہا کہ اگر مجھ پر اعتماد ہے تو دستخط کر دو' شادی روکنے کی یہ آخری چال ہے۔ میں نے اس شرائط نامہ پر جسے اسٹامپ پیپر پر قانونی دستاویز کی طرح لکھا گیا تھا خاموشی سے دستخط کر دیئے۔

میرے دوست اس شرائط نامہ پر بہت بدمزہ ہوئے۔ دو چار نے تو غصہ میں واک آؤٹ بھی کر دیا مگر ابا جی نے معاملہ فہمی سے کام لیا اور جن دو بولوں کے لئے جتن کئے جا رہے تھے وہ پڑھا دیئے گئے۔

پہلی رات میں نے کہا ''یہ شادی کرنے کے لئے جو کچھ کر سکتا تھا وہ کر دیا۔ اب اس شادی کو کامیاب تم نے بنانا ہے۔''

''بے فکر رہو'' وہ بولی۔ اور مجھے اس نے زندگی بھر کے لئے بے فکر کر دیا۔

یہ شرائط نامہ ازدواجی زندگی میں کسی طرح سے رکاوٹ نہ بنا کہ ہم دونوں نے بزرگوں کو خاطر میں نہ لائے بغیر اور ان سے دور رہ کر اپنی شرائط پر زندگی بسر کی اور خوب کی۔ بعد میں جب بیٹیوں والا بنا تو باپ کے طور پر اپنے خسر کے خدشات کو بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہو گیا' اب تو وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں' وہ شرائط نامہ بلکہ نکاح نامہ بھی گم ہو گیا مگر ہم دونوں موجود ہیں--ایک دوسرے کی پرچھائیں بنے۔

الفت کی منزل پر پہنچنے کے لئے یکم اپریل ۱۹۶۲ء کی تاریخ طے پائی۔ میں نے افراتفری میں عزیز دوستوں کو تار بھیجے۔ مگر ایک دوست بھی شادی میں شرکت کے لئے نہ آیا۔ سلیم اختر اور شادی؟ ناممکن! یقیناً یہ اپریل فول بنا رہا ہے۔ لطیفہ پر لطیفہ یہ ہوا کہ بد خریدنی یاد نہ رہی۔ ابا جی سمجھے میں خرید لایا ہوں گا میں نے سوچا ابا جی لے آئے ہوں گے۔ نکاح کے بعد چھوہارے تقسیم نہ ہوئے' بزرگوں نے اسے بہت بڑی بدشگونی جانا' لو جی کبھی دیکھا نہ سنا بد کے بغیر برات! جن بزرگوں نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ یہ شادی چھ ماہ سے زیادہ نہ چلے گی وہ اس بدشگونی کے باعث چھ ماہ کو چھ ہفتوں تک لے آئے۔

نعیم بخاری کے ٹیلی ویژن پروگرام۔ ''سٹوڈیو 2'' میں جہیز کے مسئلہ پر گفتگو کے لئے ایک پروگرام میں' میں بھی شریک گفتگو تھا۔ وہاں میں نے جہیز نہ لے جانے والی بات کی تو اس پر خوب قہقہے لگے۔ تذکرہ اس لئے کیا کہ شادی کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار جہیز' جوڑوں' زیورات' اور کھانوں پر نہیں ہوتا' سعیدہ کو جہیز میں کچھ نہ ملا' بری کے نام پر ہم نے بھی کوئی اہتمام نہ کیا۔ ولیمہ بھی کسی فائیو سٹار ہوٹل میں نہ ہوا لیکن ہم نے خوش و خرم بیالیس برس گزار کر بزرگوں کو اپنے عمل سے جھوٹا ثابت کر دیا اور یہ بھی کہ جہیز' بری' جہیز وغیرہ کا شادی کی کامیابی میں کوئی موثر اور فعال کردار نہیں ہوتا۔

اپریل تک میری تنخواہ جاری نہ ہوئی تھی لہٰذا میں نے شادی کے تمام اخراجات دوستوں سے قرضے لے کر پورے کئے۔ شادی کے بعد جسے ہنی مون پیریڈ کہا جاتا ہے' وہ ہم دونوں نے قرضے اتارنے میں صرف کیا۔۔۔ خوشی خوشی!

(جاری)

ٹ

غزلیں

تابشؔ دہلوی

بارِ حیات اٹھایئے تنہا اٹھایئے
یہ بوجھ آپ سے نہیں اٹھتا' اٹھایئے!!

وحشت میں خاک اڑانی ہی مقسوم ہے تو پھر
اک مشتِ خاک کیا سرِ صحرا اٹھایئے

ان خفتگانِ خاک کو ہمراہ لے چلیں
قدموں کے ساتھ نقشِ کفِ پا اٹھایئے

خونبار کربِ دید کے منظر ہیں رُوبرو
اب جس طرف بھی چشمِ تماشا اٹھایئے

بیمارِ عصر جلد شفایاب ہو سکے
گہوارہ سے اک اور مسیحا اٹھایئے

دنیا سے زندگی کا بڑا حوصلہ ملا
احساں کی طرح ہر غمِ دنیا اٹھایئے

نادیدہ منظروں کو اگر چاہیں دیکھنا
اپنی ہی ذات سے کوئی پردہ اٹھایئے

دل میں نفاذِ شوق کی طاقت کہاں سے لائیں
کوزہ میں کیا تلاطمِ دریا اٹھایئے

پامردیوں سے گزرے ہیں جو راہِ شوق میں
پلکوں سے ان کی گردِ کفِ پا اٹھایئے

تابشؔ سہارا لیجے نہ امید و بیم کا
تنہا کبھی حجابِ تمنا اٹھایئے

❊

ڈاکٹر وحید قریشی

اے دل ناتواں کدھر جائیں　　درد کے کارواں کدھر جائیں؟
آگ ہی آگ، شہر شہر عذاب　　اٹھ رہا ہے دھواں، کدھر جائیں؟
شہر خالی ہیں گاؤں بے آباد　　موت کے کارواں کدھر جائیں؟
کوئی منزل نہ کوئی زادِ سفر　　اب نئے پاسباں کدھر جائیں؟
شہر سونے ہیں، وادیاں خاموش　　شام عمر رواں کدھر جائیں؟
سر چھپانا بھی ہو گیا مشکل　　جون کی گرمیاں، کدھر جائیں؟

☆

ظفر اقبال

کہیں کسی بت رعنا پہ ہاتھ ڈالتے ہیں
سو اپنی ہم بھی کوئی واردات ڈالتے ہیں

کھلی ملی ہو اندھیرے میں روشنی باہم
چمک رہا ہے جو دن، اس میں رات ڈالتے ہیں

فسانہ اس کا ہے، لیکن بیان کرتے ہوئے
ہم اس میں اپنی بھی تھوڑی سی بات ڈالتے ہیں

تلاش کرتے ہیں روزن یہاں وہاں کوئی
کبھی کواڑ کے اوپر سے جھات ڈالتے ہیں

بنائیں گے کوئی آمیزہ اور ہی ڈھب کا
خمار ہجر میں خواب نشاط ڈالتے ہیں

یہ چارپائی اگر واقعی نہیں کافی
تو اور بھی کوئی چیز اس کے ساتھ ڈالتے ہیں

اگر معاملہ دنیا کا اور ہمارا ہے
تو آپ بیچ میں کیوں اپنی ذات ڈالتے ہیں

کبھی ہماری بھی ایک آدھ شرط مانتے وہ
سفارشیں جو ہمیں پانچ سات ڈالتے ہیں

سہولتیں جنہیں دیتے تھے ہم ہزار، ظفر
ہماری راہ میں وہ مشکلات ڈالتے ہیں

٭

سید مشکور حسین یاد

حق سے ہم آغوش ہے باطل ناخواستہ
وصل کی اک شکل ہے حاصل ناخواستہ

شاخِ تر و تازہ دل میں بٹھاؤ اسے
غم کا پرندہ کہ ہے نازل ناخواستہ

کیوں نہ دکھائیں اسے صورتِ سہل سرشت
سارا زمانہ کہ ہے مشکل ناخواستہ

آؤ اتر کر یہیں شہرِ شکایت بسائیں
آ جو گئی سامنے منزل ناخواستہ

خواہشوں کی صورتیں کیسے ہوں من مورتیں
ہم جو بناتے ہیں خواب با گِل ناخواستہ

پھر تو کئی چہروں نے پیار سے دیکھا ہمیں
شمع نے روشن جو کی محفل ناخواستہ

ہم نے تو جو کچھ کیا یادؔ کیا شوق سے
آیا نہ جینا ہمیں بادل ناخواستہ

٭

سید مشکور حسین یاد

کیا نظر ڈالیں کسی تکرار خو کے جسم پر
دائرے ہی دائرے ہیں آبرو کے جسم پر

آدمی کی گمرہی کا صاف دیتی ہیں پتا
الٹی سیدھی سی لکیریں چار سو کے جسم پر

کچھ نہیں معلوم چپ ہے کون، چلاتا ہے کون؟
خامشی کے زخم دیکھو ہا و ہو کے جسم پر

خاک کو عرشِ بریں پر کیوں نہ لے جائے کوئی
آسماں اترے ہوں جبکہ آرزو کے جسم پر

ہم تو سمجھے تھے سکوتِ بیکراں ہے حرف حرف
ایک ہنگامہ بپا ہے گفتگو کے جسم پر

بہہ گیا ہے سارا پانی جانفشانی کی طرح
اور داغِ ناتمامی ہے لہو کے جسم پر

سولی پہ ہے روحِ عالم اے بہارِ تازہ کار
باغ ہے ٹھہرا ہوا سرو نمو کے جسم پر

مے کے اندر کے سمندر کی خبر کیونکر ملے
جب نشے کے شیشے ہوں جام و سبو کے جسم پر

اب ہماری جان کو ہر وقت برقاتی ہیں یادؔ
تھیں کبھی کی جتنی باتیں بھی کبھو کے جسم پر

٭

تاب اسلم

اُس کو دل کا حال سنایا جا سکتا ہے
پتھر سے شیشہ ٹکرایا جا سکتا ہے

آنکھوں سے پانی کی کوئی بوند نہ برسے
یوں بھی جشن ہجر منایا جا سکتا ہے

جس کے قرب میں میں نے ساری عمر گزاری
اُس کو کیسے جی سے بھلایا جا سکتا ہے

اپنا جسم تو مٹی کا اک ڈھیر ہے لوگو!
بارش سے کب اس کو بچایا جا سکتا ہے

مانا آج کی رات بہت تاریک ہے، پھر بھی
ایک دیا تو گھر میں جلایا جا سکتا ہے

ہم بھی اپنی ناؤ کو تیار کریں تو
دریا کے اُس پار بھی جایا جا سکتا ہے

حسن تو اک خوشبو کی لہر جو ہاتھ نہ آئے
دل کو لیکن کب سمجھایا جا سکتا ہے

آنسو بن کے بول اٹھتی ہیں آخر آنکھیں
کب تک دردِ ہجر چھپایا جا سکتا ہے

اے دھرتی پر خوں کی لکیریں کھینچنے والو!
اس پر امن کا گیت بھی گایا جا سکتا ہے

وہ جو نہیں تو اب بھی بیٹھ کے تنہائی میں
یادوں کا اک شہر بسایا جا سکتا ہے

اپنی زیست کا بوجھ ہے تابؔ پہاڑوں جیسا
کب تک اس کو سر پہ اٹھایا جا سکتا ہے

٭

سید مشکور حسین یادؔ

جس کو پڑھنے کی ہم میں قدرت ہے
عاشقی وہ نماز ندرت ہے

مجھ کو مجھ سے نہ دور ہونے دیا
یہی تو اس کی خوئے قربت ہے

اب ہمیں کون دیکھ پائے گا
میں قیامت ہوں تو قیامت ہے

دیکھو دیدہ وران شہرہ وری
یہاں ہر شے شبیہ شہرت ہے

کس میں جرأت ہے بات سننے کی
کون مست الست فرصت ہے

میری ہر سانس میں رواں ہیں رموز
میری ہر سانس جان جدت ہے

یادؔ ہم کو بہت ازاتی ہے
شامہ کی یہی تو شدت ہے

٭

انور مسعود

میں دیکھ بھی نہ سکا میرے گرد کیا کیا تھا
کہ جس مقام پہ میں تھا وہاں اجالا تھا

درست ہے کہ وہ جنگل کی آگ تھی لیکن
وہیں قریب ہی دریا بھی اک گزرتا تھا

سنا ہے لوگ بہت سے ملے تھے رستے میں
مری نظر سے تو بس ایک شخص گزرا تھا

مہک رہا ہے چمن کی طرح وہ آئینہ
کہ جس میں تو نے کبھی اپنا روپ دیکھا تھا

الجھ پڑی تھی مقدر سے آرزو میری
دمِ فراق اسے روکنا بھی چاہا تھا

تم آ گئے تو چمکنے لگی ہیں دیواریں
ابھی ابھی تو یہاں پر بڑا اندھیرا تھا

گھٹا اٹھی ہے تو پھر یاد آ گیا انور
عجیب شخص تھا اکثر اداس رہتا تھا

☆

خادم رزمی

یہ کون سا دور ہے جسے پار کر رہا ہوں؟
کہ اپنے موجود سے بھی انکار کر رہا ہوں

یہ کس ہوا کی گرفت میں ان دنوں ہوں میں بھی
جو اپنے ہاتھوں سے خود کو مسمار کر رہا ہوں

بتا کے ہر بھید اپنے دشمن کے مخبروں کو
میں اپنی ہر چال آپ بے کار کر رہا ہوں

میں دست کش ہو رہا ہوں جینے کی آرزو سے
کہ اپنی پسپائیوں کا اقرار کر رہا ہوں

مجھے ڈبونا ہے جس نے اک دن یہ جان کر بھی
اُسی ہوا کو میں اپنے پتوار کر رہا ہوں

یہ سادگی ہے مری، کہ زعم دلاوری ہے
کہ اپنے غافل عدو کو ہشیار کر رہا ہوں

بہت ضروری تھا وہ جہاں ایک در کا رکھنا
وہاں بھی تعمیر ایک دیوار کر رہا ہوں

غبار ہے اک یہاں، فقط حاصل مسافت
سفر جو میں کر رہا ہوں، بیکار کر رہا ہوں

یہ اجنبی کون آئینے میں ہے آشنا سا
یہ اپنی صورت میں کس کا دیدار کر رہا ہوں

نہ ہے نہ ہوگا، نہ تھا کبھی وہ جو پہلے میرا
یہ جان کر بھی اُسی سے کیوں پیار کر رہا ہوں

اُڑا رہا ہوں جو آپ اپنا غبار رزمی
میں اپنی موجودگی کا اظہار کر رہا ہوں

٭

خادم رزمی

علامتیں وہ نہیں ہیں ان میں، کہیں اشارے نہیں ملے ہیں
مرے کنارے کے جو نشاں تھے، وہ اس کنارے نہیں ملے ہیں

جو قربتوں میں بھی دوریاں ہو رہی ہیں محسوس، بات یہ ہے
فقط بدن مل گئے ہیں دونوں کے، پر، ستارے نہیں ملے ہیں

فراتِ ہستی کے، یوں ، بہاؤ کا بھید کھلتا نہیں کسی پر
جدا ہوئے ہیں جو ایک دوجے سے، پھر وہ دھارے نہیں ملے ہیں

گئی رُتیں لوٹ کر ملی ہیں مجھے، مگر گردشِ زمانہ!
بچھڑ گئے ہیں جو مجھ سے اک بار، پھر وہ پیارے نہیں ملے ہیں

سبب ہے اس کا فقط یہی، کہ رہیں تعاقب میں کچھ ہوائیں
جو آنے والوں کو راہ میں نقشِ پا ہمارے نہیں ملے ہیں

جو یوں ہوا میں پکارتے پھر رہے ہیں پتے شجر کے، شاید!
ابھی انہیں کچھ تلاش کرتے وہ دھوپ مارے نہیں ملے ہیں
جو مل گئے ہیں، انہیں غنیمت سمجھ کے، دل میں بسا لو، رزمی!
نشان جیتی، بھلی رُتوں کے اگر وہ سارے نہیں ملے ہیں

٭

خادم رزمی

فریب خوردہ بیان رہگذار ہیں ہم
سفر کہاں، کسی آسیب کا شکار ہیں ہم
جدھر چلے ہے، اُدھر ہی کو اپنا رُخ کر لیں
گرفت باد میں آیا ہوا غبار ہیں ہم
خبر نہیں کہ پریشانیاں ہیں کس دل کی!
نجانے کونسی آنکھوں کا انتظار ہیں ہم
زباں سے کہتے ہیں اب بھی جسے کہ اپنا ہے
اُسی دیار میں رہ کر بھی "بے دیار" ہیں ہم
ہمیں نہ دیکھ اُچٹتی نظر سے یوں، جیون!
کہ جس بھی حال میں ہیں، تیرا اعتبار ہیں ہم
نہیں ہے درد شناسا، جہاں کوئی اک بھی
کسے بتائیں یہاں کتنے دل فگار ہیں ہم
مہکتی رُت کے جو سپنے تھے، ہیں وہی رزمی!
یہ اور بات، ابھی تک تو بے بہار ہیں ہم

٭

خادم رزمی

قہقہہ خود ہی سُنا اپنی ہی ناداری کا
میں نے سوچا جو کبھی تیری خریداری کا
کار غم اور فزوں تر ہوا پیری میں مری
میں نے سمجھا تھا جسے وقت ہے بیکاری کا
میں کہ مجبوری انساں پہ ہنسا ہوں اکثر
مجھ کو اقرار ہے اس اپنی گنہگاری کا
میری افتاد طبیعت ہے، نہیں ہے احساں
میں نے لُٹ کر بھی بھرم رکھا ہے جس یاری کا
سر جھکایا نہ ترے ظلم پہ جس نے اپنا
دیکھ! قبضہ ہے جہاں پر، اُسی انکاری کا
یوں جو بیزار مسیحا ہوں، مجھے ہے معلوم
موت ہی اب ہے مداوا مری بیماری کا
تم جسے جشن چراغاں کا سمے کہتے ہو
مجھ سے پُوچھو یہ موسم ہے عزاداری کا

٭

شبنم شکیل

منظر سے مرے دل کے وہ ہٹتا ہی نہیں ہے
وہ شعر جو میں نے کبھی لکھا ہی نہیں ہے

کچھ منزلیں اب اپنا پتہ بھی نہیں دیتیں
اور راستہ ایسا ہے کہ کٹتا ہی نہیں ہے

اک نقش کہ بن بن کے بگڑتا ہی رہا ہے
اک خواب کہ پورا کبھی ہوتا ہی نہیں ہے

کیا ہم پہ گزرتی ہے تمہیں کیسے بتائیں
تم نے تو پلٹ کر کبھی پوچھا ہی نہیں ہے

اک عمر گنوائی ہے تو پھر دل کو ملا ہے
وہ درد کہ جس کا کوئی چارہ ہی نہیں ہے

یہ عشق کی وادی ہے قدم اس میں نہ رکھنا
اس راہ سے واپس کوئی آتا ہی نہیں ہے

ڈھونڈے سے خدا ملتا ہے انسان ہے وہ تو
تم نے کبھی شبنم اسے ڈھونڈا ہی نہیں ہے

☆

امجد اسلام امجدؔ

چراغ جلتے رہیں یا ہوا ٹھہر جائے
تری نگاہ پہ ہر سلسلہ ٹھہر جائے

کسی بھی حرف میں تاثیر ہی نہیں رہتی
دلوں کے بیچ اگر فاصلہ ٹھہر جائے

ترے سلوک سے ہوتا نہیں یہ اندازہ
کوئی رکے تری محفل میں یا ٹھہر جائے

کسی کے وصل کا آیا نہیں ابھی موسم
کوئی بہار سے کہہ دو ذرا ٹھہر جائے

فنا کا کھیل ہے ہستی تو کیسی ممکن ہے!
زوال عمر کا یہ سلسلہ ٹھہر جائے

شب وصال میں کیسا عجب کرشمہ ہوا!
مقابل اس کے اگر آئینہ ٹھہر جائے

پلٹ کے آئیں زمانے وہی محبت کے
کہ رنگ چلنے لگیں اور صبا ٹھہر جائے

کسی کا ساتھ ملے اور اس طرح امجدؔ
کہ وقت چلتا رہے، راستہ ٹھہر جائے

☆

افتخار عارف

کچھ بھی نہیں، کہیں نہیں خواب کے اختیار میں
رات گزار دی گئی صبح کے انتظار میں

وقت کی ٹھوکروں میں ہے عقدہ کشائیوں کا زعم
کیسی الجھ رہی ہے ڈور ناخن ہوشیار میں

باب عطا کے سامنے اہل کمال کا ہجوم
جن کو تھا سرکشی پہ ناز وہ بھی اسی قطار میں

جیسے فساد خون سے جلد بدن پہ داغ برص
دل کی سیاہیاں بھی ہیں دامن داغ دار میں

جن کے علم تھے سربلند جن کے قلم تھے سرخرو
کل بھی محاصرے میں تھے آج بھی ہیں حصار میں

جیسی لگی تھی دل میں آگ ویسی غزل نہیں بنی
لفظ سنبھل نہیں سکے درد کی تیز دھار میں

٭

سرمد صہبائی

ہر سفر کے بعد ویسا ہی سفر رکھا گیا
اور پھر مقسوم میرا دربدر رکھا گیا

عرصۂ دشتِ طلب کو انتہا بخشی گئی
مہلتِ عمرِ رواں کو مختصر رکھا گیا

ہم کہاں سینے کی تہہ میں یہ سمندر تھامتے
ایک اس خاطر تجھے اے چشمِ تر رکھا گیا

بوسۂ خورشید سے کھولا سحر کا پیرہن
زانوئے شب پر مہِ کامل کا سر رکھا گیا

مضطرب رہتی ہے کوہ و دشت میں جیسے ہوا
اس طرح سینے میں سانسوں کا گزر رکھا گیا

آتے جاتے ہر نفس میں موت کا تھا ذائقہ
رائیگاں جینے میں مرنے کا ہنر رکھا گیا

ان کے رستوں پر بچھائی نارسائی کی تھکن
نیند کی دہلیز پر خوابوں کا پر رکھا گیا

حاصلِ جاں پر خس و خاشاکِ حسرت کھینچ کر
درمیاں اس دل کے خواہش کا شرر رکھا گیا

عمر بھر سرمدؔ تھی جس کو یاد رکھنے کی سزا
سامنا اس شخص سے اک لمحہ بھر رکھا گیا

خالد اقبال یاسر

ظلم کی ظلم ہی سے تلافی ہوئی
موت پر زندگی کی معافی ہوئی

جو ہوئی عاشقوں سے درِ حسن پر
عشق کے مرتبے کے منافی ہوئی

گرمیِ شعلہ فشانؔ بے نیاز آسماں
آنسوؤں کی جھڑیؔ انعطافی ہوئی

یہ مقامِ آہ و زاری سے آگے کا ہے
کوئی اٹھے کہ خاقان! کافی ہوئی

مسئلہ طے ہی تھا اپنی دانست میں
ایک سے ایک الجھن اضافی ہوئی

اپنے اپنے ہدفؔ اپنی اپنی حدیں
پیش قدمی کہاں انحرافی ہوئی

آنکھ نیچی رکھیؔ دست بستہ رہے
اک نظر جانے کب اختلافی ہوئی

قہرِ آشور نے یونہی توڑا نہیں
جانے انجانے میں انصرافی ہوئی

بولتا ہے زمانہ بھی تیری زباں
میری ہر التجا موشگافی ہوئی

اصطلاحیں تری ہیںؔ معانی ترے
میری دانش تو لافی گزافی ہوئی

تیرے سیارچےؔ نشر گاہیں تری
انکشافی کہانی بھی خافی ہوئی

مجرم و منصف و مستغیث آپ ہی
خود سے ہی گفتگو اعترافی ہوئی

کیوں نہ تیکھی نظر فتنے برپا کرے
شوخ انگڑی جو تیری غلافی ہوئی

ابروؤں کا اشارہ تو دو ٹوک تھا
مجھ سے تعبیر لیکن قیافی ہوئی

ہر دریچے کو تاکا ترا جان کر — تو یہ سمجھا کہ وعدہ خلافی ہوئی
دولت عقل رکھتے رہے سینت کر — خرچ کی جب ذرا سی اضافی ہوئی
قصر میں خود کو مامون سمجھا کیے — یورش دشمناں اکتنافی ہوئی
کون دن تھے اکھڑتے قدم جم گئے — دم بہ دم ایک آواز کافی ہوئی
پاس کانوں کے ناقوس بجتے رہے — دل کی دھیمی صدا اکتشافی ہوئی
جاگتے روز و شب اور شور و شغب — طبع کس حال میں اعتکافی ہوئی
سانپ کے زہر نے جب دکھایا اثر — زہر کی ایک خوراک شافی ہوئی
منتشر ذہن، فاسد لہو کے لیے — ایک دردوں بھری تان، صافی ہوئی
آبیاری محبت کی نفرت نے کی — تار ظلمات سے نور بافی ہوئی
سارے اوزان و ارکاں تھے خاطر نشاں — ترجمانی زباں سے زحافی ہوئی
جو بھی کہنا تھا یاسرؔ وہ کہہ تو دیا — شدت جذب نذر قوافی ہوئی

٭

۹ / ۱۱ کے بعد

منصور ملتانی

شہر جاں میں کیسے ٹھہروں جب شناسائی نہ ہو
کوئی مجھ کو روک لینے کا تمنائی نہ ہو

مان لیتا ہوں کہ میں ہوں مجرم آوارگی
گردش ایام جا تیری بھی رسوائی نہ ہو

محفلوں میں بڑھ رہا ہے قہقہوں کا شور و غل
پھر کسی کی تاک میں صدیوں کی تنہائی نہ ہو

شہر ناپرساں کا منصف عقل سے ہو گا تہی
دیدہ ور ٹھہرے گا جس کے پاس بینائی نہ ہو

فکر آہوئے رمیدہ ہے سروشت خیال
کیسے ہاتھ آئے اگر زنجیر گویائی نہ ہو

منتظر ہوتی ہے منزل اس مسافر کے لئے
جس کی راہوں پر تمازت دور تک آئی نہ ہو

چاندنی میں رقص کرنا آئینے کے سامنے
اور پھر ڈرنا کہیں کوئی تماشائی نہ ہو

وسعت قلب و نظر ہوتی نہیں اس میں کبھی
اپنی دیوار انا جس شخص نے ڈھائی نہ ہو

کیوں سوئے مقتل رواں ہیں لوگ بن کر ٹولیاں
پھر کسی منصورؔ کی رسم پذیرائی نہ ہو

٭

منصور ملتانی

سر محفل کسی کی انجمن آرائیاں دیکھو
جو دشت ذات میں اترو تو پھر تنہائیاں دیکھو

تمہیں دعویٰ ہے مجھ سے گر ذرا بھی آشنائی کا
برا کہہ لو مگر پہلے مری اچھائیاں دیکھو

تمہاری چاہ میں کر لی ہے خود اپنی نفی میں نے
مجھے کیا دیکھنا ہے اب مری رسوائیاں دیکھو

جمال یار کے بس ایک جلوے کی مسیحائی
بجھی آنکھوں میں روشن ہو گئیں بینائیاں دیکھو

گزرتا وقت دے جاتا ہے یہ بے چہرگی کیسی
اٹھاؤ آئینہ اور اپنی ہی پرچھائیاں دیکھو

زمانہ چل رہا ہے چال کیسی کیا خبر تم کو
کبھی دیوار پر لکھی ہوئی سچائیاں دیکھو

نہیں آسان بسنا چاہنے والوں کی آنکھوں میں
اگر جھیلوں میں اترے ہو تو پھر گہرائیاں دیکھو

کبھی اوطاق کے چوپال کے چہروں کو بھی پڑھ لو
کبھی تو سلوٹوں میں بھی چھپی دانائیاں دیکھو

پھر اس نے ڈھونڈ لی ہے مختصر سی راہ منزل کی
جسے منصورؔ کہتے ہیں بڑا ہے کائیاں دیکھو

٭

منصور آفاق

اک بین دیکھتے ہیں زمیں پر پڑے پڑے — پتھرا گئے ہیں قلم میں منظر پڑے پڑے

کیسا ہے کائنات کی تہذیب کن کا آرٹ — شکلیں بدلتے رہتے ہیں پتھر پڑے پڑے

اے زلفِ سایہ دار تری دوپہر کی خیر — جلتا رہا ہوں چھاؤں میں دن بھر پڑے پڑے

ویراں کدے میں جھانکتے کیا ہو نگاہ کے — صحرا سا ہو گیا ہے سمندر پڑے پڑے

ہو چکا تھا منتظر ہے مرا کون شہر میں — دیکھا تو شام ہو گئی گھر پہ پڑے پڑے

دستکوں کے انتظار میں اے کھڑکیوں کی یار؟ — بوسیدہ ہو گیا مرا بستر پڑے پڑے

منصور کوئی ذات کا تابوت کھول دے — میں مر رہا ہوں اپنے ہی اندر پڑے پڑے

٭

منصور آفاق

کچھ ہڈیاں پڑی ہوئی، کچھ ڈھیر ماس کے — کچھ گھوم پھر رہے ہیں مشینچو لباس کے

فٹ پاتھ بھی درست نہیں مال روڈ کا — ٹوٹے ہوئے ہیں بلب بھی چیرنگ کراس کے

پھر جنگ اوور ایک تجھے رات سے ملا — پھر پاؤں میں سفر وہی صحرا کی پیاس کے

ہنگامہ شراب کی صبح خراب سے — اچھے تعلقات ہیں ٹوٹے گلاس کے

کیوں شور ہو رہا ہے مرے گرد و پیش میں — کیا لوگ کہہ رہے ہیں مرے آس پاس کے

٭

منصور آفاق

وہ بوند بوند گل تلف کر رہا ہے کوئی — شبِ فراق کا اسراف کر رہا ہے کوئی

نکھرتی جاتی ہے شبنم اداس آنکھوں میں — کسی گلاب کو ہی آف کر رہا ہے کوئی

گرا رہے ہیں در و بام چند بلڈوزر — سنا ہے شہر مرا صاف کر رہا ہے کوئی

تنا رہا ہے بدن کی نزاکتوں کا ناپ
بیان حسن کے اوصاف کر رہا ہے کوئی

بڑھا رہا ہے سرِ شام وصل کی خواہش
وہ روشنی کا سوئچ آف کر رہا ہے کوئی

بڑھا رہا ہے محبت کے وائرس منصورؔ
شبِ وصال سے انصاف کر رہا ہے کوئی

٭

منصور آفاق

تیرے کرنوں والے بنت میں رات کرنا چاہتی ہے
ساحلوں پر زندگی سن باتھ کرنا چاہتی ہے

اپنے بنگلوں کے سوئمنگ پول کی تیراک لڑکی
میرے دریا میں بسر اوقات کرنا چاہتی ہے

وقت کی رہ میں فراغت کا نہیں ہے کوئی لمحہ
اور اک بڑھیا کسی سے بات کرنا چاہتی ہے

چاہتا ہوں میں بھی بوسے پنکھڑیوں کی لاٹری کے
وہ بھی ملین پونڈ کی برسات کرنا چاہتی ہے

مانگتا پھرتا ہوں میں بھی لمس کا موسم کہیں سے
وہ بھی اپنے جسم کی خیرات کرنا چاہتی ہے

٭

منصور آفاق

کلی لبادۂ تزئین سے نکل آئی
سفید آگ یہ جبین سے نکل آئی

دکھائی فلم کسی نے وصال کی پہلے
پھر اس کے بعد وہ سکرین سے نکل آئی

بلا کا دکھ تھا کسی قبر کا مجھے لیکن
بہار پھول کی تدفین سے نکل آئی

اسے خرید لیا مولوی کفایت نے
جو نیکی سینۂ کرم دین سے نکل آئی

سنا ہے حسن کے پہلو میں سو رہا ہے حسن
شبِ فراق خواتین سے نکل آئی

انہیں بھی زعم ہے تنقیص کی وراثت پہ
طبیعت اپنی بھی تحسین سے نکل آئی

گزر ہوا ہے جہاں سے بھی فوج کا منصورؔ
زمین گھاس کے قالین سے نکل آئی

٭

منصور آفاق

بھر گئی تھی بیسمنٹ نیکیوں کے شور سے
کہہ رہا تھا کون کیا، ساتویں فلور سے

نیم گرم دودھ کے ٹب میں میرے جسم کا
روشنی مساج کر اپنی پور پور سے

زاویہ وصال کا رد نہ جائے ایک بھی
شاد کام جسم ہو لمس کے سکور سے

فاختہ کے خون سے ہونٹ اپنے سرخ رکھ
فائروں کے گیت سن اپنی بارہ بور سے

بام بام روشنی پول پول لائٹیں
رابطے رہے نہیں چاند کے چکور سے

وحشتِ گناہ سے نوچ لے لباس کو
نیکیوں کی پوٹلی کھول زور زور سے

واعظوں کی ناف پر کسبیوں کے ہاتھ ہیں
کوتوال شہر کی دوستی ہے چور سے

شیر کے شکار پر جانے والی توپ کی
رات بھر بڑی رہی بات چیت مور سے

✲

یاسمین حبیب

آنکھ میں دم توڑتی خواہش نئی کھینچی ہوئی
حسرتوں کی دار پر ہے زندگی کھینچی ہوئی

رات کے تاریک پردے پر چلا کرتی ہے وہ
انتظار وصل کی ساعت کوئی کھینچی ہوئی

دھوپ میں کیوں جھلملاتی ہے ہوا کے دوش پر
میرے دوپٹے پہ کوئی پھلجھڑی کھینچی ہوئی

بجھتے رنگوں سے تراشی میں نے خود شام فراق
میرے ہاتھوں میں لکیریں ہیں مری کھینچی ہوئی

دم گھٹا جاتا تھا، اتنا حبس تنہائی میں تھا
اور سینے میں فقط اک سانس تھی کھینچی ہوئی

دور تک ڈھانپا ہوا تھا برف سے یوں راستہ
انتظاروں کی کوئی تصویر سی کھینچی ہوئی

جانے کس بہروپ کا پردہ اٹھا تھا نیند میں
خواب تھا یا شکل کوئی خوف کی کھینچی ہوئی

اک سنہرے چوکھٹے میں بولتی ہے میرے ساتھ
شکل اس کے ہاتھ کی اک سرسری کھینچی ہوئی

٭

یاسمین حبیب

گزر رہا ہے رفاقت کا سانحہ مجھ پر
ہے مہربان بہت آج کل خدا مجھ پر

میں ایک صرف شدہ لمس چھوڑ آئی ہوں
کسی پرانے تعلق کا بوجھ تھا مجھ پر

مری اکائی میں رہتا تھا اک زمانے سے
ہوا ہے منکشف مجھ میں جو دوسرا مجھ پر

دکھائی دینے لگا ہے فلک سے آگے بھی
کھلا ہے کیسا اچانک یہ راستہ مجھ پر

ہوا چمکنے لگی یوں بدن سنہرا ہوا
یہ کون سونے کا پانی چڑھا گیا مجھ پر

رکھے ہیں خواب بھی گروی مگر چکا نہ سکی
عجیب قرض کہ ہیں واجب الادا مجھ پر

نظر میں کیسے یہ خوشبو بھرے گلاب کھلے
کہ خشک پتے گرانے لگی ہوا مجھ پر

اترتی جاتی ہے مٹی میں میری پیشانی
عجیب سلسلہ سجدوں کا ہے روا مجھ پر

یہ کون ان دنوں پہچان بن گیا ہے مری؟
یہ کس نے نام کا کتبہ لگا دیا مجھ پر؟

٭

یاسمین حبیب

زخم سینے میں ہے، جال اس کے علاوہ بھی ہے
جاں بلب تیرا غزال اس کے علاوہ بھی ہے

شام کی قبر میں مرتے ہوئے سورج کو نہ دیکھ
زندگی رو بہ زوال اس کے علاوہ بھی ہے

ایک تو چاک گریباں ہے مری روح تلک
ایک اشکوں جڑی شال اس کے علاوہ بھی ہے

اک برس وہ تھا جو دنیا کی نظر میں گزرا
ایک بیتا ہوا سال اس کے علاوہ بھی ہے

صرف اک وصل کی پابند نہیں ہے نسبت
تجھ سے وابستہ خیال اس کے علاوہ بھی ہے

میں فقط پا بہ سلاسل ہی نہیں رقص کناں
پاؤں میں ایک دھمال اس کے علاوہ بھی ہے

خواب کھو دینے کا دکھ اپنی جگہ ہے لیکن
شب گزیدہ کا ملال اس کے علاوہ بھی ہے

یوں تو ہر حرف کے پتھر نے اسے توڑا ہے
دل کے آئینے میں بال اس کے علاوہ بھی ہے

دل میں موجود ہے تو داغ کی صورت لیکن
ہجر میں ایک وصال اس کے علاوہ بھی ہے

اک مرا پوچھتی ہے میری پریشاں حالی
اک مُرا خود سے سوال اس کے علاوہ بھی ہے

کچھ تو اس ذات کے پیوند ابھی باقی ہیں
کچھ محبت کا وبال اس کے علاوہ بھی ہے

میں بھی ہوں اور چناروں کا سلگتا پن بھی
تیرے ہونے کی مثال اس کے علاوہ بھی ہے

یہ کوئی کم تو نہیں نقشِ حبہ آب ہوئے
بہتے دریا کا کمال اس کے علاوہ بھی ہے

بے گھری بھی ہے، صعوبت بھی، سفر بھی ہے نیا
اک مگر عرصۂ حال اس کے علاوہ بھی ہے

(اسد ضیا کی زمین میں)

٭

یاسمین حبیب

سفر کی گرد گھر تک آ گئی ہے
دریچوں پر بہت مٹی جمی ہے

اندھیرے میں نظر آتا ہے مجھ کو
مرے اندر یہ کیسی روشنی ہے

طوالت شام کی مت پوچھ مجھ سے
ابھی تک آسماں پر ''لالگی'' ہے

میں اب تو نیند میں چلنے لگی ہوں
سفر کی ایسی عادت ہو گئی ہے

میں پھر اپنا سمجھ بیٹھی ہوں اس کو
مری دانستہ پھر اک خودکشی ہے

معمے حل کہاں ہوتے ہیں مجھ سے
فقط تنہائی کی خانہ پری ہے

میسر ہے ہر اک سوغات مجھ کو
مگر پھر بھی کہیں کوئی کمی ہے

٭

یاسمین حبیب

نام سے جس کے، بدن میں جھرجھری آتی رہی
وقت یہ آیا کہ اس کی یاد بھی جاتی رہی

یوں خزاں کی چیونٹیاں چمٹیں زمیں کی کوکھ سے
فصل گل بے چین تھی راتوں کو چلاتی رہی

ایک نقطے پر ملے احساس کے سب زاویے
دائرہ میں درد کی تصویر لہراتی رہی

اس نظر کی دھوپ کا لکھنا پڑا ہے مرثیہ
عمر بھر جو منجمد سوچوں کو پگھلاتی رہی

منزل شہر تمنا دسترس میں تھی مگر
آرزو کو راستے میں نیند آجاتی رہی

اس طرح جاڑا کوئی لپٹا رہا کہ عمر بھر
گرم پانی سے بھری بوتل کو سہلاتی رہی

٭

یاسمین حبیب

اک مجسم آبلہ، تکمیل کا غماز تھا
خواب سے لتھڑے سفر کا اور ہی انداز تھا

جانے کن تاریکیوں میں کھو گیا ہے ٹوٹ کر
جس ستارے پر کسی قسمت جلے کو ناز تھا

خامشی کی باولی بیوہ بھی ششدر رہ گئی
خالی منظر میں یہ کس کا چہرۂ آواز تھا

حسرتوں کی جا بجا گہرائیاں تھیں پاؤں میں
دل مگر بے بال و پر بھی مائل پرواز تھا

گر پڑا تھا اک سنہرا دن ہمارے ہاتھ سے
غم گزیدہ رات کا کیا سرمئی آغاز تھا

کتنے ویراں مرحلوں کی لاش دامن میں لئے
اک دفینہ رتجگوں کا ہمدم و ہمراز تھا

٭

یاسمین حبیب

منزلوں کی جستجو میں جا بجا کھوئے بھی تھے
راستے کے پتھروں سے لگ کے ہم روئے بھی تھے

تھک گئے تو درد میں جیسے کمی ہوتی گئی
بوجھ زخم آشنائی کے بہت ڈھوئے بھی تھے

روندتے ہیں آج جو قدموں میں ٹوٹے برگ وبار
اک بریدہ شاخ سے لگ کر کبھی روئے بھی تھے

رتجگے کچھ اس طرح اس آنکھ میں رچ سے گئے
سوچتے ہیں کونسی شب تھی کہ ہم سوئے بھی تھے

فصل کالک کی بھی کاٹی تھی سحر کے کھیت میں
رات کے سینے میں سورج رات بھر بوئے بھی تھے

کیوں نہیں جاتی گناہوں کی مہک تحریر سے
آب زمزم سے تو کاغذ کے بدن دھوئے بھی تھے

٭

یاسمین حبیب

ملی ہے پھول کے شاید جواب میں تتلی
کسی نے بھیجی ہے رکھ کر کتاب میں تتلی

یہ دل دھڑکتا ہے تعبیر کے اندیشے سے
بھٹکتی پھرتی ہے برسوں سے خواب میں تتلی

پروں میں ہو گیا پیوست خار کا خنجر
اٹک کے رہ گئی سوکھے گلاب میں تتلی

نظر سے رنگ کا پردہ اٹھے تو چاروں طرف
نفس سراب ہے اور ہر سراب میں تتلی

کھلا تھا کھاتہ تمنا کے موسموں کا کوئی
سنا ہے آئی ہے میرے حساب میں تتلی

ہے خوشبوؤں کے تعاقب کا اختتام کہاں
مری طرح سے ہے کتنے عذاب میں تتلی

ہر ایک رنگ کے پیچھے ہے اور رنگ کوئی
ہے کائنات کے شاید نقاب میں تتلی

٭

یاسمین حبیب

بڑھا جو درد تو ہم نے اسے پکارا ہے
یہ اس کا ذکر بھی کتنا بڑا سہارا ہے

عجیب ہے یہ محبت کہ اس محبت میں
ہر ایک لمحۂ جاں جاگ کر گزارا ہے

وہ لاجورد سمندر بلا رہا ہے ہمیں — کہ نام لہروں پہ لکھا ہوا ہمارا ہے
کسی کے نقش کفِ پا پہ چل رہے ہیں ہم — سفر کی ساری صعوبت ہمیں گوارا ہے
لگا کہ جیسے کوئی جرم ہو گیا سرزد — اسے جو ذہن سے ہم نے کبھی اتارا ہے
پلٹ کے کوئی بتانے کبھی تو آجائے — کہ زندگی کا کہاں دوسرا کنارا ہے
کہیں نہیں ہے محبت میں ساعت خوش بخت — وفا کے کھیل کا حاصل فقط خسارا ہے

*

یاسمین حبیب

بہتے ہوئے تنکوں کو سہارا نہیں کرتے — ہم موج کی وحشت سے کنارا نہیں کرتے
مشکل تو کسی طور نہیں ترکِ تمنا — خود ہم ہی بچھڑ جانا گوارا نہیں کرتے
یہ حسن سوا ہے، ہو کوئی دیکھنے والا — بکھری ہوئی ترتیب سنوارا نہیں کرتے
حالات بدلتے نہیں جذبوں سے ، لگن سے — اس وہم میں دن رات گزارا نہیں کرتے
رکھتے ہیں کوئی فتح ابد اپنی نظر میں — ہم لوگ یونہی عشق میں ہارا نہیں کرتے
چاہو تو بصد شوق چلے جاؤ' مگر ہم — جاتے ہوئے لوگوں کو پکارا نہیں کرتے

*

یاسمین حبیب

بدلتی ساعتیں ڈھلنے لگی ہیں سالوں میں — ہنوز تیرہ شباں منجمد اجالوں میں
بھٹکتے رہنا ہے اک خواب کی تمنا کو — کبھی خیال سے باہر کبھی خیالوں میں
زماں کی اور مکاں کی گرفت سے باہر — قیام کرنا ہے تاریخ کے حوالوں میں
کسی جواب کے وحشت زدہ تکلم سے — کبھی تو گفتگو اپنی بھی ہو سوالوں میں
یہ دشت ذات کی تنہائیاں بہت ہیں مجھے — عجب کشش ہے شب ہجر کے غزالوں میں
شکست جاں کا سفر راس آگیا ہے بہت — کہ ایک شمع فروزاں ہے دل کے چھالوں میں

یہ حسن وہ ہے جو مرہونِ چشمِ بینا ہے مجھے تو گُل نظر آتے ہیں زرد گالوں میں

٭

یاسمین حبیب

قصور وار فقط میں نہیں ہوں لغزش میں مرے خلاف مرے خواب بھی تھے سازش میں
میں ڈھلتی جاتی ہوں، کندن میں ڈھلتی جاتی ہوں گُھلا ہے کیسا یہ تیزاب غم کی بارش میں
اب اڑتی راکھ خیالوں پہ جمتی جائے گی جلا رہی ہوں مراسم شعور آتش میں
بھنور میں تھی تو زمانے کے کام تھے کتنے کنارے پر ہوں تو مصروف سب ہیں پرسش میں
مثالِ بادِ صبا ہوں، چلوں تو چلتی رہوں مکاں نہیں ہے تحن دوریوں کی بندش میں
مجھے خوشی ہے مرے جیسا کوئی اور بھی ہے کوئی تو جاگ رہا ہے کسی کی خواہش میں

٭

اکبر حمیدی

عشق میں جورِ مہ وشاں سہنا گرمیاں سہنا، سردیاں سہنا
دشمنوں کے خروش سے مشکل دوستوں کی خموشیاں سہنا!
آندھیوں کو تو سہہ گیا ہوتا قہر تھا شورِ بادباں سہنا
آج اس سختیوں کے موسم میں یاد آتا ہے نرمیاں سہنا
کچھ تو بے اعتنائیاں اُن کی پھر زمانے کی سختیاں سہنا
شہر ہو، گاؤں ہو، کہ جنگل ہو سب درختوں کو آندھیاں سہنا
اچھے دن بھی تو آئیں گے اکبر جو بھی پیش آئے میری جاں سہنا

اکبر حمیدی

جو پہنتا ہوں تنگ جاتا ہے کچھ مجھے پورا نہیں آتا ہے
گرمیاں، سردیاں سب ایک سی ہیں کوئی موسم بھی نہیں بھاتا ہے
چھب دکھاتا ہے مری سیڑھیوں پر پھر کہیں اور اتر جاتا ہے
کام کانٹوں کے عطا فرما کر پیرہن پھول کا پہناتا ہے
میں کہیں اور چلا جاتا ہوں راستہ اور کہیں جاتا ہے
یاد کرتا ہے تمہیں جب کوئی کیا کوئی تم کو بھی یاد آتا ہے؟
دیکھئے کیا ہو نتیجہ اکبر ماضی پھر حال سے ٹکراتا ہے

اکبر حمیدی

وہ بھی دن تھے کہ بجے آنکھوں میں
خواب اب چبھنے لگے آنکھوں میں

میں نے دیکھا اُسے سب زاویوں سے
اُس کے سب رنگ بھرے آنکھوں میں

تن بدن اُس کے بھی کلیاں چٹکیں
میرے بھی پھول کھلے آنکھوں میں

وہ مناظر تھے جو اب اُڑنے لگے
پھر مرے بارہ بجے آنکھوں میں

دل کے آنگن میں جو گلزار ہوئے
سب کے سب پہلے کھلے آنکھوں میں

وہ الاؤ جو کبھی ذہن میں تھے
اُس کو دیکھا تو جلے آنکھوں میں

اُس کے ہونٹوں سے بھی ساغر چھلکے
مجھ کو بھی نشے چڑھے آنکھوں میں

جو نہ اکبر کبھی لکھ پایا اُسے
سب خطوط ایسے لکھے آنکھوں میں

اکبر حمیدی

پیدل ہوں اور شاہ سواروں سے تیز ہوں
چھ، سات، آٹھ سے نہیں ساروں سے تیز ہوں

دریا سنبھال پائے گا کیا میرے زور کو
پانی ہوں لیکن اپنے کناروں سے تیز ہوں

تقدیر پیچھے پیچھے مرے پھرتی ہے سدا
انسان ہوں میں اپنے ستاروں سے تیز ہوں

وہ بھی سمجھتا ہوں جو وہ کہتے نہیں کبھی
سب یاروں دوستوں طرحداروں سے تیز ہوں

گو پھول ہوں پہ ایسا بھی میں بے ضرر نہیں
چبھنے پہ آؤں تو کبھی خاروں سے تیز ہوں

فصلِ بہار کا نہیں کرتا میں انتظار
میں اُس طرف کے سارے اشاروں سے تیز ہوں

سادہ مزاج ہوں مگر پُر کار بھی بہت
اک نرم آگ ہوں پہ شراروں سے تیز ہوں

اکبر یہ راستے مرے پاؤں کی گرد ہیں
سب منزلوں کے راہ گزاروں سے تیز ہوں

گلشن کھنہ

پرندے ہم کو پیڑوں پر دکھائی کیوں نہیں دیتے
کسی بھی شاخ پر اب گھر دکھائی کیوں نہیں دیتے

نہ تتلی ہے نہ شبنم ہے نہ کلیاں ہیں نہ غنچے ہیں
بہاروں کے بھلا منظر دکھائی کیوں نہیں دیتے

ستارے سو رہے ہیں آسماں کی گود میں تھک کر
مجھے اب چاند کے منظر دکھائی کیوں نہیں دیتے

جہاں امن و اماں کی دیویاں آواز دیتی تھیں
اب ایسے خوبرو مندر دکھائی کیوں نہیں دیتے

شرافت فخر انساں تھی کبھی ایمان و راحت تھی
زمانے میں یہ اب جوہر دکھائی کیوں نہیں دیتے

پیالے کیوں مرے ہونٹوں تک آ کر ٹوٹ جاتے ہیں
رسیلے اب یہاں ساغر دکھائی کیوں نہیں دیتے

ریا کاری ہے کیوں شیوہ ہمارے دوستوں کا اب
محبت کے یہاں گوہر دکھائی کیوں نہیں دیتے

جہاں انسان کی انسان سے ہو دوستی گلشن
کسی بھی سمت ایسے در دکھائی کیوں نہیں دیتے

٭

اختر شمار

چاند کی صورت ہے تو اور میں ہوں ہالے کی طرح
تیرا میرا ساتھ بنیادی حوالے کی طرح

آبگینے کی طرح تجھ کو بچاتا پھرتا ہوں
تو ہتھیلی پر تھا میری ایک چھالے کی طرح

جیسے اس کے بعد آنکھیں پھر نہ دیکھیں گی تجھے
میں کہ تجھ کو دیکھتا ہوں مرنے والے کی طرح

کس طرح میں کھول سکتا ہوں محبت کا یہ راز
ایک چپ سی میرے ہونٹوں پر ہے تالے کی طرح

عشق کا یہ معجزہ ہے یا کرامت ہجر کی
آج میرے گیت بھی ہیں آہ و نالے کی طرح

دل اچانک بند ہونے کے بھی امکانات ہیں
یہ بھی لگتا ہے کسی ادبی رسالے کی طرح

زندگی کے اس سفر میں کاشؔ ہو جاتا شمارؔ
میں ترے زاد سفر میں اک پیالے کی طرح

٭

ارشد جاوید

صفا، مروہ کے درمیاں ہیں میاں
تجھ سے ہم کوئی بد گماں ہیں میاں؟

ہم تو خود اپنی خاک پا بھی نہیں
کیسے کہہ دیں کہ آسماں ہیں میاں

دل کا احرام کھل رہا ہے پھر
یہ مکاں ہیں کہ لا مکاں ہیں میاں

کوئی جائے اماں نہیں تجھ بن
ہر طرف غول قاتلاں ہیں میاں

چہرہ پڑھ کر ہی جان لیجے گا
دکھ تو ناقابل بیاں ہیں میاں

ایک کنکر بھی پاس اپنے نہیں
یہ شیاطین کے جہاں ہیں میاں

ایک میثاق ہم پہ لازم ہے
ورنہ تاریخ خونچکاں ہیں میاں

٭

ارشد جاوید

ہمیں ہی شکر کی عادت پڑی ہے
وگرنہ زندگی مشکل بڑی ہے

ملن ذت اور اشکوں کی جھڑی ہے
خوشی آنکھوں میں آکر رو پڑی ہے

کوئی تھامے ذرا سا ہاتھ دل کا
بڑی مشکل جدائی کی گھڑی ہے

بڑی عزت ہے اپنے دل میں اس کی
ہماری عمر سے غربت بڑی ہے

ابھی بچوں کے کپڑے کب بنے ہیں
کہ دشمن عید سر پہ آ کھڑی ہے

٭

ارشد جاوید

تو میرے دل سے نہ نکلے گا کبھی شک کی طرح
میں نے محسوس کیا ہے تجھے دستک کی طرح

آتش ہجر سے سلگا ہے بدن کا جنگل
کون ہے؟ مجھ کو جلاتا ہے جو دیپک کی طرح

یوں تو سب گھات میں ہیں خیمۂ جاں کی جاناں
اک ترے پیار کی لو ہے کسی دستک کی طرح

میرے اطراف اجالا سا عجب پھیل گیا — مجھ پہ ظاہر جو ہوا تو کسی بے شک کی طرح
ایسا اک لفظ ہوں میں باب وفا کا جاوید — جس کو چاٹا ہے تری یاد نے دیمک کی طرح

٭

ارشد جاوید

فرصتِ عشق بھی نہیں صاحب — چین دُنیا میں ہے کہیں صاحب
ہر کسی کے تو آستانے پر — ہم جھکاتے نہیں جبیں صاحب
دل نما چیز جس کو کہتے ہیں — کھو گئی ہے یہیں کہیں صاحب
جس جگہ یار تم نے چھوڑا تھا — ہم کھڑے ہیں ابھی وہیں صاحب
یہ کہیں دشتِ کربلا تو نہیں — پاؤں پڑتی ہے کیوں زمیں صاحب
اس پہ جاوید مر کے دیکھا ہے — موت لگتی ہے دلنشیں صاحب

٭

ارشد جاوید

دن کچھ ایسے کٹ رہے ہیں — ہم مُسلسل بٹ رہے ہیں
نام اونچا ہو رہا ہے — قد برابر گھٹ رہے ہیں
کیا ستم کہ پھر مقابل — اپنے ہی ہم ڈٹ رہے ہیں
نام جن پر ہم تھے لکھتے — وہ شجر اب کٹ رہے ہیں
تیرے غم اپنا لیے ہیں — رنج اپنے گھٹ رہے ہیں
اپنے محور سے یہاں پر — لوگ سارے ہٹ رہے ہیں

٭

ارشد جاوید

جدائی کا کڑا اِک مرحلہ ہے
محبت وحشتوں کا سلسلہ ہے

تری چاہت کا دریا موج پر ہے
مرا زادِ سفر کچا گھڑا ہے

منانے کو نہیں ہمزاد تک بھی
وہ اپنے آپ سے لگ کر کھڑا ہے

تیری یادوں کی اُنگلی تھام لی ہے
کہ رستہ زندگانی کا کڑا ہے

چراغِ عمر بجھتا جا رہا ہے
تری یادوں کا خیمہ لُٹ چکا ہے

٭

ارشد جاوید

مقتل میں بھیڑ ہے نہ سردار کوئی ہے
بجز اُس کے اور کوچہ دلدار کوئی ہے

زندانیانِ شہر ہیں اُنیٰ پہ خوف کی
کیا راہِ عاشقی یہاں ہموار کوئی ہے

ہم تشنگانِ عشق کیوں جائیں ہیں اُس گلی
اب عاشقی کا رہ گیا معیار کوئی ہے

اک عالمِ حیات ہے اس پار موت کے
چلنے کے واسطے یہاں تیار کوئی ہے

رکھے ہوئے ہیں ٹوٹے ہوئے دل دُکان پہ
آواز آ رہی ہے خریدار کوئی ہے

یہ کون کھولتا ہے گرہ میری سوچ کی
جاویدؔ یہ تو سوچ کے اُس پار کوئی ہے

٭

ارشد جاوید

کئی دن سے نشہ ٹوٹا ہوا ہے
جو تجھ سے رابطہ ٹوٹا ہوا ہے

مصائب آسماں سے کیوں نہ ٹوٹیں
دُعا کا سلسلہ ٹوٹا ہوا ہے

مرا ٹوٹا ہوا دل کیا جُڑے گا
ستارہ ہی مرا ٹوٹا ہوا ہے

اُمید اتنی نہ باندھو زندگی سے
یہ رشتہ جا بجا ٹوٹا ہوا ہے

ابھی تو دُور ہے جاویدؔ منزل ابھی سے حوصلہ ٹوٹا ہوا ہے؟

ارشد جاوید

آپ جو ارشدؔ خود کو غم میں گھولتے ہیں
تنہائی سے آ جی بھر کے بولتے ہیں

ہاں اس گھر میں اک تبدیلی آئی ہے
اَب اس گھر میں بچے اُونچا بُولتے ہیں

مَرنے کو بھی اس گھر میں سامان نہیں
کون ہیں یاں جو ہیرے موتی رولتے ہیں

محرابیں اور طاقچے سوچ حویلی کے
ماضی کے کچھ یاد دریچے کھولتے ہیں

آنسو بیتت کے رکھے تھے کچھ آنکھوں میں
تنہا بیٹھ کے گرہیں ان کی کھولتے ہیں

شک تو ان کو لگتا ہے جاویدؔ بہت
بُرف کے باٹوں میں جو ہم کو تولتے ہیں

ارشد جاوید

بکھرنا تھا' بکھرتے جا رہے ہیں
ستارے ماند پڑتے جا رہے ہیں

ہماری دشمنی ہے دوسروں سے
ہم آپس میں جھگڑتے جا رہے ہیں

یہ آندھی کس خوشی میں چل رہی ہے
یہ خیمے کیوں اکھڑتے جا رہے ہیں

منازل ہاتھ جوڑے جا رہی ہیں
مسافر پاؤں پڑتے جا رہے ہیں

نہ پوچھو شہر جاں کی خانہ جنگی
گھروں کے گھر اُجڑتے جا رہے ہیں

مری آنکھیں جو آنسو رو رہی ہیں
مرے بچے بچھڑتے جا رہے ہیں

بہت مشکل ہے کارِ عشق جاوید
بڑی مشکل میں پڑتے جا رہے ہیں

ارشد جاوید

سایوں کو کاٹ، دھوپ اُگانا بھی سیکھ لے
جاوید کچھ تو رسم زمانہ بھی سیکھ لے

تو ریگ زار درد میں اب معجزے دکھا
کاغذ کی کشتیوں کو چلانا بھی سیکھ لے

چہرے پہ اپنے نقشِ تبسم بھی ثبت کر
آنکھوں میں آنسوؤں کو چھپانا بھی سیکھ لے

اس کے بدن کی تھوڑی تمازت بھی تاپ لے
سردی سے اپنا جسم بچانا بھی سیکھ لے

لفظوں کے ننگے جسم کو جذبوں سے ڈھانپ دے
دنیا سے عیب شعر چھپانا بھی سیکھ لے

جاوید کامیابی کا واحد ہے راستہ
ظلِ الٰہی کو تو ہنسانا بھی سیکھ لے

٭

ارشد جاوید

ہم سوئیں، پر جاگے ہے دیوار کھڑی
ہر دیوار کے آگے ہے دیوار کھڑی

ریل میں بیٹھے دیکھا ایک مسافر ہے
ساتھ مسافر بھاگے ہے دیوار کھڑی

گھر کو دیکھیں تو اک ہول سا اٹھتا ہے
بیچ صحن کے لاگے ہے دیوار کھڑی

کس جا نکلوں، سوچتا ہوں جاوید بہت
پیچھے دشمن، آگے ہے دیوار کھڑی

٭

ارشد جاوید

ہمیں بھی جرم وفا میں نہ دھر لیا جائے
برون شہر کہیں اور گھر لیا جائے

یہ دل تمہارا ہے، واپس تمہیں کو کرتے ہیں
یہی نہ ہو کہ ہمیں سے ہی بھر لیا جائے

ہوئی نہیں ہے جو صحرائے وقت میں بارش
ہمارے خون سے صحرا کو بھر لیا جائے

اگر فضول ہے اتنا ہی کارِ عشق تو پھر
مجھے بتاؤ کہ کیا کام کر لیا جائے

سفر تو اپنی جگہ خود ہی بوجھ ہے جاوید
یہ کیا ضروری ہے رختِ سفر لیا جائے

٭

کرامت بخاری

ایک چہرہ مری نگاہ میں ہے — کوئی یوسف ہے اور چاہ میں ہے
دل میں رہتا ہے ایک ماہ جبیں — میرا دشمن مری پناہ میں ہے
آنکھ بھی دیکھنے کی مجرم ہے — دل بھی شامل اسی گناہ میں ہے
اک مروت بھی ہے تغافل میں — اک محبت بھی اشتباہ میں ہے
اُس سے تکرار سود مند نہیں — فائدہ جو بھی ہے نباہ میں ہے
دور کر دیں گے پاؤں کے چھالے — وہ رکاوٹ جو میری راہ میں ہے
اُس کی جانب بڑھے گی خود منزل — وہ مسافر ابھی جو راہ میں ہے
لاکھ، ڈھونڈو کہیں نہیں ملتا — لطف جو دو دلوں کی چاہ میں ہے

٭

کرامت بخاری

تیر اُس نے کمان میں رکھا — میں نے دل کو ہی دھیان میں رکھا
اپنی باتوں سے جو دیا تو نے — ذائقہ وہ زبان میں رکھا
اُس نظر کا یقین کیا کرتے — خود کو پیہم گمان میں رکھا
کون آئے گا دستکیں دینے؟ — کیا ہے خالی مکان میں رکھا
اس دیے کو جلا کے محفل میں — کیوں ہوا کی امان میں رکھا؟
دل ہے جلتا ہوا دیا لیکن — کس اندھیرے مکان میں رکھا
زندگی تو نے غم کے ماروں کو — عمر بھر امتحان میں رکھا
جتنے جذبے تھے جاوداں اُن کو — ہم نے لفظ و بیان میں رکھا

٭

کرامت بخاری

آرزوئے وصال کرتا ہوں
ہائے کیا کیا خیال کرتا ہوں

جو گزارے مری رفاقت میں
یاد وہ ماہ و سال کرتا ہوں

تیرے ہونٹوں کی آرزو کر کے
زخم کا اندمال کرتا ہوں

آئینہ دل کا ٹوٹ جاتا ہے
لاکھ میں دیکھ بھال کرتا ہوں

سانس لیتا ہوں اور زندہ ہوں
یہ بھی کب کمال کرتا ہوں

مارتے ہیں جواب میں پتھر
پھول سا جب سوال کرتا ہوں

ان چمکتے ہوئے ستاروں کو
خواب ریزے خیال کرتا ہوں

حسن اور عشق کو بہم کر کے
شعر کو لازوال کرتا ہوں

☆

کرامت بخاری

طوفان آئیں گے کبھی سیلاب آئیں گے
دریا کو میری پیاس کے جب خواب آئیں گے

اب پگڑیوں پہ آئے گی ہر شہر میں بہار
اب ہر دکان پر نئے سرخاب آئیں گے

اڑتے ہوئے سفر میں دکھائی دیے ہیں ہنس
لگتا ہے اگلے موڑ پہ تالاب آئیں گے

اشکوں کے ساتھ آنکھ کی کشتی بھی بہہ گئی
اس سے زیادہ اور کیا سیلاب آئیں گے

جاوید زخم آبلہ پائی کو بھول جا
اب اس سفر میں راستے شاداب آئیں گے

☆

زاہد مسعود

ہمارے پاس یہی بات ہے بتانے کو
چراغ مانگتے پھرتے ہیں گھر سجانے کو

پسِ غبار کوئی آئینہ کشید کریں
ذرا سی دیر ہے آنکھوں میں اشک آنے کو

ہماری کوزہ گری قرض کی بدولت تھی
سو خاک بیچ رہے ہیں اسے پکانے کو

ہوا کے ساتھ کریں گفتگوئے رنگِ چمن
کہ مشغلہ یہ غنیمت ہے غم بُھلانے کو

طویل دن کی تھکن نے سلا دیا تھا ہمیں
مچل رہے ہیں کوئی داستاں سنانے کو

زاہد مسعود

یہی نہیں کہ فقط عکسِ معتبر میں نہیں
ہمارا ذکر ترے حلقۂ اثر میں نہیں

روایتوں کے تسلسل کا بار کھینچتے ہیں
نیا تو کوئی بھی سودا ہمارے سر میں نہیں

جو ہو سکے تو نئے زائچے میں لکھ دینا
کہ جنگ ہو بھی اگر تو ہمارے گھر میں نہیں

درونِ صحن چمن پاؤں پاؤں چلتے ہیں
نئی اڑان تقاضائے بال و پر میں نہیں

نہ انحراف نظر میں، نہ خواب آنکھوں میں
کوئی سراب ہمارا کسی سفر میں نہیں

اتر رہے ہیں فصیلوں سے جگنوؤں کے دیے
کہ اب ہوا کے سوا کوئی شہر بھر میں نہیں

زاہد مسعود

یوں تو ہے باعثِ تحقیر کہیں ہونا بھی
ایک مدت سے مگر گھر کا مکیں ہونا بھی

جن کا ہونا ہے فقط وہم و گماں کی صورت
اُنکا محسوس تو ہوتا ہے یقیں ہونا بھی

رات کے پچھلے پہر تا بہ افق لازم ہے
کچھ ستاروں کے لیے زیرِ زمیں ہونا بھی

ہم جہاں ربط کی خواہش کو بسر کرتے ہیں
کاش ممکن سا بنا لیتے وہیں ہونا بھی

تیرا انکار عطا کرتا ہے اقرار تجھے
اپنے ہونے کی گواہی ہے، نہیں ہونا بھی

زاہد مسعود

ادا شناس سہی، عقل حیلہ جو کیسی — بتائے کیسے تجھے، لگ رہی ہے تو کیسی؟
مری نگاہ میں اک چاند جھلملانے لگا — ملی ہے شکل سے اک شکل ہو بہو کیسی؟
ہوا پرست زمانے، ذرا پلٹ کے تو دیکھ — ہمارے چار طرف چل رہی ہے لُو کیسی؟
وہ عکس عکس سرِ آئینہ سلامت ہو — شکستگی ہے سر حدت لہو کیسی؟
اگر یہ سلسلۂ شب سحر طراز نہیں — تو پھر چراغ میں جلنے کی آرزو کیسی؟
نئی رتوں کی ہوائیں سوال کرتی ہیں — پروں میں باندھ کے رکھی ہے جستجو کیسی؟
گرے پڑے ہیں یہاں طائرانِ تیز نوا — چلو چلیں کہ درختوں سے گفتگو کیسی؟

٭٭

زاہد مسعود

جستجوئے چشم تر کرنے کو ہیں — جاگتے ہی شب بسر کرنے کو ہیں
جھلملاتی شام کی دہلیز پر — خواب اپنے معتبر کرنے کو ہیں
جو کہانی سانس کی مہلت پہ تھی — وہ کہانی مختصر کرنے کو ہیں
جان لینا اے گزرتی زندگی — زندگی سے در گزر کرنے کو ہیں
اک ترے عکس تمنا کی طلب! — آئینے ہم پہ نظر کرنے کو ہیں

٭٭

شہناز مزمل

تھے عجیب میرے بھی فیصلے میں کڑی کماں سے گزر گئی
رہے فاصلے مرے منتظر تو میں جسم و جاں سے گزر گئی

جو بھی قرض تھا مری جان پر وہ کہیں پہ میں نے چکا دیا
رہی فکر مجھ کو نہ سود کی تو ہر اک زیاں سے گزر گئی

مجھے راستوں کی خبر نہ تھی اڑی خاک میرے وجود کی
میں تلاش کرتی ہوئی تجھے ترے لامکاں سے گزر گئی

کہیں پھول تھے کہیں تتلیاں کہیں زخم تھے کہیں بجلیاں
میں خمار میں تھی بہار کے میں ہر اک خزاں سے گزر گئی

وہ سیاہ شب تھی فراق کی کئی دیپ پلکوں پہ جل بجھے
مجھے جگنوؤں نے نوید دی کہ تو امتحاں سے گزر گئی

تھیں طویل اتنی مسافتیں کوئی ساتھ میرا نہ دے سکا
وہ یقیں کی حد پہ ٹھہر گیا میں ہر اک گماں سے گزر گئی

مری ہر صدا ہوئی نارسا تو قصور کس کا ہے تو بتا
مری آرزو مری ہر دعا تو لب فغاں سے گزر گئی

جو خلش ملی وہ عزیز تھی مجھے چارہ گر نہ ملا تو کیا
میں بھی دشمنوں کی پناہ میں کوئے دوستاں سے گزر گئی

٭

شہناز مزمل

کسی کی چنری میں دھوپ باندھی کسی کو وجہِ جمال رکھا
کسی کے دامن میں صبح ٹانکی کسی کو شب کی مثال رکھا

رضا پہ تیری ہوئی میں راضی مگر مجھے آج یہ بتا دے
جواب سارے دیئے کسی کو مرے لئے کیوں سوال رکھا

جہاں کے تخلیق کار تو نے یہ کیا کیا ہے یہ کیوں کیا ہے
بنا کے انساں کو سب سے افضل اسی کو رو بہ زوال رکھا

وہ تیرا اپنا تھا میں نے مانا میں تیری کچھ بھی نہیں تھی جاناں
بچھڑنا تقدیر میں مری تھا نصیب اس کا وصال رکھا

یہ فیصلہ تیرا فیصلہ ہے مجال کس کی کہ اس کو بدلے
کسی کے دل میں ہوا چراغاں کسی کے رخ پہ ملال رکھا

فراق کی شب چمکتی یادوں کے جگنوؤں سے میں پوچھتی ہوں
میرے لئے کیوں نہ چاہتوں کا چراغ کوئی سنبھال رکھا

٭

شہناز مزمل

دم رخصت اسے جینے کی دعا دی ہم نے
اور پھر آخری کشتی بھی جلا دی ہم نے

مل ہی جائے کسی تعبیر کو شاید اک خواب
عکس دیوار پہ تصویر بنا دی ہم نے

تیرگی حد سے بڑھی دل کے نہاں خانوں میں
بھولنے والے تری یاد جلا دی ہم نے

ڈوبتی شام میں کرنوں کو بچانے کے لئے
ریت کے گھر پہ بھی دیوار اٹھا دی ہم نے

کون آئے گا پلٹ کر ہمیں لے جانے کو
لو چراغوں کی سر شام بڑھا دی ہم نے

راکھ ہو جاتے تری آگ سے سندر سپنے
آرزو شمع تری خود ہی جلا دی ہم نے

ہم اسیران انا تشنہ لب بام گئے
بازیٔ زیست بھی داؤ پہ لگا دی ہم نے

اپنی ہی سانسوں سے دم گھٹنے لگا جب شہناز
قرض جاں دے کے سزا اپنی گھٹا دی ہم نے

٭

جواز جعفری

فلک پہ گونج رہی ہے مری صدا، کوئی ہے؟
مرے علاوہ بھی اس دہر میں بتا، کوئی ہے؟
تیرے ابد کے مضافات سے گزرتا ہوا
یہیں کہیں مری دنیا میں راستہ، کوئی ہے
بغیر اس کے مری راکھ بجھنے لگتی ہے
کھلا کہ میرا بھی سورج سے واسطہ، کوئی ہے
سماعتوں پہ کب اترے گا، اس کی چاپ کا رزق
میں کیوں جہاں میں اکیلا ہوں گر مرا کوئی ہے
ٹھہر سکی نہ کسی ایک چاک پر مری خاک
سو میرے پیش نظر اب بھی مرحلہ، کوئی ہے
اکیلا کب ہے، سر ریگ زار میرا جنوں
نواحِ جاں میں کہیں اور قافلہ، کوئی ہے
جوازؔ آنکھ میں ٹوٹا جو خواب کا کانٹا
کھلا کہ میرے تعاقب میں رتجگا، کوئی ہے

*

فارس

اگرچہ سارا سخن ہم نے عاشقانہ کہا
مگر صنم کو کبھی آج تک خدا نہ کہا
فقیہہ شہر فرشتہ سہی مگر اس نے
ہمارے حق میں کبھی کلمہ دعا نہ کہا!
پڑا جو قحط تو سب لوگ رب سے لڑنے لگے
کسی نے بادشہ وقت کو برا نہ کہا!
کئی حسیں تھے دل و جاں سے منتظر لیکن
کسی سے ہم نے غمِ دل ترے سوا نہ کہا
ہم اس کے نور کے حاسد رہے مگر اے غنیم!
کبھی حسد میں ترے چاند کو دیا نہ کہا!
اگرچہ ہم تھے شکستہ انا تو ثابت تھی
سو تیرے سامنے آ کر بھی مدعا نہ کہا
جو شش جہات سے برسے تھے ہم پہ غم، فارسؔ!
کسی سے ان کا فسانہ بجز خدا، نہ کہا

*

اشرف سلیم

بچھڑ کے خود سے تعلق بحال رکھنا تم — کبھی کبھار سہی قیل و قال رکھنا تم
وصال و ہجر محبت کا ایک حصہ ہیں — وصال لمحے مری جاں سنبھال رکھنا تم
یہ بے دریغ زمانہ ہے چھین لیتا ہے — ملا ہے درد تو اس کا خیال رکھنا تم
محبتوں کی کہانی عجیب ہوتی ہے — سفر میں ساتھ عروج و زوال رکھنا تم
ترے حصار میں برسوں رہا ہے دل اپنا — بچھڑ رہا ہوں نہ دل میں ملال رکھنا تم

✲

اشرف سلیم

پھر کوئی ہم کو بغاوت کی ہوا دیتا ہے — جو بھی دیوار اٹھاتے ہیں گرا دیتا ہے
ہم کو منظور نہیں تیری محبت کا سفر — اب یہاں کون رفاقت کا صلہ دیتا ہے
احتجاجاً بھی اٹھائیں گے نہ ہم ہاتھ اپنے — دیکھنا یہ ہے کہ وہ فیصلہ کیا دیتا ہے
اب توقع ہی نہیں کوئی رہائی کی ہمیں — جو بھی آتا ہے سزا اور بڑھا دیتا ہے
جشن اب ٹوٹتے خوابوں کا منائیں گے سلیم — اور دیکھیں گے ہمیں کون صدا دیتا ہے

✲

نوید مرزا

میں تشنہ لب ہوں مری روح میں اُتر دریا
کبھی تو جسم کے اندر بھی ہو سفر دریا

کنارِ آب میں ساکت کھڑا ہوں برسوں سے
مرے وجود کی اس تشنگی سے ڈر دریا

زمین خشک ہوئی جا رہی ہے صدیوں سے
فلک سے مانگنے والا ہے بال و پر دریا

ترے خزانوں میں کوئی کمی نہیں ہو گی
اُچھال دے مری جانب کوئی گہر دریا

گذر رہا ہے زمانوں کا دکھ اٹھائے ہوئے
کہاں سے لوٹ کے آئے گا بے خبر دریا!

ہم اپنی آنکھ کے آنسو کبھی چھپا نہ سکے
تمہاری یاد میں کرتا رہا سفر دریا

نوید مرزا

وہ آنکھیں تو نہیں رکھتا مگر پہچان لیتا ہے
ہوا کی سنسناہٹ کو شجر پہچان لیتا ہے

مجھے اپنے تعارف کی ضرورت ہی نہیں پڑتی
زمانہ جب مرے عیب و ہنر پہچان لیتا ہے

در و دیوار کی خوشبو ہمیشہ ساتھ رکھتا ہوں
میں گلیاں بھول جاتا ہوں تو گھر پہچان لیتا ہے

مجھے اس کی لکیریں آئینہ محسوس ہوتی ہیں
میں کیا ہوں، کون ہوں، دستِ ہنر پہچان لیتا ہے

اسے معلوم ہے اس پر لکھی ساری شکستوں کا
مرے چہرے کو ہر آئینہ گر پہچان لیتا ہے

تیمور حسن تیمور

اس کو اچھا لگا کہ میں رویا
بخت جاگا مرا کہ میں رویا

خوش تھی خلقِ خدا کہ میں رویا
خوب چرچا رہا کہ میں رویا

مجھ کو پتھر قرار دیتے تھے
اک دن ایسا ہوا کہ میں رویا

وہ تو آنکھوں نے مخبری کر دی
ورنہ میں مانتا کہ میں رویا؟

بھر گیا تھا غبار دل میں بہت
میں نے اچھا کیا کہ میں رویا

کیسے ہنس کر جدا کیا تھا تمہیں
یہ خیال آتا تھا کہ میں رویا

دنیا والو بہت برے ہو تم
اس سے کیوں جا کہا کہ میں رویا

کون روتا ہے شوق سے تیمورؔ
کچھ تو ایسا ہوا کہ میں رویا

٭

تیمور حسن تیمور

آخری بار یہ تدبیر بھی کر دیکھیں گے
ہم دعا مانگیں گے پھر اس کا اثر دیکھیں گے

ان کی آنکھوں کی زباں کون سمجھ سکتا ہے
جب وہ دیکھیں گے باانداز دگر دیکھیں گے

شب غریبوں کی اسی آس پہ آنکھوں میں کٹے
نیند آئے گی تو ہم خواب میں گھر دیکھیں گے

کوئی جا کر نہیں دیکھے گا کہ کیا گزری ہے
لوگ اخبار میں چھوٹی سی خبر دیکھیں گے

کشورِ عشق کا اپنا ہے نظام مسند
آپ شاہوں کو یہاں خاک بسر دیکھیں گے

سر پہ دستار سجائے ہوئے یہ سوچتے ہیں
ہم یہ دستار سنبھالیں گے کہ سر دیکھیں گے

پیار کا پیڑ لگائیں گے یہی سوچ کے ہم
ہم شجر بوئیں گے اور لوگ ثمر دیکھیں گے

یہ زمیں اپنے لئے تنگ ہوئی جاتی ہے
اپنے رہنے کے لئے اور نگر دیکھیں گے

دنیا والے جسے چاہیں اسے دیکھیں تیمورؔ
ہم تو بس آپ کو دیکھیں گے اگر دیکھیں گے

٭

تیمور حسن تیمور

تجھے زندگی کا شعور تھا تیرا کیا بنا
تو خموش کیوں ہے مجھے بتا ترا کیا بنا

نئی منزلوں کی تلاش تھی سو بچھڑ گئے
میں بچھڑ کے تجھ سے بھٹک گیا، ترا کیا بنا

مجھے علم تھا کہ شکست میرا نصیب ہے
تو امیدوار تھا جیت کا ترا کیا بنا

میں مقابلے میں شریک تھا فقط اس لئے
کوئی آ کے مجھ سے یہ پوچھتا ترا کیا بنا

جو نصیب سے تری جنگ تھی وہ مری بھی تھی
میں تو کامیاب نہ ہو سکا ترا کیا بنا

تجھے دیکھ کر تو مجھے لگا تھا کہ خوش ہے تو
ترے بولنے سے پتا چلا ترا کیا بنا

میں الگ تھا اس لئے مجھ کو اس کی سزا ملی
تو بھی دوسروں سے تھا کچھ جدا ترا کیا بنا

٭

تیمور حسن تیمور

زباں پر اک وظیفہ ہے خدا بہتر کرے گا
یہی میرا سہارا ہے خدا بہتر کرے گا

اسے مخلوق کے سارے مسائل کی خبر ہے
خدا بہتر سمجھتا ہے، خدا بہتر کرے گا

یہ دل بھی اک نجومی ہے بتاتا ہے بہت کچھ
مجھے اس نے بتایا ہے، خدا بہتر کرے گا

اکیلے بیٹھ کر آنسو بہاتا ہوں میں جب بھی
کوئی چپکے سے کہتا ہے، خدا بہتر کرے گا

بظاہر تو یہ لگتا ہے جدائی مستقل ہے
مگر دل کو یقیں سا ہے، خدا بہتر کرے گا

مرے حالات کہتے ہیں کہ بدلے گا نہ کچھ بھی
مرا ایمان کہتا ہے، خدا بہتر کرے گا

سکوں سا آ گیا دل کو کہ جب سے اس طرف سے
کوئی پیغام لایا ہے، خدا بہتر کرے گا

خدا اس کا بھرم رکھے، اسے کامل یقیں ہے
خدا بہتر ہی کرتا ہے، خدا بہتر کرے گا

مجھے یہ لوگ کہتے ہیں، کٹے گی کیسے تیمور
جواب اس کا بس اتنا ہے، خدا بہتر کرے گا

٭

ڈاکٹر فوزیہ چودھری

تمہارے عشق نے میری عجب حالت بنائی ہے
نہ دل کو چین پڑتا ہے نہ تجھ تک ہی رسائی ہے

میں رنگوں خوشبوؤں کے دیس میں آباد ہوں جاناں
مگر میں نے کہیں اندر نئی دنیا بسائی ہے

چلے آؤ نئے وعدے نئی قسمیں نبھانے کو
عجب حالات ہیں اب تو عجب وعدہ وفائی ہے

کہیں حالات اور رسمیں کہیں وعدے کی مجبوری
ہماری زندگی کیا ہے، مسلسل بے وفائی ہے

مری محرومیوں، ناکامیوں کے رازداں جو تھے
یہ غم کی داستاں میں نے فقط ان کی سنائی ہے

٭

ڈاکٹر فوزیہ چودھری

سوئے گلشن وہ آہستہ گام آ گیا
میری محفل میں وہ خوش خرام آ گیا

بے گماں ہم ہوئے تھے سفر پہ رواں
بے ارادہ ہمارا قیام آ گیا

جو بھی ساتھی ملا تم سے بہتر ملا
تم سے بہتر ملا، کیا مقام آ گیا

یہ تو سچ ہے کہ منزل کٹھن تھی مری
پھر بھی ذوقِ سفر میرے کام آ گیا

اس نے اقرارِ الفت کیا روبرو
اس کی باتوں میں کیسا دوام آ گیا

لوٹ کر اس نے دیکھا ہے میری طرف
کیا کہوں دوستو! کیا مقام آ گیا

مجھ پہ تعبیر اس خواب کی بھی کھلے
ایک شاہیں مرے زیرِ دام آ گیا

میں دھڑکتے ہوئے دل سے ہوں منتظر
نامہ بر کچھ کہو کیا پیام آ گیا

میرے پیشِ نظر منزلیں اور تھیں
مجھ کو کن منزلوں کا سلام آ گیا

٭

سید امتیاز احمد

پھر اپنی آنکھوں کو خواب آشنا کروں، نہ کروں
میں سوچتا ہوں تمہاری دعا کروں ، نہ کروں

کسی نے آ کے بتایا، بہار آ گئی ہے
میں اس برس بھی دریچے کو وا کروں ، نہ کروں

جو میرے جیسے ہیں وہ مجھ سے دور ہو گئے ہیں
جو مجھ سے اچھے ہیں ان سے ملا کروں، نہ کروں

کبھی امید ، کبھی یاس، یوں گزرتی ہے
سو کچھ بتاؤ کوئی فیصلہ کروں، نہ کروں

میں اپنے شعر میں پھر اپنا دکھ لکھوں ، نہ لکھوں
میں اپنے غم کو سپرد ہوا کروں، نہ کروں

٭

سید امتیاز احمد

گزر تو جائے گی صاحب گزارنی ہے اگر
عجیب بے سروپا ہے یہ زندگی ہے اگر

یہ روز و شب کی اُداسی، یہ دل کی ویرانی
ہمیں ہے سہل، اسی میں تری خوشی ہے اگر

یہ کیا کہ اور کسی کام ہی کے ہم نہ رہیں
نگاہ یار، نہیں ، تجھ پہ آ پڑی ہے اگر

کبھی کبھی کے یہ دو چار حرف تلخ ہی کیا
تو کھل کے لڑ تو سہی ہم سے دشمنی ہے اگر

بتا تو دے ہمیں بے ربط گفتگو کا سبب
کہ رو تو لیں یہ ملاقات آخری ہے اگر

٭

سید امتیاز احمد

تری تلاش میں گزر تا بہ آسماں گئے ہم
بچھڑنے والے! بہت دور بھی کہاں گئے ہم

بہت سے دکھ ہیں ازاں جملہ ایک یہ بھی ہے
کہ بے نشان رہے اور بے نشاں گئے ہم

زمانہ چھوڑ کے ہم تیری سمت آئے تھے
تجھے یہ کیسے بتائیں کہ رائیگاں گئے ہم

ہوں لاکھ عیب ہنر ہم میں، کم سخن تو نہ تھے
حضور یار ہی، کچھ ایسے بے نشاں گئے ہم

ہمیں جب اس نے کہا، اٹھ کے ہم چلے آئے
ہمیں جب اس نے بلایا، کشاں کشاں گئے ہم

یہ اس کے فیصلے ہیں، ان کی رمز وہ جانے
تمھیں یہ فتح مبارک ہو دشمناں، مگئے ہم

٭

سید امتیاز احمد

لکھ لیا تھا فسانہ تھوڑا بہت
تم نے پورا سنا، نہ تھوڑا بہت

ایک مانگا قرار دل کے لیے
سو زیادہ ملا، نہ تھوڑا بہت

بنتی تھی راہ تک نہ جس دل میں
کر لیا ہے ٹھکانہ تھوڑا بہت

اور پھر خود ہی پیچھے ہٹ بھی گیا
آڑے آیا زمانہ تھوڑا بہت

زندگی سربسر غم جاناں
یا غم آب و دانہ تھوڑا بہت

٭

سید امتیاز احمد

تمھارے حسن فراواں کی خیر مانگتے ہیں
تو ساتھ عمر گریزاں کی خیر مانگتے ہیں

عجب طرح سے فروزاں ہے آج شمع جمال
ہم اپنے دیدۂ حیراں کی خیر مانگتے ہیں

دعائیں دیتے ہیں اس شہر بے محبت کو
ہوائے کوچہ جاناں کی خیر مانگتے ہیں

ذرا ہی دیر سہی، جی بہل تو جاتا ہے
خدا سے محفل رنداں کی خیر مانگتے ہیں

ہیں آپ ہم بھی انھیں میں، سو ایسا کرتے ہیں
تمام خفتہ نصیباں کی خیر مانگتے ہیں

عزیز ہوتا ہے ہر ایک کو وطن اپنا
سو ہم بھی دشت و بیاباں کی خیر مانگتے ہیں

کسی نے چھانے ہیں صحرا کسی نے کھودے پہاڑ
ہم اپنے عشق تن آساں کی خیر مانگتے ہیں

اگرچہ دل ہی دکھاتے ہیں پھر بھی کیا کیجیے
ہم اپنے حلقۂ یاراں کی خیر مانگتے ہیں

مسافروں کی دعا ہے، قبول ہو جائے
ہم اپنے جملہ عزیزاں کی خیر مانگتے ہیں

٭

سید امتیاز احمد

ہجر میں بے قرار بھی نہیں تھے — وصل کے خواستگار بھی نہیں تھے
اُن دوانوں کا کیا ہوا انجام؟ — جو سرِ کوئے یار بھی نہیں تھے
خامشی کی صدا نہ بن پائے — وہ جو صوت ہزار بھی نہیں تھے
چھوٹے چھوٹے سے جانے کتنے ہی دُکھ — آپ پر آشکار بھی نہیں تھے
بات وہ تھی کہ جان دی جائے — اور تم شرمسار بھی نہیں تھے

٭

سید امتیاز احمد

لو پھر آئی صدا اُن راستوں کی — نہیں بھولی ہوا اُن راستوں کی
کبھی ہم نے دعا مانگی تھی ہم کو — کرے مٹی خدا اُن راستوں کی
اگر کوئی مسافر آئے پوچھو — کہ اب صورت ہے کیا اُن راستوں کی؟
وہاں کیا مجھ کو پہچانے گا کوئی؟ — کہ میں تو گرد تھا اُن راستوں کی
بہت سے رنج ہیں، خوشیاں بہت سی — کوئی اک ہے عطا اُن راستوں کی

٭

سید امتیاز احمد

اب تو اتنی سی عنایت بھی نہیں مانگتے ہم — جا میاں، تجھ سے محبت بھی نہیں مانگتے ہم
ایک دل ہے، سو کبھی دھیان نہ آیا اس کا — ایک سر ہے، کہ سلامت بھی نہیں مانگتے ہم
لیے پھر آبلہ پایاں کو جہاں جی چاہے — ایسے مزدور ہیں، اجرت بھی نہیں مانگتے ہم
لیے پھر آبلہ پایاں کو جہاں جی چاہے — ایسے مزدور ہیں، اجرت بھی نہیں مانگتے ہم
ہاں کبھی دیکھنا چاہی تھی محبت کی جھلک — اب اُن آنکھوں سے مروت بھی نہیں مانگتے ہم

ہم نے لکھا بھی تو کیا' اور نہ لکھا بھی تو کیا
شعر کا بدلہ تو شہرت بھی نہیں مانگتے ہم
کس لیے نام کی شاہی پہ خفا ہوتے ہیں؟
اب تو ان لوگوں سے بیعت بھی نہیں مانگتے ہم

٭

سید امتیاز احمد

منزلوں سا سفر لگے ہے ہمیں
اب یہ رستہ ہی گھر لگے ہے ہمیں
کیا ہمیں ہوگا رنج ناکامی
عیب اپنا ہنر لگے ہے ہمیں
روشنی بجھ رہی ہے آنکھوں میں
اور اندھیرے سے ڈر لگے ہیں ہمیں
اُس کو ناراض کرنے لگتے ہیں
کوئی اچھا اگر لگے ہے ہمیں
جانے کیوں تیری یاد آجائے
کوئی پتھر اگر لگے ہے ہمیں

٭

سید امتیاز احمد

بعد میں فائدہ کیا ہو گا' اگر زاری کریں
واقعہ ہونا تو ہے پہلے سے تیاری کریں
وقت ظالم ہے' نشاں تک نہیں رہنے دے گا
کب تک اے دل ترے زخموں کی نگہداری کریں
اپنے سر آپ لیا ہم نے تیرے جسے کا بوجھ
کیونکر اب شکوۂ احساسِ گرانباری کریں
ہم کہ رسم و رہ دنیا تو نبھانے کے نہیں
یہی بہتر ہے' کوئی رسم نئی جاری کریں
کوئی دشمن نہ کوئی دوست، نہیں ، کچھ بھی نہیں
ہوں یہ حالات تو کیا چارۂ بیزاری کریں
ہم، کہ در یوزہ گری کرتے ہوئے عمر کٹی
ہے بری بات اگر دعویٰ خودداری کریں

٭

سید امتیاز احمد

فیصلہ یہ ہوا ہے آخرِ کار جیسے بے فائدہ مرے بے کار
وہ تو ہے کم سخن ہمیشہ کا ہم بھی خاموش ہی رہے اس بار
چاہنا یا نہ چاہنا اس کو رائیگانی ہے اندک و بسیار
ورنہ ہوتا ملال دونوں کو تیری بے اعتنائیوں کے نثار
میں ہٹاتا ہوں آنکھ رستے سے تو بھی چہرے سے آسمان اتار

سید امتیاز احمد

جو کر گئے ہیں کم، وہ کمائی بھی نہیں تھی جو کھو دیا، کچھ ایسی خدائی بھی نہیں تھی
اے دوست، ملاقات گراں گزری ہے دل پر آسان مگر تیری جدائی بھی نہیں تھی
سوچو تو کوئی اچھی نہیں گزری ہے یہ عمر دیکھو تو کوئی ایسی برائی بھی نہیں تھی
ہم یونہی گریزاں ہوئے ہیں راہ وفا سے اس بار وہاں آبلہ پائی بھی نہیں تھی
کچھ اپنا تعلق تھا شناسائی سے بڑھ کر یہ بات کبھی اس کو بتائی بھی نہیں تھی

سید امتیاز احمد

گر زمانہ ، نہ ہو گا، تو ہو گا کوئی غم دل کے روبرو ہو گا
آنکھ محروم حسن یار نہ ہو ہاتھ کا کیا ہے بے سبو ہو گا
ہم جہاں یاد آگئے ہوں گے تو بھی موضوع گفتگو ہو گا
تو جدا ہے مگر یہ لگتا ہے ہجر اس بار بے نمو ہو گا
چھین کر تجھ سے ہم کو لیجائے کوئی کیا اتنا خوبرو ہو گا؟
شعر اپنے کہاں، کہاں تاثیر دل یونہی بے سبب لہو ہو گا

سلیم گورمانی

یوں نہ سدھرے گا دل، سدھارنے سے — بچہ کب مانتا ہے، مارنے سے

ان دنوں ہے عجیب حالتِ دل! — ڈوبتا ہے ترے ابھارنے سے

ہو نہ ہو مستجاب اس کی نوا — دل کو مطلب ہے بس پکارنے سے

کیسی محبوب ہو گئی دنیا! — دل میں عکس آپ کا اتارنے سے

حوصلہ مند جانتے ہیں سلیم — ہارتا کب ہے کوئی ہارنے سے

٭

سلیم گورمانی

ایک عجیب احساس ہے جس کو لکھنا چاہتا ہوں — جانے کیا وسواس ہے جس کو لکھنا چاہتا ہوں

ایسا بھی نہیں ہے بات نہ ہو سکتی ہو اس سے — بیٹھا میرے پاس ہے جس کو لکھنا چاہتا ہوں

معلوم ہوا ہے جس کا ذائقہ سیرابی میں — کوئی انوکھی پیاس ہے جس کو لکھنا چاہتا ہوں

وہ جو تیرے ہجر و وصل کی فصل میں کھل نہیں پائے — ان پھولوں کی باس ہے جس کو لکھنا چاہتا ہوں

شیرینیٔ جاں کی اس روز افزونی کا باعث — تیری نگہ کی مٹھاس ہے جس کو لکھنا چاہتا ہوں

اچھے وقتوں میں اک سانس بچا کر رکھی تھی — آج وہ آخری آس ہے جس کو لکھنا چاہتا ہوں

٭

سلیم گورمانی

نہیں معلوم عاشق ہوں، منافق ہوں
میں خود حیران ہوں اپنے رویے پر
کھڑا ہوں آگ کے آگے میں بچوں سا
سجا لوں، سوچتا ہوں، پھول کالر میں
تمنا ہے تمہارے ہاتھ چوموں اور
بنایا ہے محبت کو وسیلہ تو

اسے چاہوں اگر ظاہر نہ ہونے دوں
نہ دیکھوں اس کو جس کو دیکھنا چاہوں
ڈروں بھی اور چھونا بھی اسے چاہوں
کہ تتلی کی طرح پھولوں سا بن جاؤں
گہر دو آنسوؤں کے نذر گذراوں
دعا کی ناقبولیت کا کیوں سوچوں

٭

سلیم گورمانی

کسی زمین کسی آسماں میں رہنا ہے
خلاء میں گھومتے رہنا ہے دائروں میں مدام
کبھی نہ پائے گی تکمیل داستان حیات
کوئی بھی اسم پڑھو، یہ گھن نہ ٹوٹے گا
یہ چار دن ہیں بسر کر لو جس طرح ہو سلیم

کہیں بھی ہوں، ہمیں قید مکاں میں رہنا ہے
نظام گردش سیارگاں میں رہنا ہے
ہمارا قصہ یونہی درمیاں میں رہنا ہے
یقیں کو ہالۂ وہم و گماں میں رہنا ہے
ہمیشہ کے لئے کب کوئے جاں میں رہنا ہے

٭

سلیم گورمانی

کسی کے نام کی خوشبو بسی ہے
وہ میرے دھیان سے گذرا ہے شاید
سنبھالے ہوں میں خود کو اس لئے بھی
کچلتی کیوں نہیں کانٹوں کو آخر

مرے ہونٹوں کو تتلی چومتی ہے
گلی جاں کی معطر ہو گئی ہے
کہ میں ڈولوں تو دُنیا ڈولتی ہے
یہ دُنیا پھول ہی کیوں روندتی ہے

٭

سلیم گورمانی

جو شخص کہ ملنے کا نہیں خواب کے اندر
دل چاہے اسے عالم اسباب کے اندر

پھر یاد تری دل میں اچانک چلی آئی
اک برق سی لہرا گئی اعصاب کے اندر

مایوس ابھی اتنا نہ ہو اے دل ناداں
احباب بھی کچھ ہیں ترے احباب کے اندر

شب ہجر جو کھڑا رہتا ہوں یوں ٹکٹکی باندھے
کیا مجھ کو نظر آتا ہے مہتاب کے اندر

کرتا ہے نگہبانی یہاں آگ کی پانی
جلتے ہیں دیے دیدۂ پُرآب کے اندر

٭٭

سلیم گورمانی

عذاب بیچنے والے ثواب بیچنے والے
الٰہی ہوتے ہیں کیسے یہ خواب بیچنے والے

عجیب شہر ہے یہ اور عجیب لوگ ہیں اس کے
حیا خریدنے والے حجاب بیچنے والے

نہیں تھے دیکھے جو اب دیکھتے ہیں آنکھوں سے اپنی
برائے نان شبینہ شباب بیچنے والے

یہ کیسی فصل بہاراں ہے کیسا موسم گل ہے
ہوئے ہیں سوکھ کے کانٹا گلاب بیچنے والے

سلیم صدق بیانی نے کیا دیا تمہیں آخر
سمندروں کے ہیں مالک سراب بیچنے والے

٭٭

سلیم گورمانی

سچ مرے عہد میں رسوا ہے تو ہو
خلق کو جھوٹ کی پروا ہے تو ہو

زندگی چاہنے والے ہی کہاں
فی زمانہ کوئی عیسیٰ ہے تو ہو

اب کسے جائے سکونت سے غرض؟
تیرے دل میں کوئی گوشہ ہے تو ہو

مر گئی خواہش خواہش بھی یہاں
آپ کو حسرت دنیا ہے تو ہو

بولیں کیا مصلحت آمیز دروغ
شہر سارا ستم آرا ہے تو ہو

کس کو ہیں اپنے مفادات عزیز
عشق نقصان کا سودا ہے تو ہو

سچ سے انکار کروں کیوں میں سلیم
گر مخالف مرا گھٹیا ہے تو ہو

٭

سلیم گورمانی

کوئی بات بھی نہیں سوجھتی، کوئی کام بھی نہیں سوجھتا
ہے عجیب کیفیت ان دنوں، ترا نام بھی نہیں سوجھتا

کوئی ہجر ہے نہ وصال اب، نہ خوشی رہی نہ ملال اب
کسی سانولی کا خیال اب، سر شام بھی نہیں سوجھتا

جسے پوجتے رہے خواب میں، کیے سجدے جس کو غیاب میں
وہ ہے روبرو وہ ہے سامنے، تو سلام بھی نہیں سوجھتا

دھری رہ گئی ہیں فصاحتیں، کسی کام کی نہ بلاغتیں
بحضور یار سخن وروں کو کلام بھی نہیں سوجھتا

سر جوئے یار جو سیر کو نکل آئے آئینہ رو مرا
تو سلیم بہتی ہوئی ندی کو خرام بھی نہیں سوجھتا

٭

افضل گوہر

اب بدگمان ہوں، میں تجھے سوچنے سے بھی
تو کیوں نظر نہ آیا مجھے دیکھنے سے بھی

ایسی ہوا سے کون سی برسات آ گئی؟
دیوار گر رہی ہے مرے تھامنے سے بھی

کچھ ایسے سرد ہو گئے جذبات جسم کے
جلتا ہے اب رگوں میں لہو ناچنے سے بھی

تم آ کے راستے میں کھڑے ہو گئے ہو کیوں"؟
پہلی ہوا رکی ہے کہیں روکنے سے بھی

گوہر یہ سوچتے ہی میں شرمندہ ہو گیا
پتھر خدا ہوا ہے کبھی بولنے سے بھی

☆

افضل گوہر

تمہیں تو صرف اشارہ بنانا پڑتا ہے
ہمیں تو کھیل ہی سارا بنانا پڑتا ہے

دیا گیا ہے یہ کچا مکان بارش میں
سو رات دن ہمیں گارا بنانا پڑتا ہے

سیاہ رات کے قیدی ہیں اس لئے صاحب
چراغ کو بھی ستارہ بنانا پڑتا ہے

کوئی اٹھا نہیں سکتا تمام بارِ حیات
کبھی کسی کو سہارا بنانا پڑتا ہے

یہ زندگی تو وہ حیرت سرائے ہے کہ جہاں
نظر کے بدلے نظارہ بنانا پڑتا ہے

☆

افضل گوہر

ورنہ رُکنا تھا کہاں ہم نے ترے گاؤں میں
پیڑ نے کھینچ لیا خود ہی ہمیں چھاؤں میں

میں تو افلاک میں پرواز کیا کرتا ہوں
تیری دھرتی تو بہت کم ہے مرے پاؤں میں

وہ کسی روز سمندر بھی بنا ہی لے گا
جو ملا سکتا ہو دریاؤں کو دریاؤں میں

آ اسے بھی کسی دریا کے حوالے کر دیں
ریت کی پیاس تو بجھتی نہیں صحراؤں میں

خود کو مٹی کی طرح بھی نہ بچھاؤ گوہر
روند ڈالے گا کسی روز کوئی پاؤں میں

☆

عامر سہیل

کوئی صحیفۂ فرخندہ فال ہم پر بھی!
ہوئے ہیں بارِ زر و سیم و مال ہم پر بھی!

ہوائیں نوچ رہی ہیں لباس جسموں سے
کب آسمان کو ہونا ہے ڈھال ہم پر بھی!

یہ زندگی جو تمہیں روندتی ہے پیروں تلے
کبھی ہنسی تھی نگوڑی چھنال ہم پر بھی!

بدن کہ جلتے ہوئے تاروں سے باندھے گئے
جو موجزن ہے سمندر اچھال ہم پر بھی!

پیمبروں کی بھی تکذیب دیکھتا تھا یہ وقت!
زمیں الٹتی ہے آدم کی آل ہم پر بھی!

کہ جن سے بجھتے زمانوں کی نبض چلنے لگے
وہ آسمان سے اتریں خیال ہم پر بھی

جلیں تو نور زمانوں تلک رہے عامر
اچھالنا ہے تو سورج اچھال ہم پر بھی!

عامر سہیل

ورود شب سے گریزاں دراز قد کر کے
بدن کی اوٹ سے نکلو دعا کو حد کر کے

میں دیکھتا ہوا جاتا تھا ان پہاڑوں کو
جو بے بندھے ہوئے مارے گئے تھے زد کر کے

اب اپنے خیمے کریں نصب ان خلاؤں میں
چلی گئی ہے ہوا بستیوں کو رد کر کے

مصالحت کے صحیفوں سے ہاتھ اٹھاتی ہوئی
منافقوں کی جبینوں کو مسترد کر کے

یہ کن نشیبوں میں ہم آ گئے جھلستے ہوئے
ہمیں یہ کس نے اتارا شمار صد کر کے!

یہ میں کہ طائفہ درد میں جو شامل تھا!
وہاں سے بھی ہوں نکالا گیا حسد کر کے

کہیں پہ مصرع اٹھانے کے جرم میں مطعون!
کیا گیا ہوں کہیں مسترد سند کر کے!

ذرو نشیں میں تمہارے بہت قریب تو ہوں!
یہ شب دہکنے لگی ہے ذرا حسد کر کے!

تم اپنے خواب کی یہ شال ٹھیک سے اوڑھو
میں اپنے گیت جلاتا ہوں خود کو رد کر کے

مسافرت کی گھڑی آ پڑی سو اٹھتے ہیں
نشیب ہجر سے آوازۂ ابد کر کے!

کنیز شہ کے لئے بھی کوئی غزل عامر
بنائے حسن کو دیکھیں تو خال و خد کر کے!

عامر سہیل

غزل میں رات کٹی، دن گیا کتابوں میں
کھلا کبھی کوئی گیسو کہیں حجابوں میں!

شروع غم کی تپک بھی، نشاط آخر بھی!
کہاں گئے ہجر ہیں، اک یاد کے نصابوں میں!

یہ کارخانۂ افلاک و خاک و آب و سراب!
ہمارے عجز کے کب آ سکا حسابوں میں!

کہاں پہ کس کو پہنچنا ہے، یہ بھی یاد نہیں
بھٹک رہے ہیں مسافر ابھی سرابوں میں

کھنچے ہوئے تھے وہ جسموں کے حاشیے عامرؔ
کہ لوگ دیکھ کے ڈوبا کیے شرابوں میں

ذرا ذرا سی اچٹنے لگی ہے نیند عامرؔ
طلوعِ آخرِ شب کا گذر ہے خوابوں میں

٭

عامر سہیل

بارود سے، خوف سے لدی کوئی!
پھر اترے نہ ایسی صدی کوئی

ان نیکوکار زمینوں پہ
آباد ہے کب سے بدی کوئی!

دو ہونٹ رسیلے، شہد بھرے
اک حسن کہ دودھ کی ندی کوئی!

جوں آنسو، پلٹ نہیں سکتا!
اور سال نہ چھوڑے [۲] اوی کوئی!

یہ لوگ سدا آباد رہیں!
[۳] اسمان نہ کھولے کدی کوئی!

۱۔ دلہیز (سرائیکی)   ۲۔ سندھی   ۳۔ پنجابی

٭

عامر سہیل

نواحِ قامت و رخسار و ابرووان کے بغیر
گزر رہے ہیں زمانے ترے اماں کے بغیر!

کبھی کبھی تو مجھے یوں گمان پڑتا ہے!
میں اک وجود ہوں خالی وجودِ جاں کے بغیر

بچے کھچے ہوئے ٹکڑے ہیں خشک روٹی کے!
گنے چنے ہوئے کچھ دن ہیں، رفتگاں کے بغیر

جلا کیے رگ و پے میں اداسیوں کے چراغ!
کسی یقیں کے صلے میں' کسی گماں کے بغیر!

نہ سلسلہ نہ کسی سلسلے کی زیبائش!
خدا بغیر' زمیں کے بغیر' ماں کے بغیر

وہ اک کرن خم سیارگاں سے چھنتی ہوئی!
زمیں کو چومنے آتی ہے' آسماں کے بغیر

تو آج سے وہ محافظ شبیں تمام ہوئیں!
کہ دل میں تجھ میں اترنے لگیں اذاں کے بغیر

ان آئنوں سے بدکتی تھی خلق اور مجھے!
مصاحبی کا شرف' فکر آب و ناں کے بغیر

سواد جادۂ مشکوٰۃ ہجر کم آمیز!
بدن طواف کو سوئے عرب' نشاں کے بغیر!

☆

عامر سہیل

پلک پلک' ہجر گوندھ کر آئینے تراشیں
یہ بادلوں کی ہے رہگور آئینے تراشیں

میں سارے شہروں میں یہ خبر جا کے بانٹتا ہوں
کہ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر آئینے تراشیں

وہ پتھروں میں نہیں کہ اس سے کلام کر لیں
مگر اسی کے شجر حجر آئینے تراشیں!

کھنکتی مٹی' جمے ہوئے خون کی اداسی!
کہاں کی مہلت کہ خواب بھر آئینے تراشیں

کھلے گریباں' پھٹی قمیصیں' کٹی زبانیں
جہان بجھتے ہیں ہم اگر آئینے تراشیں

بہت اندھیرا تھا پر اسے بھولتے نہیں تھے
مگر یہاں کس کے نام پر آئینے تراشیں

فضا میں ریشم کی چادریں کھل رہی ہیں عامرؔ
کہ سانس لیتے ہوئے کھنڈر آئینے تراشیں

☆

عامر سہیل

ازل' ابد' دونوں حیرتی' کون دیکھتا ہے
یہ جھپٹا ہے کہ روشنی' کون دیکھتا ہے

وہ ہونٹ جیسے شفا جہانوں کو مل رہی ہو
گلاب کھلتے ہیں دائمی' کون دیکھتا ہے!

اس ایک در پر ملائکہ کا درود دائم!
یہاں زمینوں پہ روشنی! کون دیکھتا ہے!

فلک' ملک' خاک' چاک' سب اذن کے بھکاری!
چراغ بھرنے کو حاضری' کون دیکھتا ہے!

یہ چھاؤں کی باڑ کس نے کھینچی ہے گرد میرے! وہ دھوپ شانوں پہ کیا ہوئی' کون دیکھتا ہے
ہوائیں کس کے طواف کو پھر رہی ہیں عامؔر دھنک دھنک رات کھل اٹھی' کون دیکھتا ہے

٭

عامر سہیل

سمندروں سی کسی آنکھ کا بلویا ہوا کسی بیاض میں ڈھونڈیں گے رنگ کھویا ہوا
جوار حسن میں اے خاکنائے بے خبری! یہ میں ہوں جلتے ہوئے آنسوؤں سے رویا ہوا!
خود اپنے درد سے آئی ہے آنکھ میں یہ بہار! کسی کے خواب کا ٹکڑا نہیں چھپویا ہوا!
یہ میری آنکھیں ہیں کس کائنات کی تصویر! یہ کون عہد ہے ان آئینوں میں سویا ہوا
کواڑ رات نے جب بند کر لئے عامؔر اٹھائیں نظم نے پلکیں' چراغ گویا ہوا!

٭

عامر سہیل

اس کی آنکھوں سے چھنتی ہوئی روشنی! ہم کہاں آ گئے شہر کیا' لوگ کیا' سب کا سب اجنبی ہم کہاں آ گئے!
زندگی سے کئی بار پوچھا گیے زندگی زندگی! ہم کہاں آ گئے زندگی زندگی ہم کہاں آ گئے
جیسے آواز لکنت زدہ ہو' بدن راکھ کا ڈھیر ہو جیسے پرچھائیوں کو صدا دے کوئی' ہم کہاں آ گئے!
اب ہواؤں پہ بھی اپنے اپنے بسیروں کی چتا پڑی اب تو اس پیڑ کی چھاؤں بھی مر گئی ہم کہاں آ گئے
کون ابرو ہیں جن کی سیاہی فضاؤں میں گھلنے لگی رات کی ناگنہ پھر تھرکنے لگی' ہم کہاں آ گئے
ہم کو عامؔر زمانے کی رو نے کہاں لا کے بھٹکا دیا! اب تو رشتوں کی وہ بھیڑ بھی چھٹ گئی! ہم کہاں آ گئے!

٭

عامر سہیل

دیر تک آپ سے رہی بیزار! پھر ہنسی اور زہرخند ہوئی!

کھولتا تھا سے کا تھان کوئی! ایک کترن مجھے پسند ہوئی!
میرے ہونے کی یہ گھڑی مجھ پر تیرے ہونے سے ارجمند ہوئی!
اب زمیں سے کلام ہے ہم کو آسمانوں کی راہ بند ہوئی!
ٹوٹ سکتی ہے اعتبار کی ڈور! آپ ہی آپ جو بلند ہوئی!
میکدہ یاد کا اٹھا عامر ہم پہ غم کی شراب بند ہوئی
پھر اڑے ماتمی لباس عامر پھر چراغوں کی لو بلند ہوئی!

٭

عامر سہیل

دکھتی روشنی ایجاد کر کے بہت خوش ہیں زمیں برباد کر کے
یہ خاک کج نہاد و بے خط و خال چمکتی کیوں ہے دل فولاد کر کے
گزارے زندگی اس راہ سے بھی! پرانی صحبتوں کو یاد کر کے
اترتے ہیں کسی انگیا پہ موسم لہو کی بوند کو افتاد کر کے
بہت روئی تھی ہجرت کل سر شام کسی کے آنسوؤں پہ صاد کر کے
فضا تانبے سے بھر دیتے ہیں عامر محافظ بستیاں آباد کر کے

٭

عامر سہیل

سراب اور ریت کی تہہ اور پانی کہیں کیا اور مٹی کی کہانی!
بجھایا بستیوں نے چمنیوں کو دھواں پھیلا لہو میں آسمانی!
عصا بردار ہم سے پوچھتے ہیں یہاں چشموں سے کب پھوٹے گا پانی!
اثاثہ اور کیا رکھتے مسافر بچھونا نیند کا' اک رایگانی!
سمندر سے جدائی ہو رہی ہے ہوائیں چل رہی ہیں بادبانی!
مری آواز کا سایہ بھی کیا ہے میں کیا سایہ کروں اے خوش بیانی!
بھرے ہوں کھیت بھی آنکھوں کے عامر تو کچھ خوابوں کو کم ملتا ہے پانی!

٭

عامر بن علی

ہمیشہ پیار کرنے کا چلو اقرار کرتے ہیں
اکٹھے جینے مرنے کا چلو اقرار کرتے ہیں

سفر کیسا بھی ہو، ہاتھوں میں باہیں ڈال کر کاٹیں
ہمیشہ ساتھ چلنے کا چلو اقرار کرتے ہیں

محبت میں ملے صدمے تو اپنے دل پہ جھیلیں گے
کسی سے کچھ نہ کہنے کا چلو اقرار کرتے ہیں

زمانہ تو ہمیشہ سے ہی دشمن ہے محبت کا
زمانے کو بدلنے کا چلو اقرار کرتے ہیں

تمہارا میرا رستہ روکنے پربت بھی آ جائیں
پہاڑوں سے الجھنے کا چلو اقرار کرتے ہیں

نگر والے اگر ہم کو جگہ کوئی نہیں دیں گے
تو پھر جنگل میں بسنے کا چلو اقرار کرتے ہیں

ہم اپنے صحن کے پھولوں کو مرجھانے نہیں دیں گے
خزاں کو قید کرنے کا چلو اقرار کرتے ہیں

٭

عامر بن علی

ذرا اک بار مسکا دو، بڑی گہری اداسی ہے
ہمارے دل کو بہلا دو، بڑی گہری اداسی ہے

پرانے گھاؤ سارے درد سے مانوس لگتے ہیں
نیا اک زخم گہرا دو، بڑی گہری اداسی ہے

اکیلے پن نے اپنی ساری خوشیاں چھین رکھی ہیں
کبھی شانوں کو سہلا دو، بڑی گہری اداسی ہے

تمہارا عکس یادوں میں کہیں دھندلا نہ ہو جائے
کسی دن خواب مہکا دو، بڑی گہری اداسی ہے

خزاں چہرہ گھٹاؤں کو ترستا ہے کبھی اس پر
گھنی زلفوں کو بکھرا دو، بڑی گہری اداسی ہے

جو پچھلے سال خط کے ساتھ بھیجا تھا اسی جیسا
کوئی تحفہ انوکھا دو، بڑی گہری اداسی ہے

٭

عامر بن علی

اتنے مظلوموں کا خوں روز یہاں ہوتا ہے
اب تو شہروں پہ بھی مقتل کا گماں ہوتا ہے

ہر عدالت میں ہے بازار سا ماحول بپا
ایسے ماحول میں انصاف کہاں ہوتا ہے

کس اداسی کا سماں ہے مرے چاروں جانب
ٹیس اٹھتی ہے وہیں، زخم جہاں ہوتا ہے

ہر قدم ہجر کے آثار نظر آتے ہیں
ہر پڑاؤ پہ مرے گھر کا سماں ہوتا ہے

ہم نہیں چاہتے یہ پھر بھی بدل جاتی ہے
زندگی جیسے کرائے کا مکاں ہوتا ہے

☆

عامر بن علی

ہجوم شہر سے کٹ سا گیا ہوں
میں دنیا سے بہت اکتا گیا ہوں

کئی ہمراہ تھے راہِ وفا میں
سرِ مقتل مگر تنہا گیا ہوں

کبھی دل کے سوا کوئی نہ مانی
سبھی سے مشورہ کرتا گیا ہوں

کٹھن راہوں سے تو ڈرتا نہیں تھا
اندھیری رات سے گھبرا گیا ہوں

قسم جو تو نے دی تھی، توڑ والی
انہی راہوں پہ واپس آ گیا ہوں

☆

فاروق ساغر

دردِ دل سارے مراحل سے گذر آیا ہے
تب کہیں جا کے محبت کا ہنر آیا ہے

سوچتا ہوں تجھے اس بار دعا دے جاؤں
دیکھ اسے دربدری! سامنے گھر آیا ہے

لوحِ تقدیر پہ میثاقِ خزاں لکھا تھا
اور ہم خوش تھے کہ حصے میں شجر آیا ہے

جانے اس بار مسافر کے ارادے کیا ہیں
پشت پہ باندھ کے شہباز کے پر آیا ہے

اے شہِ وقت رہے حفظِ مراتب کا خیال
سر کو خم رکھنا کہ درویش کا در آیا ہے

اب کے بستی ہی نہیں خواب بھی بہہ جائیں گے
ایسے تیور لیے ساحل پہ بھنور آیا ہے

اس اندھیرے کے تصرف میں ہیں آنکھیں میری
جو نگل کر ابھی خورشید کا سر آیا ہے

ہونٹ در ہونٹ پذیرائی ملی ہے ساغرؔ
دست در دست مقدر میں سفر آیا ہے

٭٭

فاروق ساغر

حدیثِ وقت کے عنواں! تو کس خمار میں ہے؟
نئی سحر کی کرن تیرے انتظار میں ہے

اٹھو کہ لے بھی چکی رات آخری ہچکی
زمیں کی گردشِ پیہم نئے مدار میں ہے

کوئی صدا تجھے اپنی طرف بلاتی ہے
کوئی ستارہ ابھی تیری راہ گذار میں ہے

تجھے حیات کے ہر روز و شب بدلنے ہیں
کہ ایسا کرنا ابھی تیرے اختیار میں ہے

یہ قفلِ لب تو ہے صدیوں کا بند دروازہ
بس ایک ضرب پہ کھلنے کے انتظار میں ہے

یہ سوچ بدلے تو شاید نظام بھی بدلے
جو اس زمین پہ صدیوں سے اقتدار میں ہے

نہ اب کے فصل میری ہے نہ پھول اس کے ہیں
یہ کس خزاں کا تسلط میری کپاس میں ہے

سنو کہ ظلمتِ شب کہہ رہی ہے تارے سے
سحر کا اگلا پڑاؤ میرے دیار میں ہے

دہل گیا ہوں میں طوطے کی فال پہ ساغرؔ
کہ وصلِ یار کا امکاں اسی بہار میں ہے

٭٭

افتخار شفیع

میانِ رہزن و رہبر مجھے نہیں معلوم
یہ کون ہے مرے اندر مجھے نہیں معلوم

ستارہ وار چلا تھا دیارِ خواب کی سمت
اب آ گیا ہوں کہاں پر مجھے نہیں معلوم

گزر رہا ہوں کسی قریۂ جمیل سے اب
بہشت ہے کہ ترا گھر مجھے نہیں معلوم

میں تجھ سے دور کسی شہرِ نارسا میں ہوں
میں کس لئے ہوں یہاں پر مجھے نہیں معلوم

ذرا سی دیر کو مدھم ہوئی چراغ کی لو
پھر اس کے بعد کا منظر مجھے نہیں معلوم

بس اک اڑان کی خواہش نے آ لیا تھا مجھے
کہاں گئے مرے شہپر مجھے نہیں معلوم

لئے تو پھرتا ہوں اک وسعتِ نظر کو میں
یہ عشق ہے کہ سمندر مجھے نہیں معلوم

٭

افتخار شفیع

جدید ہوتے ہوئے کہنہ سال آدمی ہوں
میں آپ اپنے لئے اک سوال آدمی ہوں

مجھے بھی نخلِ تمنا کے رہگزار میں دیکھ
میں برف زار میں چنوں پہ شال آدمی ہوں

مری تلاش میں پھرتی ہے ریگِ صحرا بھی
میں اپنے دشت میں ہوں اور غزال آدمی ہوں

کسی پہ آج تک کھل سکا نہ عقدہ مرا
میں دوستوں کے لئے اک سوال آدمی ہوں

مجھی سے روشنی پاتے ہیں اختر و مہتاب
شبِ سیاہ میں سورج مثال آدمی ہوں

مجھے پکار کے دیکھو کسی شبستاں سے
میں اپنے عہد کا روشن خیال آدمی ہوں

بہت سنبھال کے رکھو مجھے کہ میں صاحب
عروج دور میں محوِ زوال آدمی ہوں

٭

افتخار شفیع

ہم اپنی خاک پہ ہیں کھڑے ایسے وقت بھی
جب خاک داں کو چھوڑ رہے ہیں درخت بھی

ہم نے وہ اک کتاب جو رکھی تھی رحل پر
ہم اس کو ڈھونڈتے رہے ہجرت کے وقت بھی

پاؤں بندھے ہوئے تھے ہمارے زمین سے
ہم سے سفر کا ہو نہ سکا بندوبست بھی

کل رات اپنے آپ سے ٹکرا گیا تھا میں
کچھ اس طرح کہ آئی نہیں بازگشت بھی

بجھتے ہوئے دیے کو بچا تو لیا مگر
دیکھی گئی نہ ہم سے ہوا کی شکست بھی

تو ہی فقط نہیں، ہے مرے دل میں افتخار
اس خانقاہ میں ہیں کئی اور مست بھی

٭

افتخار شفیع
(نذیر احمد مشتاق)

سارے آثار بتاتے ہیں مکیں رہتا ہے
کوئی طوفاں کی طرح زیر زمیں رہتا ہے

میں نکل آتا ہوں بازار کے سناٹے میں
گھر میں تو خوف کا احساس نہیں رہتا ہے

مجھ کو ہوتا ہے گماں رات پہ دن ہونے کا
میرے اطراف میں اک شعلہ جبیں رہتا ہے

میں کسی سمت چلا جاؤں عیاں ہونے کو
اس کے ہونے کا بہرطور یقیں رہتا ہے

اس کی آواز کہیں دور سے کیوں آتی ہے
وہ جو اک شخص مرے دل کے قریں رہتا ہے

٭

اسلام عظمی

زور کچھ چلتا نہ تھا قدر و قضا کے سامنے
اک دیا روشن رہا پھر بھی ہوا کے سامنے

اپنے اپنے دائروں میں اپنے اپنے دکھ لیے
تو خدا کے سامنے میں نا خدا کے سامنے

ایک بے موسم محبت اور رسوائی کا خوف
رنگ سب بے رنگ تھے رنگ حنا کے سامنے

کیا ملے گا اب محبت کا قرینہ سیکھ کر
کیا کرے گی اب وفا اک بے وفا کے سامنے

خوبصورت بستیوں کے خوبصورت لوگ بھی
بے طرح بے بس ہوئے جھوٹی انا کے سامنے

ایک پتھر تھا سو اس کو موم کر پائے نہ ہم
بس چلا اپنا نہ کوئی کج ادا کے سامنے

آپ بیتی بھی تھی عظمیؔ اور جگ بیتی بھی تھی
پر زباں کھلتی نہیں تھی آشنا کے سامنے

٭

اسلام عظمی

ستارہ وار بہت دور جھلملاتا ہوا
وہ میرے ساتھ رہا راستہ دکھاتا ہوا

جدھر بھی جاؤں مرے ساتھ ساتھ رہتا ہے
بگولہ سا، وہ مرے نقش پا مٹاتا ہوا

جو پوچھتے ہو سنو! یہ زمین میری نہیں
میں آ گیا ہوں یہاں کشتیاں جلاتا ہوا

مرا زوال تماشا بڑے مزے کا تھا
تمام شہر ملا مجھ کو مسکراتا ہوا

خیال و خواب کی اک کیفیت نے آن لیا
میں چل رہا تھا ترا نام گنگناتا ہوا

فریب دشت و بیاباں میں قید ہیں دونوں
میں رُکا اور وہ مرا حوصلہ بڑھاتا ہوا

کوئی دریچہ ہوا وا نہ در کھلا عظمیؔ
گزر گیا میں گلی سے صدا لگاتا ہوا

٭

اسلام عظمی

ایک نادیدہ نمی آنکھوں میں ہے
روشنی ہی روشنی آنکھوں میں ہے

ہے ابھی آلودۂ دنیا یہ دل
وحشتیں ہیں، برہمی آنکھوں میں ہے

راستہ سیدھا ہے، گر دیکھے کوئی
کچھ نہ کچھ ورنہ کجی آنکھوں میں ہے

ماورا نقطوں سے باتیں اس کی ہیں
اور نصاب شاعری آنکھوں میں ہے

رتجگے میں شب کٹے گی آج بھی
چاند دل میں، چاندنی آنکھوں میں ہے

رونق بازار سے بیزار دل
ایک کچی کوٹھری آنکھوں میں ہے

بھول جائے کس طرح عظمی تجھے
ہو بہو صورت تری آنکھوں میں ہے

٭

قمر جاوید

ایک ستارا دُور اُفق پر ایک ستارا آنکھوں میں
چاروں جانب رات کا دریا خواب کنارا آنکھوں میں

بڑھتے بڑھتے یہ پانی تو اپنے گھروں تک آپہنچا
لوگو ڈُوبتے شہر کا منظر بھر لو سارا آنکھوں میں

سیل رواں سے ساحل جاں تک رخت سفر بس اتنا ہے
کچا گھڑا، سسی کی آنکھیں، تخت ہزارہ آنکھوں میں

شہر جنوں کے بازاروں میں گرد مسافت چہروں پر
گزرے دنوں کے پھول اور موسم پارہ پارہ آنکھوں میں

سانسوں کے صحرا سے آگے ایک سمندر جسموں کا
جس کے لبوں پر پیاس انوکھی درد نیارا آنکھوں میں

٭

فاطمہ غزل

ہم گلی سے تری، چپ چاپ گزر آتے ہیں
اپنی دھڑکن تری دہلیز پہ دھر آتے ہیں

ایک تو ہے کہ تیری چاپ کو ترسے مرا دل
ورنہ تو شام کو سب لوٹ کے گھر آتے ہیں

تو نے ساحل پہ کیا مجھ سے کنارہ مری جاں
اب ذرا دیکھ مری سمت بھنور آتے ہیں

زندگی جیسے شب ہجر ہے، گزرے گی مگر
دیکھ تو ہاتھ پہ وہ رکھ کے سحر آتے ہیں

آپ تو میرے لیے بن کے چراغ آئے ہیں
آپ کے ساتھ اُجالے بھی ادھر آتے ہیں

اُن سے ملتے ہوئے اکثر میں غزل سوچتی ہوں
کیا وہ ایسے ہی ہیں، جیسا کہ نظر آتے ہیں؟

فاطمہ غزل

بہت قریب سے مجھ کو پکارتا ہے کوئی
فلک کے تارے زمیں پر اتارتا ہے کوئی

میں اس کے بال سنواروں کہ اس کو دیکھا کروں
مجھے خیالوں میں لیکن سنوارتا ہے کوئی

ہوا قریب سے گزری تو یوں لگا مجھ کو
کسی حصار میں مجھ کو اُتارتا ہے کوئی

مری منڈیر پہ کس نے دیا جلایا ہے
میری حیات کو دیکھو نکھارتا ہے کوئی

یہ زندگی تو ہے میری مگر یہ لگتا ہے
نہ ہو کے بھی اُسے جیسے گزارتا ہے کوئی

غزل نگاہ کو اس سمت اور کر اُونچا
کہ اس بلندی سے تجھ کو پکارتا ہے کوئی

راشدہ اداسؔ

یوں تو اکثر اے ہوا! اس سے گلہ رکھتی ہوں میں
دل کے جزداں میں مگر، پھر بھی دعا رکھتی ہوں میں

جو اسے میرا بنا دے اس جہانِ عشق میں!!
جن کے اپنے واسطے ایسی سزا رکھتی ہوں میں

سرخ رو دنیا میں وہ دکھلائے جو مجھ کو سدا
شہرِ دل میں اک دیا ایسا جلا رکھتی ہوں میں

بھول نہ جائے خدا، مجھ کو خوشی کی آس میں
کچھ دکھوں کو واسطے اپنے بچا رکھتی ہوں میں

اس کو یزداں نے لکھا ہے چاند! میرے بخت میں
خود فراموشی میں بھی اسکا پتہ رکھتی ہوں میں

ورد کرتی ہوں میں اس کا رات کے پچھلے پہر
چاند! اس کی یاد کو دل میں چھپا رکھتی ہوں میں

میں ہوا کے ہاتھ اسکو بھیج دیتی ہوں دُعا
جس طرح ممکن ہو اُس سے رابطہ رکھتی ہوں میں

میں جہاں کی بھیڑ میں گم ہو نہیں سکتی اداسؔ
کیونکہ دل کے طاقچے میں اک دیا رکھتی ہوں میں

٭٭

راشدہ اداسؔ

مجھے وہ یہ بتانا چاہتا ہے
کہ وہ مجھ کو بھلانا چاہتا ہے

رویے میں بھی تبدیلی نئی ہے
مجھے وہ کیا بتانا چاہتا ہے

میں اسکی راہ کا پتھر ہوں شاید
مجھے رہ سے ہٹانا چاہتا ہے

یہ طوفاں آج بے مقصد نہیں ہے
شجر پتے گرانا چاہتا ہے

وہ شہرِ دل میں پھر سے چاہتوں کی
نئی شمعیں جلانا چاہتا ہے

مرے حق میں ضیافت کے بہانے
بلانے کا بہانہ چاہتا ہے

میں بن تیرے ہوں تیری ہمسفر، اور
تو میرا دل دکھانا چاہتا ہے

مجھے کچھ دیر یونہی بھول کر کیوں
تو خود کو آزمانا چاہتا ہے

اے مجھ کو بھولنے والے ترا غم
میرے دل میں ٹھکانہ چاہتا ہے

٭٭

عطا محمد خان

دیواروں میں پھیل گئے ہیں خوف کے مارے لوگ
اپنے آپ سے ڈرتے ہیں یہ سہمے سہمے لوگ

پانی پانی کرتے ہاتھ گنوا بیٹھے ہیں اپنے
ساحل ساحل ڈوب گئے سب' میں اور میرے لوگ

ایک طمانچے کی صورت ہیں، شہر کے چہرے پر
فٹ پاتھوں پر پڑے ہوئے یہ بھوکے ننگے لوگ

نصف صدی سے چلے ہوئے ہیں اپنی منزل کو
حرف حرف تاریخ کے چہرے پر یہ لکھے لوگ

کیسے کیسے زخم لئے پھرتے ہیں دیکھ عطاؔ
شہر بھرے ان ہنگاموں میں اجڑے اجڑے لوگ

☆

عطا محمد خان

کاش دریا کے کنارے کوئی دریا ہوتا
پیاس بڑھتی نہ اگر راہ میں صحرا ہوتا

ہم چلے آتے سمندر کو لئے ہاتھوں میں
تم نے اک بار اگر ہم کو پکارا ہوتا

ہم تجھے پیرہنِ قوسِ قزح پہناتے
تو اگر قریۂ مہتاب میں آیا ہوتا

یہ تو وحشی کی ادا تھی کہ رہا میں خاموش
ورنہ دنیا کی طلب تھی کہ تماشہ ہوتا

نام کو ہم بھی ترے زیبِ غزل کر دیتے
ہم کو منظور نہیں تھا ترا چرچا ہوتا

بیٹھ جاتے کہیں سستانے اگر ہم بھی عطاؔ
کون پھر منزلِ مقصود پہ پہنچا ہوتا

☆

عطاء الحق قاسمی

معیار کیا ہے، صاحب معیار کون ہے؟
کردار کیا ہے، صاحب کردار کون ہے؟

اے شخص تیرا ہاتھ ہے تلوار پہ مگر
یہ تو بتا کہ صاحب تلوار کون ہے؟

کہتے ہو جانثار ہے، دلدار ہے، مگر
یہ بھی کبھی بتاؤ کہ دلدار کون ہے؟

اک دوسرے کے درپے آزار ہیں سبھی
اور پوچھتے ہیں درپے آزار کون ہے؟

ہر شخص ذوق و شوق سے کھجلا رہا ہے کان
مصروف سارا شہر ہے، بیکار کون ہے؟

٭٭

عطاء الحق قاسمی

خواب میں نے دیکھا تھا، کیا حسیں سویرا تھا
آنکھ جب کھلی میری، پھر وہی اندھیرا تھا

میں نے اس کو دیکھا تھا، ماہتاب چہروں میں
ماہتاب چہروں میں بس اسی کا چرچا تھا

اس گلی میں جا نکلا، میں اداس لمحوں میں
بند تھی گلی وہ بھی، اور چپ کا پہرہ تھا

تم تو شہر خوباں کی ہر ادا سے واقف تھے
کب کسی نے آہٹ پر دل دریچہ کھولا تھا؟

دونوں ایک جیسے تھے، دونوں بچوں جیسے تھے
وہ بھی ہنستا روتا تھا، یہ بھی ہنستا روتا تھا

قاسمی سے کہنا تم، اب کہاں کی تعبیریں
تم نے خواب جو دیکھا، خواب وہ انوکھا تھا

٭٭

شہاب صاحب

''شہاب نامہ'' کا ایک باب جو لکھا نہیں گیا

پروفیسر فتح محمد ملک

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وفاقی دارالحکومت کی کراچی سے راولپنڈی منتقلی کو بس جمعہ جمعہ آٹھ دن ہی ہوئے تھے۔ اس اچانک تبدیلی نے راولپنڈی کے قصباتی اور مضافاتی ماحول کو یکدم بدل کر رکھ دیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے افسر شاہی نے اس چھوٹے سے شہر پر دھاوا بول دیا ہو۔ اس صورت حال نے راولپنڈی کی ادبی اور تہذیبی فضا کو بھی قدرتی طور پر متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ ادبی بحث مباحثوں میں بھی خلوص کی جگہ ریاکاری اور نظریاتی وابستگی کے ساتھ ساتھ ابن الوقتی کا چلن عام ہونے لگا تھا۔ اس زمانے میں حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس راولپنڈی پریس کلب میں ہوا کرتے تھے۔ ایسے میں حلقہ نے قدرت اللہ شہاب کے ساتھ ایک شام کا اہتمام کیا تقریب میں شہاب صاحب کی موجودگی میں ان کی شخصیت اور ان کے فن پر چند مضامین پیش کیے گئے۔ شہاب صاحب ان دنوں صدر ایوب خان کے پرنسپل سیکرٹری تھے۔ اس لئے اجلاس میں ادیب بس آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ افسر شاہی کے اس ہجوم میں جب میں اپنا مضمون پڑھتے پڑھتے اختتامی حصے تک آپہنچا اور شہاب صاحب کے فن میں جمود وزوال اور اس کے اسباب ونتائج تک پہنچا تو ریڈیو پاکستان اور وزارت اطلاعات کے تین مختلف افسران نے مجھے روکنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ میرے مضمون کا یہ حصہ سیاسی ہے ادبی نہیں۔ اس لئے مجھے یہ حصہ نہ پڑھنا چاہیے۔ میرا نقطہ نظر یہ تھا کہ جسٹس ایم آر کیانی کے اٹھائے ہوئے سوالات کا جواب دے دے کر ایوب طرز حکومت کی وکالت کا جو فرض شہاب صاحب نے اپنے ذمہ لے لیا ہے وہ ان کے فن اور ہماری تخلیقی زندگی کے لئے نقصان دہ ہے۔ ان کی تقریر ان کی تحریر کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی ہے اور یوں ان کی فنی نشوونما رک گئی ہے۔ یہ رویہ ہمارے دوسرے بڑے ادیب بھی اپناتے نظر آرہے ہیں جس سے ہماری تہذیبی زندگی منفی طور پر متاثر ہو رہی ہے۔ اس لئے میرے مضمون کا یہ حصہ انتہائی اہم ہے اور اگر مجھے یہ باتیں نہ کرنا ہوتیں تو شاید یہ مضمون لکھا ہی نہ جاتا۔ اس پر معترضین اور زیادہ خفا ہوئے اور اونچی آواز میں حلقۂ ارباب ذوق کے قواعد وضوابط کا حوالہ دینے لگے۔ اس پر قدرت اللہ شہاب

کھڑے ہو گئے اور انتہائی ناگواری کے ساتھ اپنے حامیوں کو چپ رہنے اور میرا مضمون سننے کی تلقین کی۔ جب میں مضمون ختم کر چکا تو سب سے پہلے شہاب صاحب نے تعریفی کلمات کہے‘ آخر میں انہوں نے صرف میرے مضمون کی تعریف کی اور کہا کہ میں ان سوالات پر غور کروں گا۔ صدر کے علاقے کا وو گیز کیفے ان دنوں ادیبوں، شاعروں، مصوروں اور کھلاڑیوں کی پسندیدہ جگہ تھی۔ شام سے رات گئے تک یہاں بزرگ اور نوآموز ادیب آتے جاتے رہتے تھے۔ حلقہ ارباب ذوق کے مذکورہ اجلاس کے تین روز بعد جناب ممتاز مفتی مجھے کیفے سے اٹھا کر باہر لے گئے اور بطور خاص اس مضمون کی داد دی اور کہا کہ شہاب صاحب چاہتے ہیں کہ یہ مضمون نقوش میں شائع ہو۔ تم مجھے اس مضمون کی ایک نقل فراہم کر دو تا کہ میں طفیل صاحب کو بھجوا دوں۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ یہ مضمون خود شہاب صاحب نے ایک حرف تک تبدیل کیے بغیر نقوش میں شائع کر دیا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں شہاب صاحب نے صرف خوف فساد خلق سے میری حمایت نہیں کی تھی بلکہ انہیں واقعتاً مضمون پسند آیا تھا۔ یہ گویا میرا شہاب صاحب کی شخصیت سے پہلا تعارف تھا۔

بہت جلد ایوب خان نے امریکی دباؤ میں آ کر شہاب صاحب کو سفیر بنا کر یورپ بھجوا دیا اور ان کی جگہ الطاف گوہر کو لاہور سے اسلام آباد لے آئے۔ ایک بار پھر جناب ممتاز مفتی مجھے ڈھونڈتے ہوئے آئے اور یہ پیغام لائے کہ شہاب صاحب کے اعزاز میں ایک الوداعی عشائیہ کا اہتمام کیا گیا ہے اور شہاب صاحب سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے نام اور پتے دیں تا کہ انہیں تقریب میں بلایا جائے۔ انہوں نے تمہارا نام بھی دیا ہے اور کل شام تمہیں سٹیلائٹ ٹاؤن اے بلاک کی فلاں کوٹھی میں اس عشائیہ میں شریک ہونا ہے۔ دوسری شام جب میں وہاں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مفتی صاحب اور میرے علاوہ وہاں کوئی اور ادیب موجود نہیں تھا۔ اس روز مجھے اپنے لیے شہاب صاحب کی شفقت پر بہت فخر محسوس ہوا۔

جب شہاب صاحب سفارت کے پردے میں اپنی جلاوطنی کی مدت پوری کر کے واپس اسلام آباد آئے تو انہیں وزارت تعلیم کا سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ میں ان دنوں گورنمنٹ کالج راولپنڈی میں پڑھایا کرتا تھا۔ اچانک ایک روز ایک نوٹیفیکیشن کے ہمراہ یہ پیغام ملا کہ میں اپنے کوائف نامہ کی چند نقول وزارت تعلیم کو بھجوا دوں۔ نوٹیفیکیشن پڑھ کر پتہ چلا کہ وزارت تعلیم نے مجھے امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرر کے طور پر نامزد کر دیا ہے۔ میں دوسرے روز شہاب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، شکریہ ادا کیا اور یہ پیشکش قبول کرنے سے معذرت پیش کی۔ میرا استدلال یہ تھا کہ مجھے غیر ملکیوں کو اردو پڑھانے کا ہنر نہیں آتا۔ میں یہ ہنر سیکھنا بھی نہیں چاہتا کیونکہ میں اپنا سارا وقت ادب اور ادبی تنقید کو دینا چاہتا ہوں۔ شہاب صاحب نے ازراہ شفقت میری معذرت قبول کر لی۔ چند برس بعد پھر ایک ایسا موقع آیا جب وزارت تعلیم میں درجنوں ایجوکیشنل ایڈوائزر متعین کرنے کی منصوبہ بندی ہو رہی تھی۔ کسی نے میرا ذکر بھی کیا۔ اس پر شہاب صاحب نے عدم اتفاق کرتے ہوئے فرمایا کہ اسے وزارت تعلیم میں مت لایا جائے اس لئے کہ وہ یہاں آ کر ناخوش رہے گا۔ یہ جان کر مجھے بہت خوشی

بھی ہوئی اور ایک گونہ حیرت بھی کہ شہاب صاحب میری کم آمیزی کے باوجود مجھے خوب سمجھتے ہیں۔

میری طرف سے احترام اور ان کی جانب سے شفقت کے باوجود ہمیں ایک دوسرے سے ملنے کے مواقع بہت کم ملے۔ کبھی میں ملک سے باہر رہا اور کبھی وہ۔ بھٹو صاحب وزیراعظم بنے تو انہوں نے شہاب صاحب کو لندن سے واپس بلایا اور وزارت تعلیم میں سیکرٹری جنرل کا مقام دیا۔ اس دور میں شہاب صاحب سے نسبتاً زیادہ ملاقات رہی۔ اسی دور کی ایک شام میرے لیے نا قابل فراموش بن کر رہ گئی ہے۔ ہوٹل ہالیڈے ان میں کشمیر پر ایک سیمینار ہو رہا تھا۔ سیاسی تقریریں سنتے سنتے ہم سیمینار روم سے کھسک کر کافی کارنر میں جا بیٹھے۔ کشمیر' کشمیریوں اور مسئلہ کشمیر پر دھواں دھار تقریریں سن کر آئے تھے' اس لئے خاموش بیٹھ گئے اور چائے پینے لگے۔ ابھی چند لمحات ہی گزرے تھے کہ شہاب صاحب نے خاموشی توڑی اور بہت سی باتوں کے درمیان ایک چشم دید واقعہ بیان کیا۔ سن اڑتالیس کی ایک سہ پہر وزیراعظم لیاقت علی خان اور وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان نے انہیں وزارت امور کشمیر کے سیکرٹری ہونے کے ناطے طلب فرمایا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے تو چپ طاری ہوگئی۔ گھنٹی بجی اور جنرل اکبر خان گھنٹی کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ لیاقت علی خان نے جنرل اکبر خان کو بتایا کہ کشمیر میں جنگ بندی کے لئے حکومت برطانیہ کا شدید دباؤ ہے'۔ اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ فوراً جنگ بند کر دی جائے اور مسئلہ اقوام متحدہ کی وساطت سے حل کیا جائے۔ اس پر جب جنرل اکبر خان نے اپنی ساری دلیلیں بے اثر ہوتی دیکھیں تو وزیراعظم سے اپیل کی کہ اگر یہی آخری فیصلہ ہے تو جنگ بندی کے لئے آج رات کی بجائے کل دن کا کوئی وقت مقرر کر دیا جائے۔ شہاب صاحب نے اپنے تیز بین مشاہدے کی روشنی میں بتایا کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے لیاقت علی خان جنرل اکبر کی اس بات کو مان گئے ہیں اور زبان کھولنے ہی والے ہیں کہ سر ظفر اللہ خان غصے میں آگ بگولہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور براہ راست جنرل اکبر خان کو ڈانٹنے ڈپٹنے لگے۔ یہ ڈانٹ ڈپٹ اس جملے پر ختم ہوئی:

You are summoned here to obey the orders. You are not here to argue but only to obey the orders. Get out.

جنرل اکبر خان کمرے سے باہر نکل گئے اور وزیراعظم لیاقت علی خان حیران پریشان بیٹھے دیکھتے رہ گئے۔ ذرا سی دیر کی گونجتی گرجتی خاموشی کے بعد مجھے بھی جانے کی اجازت دے دی گئی۔

میرے لیے یہ واقعہ زندگی کے انتہائی نا قابل فراموش واقعات میں سے ایک ہے۔ ایک مدت بعد جب میں نے کشمیر پر کچھ لکھنا چاہا تو میں نے ''شہاب نامہ'' کی ورق گردانی کی تو یہ واقعہ کہیں نظر نہ آیا۔ اب بھی کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اس نا قابل فراموش واقعے کو شہاب صاحب کیسے بھول گئے؟

شہاب صاحب کی افسری اور درویشی

ڈاکٹر آفتاب احمد خان

قدرت اللہ شہاب ہمارے زمانے کے نامور ادیب اور سول سرونٹ تھے۔ میں ان کی جاننے والوں میں ضرور تھا مگر مجھے ان سے کوئی خاص قرب حاصل نہیں تھا۔ انڈین سول سروس میں تو وہ آزادی سے کچھ سال قبل آچکے تھے البتہ آزادی کے بعد بطور ادیب شہاب صاحب نے اپنی کتاب "یا خدا"، "ماں جی" اور بعض دوسری کہانیوں کی اشاعت پر شہرت پائی اور ان کا نام پاکستان کے ادبی حلقوں میں مقبول ہوا۔ پھر اس کے بعد ان کی شہرت بطور سول سرونٹ عام ہوئی۔ وہ پہلے ملک غلام محمد، صدر پاکستان کے سیکرٹری ہوئے پھر جب سکندر مرزا صدر بنے تو شہاب صاحب اسی عہدے پر فائز رہے۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے بعد سکندر مرزا بیرون ملک رخصت کر دیے گئے اور جنرل محمد ایوب خاں نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر پاکستان کا منصب سنبھالا تو شہاب صاحب ان کے سیکرٹری کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دینے لگے۔ ملک غلام محمد، سکندر مرزا اور جنرل ایوب خاں تین نہایت مختلف مزاج کے آدمی تھے اور بطور افسر حکومت کے مختلف محکموں سے وابستہ رہے تھے۔ شہاب صاحب کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے ان تینوں کے دور میں عہدہ بطور سیکرٹری صدر پاکستان برقرار رکھا اور تینوں کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ اپنے خاص دوستوں کے حلقے میں وہ ان کے لطیفے بھی سناتے تھے مگر انہوں نے بطور سول سرونٹ اپنی وفاداری میں کبھی فرق نہیں آنے دیا۔

جنرل ایوب خاں کے مارشل لاء کے بعد جمیل الدین عالی اور ان کے احباب نے رائٹرز گلڈ کا ڈول ڈالا اور شہاب صاحب کو بطور ادیب اس لئے بھی شامل کیا کہ وہ جس عہدے پہ متمکن تھے اس سے گلڈ کی ترقی اور فروغ میں مدد مل سکتی تھی۔ گلڈ کے افتتاحی اجلاس میں جس سے ایوب خاں نے خطاب کیا، شہاب صاحب نے اپنی تقریر میں ان کا استقبال کرتے ہوئے ایک ایسی بات کہی جس نے اکثر سننے والوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ انہوں نے کہا:

"چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی موجودگی میں تمام مارشل لاء آرڈرز کے درمیان میں بطور فرد اور

بطور ادیب اپنے آپ کو بالکل آزاد محسوس کرتا ہوں''۔

شہاب صاحب کے اس اعلان سے بطور سول سرونٹ ان کی وفاداری کا برملا اظہار ہوتا تھا۔

ایوب خاں کے مارشل لاء کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کیانی صاحب نے اپنے کچھ خطبات میں مارشل لاء حکومت پر طنز و مزاح کے تیر چلائے۔ جسٹس کیانی کے یہ خطبات اپنے تلخ اور شیریں انداز کی بناء پر اس زمانے میں خاصے مقبول ہوئے اور ان کو لوگوں نے بڑی خوشگوار حیرت سے پڑھا کہ ایک برگزیدہ جج نے کھلے بندوں مارشل لاء کی حکومت کا مذاق اڑایا ہے۔ شہاب صاحب نے حکومت سے اپنی وفاداری کے ثبوت میں جسٹس کیانی کے خطبات کا جواب دیا اور حکومت کی مدافعت میں بڑا زور مارا مگر وہ ''مولوی مدن کی سی بات'' پیدا نہ ہوئی۔

اس سلسلے میں ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے جس کی تفصیل مجھے مجید ملک صاحب سے کہ اس زمانے میں پرنسپل انفارمیشن آفیسر تھے، معلوم ہوئی۔ ایوب خاں کے مارشل لاء کا ایک ''کارنامہ'' جس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ''پاکستان ٹائمز''، ''امروز'' اور ''لیل و نہار'' کا سرکاری تحویل میں لیا جانا تھا۔ مجید ملک صاحب سے میرے بڑے قریبی تعلقات تھے۔ اپریل ۱۹۵۹ء کی ایک دوپہر کو کراچی کے گورنمنٹ آفیسرز ہوسٹل میں جہاں میں مقیم تھا، انہوں نے اپنی سٹاف کار بھیج کر مجھے دفتر بلا بھیجا۔ میں جب وہاں پہنچا تو مجید صاحب اپنے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ مجھے انہوں نے صوفے پر بیٹھنے کو کہا، کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور میرے قریب آ کر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد انہوں نے بہت سنجیدہ لہجے میں کہا کہ ایک ایسا واقعہ ہونے والا ہے جس کا میرے دل پر بہت بوجھ ہے۔ میں تم سے اس کا ذکر کرنا چاہتا ہوں مگر تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اس سلسلے میں کسی سے بات نہیں کرو گے۔ میں نے وعدہ کر لیا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ پروگریسو پیپرز یعنی ''پاکستان ٹائمز''، ''امروز'' اور ہفت روزہ ''لیل و نہار'' کو اپنے قبضے میں لے لیا جائے اور یہ کہ اس سلسلے میں وہ آج شام کی گاڑی سے لاہور جا رہے ہیں۔ مجید ملک صاحب نے کہا کہ میں نے اپنے طور پر اس کی بہت مخالفت کی مگر میری رائے سے کسی نے اتفاق نہیں کیا۔ میں نے قدرت اللہ شہاب سے بات کی اور اس امید کے ساتھ کہ وہ اس سلسلے میں ضرور میری ہمنوائی کریں گے، اس لئے کہ انہوں نے رائٹرز گلڈ وغیرہ کے قیام میں حصہ لیا ہے اور آزادی اظہار کا دعویٰ کیا ہے مگر شہاب صاحب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ملک صاحب یہ مارشل لاء کی حکومت کا فیصلہ ہے، آپ اور میں اس میں کیا کر سکتے ہیں سوائے اس کے کہ جو کام ہمیں سونپا جائے اسے پورا کریں۔ مجید ملک صاحب نے کہا کہ میں یہ جواب سن کر بہت مایوس ہوا اور آ کر میں نے اس اقدام کے خلاف ایک نوٹ لکھنے کا فیصلہ کیا جس کے بعد انہوں نے ایک فائل میری طرف بڑھا دی اور وہ نوٹ پڑھوایا۔ مجید ملک صاحب نے کہا کہ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی اور چارہ کار نہیں تھا۔ اس موقع پہ مجھے لاہور میں موجود رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ باقی سب متعلقہ لوگ بھی قدرت اللہ شہاب سمیت وہاں موجود ہوں گے۔ چنانچہ دو، تین دن کے بعد یعنی سرکاری تحویل میں لیے جانے

کے بعد جب ''پاکستان ٹائمز'' نکلا تو اس میں شہاب صاحب کا لکھا ہوا ایڈیٹوریل تھا جس کا عنوان تھا ''نیو لیف''۔ اس واقعے سے بھی بطور سول سرونٹ شہاب صاحب کی وفاداری کا اظہار ہوتا ہے جو ان کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل تھی۔

جنرل ایوب خان کے بعد جنرل یحییٰ کا دور آیا۔ شہاب صاحب ذہین آدمی تھے وہ بھانپ گئے کہ یہ جنرل اور قماش کا آدمی ہے چنانچہ وہ طویل رخصت پر انگلستان چلے گئے اور یحییٰ خاں کے دو اڑھائی سال کے دور سے بالکل بے تعلق رہے۔ ہاں جب ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے وزیر اعظم بنے تو وہ وطن واپس آ گئے۔ ان سے شہاب صاحب کے اچھے تعلقات تھے۔ چنانچہ وہ ان کے عہد حکومت میں سیکرٹری تعلیم اور سیکرٹری کلچر وغیرہ کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ میں نے اوپر تین سربراہان مملکت کا ذکر کیا ہے جن کے ماتحت نہایت کامیابی سے شہاب صاحب نے کام کیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو ان تینوں سے سراسر مختلف قسم کے سربراہ حکومت تھے۔ وہ اہل سیاسی لیڈر تھے اور ان کا انداز و حکمرانی اور قسم کا تھا مگر شہاب صاحب نے ان کے ساتھ بھی اسی کامیابی سے خدمات انجام دیں۔

شہاب صاحب کو شروع ہی سے تصوف اور روحانیت سے بڑا شغف تھا اور وہ پیروں فقیروں سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور اس سلسلے میں مختلف قسم کے واقعات بھی سنایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں میرا ایک دلچسپ واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد گورنمنٹ کالج میں سائنس کے پروفیسر تھے جبکہ میں وہاں شعبہ انگریزی میں لیکچرار تھا۔ وہ مجھ سے بڑی شفقت فرماتے اور مجھے ان سے بڑا قرب حاصل تھا۔ جب ڈاکٹر صاحب کی ترقی ہوئی تو انہیں گورنمنٹ کالج جھنگ کا پرنسپل بنا دیا گیا۔ یہ شاید ۱۹۵۲ء کا واقعہ ہے کہ مجھے ڈاکٹر صاحب نے جھنگ آنے کی دعوت دی۔ اس زمانے میں قدرت اللہ شہاب وہاں کے ڈپٹی کمشنر تھے اور ان سے ڈاکٹر صاحب کی ملاقات رہتی تھی۔ جس شام میں جھنگ پہنچا اسی شام ڈاکٹر صاحب نے شہاب صاحب کو کھانے پر بلایا۔ ہم لوگ کھانے کے بعد ڈاکٹر صاحب کے مطالعے کے کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں دور سے کسی کے گانے کی آواز آئی جو رفتہ رفتہ قریب اور زیادہ سے زیادہ بلند ہوتی گئی۔ رات کی خاموش فضا میں یہ آواز ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اس آواز سے آشنا تھے اور میں بھی چنانچہ انہوں نے میری طرف دیکھا اور میں نے ان کی طرف مگر ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ آخر وہ آواز کوٹھی کے اندر سے آنے لگی اور پھر اچانک بند ہو گئی۔ چند لمحوں بعد ایک لمبا تڑنگا پکے رنگ اور کالی داڑھی والا شخص گیروے رنگ کے کرتے میں ملبوس گلے میں منکوں کی مالائیں ڈالے ڈاکٹر صاحب کے ملازم کے ساتھ آداب سلام بجالاتا کمرے میں داخل ہوا۔ شہاب صاحب تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھے اس شخص کو دیکھتے ہی وہ اس طرح اٹھے کہ جیسے وہ اس کے گھٹنے چھو لیں گے۔ عین اس وقت ڈاکٹر صاحب نے رسان سے یہ کہہ کر اس ساری طلسماتی فضا کا خاتمہ کر دیا کہ شہاب صاحب تشریف رکھئے یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ یہ کہنے کے بعد وہ اس شخص سے مخاطب ہوئے کہ موتی شاہ، تم نے کھانا کھایا

ہے؟ اور اس کے ساتھ ہی ملازم سے کہا کہ موتی شاہ کو کھانا کھلائے اور اس کے ٹھہرنے کا بندوبست کرے۔ دراصل شہاب صاحب اپنے رجحان طبیعت کی بدولت یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ کمرے میں کسی روحانی بزرگ کا نزول ہوا ہے۔ موتی شاہ ملازم کے ساتھ کمرے سے رخصت ہوئے تو شہاب صاحب نے کسی قدر خفت کے ساتھ اطمینان کا سانس لیا۔

موتی شاہ ڈاکٹر نذیر احمد کے ملنگ بھائی تھے اور ان سے عمر میں کوئی چھ برس چھوٹے تھے۔ میں ان سے اس واقعے سے پہلے کئی دفعہ مل چکا تھا۔ پہلی دفعہ میں نے اپنے چند دوستوں کے ہمراہ موتی شاہ کو شاہی محلے کی ایک بیٹھک میں گانے کی محفل میں دیکھا تھا جہاں بڑے غلام علی اور برکت علی وغیرہ کا اجتماع ہوتا تھا۔ موتی شاہ نے ایسی پاٹ دار اور ساحرانہ آواز پائی تھی کہ بائید وشاید۔ وہیں میں نے یہ سنا کہ بڑے غلام علی خان ان کو کلاسیکی موسیقی کی باقاعدہ تعلیم دینا چاہتے تھے کہ وہ اپنی بے مثال آواز کی بناء پر بطور شاگرد ان کا نام روشن کریں گے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کوشش بھی کی مگر موتی شاہ تو پیدائشی طور پر کمزور ذہن رکھتے تھے ان میں کچھ سیکھنے پڑھنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی بس بعض صوفیانہ غزلیں اور پنجابی گیت سادہ سروں میں گایا کرتے تھے۔ آواز کی بدولت گانے میں جادو جگا دیتے تھے۔

شہاب صاحب ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد اپنے صوفیانہ مشاغل میں کچھ زیادہ منہمک ہو گئے۔ اس دوران میں انہوں نے داڑھی بھی بڑھالی، اسی زمانے میں انہوں نے اپنی مشہور کتاب ''شہاب نامہ'' لکھی جس میں اوراد و وظائف کے علاوہ اس قسم کے بہت سے واقعات کا بھی ذکر ہے جس پر حقیقت سے زیادہ شہاب صاحب کے زرخیز تخیل کی کارفرمائی کا شبہ ہوتا ہے۔ شہاب صاحب کی یہ خودنوشت بھی بڑی مقبول ہوئی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اسلام آباد کے سرکاری افسروں کی بستی میں میرا قیام ایک ایسے مکان میں رہا ہے جس کے سامنے کے مکان میں شہاب صاحب ریٹائرمنٹ کے بعد مقیم تھے۔ شہاب صاحب کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ بیٹا تعلیم میں مصروف تھا اور وہ اس گھر میں اپنے کسی عزیز کے ساتھ رہتے تھے۔ کبھی صبح کی سیر کے وقت ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ کبھی میں ان کے ہاں چلا جاتا تھا اور کبھی وہ ہمارے ہاں آجاتے تھے۔

شہاب صاحب کا انداز عام سی ایس پی افسروں کا انداز نہیں تھا، ان میں عہدے کی نمائش یا اس قسم کی کوئی رعونت نہیں تھی۔ وہ سادہ آدمی تھے اور سادہ زندگی گزارتے تھے۔ اپنے چند مخصوص احباب کے علاوہ بہت کم کسی سے کھلتے تھے۔ وہ دراصل بہت گہرے آدمی تھے۔ ان کی زندگی کا ایک پہلو تصوف اور روحانیت سے متعلق تھا مگر اس کے ساتھ ہی وہ اپنے دنیاوی مشاغل اور مقاصد کی تکمیل اور تحصیل میں بھی مصروف رہتے تھے۔ وہ ان دونوں دنیاؤں کے کامیاب شہری تھے۔

☆

جلالی اور جمالی قدرت اللہ شہاب

اصغر ندیم سیّد

ہمارے ادب میں بہت شان و شوکت اور تام جھام والی شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں، جن سے آنکھ ملانے کا حوصلہ مشکل سے ہوتا ہے۔ خود ہمارے اپنے زمانے میں ساٹھ ستر کی دہائیوں میں بڑی گونج تھی، بڑا طنطنہ تھا۔ اخباروں میں ادبی پرچوں میں ایسی اشرافیہ کا جن کا تعلق کسی نہ کسی سطح پر حکومتی اداروں، سرکاری عہدوں یا براہ راست حکومت وقت سے تھا، ان میں دو طرح کی شخصیات تھیں۔ ایک وہ جن سے ملنے کو جی چاہتا تھا اور دوسری وہ جن کے قریب جاتے ہوئے با ادب با ملاحظہ ہوشیار کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ پہلی قسم کی شخصیات میں اختر ریاض الدین، ابن انشاء، ن۔ م راشد وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں اور دوسری قسم کی شخصیات میں قدرت اللہ شہاب اور الطاف گوہر کا نام آتا ہے۔ جب ہم نے پڑھنا لکھنا شروع کیا تو ان دونوں شخصیات کا طوطی بول رہا تھا۔ کراچی، لاہور اور اسلام آباد کے جغادری اور ثقہ ادیب دونوں کی قربت حاصل کرنے کے لئے بے چین رہتے تھے۔ دونوں کی ایک ٹیلی فون کال کے لئے ہمارے بعض ادیبوں نے گھروں میں پہلی دفعہ ٹیلی فون لگوا لئے تھے۔ دونوں کے متعلق مختلف معجزاتی اور کراماتی واقعات گردش کرنے لگے۔ کالم نویسوں نے الگ سماں باندھا۔ ادبی پرچوں نے الگ ہوا باندھی۔ انہی دنوں یہ واقعہ عام ہوا کہ قدرت اللہ شہاب سلیمانی ٹوپی پہن کر اسرائیل کا دورہ کر آئے ہیں۔ بعد میں ''شہاب نامہ'' نے اس واقعہ کی تصدیق کر دی۔ اس ادبی فضا میں اچانک رائٹرز گلڈ بن گئی اور پھر ادیبوں اور شاعروں کو اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ گروہ بندیاں ہونے لگیں۔ مراعات حاصل کرنے کے لئے دوڑ دھوپ ہونے لگی۔ غیر ملکی دوروں اور ہوائی جہاز کی سیر کا سلسلہ عام ہوا جسے الطاف گوہر اور قدرت اللہ شہاب نے ایک نظر دیکھ لیا۔ وہ پھولے نہیں سماتا تھا۔ پھر وفود بننے لگے۔ کوئی ڈھاکہ جا رہا ہے اور کوئی ڈھاکہ سے آ رہا ہے۔ سیاسی بے اعتدالیوں کو ادیبوں کے ذریعے اعتدال پر لانے کا عمل شروع ہوا جو اے۔ کی جنگ کے بعد اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ لیکن اس سے قبل بہت کچھ ہوا۔ کئی سیمینار، کئی دورے، کئی پلاٹ، کئی عہدے دونوں کے اثر و رسوخ سے حاصل ہونے لگے۔ اور طرح طرح کی کہانیاں سننے کو ملیں۔ پھر ادبی انعامات نے ماحول کو بہت گرمایا۔ زور دار قسم

کئی گروہ بندیاں ہوئیں۔ کسی کا انعام کسی کی جھولی میں گرا۔ بس یہاں سے ہمارے ادیبوں نے کسی حد تک سرکاری اور غیر سرکاری مراعات میں حصہ دار بننا شروع کر دیا جس کا سلسلہ بہت دور تک چلا جاتا ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ غیر معترضہ تھا۔ ہم ذکر کر رہے تھے الطاف گوہر اور قدرت اللہ شہاب کی کرشمہ سازیوں کا۔ الطاف گوہر تو خیر میڈیا کو کنٹرول کرنے میں مصروف ہو گئے۔ لیکن قدرت اللہ شہاب جانتے تھے یہ سرکار دربار زیادہ دیر وفا نہیں کرتا۔ اس لئے کچھ سامان الگ پڑاؤ کا بھی کر لینا چاہئے۔ یہ خیال الطاف گوہر کو بہت بعد میں آیا جب انہوں نے اسلامیات کے شعبے میں کام کیا۔ قدرت اللہ شہاب تو خیر اپنے دو افسانوں ''یا خدا'' اور ''ماں جی'' کی وجہ سے اردو افسانے کا مستقل حوالہ بن چکے تھے پھر بھی انہیں ضرورت تو تھی کہ اپنی تخلیقی وسعت کو دریافت کریں۔ زندگی کے بھرپور تجربے کا اثاثہ تو ان کے پاس تھا ہی۔ جب ذرا کاروبارِ دنیا سے فرصت ملی تو دوبارہ افسانے کی طرف لوٹ کے نہیں گئے۔ شاید ایک خوف سا تھا کہ ''ماں جی'' اور یا خدا'' میں افسانے کو جہاں چھوڑا تھا وہاں سے اٹھائیں تو کیسے اٹھائیں۔ اور اس بیچ بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے گزر چکا تھا۔ افسانے کی دنیا میں رونق لگ چکی تھیں۔ کہیں انتظار حسین کا تانگہ دوڑ رہا تھا' کہیں اشفاق احمد نے تھیٹر لگا رکھا تھا' کہیں احمد ندیم قاسمی کا چھاپہ لگا ہوا تھا' کہیں ترقی پسندوں نے دکان سجا رکھی تھی تو کہیں جدید علامتی افسانے کی شعبدہ بازیاں موضوع بنی ہوئی تھیں۔ ایسے میں قدرت اللہ شہاب نے مناسب سمجھا کہ دوبارہ اس کوچے کا رخ نہ ہی کیا جائے تو اچھا ہے۔ تو پھر کیا کریں۔ ایک بڑی واردات اور بڑے تجربے کا ناول لکھیں۔ اس کے لئے خود اپنی زندگی کو حوالہ بنائیں یا اسی تپسیا میں سے کوئی کندن نکالیں۔ واقعہ نگاری تو ان کے تخلیقی جوہر میں شروع میں شامل تھی جس پر سرخ فیتہ کچھ دیر کے لئے لگ گیا تھا اب جو سرخ فیتہ کھلا تو کتاب زندگی کے سارے باب کھل گئے۔ قدرت اللہ شہاب نے کئی بار سوچا ہوگا کہ ناول لکھوں یا آپ بیتی۔ کیا لمحہ ہوگا یا کیا آگہی ہوگی کہ شہاب صاحب کو لگا کہ ناول میں ان کی ذات اور زندگی کے کھرے تجربے اپنا جلوہ نہیں دکھا سکیں گے اور سب سے بڑھ کر ان کی شخصیت اور ان کی ذات کا طلسم کیسے بندھ پائے گا۔ یہ سوچنے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ آپ بیتی اردو ادب کو نئے حقائق اور نئی انسانی کیفیات سے آشنا کر سکے گی۔ آپ بیتی ہمارے معاشرے میں ذرا سوچ سمجھ کے لکھی جاتی ہے۔ معاشرے کی قوت برداشت تو بس اتنی سی ہے کہ طوائف اور شراب کو کئی برقعے پہنانے پڑتے ہیں اور پڑھنے والوں کو اپنے تخیل کا سہارا لے کر مطلوبہ نتائج حاصل کرنے ہوتے ہیں۔ ایسے میں جوش ملیح آبادی تو اپنی دبنگ شخصیت اور شاعری کا الاؤنس لے کر بخشے گئے ورنہ ان کی کتاب تو ضبط ہو ہی جاتی اس کے ساتھ ان کی زندگی کی بچی کھچی سانسیں بھی ضبط ہونے کا اندیشہ تھا۔ ایسے میں قدرت اللہ شہاب کیسے کوئی معرکہ انجام دے سکتے تھے۔ انہیں کس چیز نے بچا لیا۔ یا ان کی گٹھڑی میں ایسا مال تھا جو عام طور پر آپ بیتیوں میں نہیں ہوتا۔ قدرت اللہ شہاب کو سرکاری فائلیں سلیقے سے رکھنا اور انہیں نمٹانا آتا تھا۔ انہیں معلوم تھا کس فائل کو کتنی دیر روکنا ہے اور کس کونے میں رکھنا ہے۔ اپنی زندگی کے واقعات کی فائلیں بھی انہوں نے بہت سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ اس کا پتہ ''شہاب نامہ'' پڑھ کے ہوتا ہے۔ البتہ

حیرت کی بات یہ ضرور ہے کہ آپ بیتی جن باتوں سے مقبول ہوتی ہے ان میں سے ایک بھی بات ''شہاب نامہ'' میں نہیں ہے۔ اس کے باوجود ''شہاب نامہ'' نے مثالی مقبولیت حاصل کی۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ سنگ میل کے جناب نیاز احمد کی کاروباری بصیرت تھی کہ انہوں نے پہچان لیا تھا کہ یہ آپ بیتی ان کے ادارے کی نیک نامی میں اضافہ کرے گی۔ اور پھر یہی ہوا کے مہینے میں ایک ایڈیشن ایسے بکتا تھا جیسے تازہ جلیبیاں بکتی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ روایتی فارمولے اور مصالحے کو استعمال کئے بغیر ''شہاب نامہ'' اتنا کیسے مقبول ہوگیا۔ نہ اس میں عورتوں کے دل لبھانے والے قصے ہیں نہ اس میں زندگی کی بے اعتدالیوں کے سخت مقامات آتے ہیں۔ نہ مقدس رشتوں پر بے رحم حقیقت نگاری کے چھینٹے پڑے ہوئے ہیں۔ پھر کون سے تجربے ہیں جنہیں اردو ادب کے قاری نے اپنے طرز احساس کے ساتھ جڑتے ہوئے محسوس کیا۔ ایک بات یہ بھی اہم ہے کہ جب ''شہاب نامہ'' آتا ہے قدرت اللہ شہاب گوشۂ گمنامی میں جا چکے تھے۔ بس ان دنوں کی یاد ہی گردش کر رہی تھی۔ ان کا وہ اثر و رسوخ اور دبدبا باقی نہیں رہا تھا۔ وہ ایک درویش کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی آپ بیتی ادب کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ روحانیات کی کرشمہ سازی تھی۔ بیان کا انوکھا پن تھا یا تجربوں کا تنوع تھا یا شخصیت کا سحر تھا۔ آخر کیا تھا۔ ''شہاب نامہ'' کی فضا میں ایک پراسراریت ایسی تھی کہ پڑھنے والوں کو مسلسل نئی حیرت کی امید دلاتی تھی اور اپنے ساتھ ساتھ لیے جاتی تھی۔ قدرت اللہ شہاب نے تو اپنی کامیاب واپسی کا راستہ تلاش کر لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی الطاف گوہر نے قرآن مجید کی تفسیر کے ذریعے نہ صرف اپنی نجات کا سوچا بلکہ اپنی علمیت کا ثبوت دینے کی کوشش بھی کی۔ میں جن سے ساٹھ ستر کی دہائی میں نہیں مل سکا تھا یا ان کے رعب کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے آخری دور میں قریب بیٹھنے کا موقع حاصل کر سکا۔ الطاف گوہر نے اپنی یادداشتیں بھی تحریر کرنی شروع کر دی تھیں۔ اسے کیا پذیرائی ملے گی، یہ ابھی دیکھنا ہے۔ قدرت اللہ شہاب تو لگتے تھے کہ کوئی صوفی اپنی بے نیازی کے حجرے سے نکل کے آپ کے سامنے آکر بیٹھ گیا ہے۔ سفید کرتے شلوار میں سفید بالوں کے ساتھ جب وہ آکر بیٹھتے تھے تو لگتا تھا ایک زمانہ ابھی کروٹ لے گا اور کسی پرانی یاد میں ہمیں ملا دے گا۔ وہ ان خوش قسمت ادیبوں کی بدقسمتی ہے کہ روزی روٹی کے چکر میں وہ اپنے مختصر سے دائرے میں گھومتے رہتے ہیں۔ سفر اور زندگی کے وسیع کینوس کا مشاہدہ نصیب نہیں ہوتا۔ صرف اپنے طبقے تک محدود رہتے ہیں۔ عشق تو دوسری بات ہے، عورت کو جاننے کے لئے لمحے بھر کا قرب بھی نصیب نہیں ہو پاتا۔ ہمارے شاعروں اور ادیبوں کو باہر کے ملکوں میں جانے کا اب موقع ملا ہے۔ اس کی حقیقت بھی ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ میزبان کے گھر سے ایئر پورٹ تک بس یہی ان کی کل کائنات ہوتی ہے۔ ایسے میں قدرت اللہ شہاب کو اقتدار کے ایوانوں سے لے کر دنیا کے عجائبات تک ہر شے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس لئے ''شہاب نامہ'' انوکھے تجربوں کی دستاویز بن گیا۔ لیکن کیا یہ کافی ہے کہ آپ نے اتنے انوکھے تجربے کئے ہوں۔ ایسا تو ہو سکتا ہے بے شمار اور لوگوں نے بھی کیا ہو۔ اصل طلسم شہاب صاحب کے بیان کا ہے یا بیان کرنے کے یقین کا۔ یہ دو مختلف باتیں ہیں۔ بیان کا حسن اور بات ہوتا

ہے اور بیان کے پیچھے بیان کرنے والے کا یقین کچھ اور ہوتا ہے۔ قدرت اللہ شہاب جو بات بھی کرتے ہیں پڑھنے والا یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ اگر خود کو صوفی اور کراماتی سے بڑھ کر کسی ''فرقہ باطنیہ'' کا سربراہ منوانا چاہتے تو منوا سکتے تھے۔

شہاب صاحب کا کمال کیا یہ کم ہے کہ بابوں کے سپیشلسٹ اشفاق احمد کو اپنا مرید بنا لیا۔ اشفاق صاحب بہت ہوشیار قسم کے بابا سپیشلسٹ ہیں۔ وہ اپنے بابے بدلتے رہتے ہیں جیسے بعض سیاست دان پارٹیاں بدلنے میں مشہور ہوتے ہیں۔ جیسا زمانہ ہوتا ہے ویسا ہی اشفاق صاحب کا بابا ہوتا ہے۔ چونکہ اشفاق صاحب کو تمام عقل کی باتیں وہ بابا بتاتا ہے۔ اس لئے زمانے کے مطابق وہ اپنا بابا اسی حساب سے رکھتے ہیں۔ ان کی مہربانی ہے کہ وہ ہمیں وقتاً فوقتاً اپنے بابوں سے ملاتے رہتے ہیں۔ کبھی مغل پورے کا بابا، کبھی شیخوپورے کا بابا، کبھی نکانہ صاحب کا بابا۔ ایک زمانہ تھا اشفاق صاحب حضرت واصف علی واصف کی صحبت میں گیان حاصل کرتے تھے۔ پھر پتہ چلا قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی ان کے گرو ہو گئے ہیں۔ مفتی جی تو خیر بے حد عوامی قسم کے گرو تھے۔ ہمیں بھی اکثر آشیرباد سے نوازتے رہتے تھے۔ البتہ قدرت اللہ شہاب جلالی اور جمالی قسم کے پیشوا قسم کے گرو تھے۔ اور اشفاق صاحب نے آخری وقت تک انہیں قبول کئے رکھا۔ ہمیں یاد ہے شہاب صاحب کی برسی کی قرآن خوانی بڑی باقاعدگی سے اشفاق صاحب اور بانو آپا کے لان میں ہوتی رہی ہے۔ جہاں بکرے کے گوشت کی دیگیں اور پلاؤ کے ساتھ موسمی میوہ جات کا بہت اہتمام کیا جاتا تھا۔

قدرت اللہ شہاب نے کیا کمال کیا کہ اپنے اقتدار کے زمانے میں جتنا وہ اپنے پڑھنے والوں سے دور رہے اقتدار سے دور ہونے اور پھر وفات کے بعد اتنا ہی اپنے پڑھنے والوں کے دلوں میں آباد ہو گئے۔ یہ کرشمہ پاکستان میں تو کبھی نہیں ہوا کرتا۔ شان و شوکت والے دور میں صرف مراعات پسند ادیبوں کے نرغے میں رہتے تھے اور وفات کے بعد ایک ہجوم عاشقاں اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ کیسا نسخہ انہوں نے مرنے سے پہلے اپنی فائل میں رکھ چھوڑا تھا یہ سوچنے والی بات ہے۔

میرے والد

ڈاکٹر ثاقب شہاب

مجھ سے اپنے والد محترم کی شان میں چند الفاظ لکھوانا ویسے ہی لا حاصل ہے جیسے کسی نامی مصور کے بیٹے سے ایک شاہکار تصویر بنانے کے لیے کہنا۔

بہر حال میں یہ ضرور کہوں گا کہ میرے والد کو گورنمنٹ کالج لاہور سے ایک خصوصی لگاؤ اور دلی تعلق تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب طالب علموں کے لیے حصولِ علم اپنے اندر ایک منزل کا درجہ رکھتا تھا نہ کہ منزل تک پہنچنے کا ایک منظم اور تیز ترین ذریعہ جیسا کہ آج کل بن گیا ہے۔

ہمارا دور بے اعتباری کا دور ہے۔ نفسا نفسی کے اس دور میں ہماری قوت بازو ہمارا ایمان اور وہ اخلاقی علم و دانش ہے جو ہماری قوم کی میراث ہے۔

حالات میں مثبت تبدیلی لانے کے لیے خود اعتمادی اور موجودہ جمود پر سوال اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اس کالج کے نوجوان مولفین و مصنفین یقیناً ایسے ہی خوش آئند اور باذوق لوگ ہیں جو زمانے میں نئی روشیں پیدا کرتے ہیں۔ یہ بے لوثی برقرار رہنی چاہیے۔ یہی تو وہ زادِ راہ ہے جس سے اس خود غرض دنیا کا کٹھن سفر ہنستے کھیلتے کٹ جاتا ہے۔ دنیا بہت سے رنگوں کی آمیزش ہے اسے ہم محض خط کھینچ کر درست یا غلط میں خانہ بند نہیں کر سکتے۔ یہ کمال ہمارے ہاتھوں میں ہے کہ ہم ان رنگوں سے ایک جگمگاتی قوسِ قزح تشکیل دیں یا تمام رنگوں کو ملا کر ایک بدنما دھبہ بنا دیں۔

معاشرے کی بے حسی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ ہماری طرح دوسری نسلیں بھی یہی سمجھتی رہی ہیں کہ ان کا دور تمام زمانے میں سب سے زیادہ خود غرض اور دشوار ہے اور یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔

ہمیں اس بے رحم دور تذبذب میں رہتے ہوئے، جو ہمارا زمانہ حال ہے، نہ صرف اپنے ماضی سے سبق سیکھنا ہوگا بلکہ اپنے لیے ایک خوشحال اور مستحکم مستقبل تعمیر کرنے کی کوشش بھی کرنا ہوگی۔

ہمارا عمل متوازن ہونا چاہیے۔ ہم دین اور دنیا دونوں کے لوگ ہیں اور یہی ہماری طاقت ہے۔

مجھے اپنے والد کی جو خصوصیات ہمیشہ یاد رہیں گی وہ ان کا مضبوط ایمان، ہمت اور انکساری ہے۔ ان میں سے ہر ایک خوبی وہ گوہر نایاب ہے جسے حاصل کرنے کے لیے ایک عمر درکار ہوتی ہے۔ تینوں خوبیاں مل کر ایک ایسا مرقع بن جاتی ہیں جس میں ہر ایک خوبی دوسری کی تقویت دیتی ہے۔

اور ہمیں اسی طرح اپنے ہم عصروں اور بزرگوں سے فیض یاب ہونے میں کوشاں رہنا چاہیے۔

ٹ

شفیق احمد خان

شفیق احمد خان کی شاعری ایک بے چین، غیر مطمئن اور مضطرب شخص کے جذبات کی غماز ہے وہ ہر چیز اُس کے اصلی مقام پر دیکھنے کا خواہاں ہے وہ اپنے اطراف میں توازن اور عدل دیکھنا چاہتا ہے مگر جب اسے صورتحال اس کے برعکس دکھائی دیتی ہے تو وہ غزل اور نظم دونوں میں مصرعہ مصرعہ اپنا احتجاج ریکارڈ کراتا ہے۔ غزل کی نسبت نظم میں اُس کی فنی چابکدستی اور مہارت نمایاں ہے اُس کی نظموں کی ایک بڑی خوبی جو اسے ہمعصر نظم گو شعراء سے منفرد اور ممتاز بناتی ہے یہ ہے کہ نظم پڑھتے ہوئے پہلے پہل قاری کو یوں لگتا ہے جیسے وہ کسی تنگ و تاریک گلی میں داخل ہو گیا ہے پھر آہستہ آہستہ گذرتے مصرعے برقی قمقموں کی طرح روشن ہوتے جاتے ہیں اور آخری مصرعہ پڑھنے تک نظم تفہیم کی روشنی سے بھر جاتی ہے۔

ایک شاعر کا کلام

شفیق احمد خان

یہ ہوا، یہ وقت کی داشتہ (۱)

O

یہ ہوا یہ وقت کی داشتہ
بڑی بے لحاظ انا پرست
کبھی ہو خفا تو یہ پل میں شہر اجاڑ دے
کبھی جا کے پھرتی ہے دور فرش پہ آب کے
کبھی رات جا کے بتائے پیڑ کی شاخ پر
کبھی بادبان کو اوڑھ لیتی ہے شوق میں
کبھی بادلوں کو اڑائے پھرتی ہے کو بکو
کبھی جا چھپے کسی کوہسار کی اوٹ میں
یونہی ایک پل جو رکی رہے
کبھی بستیوں کے مکیں گھٹن سے بلک پڑیں
سرِ شام موسمِ گرم میں
کبھی بن کے بادِ سموم چلتی ہے دیر تک
کبھی آ کے موسمِ سرد میں
یونہی مثلِ تیغ یہ کاٹتی ہے بدن بدن
بڑی سوگوار اداس غم سے بھری ہوئی
بڑی پائمال نڈھال خود سے ڈری ہوئی
کبھی بے قرار ہے بحر بحر کی موج میں
کسی بچھڑے یار کی کھوج میں
کہیں دشت دشت میں ریت ریت سے کھیلتی
کوئی بے گھری کا عذاب جان پہ جھیلتی
یہ ہوا یہ وقت کی داشتہ

۸۶

یہ ہوا، یہ وقت کی داشتہ (۲)

O

یہ ہوا یہ وقت کی داشتہ
مجھے آ کے کہتی ہے کان میں مرے ساتھ چل
کسی اور دیس کے شہر میں
جہاں زندگانی کے صبح و شام عجیب ہیں
جہاں زندگانی کا رنگ روپ ہی اور ہے
جہاں چھاؤں دھوپ ہی اور ہے
جہاں آسمانوں پہ بادلوں کے پڑاؤ رہتے ہیں سال بھر
کسی اجنبی سے دیار میں
جہاں رہنے والوں کے مختلف سے مزاج ہیں
جہاں بسنے والوں کے اور رسم و رواج ہیں
جہاں امن ہے جہاں زندگی کا شعور ہے
جہاں علم ہے جہاں روشنی جہاں نور ہے
کسی قید خانے سے کم نہیں
یہ جو اک جگہ کا قیام ہے
وہی دکھ بھری ہیں کہانیاں
وہی کوچہ و در و بام ہے
وہی زندگی کی ضرورتیں
وہی صبح ہے وہی شام ہے
کبھی بچ بچا کے تعلقات کی بھیڑ سے
کبھی دے ہاتھ میں ہاتھ چل
یہ ہوا یہ وقت کی داشتہ
مجھے آ کے کہتی ہے کان میں مرے ساتھ چل

٭٭

تری جستجو کے ملال میں

O

مجھے تو بھی چھوڑ کے گم ہوا
کسی شہرِ حسن نگار میں
کسی اجنبی سی زمین پر
کسی خوابناک دیار میں
کسی بام پر کسی طاق پر
کوئی اک چراغ ملا نہیں
تجھے ڈھونڈتا پھرا کو بکو
کہیں کچھ سراغ ملا نہیں
سبھی زخم میں نے چھپا لیے
ترے غم کی شال لپیٹ کر
کوئی شام آئی تو لے گئی
مجھے ریزہ ریزہ سمیٹ کر
وہ اجڑ اجڑ کے بکھر گئے
وہ جو خواب دل میں مکین تھے
انہیں بادِ یاس بجھا گئی
جو چراغ حرفِ یقین تھے
وہ جو گردباد تھے عشق کے
کئی جال خوف کے بن گئے
سرِ دل جو لمحے تھے شوق کے
مجھے کس فصیل میں چن گئے
مرے خال و خد ہی بدل گئے
تری جستجو کے ملال میں

مرا اضطراب نہ کم ہوا
ترے ہجر کے مہ و سال میں

٭

یہاں وشت وقت کی دھوپ میں

○

مری بات پر تجھے دکھ ہوا
مجھے دکھ ہے تیرے ملال کا
کبھی مہر و ماہ یہ مال و زر تری اک خوشی سے ہے کم مجھے
مری دسترس میں نہیں ہے کچھ اسی بات کا تو ہے غم مجھے
تجھے کیا خبر کہ مرے لیے
تیرا ساتھ بھی کسی آسماں کی مثال ہے
یہاں دشت وقت کی دھوپ میں
کسی سائباں کی مثال ہے
تجھے کیا کہوں کہ یہ زندگی
کئی گردشوں کی اسیر ہے
یہ جو دل کا شہر ہے سو طرح کی ملامتوں کے غبار میں
یہ جو رتجگوں کے عذاب آن کے گھیر لیتے ہیں دل کو شب کے سکوت میں
جو لگے ہیں زخم مرے نصیب کے جسم پر
کبھی ہو سکے نہ رفو جو سوزن وقت سے
مری داستاں ہے کئی طرح کی اداسیوں سے اٹی ہوئی
مری سوچ ہے کئی دائروں میں بٹی ہوئی
میں کسے کہوں کہ میں کس کے غم میں ملول ہوں
میں تو کچی عمر کے عشق کی کوئی دردناک سی بھول ہوں
مجھے تیرے ہجر نے راستوں میں بچھا دیا

میں تو رہگزار کی دھول ہوں
میں کسے کہوں مرے سارے خواب سراب ہیں
میں کسے کہوں کہ یہاں وہاں
مرے آس پاس عجیب طرح کے لوگ ہیں
میں کسے کہوں مجھے کیسے عشق کے روگ ہیں
مری بات پر تجھے دکھ ہوا
مجھے دکھ ہے تیرے ملال کا
کہیں دل میں آن کے رک گیا
کوئی ایک لمحہ زوال کا

٭٭

یہاں سمت ملنا محال ہے

O

ترا ہجر لے کے عجیب دشت میں آ گیا
کہیں زندگی کا سراغ ملتا نہیں کوئی
مرے جسم و جان نڈھال پیاس سے ہو گئے
کئی دشت ہیں مرے چار سو
بڑی ریت ہے بڑی ریت ہے مرے روبرو
یہاں سمت ملنا محال ہے
کوئی جان لیوا ملال ہے
وہ ملال ہے کہ اتر رہا ہے وجود میں
مجھے یاد آتے ہیں اپنے شہر کے بام و در
جہاں زندگی کی بہار تھی
یہ جو تیرے عشق کی بھول بن کے ببول روح میں چبھ گئی
مجھے بے قراری کا روگ کوئی لگا گئی

یہ ترے مزاج کی بے رخی
مجھے خاک خاک ملا گئی
مرے سارے خواب جلا گئی
مجھے شام ہوتے ہی گھیر لیتی ہیں وحشتیں
مری آنکھ میں کئی رتجگوں کے قیام ہیں
میں تو ایک عمر سے ظلمتوں کا اسیر ہوں
کسی بام پر بھی چراغ ملتا نہیں کوئی
مجھے تیرے ہجر کے رہگزار میں دور تک
کہیں زندگی کا سراغ ملتا نہیں کوئی
ترا ہجر لے کے عجیب دشت میں آ گیا ہوں

☆

عشق میں پا لیا سرور عجیب
ہے مرے آس پاس نور عجیب

عاجزی کی ردا ہوں اوڑھے ہوئے
پر طبیعت میں ہے غرور عجیب

بڑھتے بڑھتے خلا سا بڑھتا گیا
ہو گئے ہوتے ہوتے دور عجیب

کوئی موسم ہے رائیگانی کا
روز و شب دل ہے ناصبور عجیب

یونہی چپ سی لگی نہیں دل کو
بات اب کے ہوئی ضرور عجیب

وا ہوئے در دروں ذات کئی
مل گیا درد سے شعور عجیب

مار ڈالا ہے رتجگوں نے شفیق
اک تھکن سے بدن ہے چور عجیب

☆

غم سے دل میں پڑی دراڑ عجیب
روح پر آ گرا پہاڑ عجیب

جانے والے نہ لوٹ کر آئے
من کی بستی ہوئی اجاڑ عجیب

جاتے جاتے لگا گیا کوئی
چار سو دل کے دکھ کی باڑ عجیب

اب بھی تکتے ہیں راستہ اس کا
میرے گھر کے کھلے کواڑ عجیب

سوچ کی غم زدہ زمینوں سے
پیڑ غم کے کبھی اکھاڑ عجیب

بجھتی آنکھوں میں ہیں شفیق کہیں
خواب رکھے ہوئے کباڑ عجیب

٭

جل بجھے سوچ کے چراغ عجیب
بھر گیا راکھ سے دماغ عجیب

دھل نہ پائے کسی بھی موسم میں
ایسے دل پر لگے تھے داغ عجیب

اب تو ہر اک شجر کی شاخوں پر
شور کرتے ہیں بیٹھے زاغ عجیب

دل بے بس بچھڑنے والوں کا
ڈھونڈ جا کر کوئی سراغ عجیب

چار جانب تھے زرد رنگ کے پھول
خواب تھا خواب میں تھا باغ عجیب

آ گئی کام پھر فراموشی
مل گیا درد سے فراغ عجیب

یاد سے دل شفیق خالی ہوا
جیسے مے سے تہی ایاغ عجیب

٭

کیسے لائے تھے ہم نصیب عجیب
غم کی پہنے پھرے صلیب عجیب

میں عجب نیند کے خمار میں تھا
کوئی سایہ رہا قریب عجیب

تھک کے سویا تو رات بھر مجھ کو
خواب آتے رہے عجیب عجیب

کس نے پھر لوٹ لی متاعِ جنوں — کس نے پھر کر دیا غریب عجیب
شک تھا اک زہر دل میں پھیل گیا — بن گیا خوف بھی صلیب عجیب
دل تھا اک بے کنار حیرت میں — کوئی منظر تھا اک مہیب عجیب
اس کے اور میرے درمیان شفیق — وقت پھر بن گیا رقیب عجیب

رنگ پھیلے ہیں چاروں اور عجیب — رقص کرتا ہے بن میں مور عجیب
کون ہے جو سکوں چراتا ہے — کون من میں چھپا ہے چور عجیب
چار سو اک سکوت طاری ہے — ذہن میں گونجتا ہے شور عجیب
بن کے آندھی شجر اکھاڑ دیئے — کیسا آیا ہوا میں زور عجیب
تم سے رشتہ تھا غم نبھانے کا — ٹوٹ جائے گی اب یہ ڈور عجیب
خواب آنکھوں میں مر گیا تھا شفیق — بن گئی دل میں کوئی گور عجیب

حوصلے ہو گئے تھے پست عجیب — ہم رہے دکھ کے زیرِ دست عجیب
یہ جو تیری طلب میں رہتا ہے — کوئی پاگل ہے غم پرست عجیب
عاشقی روگ بن گئی جاں کا — کب ہوا کوئی بندوبست عجیب
پھر یقیں خاک میں ملا سارا — ہر قدم پہ ہوئی شکست عجیب
ایک سیلِ فنا ہے ہر جانب — اور کچھ دن ہے بزمِ ہست عجیب
ہر گھڑی دل میں ہے سرور شفیق — ہم ہیں اپنی ہوا میں مست عجیب

لاہور لاہور ہے

پرانا لاہور اور اس کی تہذیبی روایتیں

عبداللہ ملک

ہر شہر خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کی ایک اپنی تاریخ ہوتی ہے، ایک تہذیب اور تہذیبی روایت ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جیسے جیسے کوئی شہر پرانا ہوتا جاتا ہے تو اس کی تاریخ اور روایات میں بھی وسعت آتی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے لاہور کی تاریخی اور تہذیبی روایات کا ذخیرہ بے پایاں ہے اور ہر دور میں ان روایات میں اضافہ ترمیم ہوتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر اندرون لاہور کے محلوں کے ناموں پر ہی نگاہ ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اندرون شہر کے بعض محلوں کا مغلیہ دور کی فوج سے متعلق پیشوں سے کتنا گہرا تعلق رہا ہوگا۔ مثلاً محلہ تیر اندازاں، محلہ تیر گراں، بارود خانہ کوچہ چابک سواراں وغیرہ وغیرہ۔ لاہور چونکہ زمانہ قدیم سے پنجاب کا دارالحکومت چلا آ رہا ہے اس لئے اس شہر کی وسعتوں میں بھی اسی حساب سے اضافہ ہوتا رہا ہے کیونکہ مختلف سمتوں سے لوگ روزی روزگار کی تلاش میں کشاں کشاں وارد ہوتے رہے اور پھر یہیں کے ہو رہے اور ان علما، صوفیا اور اہل علم و دانش کی تخلیقات نے بھی اسی شہر میں جنم لیا۔

ایسے شہر کی تہذیبی زندگی پر بہت کم کام ہوا ہے اور ابتدائی کاموں میں مولوی نور احمد چشتی کی تحقیقات چشتی اور پھر اسی تحقیقات چشتی کے مصنف نور احمد کی دوسری کتاب یادگار چشتی تقریباً ڈیڑھ صدی پہلے تحریر کی گئی۔ یہ دونوں کتب انگریزی راج کے بعد انگریزی افسروں اور کمشنروں کے ایما پر وجود میں آئی تھیں کیونکہ انگریز افسروں کو یہاں پر حکومت کے لیے یہاں کی تہذیبی روایات کا جاننا ازبس ضروری تھا۔ چنانچہ یادگار چشتی میں تو اندرون شہر میں بسنے والی مختلف برادریوں اور قبائل کی زندگی کی بے حد دلچسپ تفاصیل بیان کی گئی ہیں۔ اور تحقیقات چشتی ایک طرف تو سرسید کی آثار الصنادید کی طرز پر لاہور کے مزاروں، قبروں، مساجد، گوردواروں اور ٹھکوشالوں کی داستان ہے تو دوسری طرف لاہور کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔

اسی طرح انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں ایک طرف کنہیا لال کی تاریخ لاہور تخلیق ہوئی تو انیسویں صدی کے آخری سالوں میں بزبان انگریزی تاریخ لاہور تصنیف ہوئی۔ اس کے مصنف محمد لطیف تھے جو

انگریزی عہد میں جج کے عہدے پر فائز رہے اور انہوں نے ایک طرف پنجاب کی تاریخ پر ایک مبسوط تحقیقی کتاب تصنیف کی تو دوسری طرف انہوں نے لاہور اور ملتان کی تاریخ بھی قلم بند کی۔ لاہور پر ان کی انگریزی میں قلم بند کی گئی تصنیف ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ اسکے بعد قیام پاکستان کے بعد کے دور میں سب سے پہلے ڈاکٹر محمد باقر نے تاریخ لاہور پر ایک خاصی ضخیم کتاب تصنیف کی تھی۔ یہ قیام پاکستان کے بعد کے ابتدائی سالوں میں رقم کی گئی تھی۔ لیکن ہوا یہ ہے کہ لاہور کی تہذیبی زندگی پر کوئی تاثراتی کام نہیں ہوا۔ لیکن اس قحط کے باوجود ''نقوش'' کے لاہور نمبر نے اس کمی کو ایک حد تک پورا کیا۔

میں نے اسی برس اس شہر میں گزارے ہیں اور میرے آباؤ اجداد بھی اسی شہر کے رہنے والے تھے۔ اس لحاظ سے میں خالصتاً لاہوری شہر اور وہ بھی فصیل کے اندر بسنے والے لاہور کا باسی رہا ہوں اور میں نے اس شہر کی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے۔ میں نے ۱۹۵۸ء میں اندرون شہر والے اپنے آبائی گھر اور محلے کو خیر باد کہا تھا لیکن اس اندرون شہر کی زندگی اور اس کی روایات کو میں کبھی بھلا نہیں سکا۔ اسی لیے جب میں سیاسی جھمیلوں پر لکھ لکھ کر تھک جاتا ہوں تو پھر یہی جی چاہتا ہے کہ کچھ گزرے دور کی باتیں ہو جائیں۔ اس سے مجھے بے پناہ سکون ملتا ہے اور میری تھکان دور ہو جاتی ہے۔ ویسے ایک بات یاد رہنی چاہیے کہ شہر کوئی سا بھی ہو وہ کبھی ایک اکائی نہیں ہوتا اس لئے کہ اندرون شہر کے ساتھ ساتھ سول لائنز بھی وجود میں آتی ہیں اور یہ سول لائنز صرف انگریزی دور کی ہی دین نہیں ہیں بلکہ یہ ازمنہ وسطے میں بھی ہوتی تھیں۔ مغلیہ دور حکومت میں یہ جو مغلپورہ، باغبانپورہ وغیرہ کی بستیاں تھیں تو یہ کیا تھیں یہ اس دور کی سول لائنز تھیں جہاں ''امراء اور شرفاء'' رہائش پذیر ہوتے تھے اور شہر کے اندر بھی امراء رہتے تھے۔ اور یہ جو اندرون شہر مختلف حویلیاں ہوا کرتی تھیں یہ انہی فوجی امراء کی ہوتی تھیں جہاں وہ رہتے اور پھر یہی وسیع و عریض حویلیاں جب زمانے کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکیں تو انہی حویلیوں کے ملبے پر سے پورے کے پورے محلے اٹھے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ میں نے بھی اس شہر کے اکثر علاقوں کو اجڑتے اور پھر بستے دیکھا ہے۔ اس لئے اس پورے دور کے عروج وزوال کے بارے میں تاثرات خاصی اہمیت کی شے ہو سکتے ہیں۔ اس شہر کی پرانی زندگی کے بارے میں سوائے یونس ادیب مرحوم کی ''میرا شہر لاہور'' کوئی بھی تاثراتی تصنیف میری نظر سے نہیں گزری۔ چند دن ہوئے میں اپنے چند ہم عمر عزیزوں سے گپ کر رہا تھا اور لاہور کے اشاعتی اداروں کا ذکر چل نکلا۔ چونکہ میرے بہت سے عزیز و اقارب اور بزرگ بھی ان اشاعتی اداروں سے منسلک رہے ہیں اور آج بھی میرے کئی عزیز ان اشاعت گھروں سے منسلک ہیں، چنانچہ اس گپ کے دوران ہی مجھے یہ خیال آیا کہ لاہور کے مختلف اشاعتی اداروں کے بارے میں اگر کوئی تحقیقی اور تاریخی کتاب تحریر نہیں کر سکتا تو کم از کم تاثرات تو تحریر کر ہی سکتا ہوں۔

ویسے آج کے اہم اشاعتی اداروں کے مالکان کو اس طرف توجہ دینی چاہئے کہ وہ اس شہر کے اشاعتی

اداروں کے بارے میں کوئی تحقیق نہ سہی کم از کم تاثراتی کتاب یا کتب ہی شائع کریں۔ انیسویں صدی کے آخری دور میں قائم ہونے والے ادارے "دارالاشاعت" نے ہماری ادبی اور تہذیبی زندگی کو نکھارنے اور اسکی بنیادیں مستحکم کرنے میں بے پناہ کام کیا ہے اور نہ صرف ان گنت کتب شائع کیں بلکہ بچوں اور عورتوں کے رسائل کا اجرا کر کے ہماری تہذیبی روایات کو صحیح بنیادیں فراہم کیں اور ان کے بچوں کے رسالے "پھول" کی اب نئے دور میں آبیاری نوائے وقت کا ادارہ کر رہا ہے۔ اور اس قومی دارالاشاعت نے کتابوں کے ساتھ ساتھ ادیبوں کو ادب اور صحافت کے میدان میں ایک مقام عطا کیا۔ عبدالمجید سالک، غلام عباس اور احمد ندیم قاسمی ان ادیبوں کی صف کا ہراول دستہ ہیں جن کا تشخص اور پہچان دارالاشاعت کے حوالے سے حاصل ہوئی۔ یہی نہیں بلکہ خود امتیاز علی تاج، مولوی ممتاز علی، مالک دارالاشاعت کے دوسرے صاحبزادے تھے ان کا بھی ادب میں نام اسی ادارے کے حوالے سے ہی شہرت کی بلندیوں پر پہنچا اور امتیاز علی تاج کا شہرہ آفاق ڈرامہ "انارکلی" اس قومی دارالاشاعت سے ہی تیس کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں شائع ہوا تھا اور پھر چچا چھکن جو امتیاز کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ تھا وہ بھی یہیں سے شائع ہوا تھا اور مولانا عبدالمجید سالک کی ترمیم کی ہوئی ٹیگور کی مشہور عالم تصنیف گیتان بھی یہیں سے بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں شائع ہوئی تھی۔

یہ کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ نہ مولنا ممتاز علی جن کو اس زمانے میں شمس العلما کا خطاب انگریز سے ملا تھا، کی کوئی مفصل سوانح رقم ہوئی ہے اور نہ ہی قومی دارالاشاعت کے عروج و زوال کے بارے میں کوئی کتاب رقم ہوئی ہے۔ اس ضمن میں کم از کم میں اپنی جہالت کا اعتراف کرتا ہوں۔ بہرحال اسی دارالاشاعت نے حجاب امتیاز علی جیسی نابغہ روزگار افسانہ نویس اور ناول نگار کو متعارف کرایا جن کا پوری نصف صدی تک اردو ادب میں ہی نہیں بلکہ لاہور کی تہذیبی زندگی میں بھی سکہ چلتا رہا۔

شمس العلما مولوی ممتاز علی، ان کی بیگم محمدی بیگم جنہوں نے تہذیب نسواں کا اجرا کیا اور جس کی مخالفت سرسید نے کی۔ ان کا پورا خانوادہ علم و ادب میں نامور رہا۔ یہ درست ہے کہ ان کے بڑے بیٹے سید حمید علی، علم و ادب کی اقلیم میں داخل نہیں ہوئے لیکن وہ جب تک زندہ رہے دارالاشاعت ایک اہم اشاعتی ادارے کے طور پر فعال رہا اور حمید علی صاحب کا شمار اس زمانے کے اہم ناشروں میں ہوتا تھا۔ لیکن امتیاز علی تاج اس کاروبار سے غالباً بہت پہلے الگ ہو گئے تھے۔ بلکہ بھائیوں میں بھی تعلقات کوئی زیادہ اچھے نہیں رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب امتیاز علی تاج کا قتل ہوا تو اس قتل میں بھی حمید صاحب کی اولاد کو ملوث کرنے کی کوشش کی گئی۔ آج میں پرانے زمانے اور اشاعت گھروں کا ذکر کرنے بیٹھا ہوں تو رہ رہ کر مجھے قومی دارالاشاعت واقعہ گوالمنڈی کا چوبارہ یاد آتا ہے۔ جہاں مدتوں میرے محترم اور دوست ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے خاندان کے ساتھ مقیم رہے اور یہ چوبارہ اس وقت چھوڑا جب انہوں نے اپنا ذاتی مکان تعمیر کرا لیا۔

☆

لاہور میں تالیف قلب کا کمال

مشکور حسین یاد

میں اپنے والد محترم کے ساتھ ۲ نومبر ۱۹۴۷ء کی صبح کو براستہ بہاول پور پاکستان پہنچا۔ میرے باقی سب پیارے یعنی میری والدہ، میرا بھائی، میرے نانا نانی، میری بیوی، میری ڈیڑھ سالہ معصوم بچی اور دیگر رشتہ دار راہ آزادی میں قربان ہو چکے تھے۔ بہاول پور سے ہم لوگ ملتان پہنچے اور چند روز پیر زادہ منظور حسین ضیاء صدیقی مرحوم کے گھر قیام کر کے وہاں سے لاہور پہنچے۔ اس وقت نومبر کا آخر اور دسمبر کا آغاز تھا اور ہم باپ بیٹے کے پاس ایک کرتا اور ایک قمیض کے علاوہ تن ڈھانپنے کے لئے کچھ نہ تھا۔ یہ کرتا پاجامہ بھی ہمارے ایک ملازم نے دیئے تھے۔ میں تو زخموں سے چور تھا لیکن پاکستان اور لاہور پہنچنے کی خوشی اس قدر زیادہ تھی کہ اسی حالت میں ہر جگہ پھرتا تھا۔ میرے ایک عزیز نے مجھے احسان دانش صاحب سے ملوایا تو انہوں نے شورش کاشمیری کو ایک خط لکھ کر دیا کہ وہ مجھے اپنے اخبار ''احرار'' میں عملۂ ادارت میں رکھ لیں لیکن شورش صاحب نے جب مجھ سے کہا کہ کچھ لکھ کر دکھایئے تو مجھے اچھا نہ لگا۔ لیکن ہمارے ایک عزیز جناب سید امیر حسین نے، بھاٹی گیٹ سے ایک نیا روزنامہ ''جدید نظام'' نکل رہا تھا، نازش رضوی صاحب کے ساتھ عملۂ ادارت میں رکھوا دیا۔ ابھی دو دن ہی گزرے تھے کہ نازش رضوی کہنے لگے آج رات کو گورنمنٹ کالج لاہور میں مشاعرہ ہو رہا ہے، کالج کے پرنسپل پطرس بخاری صدارت کریں گے۔ کہا اس میں چلو گے؟ میں نے ہاں کر دی یہ سوچے بغیر کہ سردی کا زمانہ ہے اور میرے پاس بہت معمولی سا لباس ہے۔ علاوہ ازیں سر پر پٹی بندھی ہے گویا بہت ہی ناگفتہ بہ حالت ہے۔ شام کو میں دفتر پہنچ گیا اور وہاں نازش رضوی صاحب کے ہمراہ مشاعرے میں شرکت کے لئے چل پڑا۔ فاصلہ کوئی زیادہ نہ تھا۔ پانچ چھ منٹ میں ہم لوگ گورنمنٹ کالج پہنچ گئے۔

کالج کے اوولڈ ہال میں مشاعرہ ہونے والا تھا۔ جیسے ہی میں نازش رضوی صاحب کے ہمراہ ہال میں داخل ہوا تو میری ہیئت کذائی دیکھ کر لڑکوں نے مجھے روک لیا۔ میں نے نازش رضوی صاحب کو ذرا بلند آواز میں پکارا تو انہوں نے لڑکوں سے کہا ''یہ میرا آدمی ہے اسے آنے دو۔'' گویا نازش رضوی نے مجھے اپنا ملازم ظاہر کیا یا

اس وقت میں نے یہ سمجھا۔ میرا خیال پہلے تو یہی تھا کہ میں سامعین میں بیٹھ جاؤں گا لیکن اب مجمعے میں آ کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ نازش رضوی اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے اب تو میں عین اس کے ساتھ بڑے شاعروں میں جا کر نہ بیٹھا تو بات ہے۔ چنانچہ نازش رضوی آگے بڑھتے رہے اور میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا اور جیسے ہی وہ ایک کرسی پر بیٹھنے میں ان سے بھی آگے، ایک کرسی خالی تھی، اس پر جا بیٹھا۔ کرسی پر بیٹھ کر جو میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو پتا چلا کہ میں تو واقعی بہت بڑے شعرا کے درمیان بیٹھا ہوں۔ میرے ایک طرف عابد علی عابد پرنسپل دیال سنگھ کالج لاہور بیٹھے تھے اور دوسری طرف فیض احمد فیض تھے۔ ان کے علاوہ اس زمانہ کا کون بڑا شاعر اور دانشور تھا جو میرے آگے پیچھے اور ارد گرد نہ بیٹھا تھا۔ سب لوگ مجھے عجیب عجیب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

ایک دفعہ تو میرا دل چاہا کہ میں کرسی چھوڑ کر کہیں دوسری جگہ جا بیٹھوں لیکن جب نازش رضوی صاحب کی طرف دیکھتا تو یوں لگتا کہ جیسے وہ میرے بیٹھنے کو کچھ زیادہ ہی برا محسوس کر رہے ہیں۔ میں بزعم خویش انہیں جلانے کے لئے اپنا ارادہ ترک کر دیتا۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ اب میں اسی جگہ ڈٹ کر بیٹھوں گا۔ مجھ میں کون سی برائی ہے۔ یہی نا کہ اس وقت میرا لباس بہت ہی معمولی اور خستہ ہے۔ میں زخمی بھی ہوں۔ لمحے لمحے کے بعد مجھے خیال آتا کہ نہیں نہیں میرا یہاں بیٹھنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ ان لوگوں کو کیا معلوم کہ میں کس طرح نہ صرف خود لٹ پٹ کر آ رہا ہوں بلکہ راہ آزادی میں اپنے قریب قریب تمام پیاروں کو خون میں لوٹتا دیکھ کر آ رہا ہوں۔

لیکن جب میں صاحب صدر یعنی پطرس بخاری کی طرف دیکھتا تو مجھے یوں لگتا جیسے وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں برخوردار ڈٹ کر بیٹھے رہو۔ کیا ہم اس قدر اندھے ہیں کہ تمہارے شہید پیاروں نے جو تمہارے گرد ایک نور کا ہالہ بنا ڈالا ہے ہمیں وہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ لیکن مجھے سب سے بڑی حیرت یہ ہو رہی تھی کہ پطرس بخاری صاحب نے میری طرف ایک بار بھی نہیں دیکھا اور ساتھ ہی ساتھ مجھے بھی احساس ہو رہا تھا جیسے انہوں نے مجھے، جس وقت میں ہال میں داخل ہو رہا تھا، اسی وقت دیکھ لیا تھا اور بس ان کا ایک بار دیکھنا ہی کافی تھا۔ اور جونہی میں پطرس بخاری صاحب کی طرف سے نظریں ہٹا کر اپنے ارد گرد دیکھتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ سب کی نظریں مجھ پر اس طرح پڑ رہی ہیں جیسے وہ مجھے ابھی ختم کر ڈالیں گی۔ یا کم از کم اگر ان کا بس چلے تو وہ مجھے ابھی ہال سے باہر نکال پھینکیں۔ میں ان سب کی نظروں سے گھبرا کر جب پطرس بخاری صاحب کی طرف دیکھتا تو مجھے پھر یہی احساس ہوتا جیسے وہ کہہ رہے ہیں ارے میں ان لوگوں کا بالکل خیال نہ کرو تم بالکل ٹھیک جگہ بیٹھے ہو۔ بخاری صاحب نے کالی اچکن پہن رکھی تھی اور غالباً اس کے نیچے علی گڑھ کا سفید پاجامہ تھا۔ وہ اس لباس میں بہت جچ رہے تھے۔ اور جب انہوں نے صوفی غلام مصطفےٰ تبسم صاحب کو اسٹیج پر تشریف لانے کے لئے پکارا تو ایک دم مسکرا کر کہنے لگے ''حاضرین مشاعرہ شاید آپ یہ سن کر حیران ہوں کہ صوفی تبسم میرے رفیق کار ہی نہیں ہیں، میرے شاگرد بھی ہیں''۔ ہال میں خوشگوار قہقہوں کی صدا بلند ہوئی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہو رہی تھی کہ اس وقت کوئی اسٹیج سیکرٹری نہ

تھا۔ ہر شاعر کو خود پطرس بخاری بلا رہے تھے۔ شاید اس لئے کہ یہ مشاعرہ ریڈیو پاکستان سے نشر ہو رہا تھا۔ اسی دوران ہی پطرس بخاری صاحب نے حضرت نظر امروہوی کو دیکھ لیا جو سامعین کے درمیان کھڑے تھے۔ پطرس بخاری اپنی کرسی ادارت سے اٹھ کر مائیک کے پاس آئے اور اعلان کیا کہ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ یہاں جناب نظر امروہوی موجود ہیں۔ میں ان سے درخواست گزار ہوں کہ وہ مائیک پر تشریف لائیں اور اپنے تازہ بہ تازہ اشعار سے ہمیں محظوظ فرمائیں۔ نظر امروہوی بھی کالی اچکن اور سفید پاجامے میں ملبوس تھے، گھنگریالے سفید بال بہت خوبصورت لگ رہے تھے اور جب ترنم کے ساتھ انہوں نے اپنی غزل سنائی شروع کی تو مشاعرہ لوٹ لیا۔ مجھے اب تک نظر امروہوی کی غزل کا ایک مصرع یاد ہے "بڑھتا ہے شوق تنگئی داماں کے ساتھ ساتھ"۔ لیکن اس مشاعرہ میں جو چیز مجھے آج تک نہیں بھولی وہ پطرس بخاری کی تالیف قلب کے ضمن میں میری طرف محبت بھری ادائے التفات تھی۔ وہ مسلسل مجھے اپنی اس ادا سے یہی کہے چلے جا رہے تھے۔ "ارے برخوردار مشاعرہ کا لطف خوب خوب اٹھاؤ۔ بالکل پریشان نہ ہو۔ تم اس پورے مشاعرے کی جان ہو۔"

سچ تو یہ ہے کہ تالیف قلب کے حوالے سے مجھے ایسا تجربہ کبھی نہیں ہوا تھا اور نہ پھر کبھی ہوا کہ ایک شخص میری طرف دیکھ بھی نہیں رہا ہے لیکن مجھے یہ احساس بھی دلا رہا ہے کہ عزیزم تم میری آنکھوں ہی میں نہیں دل میں بھی بیٹھے ہوئے ہو۔ تمہارے آنے سے میری ہی آبرو نہیں بڑھی میرے تمام کالج کی عزت کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تالیف قلب ایک بہت ہی نازک چیز ہے۔ اس میں دوسرے کی انا کے مجروح ہونے کے امکانات سے ہم کسی وقت بھی انکار نہیں کر سکتے۔ تالیف قلب میں اگر دوسرے کو ذرا سا یہ احساس ہو جائے کہ کوئی مجھے رحم کے قابل سمجھ رہا ہے تو یہی تالیف قلب ایک سفاکانہ عمل کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ یقیناً پطرس بخاری نے مجھے ایک بار نہیں کئی بار دیکھا ہوگا لیکن میری نظریں بچا کر اور یہی وہ تالیف قلب کا کمال تھا جو اس رات پطرس بخاری صاحب کی ایک ایک ادا سے مجھے ہمت اور حوصلہ بخش رہا تھا۔ میں لاہور میں اپنی اس آمد کو کسی طرح بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ گویا لاہور نے عزت اور آبرو کے ساتھ میرا استقبال کیا۔

لاہور جو شہر تھا

ڈاکٹر انیس ناگی

شہر بھی انسانوں کی طرح اپنا رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ حالات انسان کو بدلتے ہیں اور انسان شہروں کو بدلتے ہیں۔ کوئی شہر اچھا یا برا نہیں ہوتا اس کے مکین اسے اچھا اور برا بناتے ہیں۔ کچھ شہر اپنے ماضی کو ساتھ لے کر چلتے ہیں اور کچھ شہر اپنے ماضی کو محو کر دیتے ہیں۔ آپ پیرس جا کر دیکھیں نپولین کی یادگاریں اور اس کے مجسمے اس طرح شہر میں نصب ہیں کہ یوں لگتا ہے کہ اس کی سواری ابھی ابھی یہاں سے گزری ہے۔ روم میں ابھی تک ایسی گلیاں موجود ہیں جو جولیس سیزر کے زمانے میں تعمیر کی گئی تھیں' جو آج تک اچھی حالت میں موجود ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں الٹی گنگا بہتی ہے، ہم نام نہاد جدیدیت کے نام پر ہر اس نقش کو محو کرنے میں مصروف ہیں جو کبھی ہماری شناخت کا حوالہ تھا۔ اس کی سب سے بڑی مثال لاہور شہر ہے جو ماحولیاتی کثافت کے اعتبار سے دنیا کا تیسرا گندہ شہر ہے۔ کبھی اس شہر کو عروس البلاد کہا جاتا تھا اور کبھی لوگ یہ بھی الاپتے تھے کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ آج کے لاہور کے حوالے سے ماضی کی یہ باتیں کچھ ناقابل یقین معلوم ہوتی ہیں۔ اب لاہور میں رہا ہی کیا ہے؟ شاپنگ پلازے، برگر ہاؤس اور بدوضع بڑی بڑی کوٹھیاں جو ہر طرح کے تعمیراتی حسن سے عاری ہیں۔ لاہور اب تین حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ اس کا پہلا حصہ قدیمی ہے، وہ علاقہ جسے اندرون شہر کہا جاتا ہے۔ لاہور کا دوسرا حصہ وہ ہے جو انگریزوں کے نو آبادیاتی دور میں آباد ہوا تھا۔ اس کا تیسرا حصہ وہ نئی آبادیاں ہیں جو بیرون ملک دولت آنے سے یا مشکوک طریقے سے حاصل شدہ زر کثیر کی نمائش گاہیں ہیں۔ لاہور کے تین حصوں کے علاوہ ہر جگہ ناجائز کچی آبادیوں کی فصل اگی ہوئی ہے۔ کچی آبادیوں میں ہر روز اضافہ ایک عجیب و غریب نفسیات اور اقتصادی حالت کا مظہر ہے جس پر غور نہیں کیا گیا۔ ہماری کمزور حکومتیں کچی آبادیوں کی طرح سے شور و غوغا سن کر انہیں ایک دم مالکانہ حقوق دے دیتی ہیں۔ غربت کی آڑ لے کر لاکھوں کی تعداد میں نفوس نے لاہور کو قبضے میں لیا ہوا ہے۔ گزشتہ پچیس سالوں میں معاش کی تلاش میں دیہاتوں اور چھوٹے شہروں سے لاتعداد لوگوں نے لاہور میں ہجرت کی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں لاہور کی آبادی سات آٹھ لاکھ کے قریب تھی اور اس

وقت یہ ایک کروڑ کے لگ بھگ جا پہنچی ہے۔ لوگوں کی اتنی بڑی تعداد نے اپنی معیشت کے لئے شہر کے تمام فٹ پاتھوں اور کالی جگہوں پر قبضہ کرلیا ہے جس کے نتیجے کے طور پر سارا شہر ایک لنڈے بازار کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ وہ لاہور جو اپنے وسیع پن، باغات، اور سایہ دار درختوں کے لئے مشہور تھا وہ ایک منڈی بن چکا ہے جہاں کسی شخص کی کوئی شناخت باقی نہیں رہی۔ ایک زمانہ وہ تھا جب لاہور میں راہ چلتے ادیبوں کی لوگ شناخت کرتے تھے اور انگلی اٹھا کر کہا کرتے تھے کہ وہ تانگے میں سعادت حسن منٹو جا رہا ہے۔ کوئی کہتا مال روڈ پر اس نے آج فیض احمد فیض کو سیر کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ لیکن اب غالب یا اقبال بھی مال روڈ پر سیر کرنے نکلیں تو کوئی انہیں پرکاہ کی وقعت بھی نہیں دے گا بلکہ ان کی جیبیں بھی کاٹ لی جائیں گی۔ کثرت آبادی اور کمرشل ازم نے انسانوں، جگہوں اور عمارات کی اہمیت کو عام نظر سے اوجھل کر دیا ہے۔

لاہور فن تعمیر سے عاری شہر ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مغل بادشاہوں (جن کا دور حکومت سب سے طویل تھا) نے بھی شہر کی تعمیر میں منصوبہ بندی نہیں کی تھی اس لئے لاہور لندن، پیرس اور دوسرے قدیمی شہروں کی نسبت ایک بے ربط شہر لگتا ہے جہاں نہ تو فن تعمیر نظر آتا ہے اور نہ ہی عمومی افادیت کے ادارے۔ یہ ایک بکھرا ہوا بے ترتیب شہر ہے۔ جس نے جہاں چاہا ایک چوکور سی عمارت کھڑی کر دی۔ مغل بادشاہوں کی فن تعمیر میں دلچسپی قلعوں، مساجد اور مقبروں تک محدود تھی۔ لاہور شہر کے ماضی کے بارے میں بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ اس کی موجودگی کو روپانڈو کے زمانے سے تسلیم کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب ان بھائیوں میں جنگ شروع ہوئی تو پانڈوں نے قصور جانے سے پہلے لاہور میں رنگ محل کے باہر پڑاؤ کیا تھا۔ قدیمی لاہور شاہی قلعہ (جہاں پرانے زمانے میں ایک بڑا ٹیلہ تھا) پر آباد ہونا شروع ہوا تھا۔ اچھرہ لاہور کی سب سے پرانی ہندوؤں کی آبادی تھی۔ خاندان غلاماں کے سبکتگین بادشاہ کے بعد ہر اہم غیر ملکی حملہ آور نے لاہور میں قیام کیا بلکہ اسے جی بھر کے لوٹا اور اسے تاراج کیا۔ تاریخی ریکارڈ کے مطابق لاہور کو تیرہ مرتبہ تاراج کیا گیا تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ مغلوں سے لے کر انگریزوں کے زمانے تک لاہور اور پنجاب کے گورنر (صوبہ دار) غیر ملکی رہے ہیں۔ کبھی ترک، کبھی ایرانی، کبھی مغل اور کبھی انگریز، صرف ایک مرتبہ کچھ عرصہ کے لئے ایک مقامی جرنیل کو مغلوں نے لاہور کا گورنر تعینات کیا تھا۔ لاہور مغلوں اور پھر انگریزوں کے لئے ثانوی حیثیت کا شہر تھا۔ تین چار سو سالوں سے دہلی دار الخلافہ رہا جس کے نتیجے کے طور پر حکمرانوں کی توجہ دہلی اور اس کے اردگرد کے شہروں پر رہی۔ لاہور ایک تاریخی گزرگاہ تھی۔ کشمیر جاتے ہوئے جہانگیر یہاں پڑاؤ ڈالتا۔ اکبر نے دکن اور بنگال کی طرف عسکری مہمات کا آغاز یہاں سے کیا۔ چنانچہ ان حکمرانوں کو لاہور کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں تھی۔ مقامی مہاراجوں میں رنجیت سنگھ واحد حکمران تھا جس نے قریباً پچیس برسوں تک تخت لاہور کو سنبھالے رکھا۔ یہ پنجاب کی تاریخ میں شخصی حکومت کا عجیب وغریب دور تھا جس میں نظام حکومت رنجیت سنگھ کی بوالعجبیوں کے تابع تھا۔ رنجیت سنگھ ایک جنونی حکمران تھا جو بیک وقت سکھ کلچر کا ہیرو بھی تھا۔ اپنے طور پر تو اس نے لاہور میں کوئی عمارت تعمیر نہیں کی بلکہ اس نے مغلوں کی

تمام عمارتوں کو برباد کیا اور ان کے قیمتی حصوں کو امرتسر منتقل کر دیا۔

انگریزوں کا نو آبادیاتی دور حکومت بعض پہلوؤں سے لاہور کے لئے کافی سود مند ثابت ہوا۔ انہوں نے نظم و نسق چلانے کے لئے لاہور کو جدید طرز پر تعمیر کیا۔ پرانے لاہور کا نقشہ بڑا دلچسپ تھا۔ غیر ملکی سیاحوں کے سفر ناموں میں لاہور کی کلچرل زندگی کے بارے میں ولیم فنچ کی معلومات بڑی دلچسپ ہیں۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں برطانوی سیاح ولیم فنچ لاہور آیا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق لاہور میں چھ ماہ سے زیادہ عرصے کے لیے سردی کا موسم تھا۔ راوی دریا بالکل شہر کے ساتھ لگا ہوا تھا، اس کا ایک پاٹ شاہی قلعہ کے ساتھ تھا جو بتدریج پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔ (اسی میں رنجیت سنگھ نے غیر ملکی انجینئروں سے لکڑی کا ایک جہاز بنوایا تھا جو پیڈلوں سے چلتا تھا)۔ پرانی تصاویر کے مطابق راوی دریا داتا دربار کو چھو کر آگے نکلتا تھا پھر یہ پنجاب سول سیکریٹریٹ کے پاس سے ہوتا ہوا بُرجی کے ساتھ ساتھ بہتا تھا۔ ساندہ اور کشن نگر دریا کے پاس آباد تھے۔ ولیم فنچ کے بیان کے مطابق لاہور میں بادام، انار اور خوبانی وافر تعداد میں پائی جاتی تھی۔ اندرون شہر بہت گندہ تھا۔ گلیوں میں سارا دن مویشی گھومتے رہتے اور مٹھائی کی دکانوں پر مکھیوں کی یلغار ہوتی۔ شاہی طبیب فرانسیسی نژاد منوچی نے بھی اپنے سفر نامے میں سترہویں صدی کے لاہور کا حال بیان کیا ہے۔ ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی میں بھی لاہور کوئی صاف ستھرا شہر نہیں تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد بھی لاہور میں رہتے تھے۔ ان کے بیان کے مطابق اندرون شہر گلیوں میں اتنا تعفن ہے کہ منہ اور ناک ڈھانپے بغیر چلنا محال ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ برطانوی عہد حکومت میں لاہور کی تعمیر نو کی گئی اور انگریزوں نے سب سے پہلے یہاں ریلوے سٹیشن، عدالتیں، ڈاکخانے اور عوام الناس کی سہولت کے لئے عمارتیں تعمیر کیں۔ انگریزوں نے مغل اور گوتھک طرز تعمیر کے امتزاج سے ایک نیا طرز تعمیر وضع کیا تھا۔ یہ طرز تعمیر آج بھی لاہور کے عمارتی شکوہ کا باعث ہے۔ اس کے علاوہ جو بھی نئی عمارتیں ہیں وہ جدیدیت کی حامل تو ہیں لیکن مخصوص طرز تعمیر سے عاری ہیں۔ مکانات کی تعمیر میں بھی امریکی طرز تعمیر کی نقالی کی گئی ہے۔ لاہور کے اردگرد بے شمار نئی آبادیاں تعمیر ہوئی ہیں۔ جو صرف چوکور قسم کے مکانوں پر مشتمل ہیں۔

لاہور کے بارے میں ایک غیر معمولی بات یہ ہے کہ یہ تجارت، صنعت و حرفت اور علم و ادب کی ایک منڈی رہی ہے۔ لاہور شہر نے کبھی اپنا کوئی ہیرو پیدا نہیں کیا۔ علم و ادب کے میدان میں ہمارے مشاہیر مولانا محمد حسین آزاد، علامہ اقبال، فیض احمد فیض، سعادت حسن منٹو، فن موسیقی میں روشن آرا بیگم، نور جہاں، استاد نصرت فتح علی خان، مصوری میں صادقین، شاکر علی ان سب کا تعلق لاہور سے نہیں تھا۔ البتہ نامور مصور عبدالرحمان چغتائی لاہور کے رہنے والے تھے۔ پنجاب کا دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے لاہور کو مرکزیت رہی ہے اسی باعث فنکار یہاں آ کر اپنے ہنر کی نمائش کرتے ہیں۔ لاہور اچھی لائبریری سے محروم شہر ہے۔ قائد اعظم لائبریری کے قیام سے قبل لاہور میں کوئی باوقار قدیمی یا نیا کتب خانہ بھی نہیں تھا۔ ایک سکھ رئیس دیال سنگھ نے لاہور میں ایک بڑا کتب خانہ

تعمیر کیا تھا جواب کتابوں سے خالی ہو چکا ہے۔ لاہور سرمائے اور غربت کا شہر ہے۔ کسی اہل ثروت نے ابھی تک کسی ویلفیئر ہسپتال، کتب خانہ یا Public Utility کا کوئی ادارہ قائم نہیں کیا۔ آج کل لاہور کی تزئین اور اس کے اصلی رنگ روپ کو بحال کرنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ یہ ایک مستحسن قدم ہے۔ لیکن صرف ان عمارتوں کو بحال کیا جا رہا ہے جو برطانوی عہد میں تعمیر ہوئی تھیں۔ یہ عمارتیں زیادہ تر مال روڈ پر واقع ہیں۔ اصل ضرورت قدیمی لاہور کو بحال کرنے کی ہے۔ دورِ مغلیہ کی بہت سی چھوٹی چھوٹی عمارتیں زبوں حالی کا شکار ہیں جو توجہ کی طالب ہیں۔

☆

چودھواں دروازہ

عارفہ سیدہ

اس شہر خوباں کے تیرہ دروازے اینٹ پتھر کے اور چودھواں میرا دل۔ کسی شہر میں اگر دل کے دروازے سے داخل نہ ہوا جا سکے تو وہ شہر احساس کا وطن نہیں ہو پاتا۔

تاریخ کے زمان میں اور جغرافیے کے مکان میں لاہور جیسے شہر بہت کم ہیں۔ یہاں تاریخ اپنے ہر موڑ پر اس صورت سے شہر پر گزری کہ اپنے نقش ثابت کرتی چلی گئی۔ قبل از تاریخ کا لاہور تاریخ کے اپنے حافظے سے محو ہو چکا ہو لیکن یہ شہر اپنے نام کی ایک روایت کی نسبت بھگوان رام کے بیٹے کے نام سے رکھتا ہے۔ خود فراموشی آئینہ روزگار کا زنگ بن جاتی ہے۔ لیکن یہ بات ہر روایت سے ثابت ہے کہ ہر گزرنے والی تہذیب کے خطوط لاہور کے پیکر کو تراشتے رہے۔ اس شہر نے تہذیب کے مختلف رنگوں کا لمس جس طرح محسوس کیا ہے اس کا مساوی خال خال ہی ملے گا۔

ٹھاٹھیں مارتے دریا کے کنارے، باغوں کے جھنڈ میں بسا، پھولوں کی خوشبو سے لدا پھندا یہ شہر دلوں کو موہ لیتا تھا۔ شہر کا مزاج معتدل تھا اور فضا مہربان۔ وہ سندھ کے ریگستان سے گزر کر یہاں آیا ہو، یا کابل کی دشوار گھاٹیوں سے گھوڑے کی ٹاپوں کی گونج سنتا اس شہر میں وارد ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ اس متوازن مزاج، حس ملکہ اور تواضع خاطر شہر سے سرسری گزر جاتا۔ اس جہان دیگر میں مستقل قیام تو ملوکیت کی سیاست کا مقدر نہ تھا۔ لیکن اپنی نشانی چھوڑے بغیر، یہاں سے جانے کو کسی کا جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ آتے تھے تو حکم اور فتح کا سامان لئے، اس شہر میں ذرا تکیہ کر کے، منزلیں سر کر لینے کو۔ لیکن کوئی نہ کوئی باغ، عمارت، چوک، فوارہ دے کر تاریخ کے وثیقہ میں تہذیب کا کچھ حصہ اپنے نام کرا کے، بڑھ جاتے تھے۔ تشکر کی، تلطف کی ایک صورت یوں بھی تھی۔

روح کے اکتارے پر یکتائیت کا گیت الاپنے والوں کو یہ شہر بھاتا تھا۔ کیسے کیسے خدا کے دوست اس زمین میں پیوند ہیں۔ جب تک جیئے زخمی روحوں کو محبت اور انسانیت کا مرہم بانٹتے رہے، اب نہیں ہیں تو بھی اضطراب کی تشفی کا سامان ہیں۔ انہیں اپنے کی پہچان تھی اور پرائے کا خیال۔ محبت کا ایک شاداب چشمہ تھا، جہاں

سر جھکا کر، ہر کوئی حسب ظرف سیراب ہو لیتا تھا۔ یہ رواداری اور نرم خوئی اس شہر کے مزاج کو راس آئی۔ خوش پوشوں، خوش ذوقوں کا یہ شہر خوش خیال اور خوش عقیدہ ہوتا گیا۔ مروت اور برداشت کی کنجی سے دلوں کے قفل کھلتے تھے۔ تعصب اور تنگ ظرفی کی مجال کہاں تھی؟ تہذیب تحمل کی فضا میں پھلتی پھولتی ہے۔ رنگوں میں رنگ ملتے ہیں۔ وضع میں وضع ڈھلتی ہے۔ خیال سے خیال خوشہ چینی کرتا ہے۔ ادب، ذوق، ذائقہ لباس، تراش خراش، بول چال اور رسم و رواج زندگی کے ایک مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا قرینہ سیکھ لیتے ہیں۔

یہ فرشتوں کا شہر تھا نہ جنت میں آباد۔ اولاد آدم بستی تھی اور خمار گندم سے غافل بھی نہ تھی۔ ساری الجھنوں کے باوصف انسان ہونے کی تمنا میں زندگی کی تراش خراش میں مستقل مزاجی سے مصروف۔ یہ شہر عجب قسمت رکھتا ہے۔ فوجوں کی گزرگاہ رہا، مگر باقاعدہ میدان کارزار کبھی نہیں بنا۔ ایک تماشائی کی حیثیت سے نیرنگیِ زمانہ میں اس کی گواہی معتبر رہی۔ یہ گواہی شہر کا اپنا مزاج کاڑھنے میں بہت کام آئی۔ تہذیب میں انتخاب کی ریزہ کاری نے رنگ، نسل، زبان، کا فرق مٹا دیا۔ ایک عقیدے کا یقین، زندگی کے عمل میں خون بن کر دوڑا اور لاہور ایک بوقلموں مسلمان قرینہ، تہذیب کا مرکز ٹھہرا۔ فطرت کی کشادگی اور شادابی نے شہر کا نقشہ قطع کیا اور حسن لطیف کے مختلف مرقعے ساز، آواز، رنگ اور حرف و صورت کے زاویوں سے مرتسم کیے۔

جس شہر نے اعتماد کی اٹھان اور عروج کا بانکپن دیکھا تھا اسی نے اس کو شرمندہ، پسپا اور بے بضاعت ہوتے دیکھا۔ کوہ نور کی آب یہاں اتری۔ زیب النسا جیسی بنت مآب، صاحب فکر خاتون کے مقبرے کے مصفا سنگ مرمر کو بے عصمت ہوتے ہوئے بھی اسی شہر نے دیکھا۔ جو عیش میں یاد خدا، اور طیش میں خوف خدا سے بے نیاز ہوئے تھے بخت نے ان سے کنارہ کیا۔ مسلمانوں کے سر سے ہما کا سایہ اٹھا اور اہل فرنگ کا طوطی بولنے لگا۔ کساد بازاری نے جنھیں، دام چکانے کا فن سکھا دیا تھا انھوں نے تاج و کلاہ کی قیمت لگاتے لگاتے وہ سر ہی ارزاں کر دیے، جو خود کو سروری کا حقدار گردانتے تھے۔ لاہور کے کانوں نے ایک بہت ہی نامانوس لہجہ میں حکم سنا اور ایک نئی چال کا حاکم دیکھا۔ اس تخریب میں تعمیر کی صورت بھی مضمر رہی۔ باغوں کے اس شہر میں نئے باغ لگے۔ پرانوں کی درستگی میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ علم کا شیدائی شہر تھا، اب اس میں نئے علوم کی پیوند کاری ہوئی۔ غیر ملکی حاکم کچھ کم عیار نہ تھا۔ رموز خواجگی کا کامیاب نباض تھا۔ حاکمیت کے استقلال کی خاطر نئے پیمانے اور نئی میزان مقرر ہوئی۔ شہر کی آراستگی کا سامان بطرز دیگر مہیا ہوا۔ ایک شاداب تہذیبی اور علمی ورثہ کو سہولت اور ذات پسندی نے تعیش کی خزاں کے سپرد کیا تھا، اس نئے علم کے غلغلہ سے بہت سی گرد آلود گرہیں کھلیں۔ لاہور کی تواضع کا چلن یہاں بھی قائم رہا۔ نئے طریقوں کو ملنساری سے قبول کیا۔ رسل و رسائل کے نئے قرینے اپنائے۔ اظہار کی نئی جہتوں کی جھجک مٹائی اور تجربے کی اجنبیت سے خود کو ہراساں نہ ہونے دیا۔ صبحوں کا یہ شہر صبح خیز رہا۔ رات کا جادو کچھ کے سر چڑھ کر بولتا تھا اور کچھ کے دل پر۔ شامیں رنگین رہیں، صبح کی چہکار دن ڈھلے کے ملگجے اندھیرے میں فکر میں مشغول ہو جاتی۔ دیوان عام، دیوان خاص، دربار اور محل کہنگی نے جزدان میں لپیٹے، مال

روڈ اشرافیہ کے قدموں کی چاپ کی شناسا ہوئی۔ گورنر ہاؤس میں گردنیں خم ہونے لگیں۔ جمخانہ میں بینڈ کی دھن پر روایت کورنش بجا لانے لگی۔ چھوٹی حاضری، بڑی حاضری متعارف ہوئی، چھوٹے بڑے کا فرق اسی طرح حاضر رہا۔

عہد غلامی کا تھا مگر سنگ آزاد نہیں تھے۔ امن کی خاطر سنگ مقید کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ایک انتظام کی صورت تھی کہ عام تھی۔ علم دوستی نے تہذیب کو سر بگریباں نہ ہونے دیا تھا۔ ایک عرصہ کی شورہ گردی کے بعد منت غیر کے باوجود یہ سکون بھی لاہور کے معتدل مزاج کو بھلا لگا۔ گرد ملال مٹانے کو، کاوش خیال نے نئے نئے پیمانے تراشے۔ مصوری، خطاطی، فن تعمیر اور شعر و ادب کی جان دار روایت نے نئے اسالیب اور نئے معانی کی تلاش شروع کر دی۔ علم اس شہر کا وظیفہ تھا اور تہذیب اس شہر کا وطیرہ۔

غیر ملکی حاکم کے لئے یہ زمین اجنبی تھی۔ نجانے حاکیت کا غرور تھا یا انگریز کے پے تلے مزاج کی عکاسی کہ شہر بڑھا تو خوب، مگر بگڑا ذرا بھی نہیں۔ ترقی تھی تو ایک سلیقہ بھی تھا۔ ضرورتیں نئی تھیں اور ایجاد بھی طرفہ۔ ایک نیا طرز تعمیر ابھرا۔ کشادگی اور وسعت سے متوازن سرسبزی اور شادابی کا جان سوزی سے اہتمام لئے یہ مینو سواد شہر اب پیرس نژاد ٹھہرا۔ وقت بدلا تھا، خاصیت نہیں بدلی تھی۔ نقد معیار سر بگریباں نہ ہوئی تھی۔ چوک، فوارے، باغ، چہکتے، لہلہاتے اور مہکتے رہے اور رہنے والے رشک چمن۔ کلاسیکیت میں جدت کا ٹانکا لگا۔ دو دتبہ جام دو آتشہ ہوگئی۔

ہر زندہ تہذیب کو تبدیلی قبول ہوتی ہے۔ لاہور اس اصول سے الگ نہیں، یہ وقت کے ساتھ ساتھ تراش خراش اور رد و قبول کی احتیاط کے عمل میں سرگرم رہا۔ علم کی بے ریا فضا کا فیض اٹھانا اس کو لطف دیتا تھا اور وسیع المشرب ہونے کا سرور اسے راس آتا تھا۔ جیسے جیسے ہم اپنے مختار خود ہوتے گئے علم کم ہوتا گیا، ظرف تنگ ہوتے گئے۔ ناقص علم کا ڈنکا بجنے لگا اور کم علموں کی بن آئی۔ خود پرستی کا ایسا سیلاب آیا کہ وضعداری کا ٹھاٹھیں مارتا دریا تنک آب ہوا۔ اب سے پہلے رعایتیں بدلی تھیں، قرینے بدلے تھے، آداب خواجگی بھی پہلے جیسے نہ رہے تھے، مگر اس سب کے باوجود شہر کی خاصیت نہ بدلی تھی۔ فساد نفس نے اس شہر کی تہذیب پر گھونگھٹ کا ایسا وار کیا کہ شہر کی صورت بدلی تو بدلی، سیرت ہی غیر ہوگئی۔ زندگی نگار خانے سے نکل کر نقار خانے میں آ گئی۔ جو شہ کو مات دے دیا کرتے تھے اب صرف گھوڑوں کی چال کے واقف رہ گئے۔

ترقی کے نام پر سرسبزی بیگانہ ہوئی اور شادابی پامال۔ کشادگی اور وسعت کو تو سہولتوں کی خاطر زنجیر ہونا ہی تھا۔ صدیوں سے وقت کو اپنی شاخوں میں چھپائے، شہر کو سائے کی گود میں لئے چھتنار درخت زد میں آئے۔ چہکار بھی رخصت ہوئی اور مہکار بھی۔ صبحوں کا شہر اداس ہو گیا، صبحیں تنہا رہ گئیں۔ پرندے خفا ہوئے اور فطرت خاموش۔ جہاں سایہ آنکھوں سے لگا چلا آتا تھا اب کسی دیوار کو ترستا ہے۔ اب یہ شہر اس شور سے گونجتا ہے کہ الاماں والحفیظ۔ اور ہم منہ اٹھا اٹھا کر مدد کو ڈھونڈتے ہیں کہ کوئی ہمارے شور کا نسخہ لکھ دے۔ صبر اور برداشت کا نسخہ

اپنے سوا کہیں اور سے نہیں ملتا۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ تہذیب تو شہروں کو نقد جاں کے عوض خریدتی ہے۔ ہم نے اس شہر خوباں کو کتنی ارزانی سے پامال اور داغدار کیا۔ لاہور اس سلوک کا عادی نہ تھا۔ اب مجبور ہوا ہے۔ اس کی زندگی ایک ہنگامے پر موقوف ہو گئی اور وقت اس ہنگامہ کا متلاشی کہ ہم ایک لمحے کو ٹھہر جائیں اور ٹھہر کر سوچیں۔ وہ جو سوچنے کو ٹھہتے نہیں وقت انہیں معاف نہیں کیا کرتا۔ خواجگی کی شوریدہ سری، اہل شہر کی بے حسی کا سامان بنی۔ نیتوں کے سیلاب میں ٹھاٹھیں مارتا دریا مشت خاک ہوا۔ ہوس نے وہ گل کھلائے کہ چمن کی خاک اڑ گئی۔ وہ زمین جو رزق اگلتے نہ تھکتی تھی، بھوک مٹانے کا سامان نہیں کر پاتی۔ رہ رہ کر پاؤں پکڑے لیتی ہے کہ ہم ذرا ٹھہر جائیں ٹھہر کر سوچیں۔

تیرہ دروازے تو صدیوں سے دیدہ حیران ہیں اب چودھواں دروازہ بھی پلک جھپکنا بھول گیا۔

ٹ

لاہور کے چند اہم افسانہ نگار اور رجحانات

خالد سنجرانی

مغلیہ بادشاہت کے خاتمے اور خود مختار ریاستوں کے انحطاط کے بعد لاہور ایک بڑے ادبی مرکز کی حیثیت سے ابھرا۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں، پر شکوہ اسلامی، ملی فلسفیانہ شاعری، آزاد نظم کے نئے شعری آہنگ، اردو غزل کے جدید رجحانات، مزاحیہ ادب کے بے مثل نمونوں، تراجم کے قابل قدر حوالوں، خاکہ نگاری کے نئے اور دیر پا ضابطوں، افسانہ اور ناول وغیرہ کے معتبر ترین رجحانات کے حوالے سے لاہور کی علمی و ادبی فضا سدا بہار رہی ہے۔ ادب کی اس وسیع روایت کی نمو میں باہر کے تخلیق کاروں کے ساتھ ساتھ لاہور میں رہنے والے ادیبوں اور شاعروں نے گراں قدر خدمات سر انجام دیں۔ لاہور مشاہیر کا مسکن ٹھہرا۔ یہاں کے علمی و ادبی مجلوں، تنقیدی محفلوں کی روایت، تخلیق کاروں کے باہمی میل ملاپ نے لاہور کی علمی و ادبی روایت کو بالیدگی عطا کی ہے۔

اردو افسانے پر نگاہ دوڑائی جائے تو معلوم ہوگا کہ اہم ترین افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقی زندگی کا بہترین حصہ لاہور میں بسر کیا۔ لاہور کے اہم افسانہ نگاروں میں راجندر سنگھ بیدی اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ بیدی کی تخلیقی آنکھ ۱۹۳۱ء میں افسانے کے روشن منظر پر کھلی۔ اس برس انہوں نے اپنا پہلا مطبوعہ افسانہ "مہارانی کا تحفہ" لکھا جو ادبی دنیا میں شائع ہوا۔ اس افسانے کو نہ صرف فٹ نوٹ کے ساتھ شائع کیا گیا بلکہ اسے سال کا بہترین افسانہ بھی قرار دیا گیا۔ اس افسانے کی اشاعت سے قبل اور کچھ سال بعد تک بھی ادبی مجلوں کے مدیران نے بیدی صاحب کے ساتھ سرد مہری کا رویہ اپنائے رکھا جس کا انتقام بیدی نے یوں لیا کہ سال کے بہترین قرار دیئے جانے والے افسانے کو انہوں نے رد کر کے اپنے پہلے افسانوی مجموعے میں شامل نہ کیا۔ بیدی کا اولین افسانوی مجموعہ ۱۹۳۴ء میں "دانہ و دام" کے عنوان سے شائع ہوا۔ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ بیدی کے یہ دونوں مجموعے لاہور کے زمانۂ قیام کی نشانیاں ہیں۔ بیدی ۱۹۱۵ء میں لاہور چھاؤنی کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوئے اور نو برس تک جی۔ پی۔ او لاہور میں معمولی ملازم رہے۔ اب معلوم نہیں کہ کرشن چندر کے اصرار پر انہوں نے ڈاک خانے کی یہ ملازمت ترک کی یا منٹو کا افسانہ "ترقی پسند" اس کا سبب بنا۔

بیدی نے لاہور سے جس افسانوی روایت کا ڈول ڈالا وہ پیش رو افسانے سے یکسر جدا ہے۔ بیدی نے اپنے پیش رو افسانہ نگاروں کی مانند نہ تو روحانی طرزِ فکر اور طرزِ اسلوب کو برتا، نہ دیہات کی زندگی اور اس کے مسائل کو موضوع بنایا اور نہ ہی مغل شہزادیوں کی مفلوک الحالی کو رقت آمیز پیرائے میں بیان کیا۔ بیدی نے گھریلو زندگی میں رشتوں کے باہمی تعلق کی اس نزاکت کو چھوا جسے ضبطِ تحریر میں لانا ایک اعجاز ہے۔ اس کی عمدہ مثال ''بھولا'' ہے۔ اس نوع کے افسانوں میں بیدی کی اپنی نیک نفسی اور اپنے اہلِ خانہ کی مثالی محبت کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ بیدی نے افسانے کہ وہ جہت بھی اجاگر کی جس میں اساطیری حوالے امڈتے چلے آئے ہیں، فکر و فلسفہ اور جدید علوم کی اصطلاحیں جو سنجیدہ علوم تک محدود تھیں ان پر اردو افسانے کے در کھل گئے۔ کرداروں کے ہاں نفسی اخریت اجاگر کرنے میں بیدی کا بڑا عمل دخل ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ عہد کہ جس میں ''آتش پارے'' اور ''انگارے'' جیسے افسانوی مجموعے الاؤ کی صورت اختیار کرنے پر مائل دکھائی دیتے ہیں تو وہاں لاہور میں اس نوع کا احتجاج اور انقلابی فکر ابھرتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ لہٰذا بیدی کی وساطت سے لاہور کے اردو افسانے کا جو ابتدائی مزاج متعین ہوا وہ امرتسر، بمبئی اور دہلی کے افسانوی مزاج سے جدا ہے اور رجسٹرڈ ترقی پسند افسانوی منشور سے بھی اس کا تعلق گہرا نہیں ہے۔ لاہور کے افسانہ نگاروں کا ایک اور ابتدائی رجحان رومانیت کا ہے جو میرزا ادیب اور حجاب امتیاز علی کے افسانوں کی صورت میں سامنے آیا۔

۱۹۴۷ء نے لاہور کو بڑے اہم افسانہ نگار دیے۔ منٹو ''باجو والی گلی'' سے نکل کر لکشمی مینشن آ پہنچا۔ غلام عباس اگرچہ منٹو کی طرح خالص امرتسری ہے لیکن اس کا لڑکپن لاہور کے گلی کوچوں میں گزرا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد وہ آل انڈیا ریڈیو چھوڑ کر پاکستان آ گئے۔ انتظار حسین نے محمد حسن عسکری کے ریڈیائی پیغام پر لبیک کہا اور سلیم احمد کے ہمراہ میرٹھ سے روانہ ہوئے اور کرشن نگر کو اپنا ابتدائی ٹھکانا بنایا۔ ممتاز مفتی لکڑی سے بندوق کا کام لیتے ہوئے بہ حفاظت لاہور آ گئے اور مہاجرین ریلیف کیمپ میں دلاسہ دینے کے سرکاری کام پر مامور رہے۔ تب حجاب امتیاز علی، میرزا ادیب، احمد ندیم قاسمی، آغا بابر، اشفاق احمد، بانو قدسیہ وغیرہ لاہور ہی میں تھے۔ یوں لاہور میں افسانہ نگاروں کی دو نسلیں یکجا ہو گئیں ایک تو وہ جو قیامِ پاکستان سے پہلے افسانہ لکھ رہے تھے اور ایک وہ افسانہ نگار جو قیامِ پاکستان کے بعد اپنی تخلیقی صلاحیت کا اظہار کرنے والے تھے۔

۱۹۴۷ء کے فسادات کا جو خونی منظر بنا، مذکورہ بالا افسانہ نگاروں کے ہاں اس منظر کی گواہی دکھائی دیتی ہے۔ بعض گواہیاں ایسی دل آزار اور تلخ ہوتی ہیں کہ آواز گلے سے نکالے نہیں نکلتی۔ پاکستان اور ہندوستان کے قیام اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے حوادث نے افسانہ نگاروں کے سوچنے اور سمجھنے کی قوت چھین لی۔ منٹو نے لکھا: ''طبیعت میں اکساہٹ پیدا ہوئی کہ لکھوں۔ لیکن جب لکھنے بیٹھا تو دماغ کو منتشر پایا..... میں اپنے عزیز دوست احمد ندیم قاسمی سے ملا، ساحر لدھیانوی سے ملا ان کے علاوہ اور لوگوں سے ملا۔ سب میری طرح ذہنی طور پر مفلوج تھے۔'' ہنگامے، قتل و خون، حملے فسادات، ریلیف کیمپ وغیرہ کے موضوعات ان افسانہ نگاروں کے اندر ہی

اندر کھولتے رہے۔ پھر دھیرے دھیرے یہ لاوا باہر کو آیا۔ منٹو نے لاہور آنے کے بعد پہلا افسانہ ''ٹھنڈا گوشت'' لکھا۔ احمد ندیم قاسمی نے نقوش کے لئے افسانہ یہ کہہ کر نہ لیا کہ یہ بہت گرم ثابت ہوگا۔ منٹو نے اگلے ہی روز ''کھول دو'' لکھ کر قاسمی صاحب کے حوالے کر دیا۔ لاہور میں لکھے جانے والے منٹو کے یہ دو ابتدائی افسانے فسادات سے متعلق ہیں۔ منٹو کے دیگر افسانے مثلاً ''شریفن''، ''موذیل''، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ''گورمکھ سنگھ کی وصیت''، ''وہ لڑکی''، ''رام کھلاون''، ''عزت کے لئے'' اور ''ڈارلنگ'' وغیرہ ۱۹۴۷ء کے گرد و پیش کا منظر سامنے لاتے ہیں۔ اسی عہد میں لاہور کے ہر اہم اور غیر اہم افسانہ نگار کے ہاں فسادات کا موضوع دکھائی دیتا ہے۔ موضوعاتی سطح پر اس رجحان نے اردو کو لازوال افسانے دیئے۔ منٹو کے بہت سے افسانوں کے ساتھ ساتھ میرزا ادیب کے ''دیئو''، احمد ندیم قاسمی کے ''پرمیشر سنگھ''، اشفاق احمد کے ''گڈریا''، شہاب کے ''یا خدا'' کو کلاسیک کا درجہ ملا ہے۔ لاہور کے افسانہ نگاروں نے ہندوؤں اور سکھوں کے انسانیت سوز مظالم کو جہاں موضوع بنایا تو انہوں نے اپنوں کے سنگ دل رویوں کو بھی افسانوں میں جگہ دی۔ اس اعتبار سے مہاجرین ریلیف کیمپ ایک بڑے موضوع کے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ لاہور میں جو افسانے لکھے گئے، اس میں مثالیت پسندی نظر نہیں آتی یہی وجہ ہے کہ فسادات پر لاہور میں لکھے جانے والے افسانوں میں سندر لال بابو نظر نہیں آتا جو اپنی مغویہ بیوی کو دیوی کا درجہ دے۔ منٹو کا ''کھول دو'' اور شہاب کا ''یا خدا'' اپنوں کے گھناؤنے چہرے تخلیقی صلیب پر لٹکائے ہوئے بلند ہوتا ہے۔

۱۹۴۷ء میں اور اس کے آس، چند ایسے افسانہ نگار بھی ہجرت کر کے لاہور آ گئے کہ جن کا لڑکپن اور جوانی ہندوستان کے گلی کوچوں میں گزرا تھا۔ اس نوع کے افسانہ نگاروں نے ترک شدہ سرزمین کی بازیافت کی۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ہجرت کا موضوع ''جذباتی رویے کی پیداوار ہے'' اور جدا ہونے والے احباب، گلی کوچے، آنگن، پیڑ، پرندے اور آوازوں کی بازیافت کے پس پردہ سیاسی، معاشی اور نفسیاتی عوامل کار فرما ہیں۔ میرے نزدیک ہجرت کے موضوع پر ایسی آرا بے رحم ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم کسی تخلیقی فنکار کو اس بات پر مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے ماضی سے لاتعلق ہو جائے اور مجاہدانہ طرز پر للکارتے ہوئے اپنے گزرے ہوئے کل سے دستبردار ہو جائے۔ افسانے میں ہجرت اور ماضی کی بازیافت کا رجحان اگر ''مریضانہ'' ہے تو پھر ہمیں ''فسانۂ عجائب'' اور اردو کی کئی اور منظوم داستانوں کو ادبی شفا خانے کی میز پر لٹانا پڑے گا۔ صورت حال جو بھی ہو، افسانے کے اس نئے رجحان نے نہ صرف نئی سرزمینوں کو دریافت کیا بلکہ افسانے کی زبان کو نئے لب و لہجے سے بھی ہم کنار کیا۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر ساٹھ کی دہائی تک کا عرصہ، لاہور میں اردو افسانے کا عہد زریں ہے۔ موضوع اور تکنیکی، دونوں سطح پر افسانے نے ایک ہی جست میں صدیوں کا فاصلہ طے کر لیا۔

سرئیل ازم، داداازم، تجریدیت اور مابعد الطبیعاتی موضوعات کی تنقید، (تعارفی تنقید) کا آغاز تو کراچی سے ہوا مگر اردو افسانے میں ان نظریات کی معصوم تلاطم لاہور سے شروع ہوئی۔ اس حوالے سے منٹو کے

افسانے ''پھندنے'' اور ''فرشتہ'' قابل ذکر ہے۔ بہت ممکن ہے کہ منٹو اور محمد حسن عسکری کا وہ ملاپ جس پر احمد ندیم قاسمی نے ایک کھلے خط کی صورت میں احتجاج بھی کیا تھا، اس رجحان کا سبب بنا ہو۔ منٹو کے افسانے ''فرشتہ'' کے بارے میں تو انوار احمد نے یہاں تک کہا: ''انور سجاد، خالدہ حسین، رشید امجد اور مرزا حامد بیگ کی بہت سی کہانیاں ''فرشتہ'' کی کوکھ سے نکلی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔''

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ساٹھ کی دہائی تک اردو افسانے نے ہر طرح کی حقیقت نگاری کے ممکنہ امکانات کو چھو لیا تھا۔ ایسے وقت میں ''آخری آدمی'' کی اشاعت ہوئی۔ انتظار حسین کے اس افسانوی مجموعے نے اسلوب، تکنیک اور موضوع کو بدل کر رکھ دیا۔ انتظار حسین نے اپنے افسانوں کے تمثیلی اور علامتی نظام میں آسمانی صحیفوں، حکایتوں اور روایتوں کو اہمیت دی اور برصغیر کی تاریخ سے علامتوں کا ایک ذخیرہ لے آئے۔ لاہور ہی سے انور سجاد اور مسعود اشعر نے علامتی افسانے کو ترقی دی۔ جبکہ میرزا ادیب، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ، فرخندہ لودھی، غلام الثقلین نقوی اور دیگر چند افسانہ نگاروں نے افسانے میں کہانی اور حقیقت کا رشتہ برقرار رکھا اور سلیم اختر نے باطنی گوشوں کو موضوع بنایا۔

۱۹۷۱ء کی جنگ اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر پوری قوم چپ رہی یا پھر فریب نظر کا کمال ہے کہ چپ کروائی گئی۔ ۱۹۷۱ء کے سانحے نے کوئی بڑا ادب تخلیق نہیں کیا۔ اردو ادب جو وسیع اصناف کا حامل ہے۔ اس حوالے سے نادار دکھائی دیتا ہے۔ لیکن لاہور سے انتظار حسین اور مسعود اشعر نے اس موضوع کے حوالے سے افسانے تحریر کیے۔ ''شہر افسوس'' ''وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے'' ''اندھی گلی'' ''وہ جو کھوئے گئے'' ''ہندوستان سے آخری خط'' انتظار حسین کے وہ افسانے ہیں جو سقوط ڈھاکہ کے المیے کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ سقوط ڈھاکہ سے منسلک شکستہ توقعات کی غارت گری کسی اور صنف ادب نے پیش کی ہو یا نہ کی ہو، افسانے نے یہ کرب اپنے من میں ضرور اتارا۔

ستر یا اسی کی دہائی تک لاہور میں اردو افسانے نے جو رجحانات اختیار کیے، وہ عہد آفریں ثابت ہوئے۔ اردو افسانے میں ابھی تک گزشتہ تجربات کی توسیع دکھائی دیتی ہے۔ لاہور نے اردو افسانے کی روایت کو معتبر بنایا ہے اور رنگا رنگ تجربات اور رجحانات کو جنم دیا ہے۔ اب آنے والا افسانہ نگار یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے ورثے میں کونسی ایسی توانا روایت ملی ہے جس کے بل بوتے پر اردو افسانہ، عالمی افسانے کے مقابل کھڑا ہو سکے۔

لاہور کا جو ذکر کیا

گوپال متل

گوپال متل اردو ادب کے حوالے سے ایک جانا پہچانا نام ہے۔ وہ افسانہ نگار، شاعر اور مترجم تھے۔ وہ ادب میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ بعد میں تحریک کے بڑوں سے ان کے اختلافات پیدا ہوئے۔ حال ہی میں ادارہ "بک ہوم" لاہور نے ان کی کتاب "لاہور کا جو ذکر کیا" شائع کی ہے۔ یہ ایک نہایت دلچسپ کتاب ہے۔ اس میں اپنے معاصرین کے ساتھ ان کی چشمک کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں اور انہوں نے بیشتر مقامات پر ان کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ بہت شائستگی سے ان کی خامیوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ "معاصر" کے قارئین کی دلچسپی کے لیے ہم اس کتاب کے چند حصے "بک ہوم" کے شکریے کے ساتھ یہاں شائع کر رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔ (ادارہ)

ایم حسن لطیفی کی شخصیت انتہائی دلچسپ ہی نہیں بلکہ عجوبہ روزگار تھی۔ یہ صاحب مغرب سے صحافت کی تعلیم حاصل کر کے آئے تھے۔ بہت اچھے شاعر تھے اور علم کی بھی ان کے پاس فراوانی تھی۔ لیکن صحافت کی ڈگری کے ساتھ ساتھ وہ یورپ سے یہ خبط بھی ساتھ لے کر آئے تھے کہ وہ مہدی موعود ہیں۔ وہ تنہا نویسی کے اصول پر ایک پندرہ روزہ پرچہ نکالتے تھے۔ اس میں ان کی نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں اور مضامین بھی۔ اس میں وہ اپنے مہدی ہونے کا پروپیگنڈہ کرتے تھے اور ''نظریہ مہدیت'' کے نام سے انہوں نے ایک کتابچہ بھی لکھا تھا۔ پرچہ پر مقام اشاعت کی جگہ لدھیانے کی بجائے ارض لُد لکھا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ بشارتوں کے مطابق مہدی موعود ارض لُد سے اٹھے گا اور لدھیانہ ہی ارض لُد ہے۔ کتابچے سے ان کا مہدی موعود ہونے کا ثبوت خواہ نہ ملتا ہو لیکن ان کے کثیر المطالعہ ہونے کا ثبوت ضرور ملتا تھا۔ انہوں نے ماضی کی بشارتوں کا سہارا لے کر بڑے پُر پیچ استدلال سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ان کی ذات میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو مہدی موعود میں پائی جانی چاہئیں۔ اپنے دعویٰ مہدویت کی تائید میں وہ اقبال کا یہ شعر بھی استعمال کیا کرتے تھے۔

ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی وہی آخر زمانی

اس سے گمان گزرتا تھا کہ مہدویت ان کے نزدیک وہبی نہیں بلکہ اکتسابی چیز تھی اور ان کے دعوے میں صرف جنون ہی کو دخل نہیں تھا۔ شاید انہوں نے اپنے طور پر ایک چال چلی تھی جو ناکام ہو گئی۔ اسباب خواہ کچھ ہوں نتیجہ خطرناک تھا۔ مہدویت کے پرچار میں ان کی دولت بھی ختم ہوتی گئی اور صحت بھی۔ جب میں ان سے ملا تھا تو وہ دھان پان رہ گئے تھے۔ سنا ہے تقسیم کے بعد وہ پاکستان چلے گئے اس کے بعد خدا ہی جانتا ہے ان کا کیا حشر ہوا۔

ایک تو میں لدھیانے کی آوارگی کی وجہ سے مجرم ضمیری میں مبتلا تھا اور دوسرے ملازمت مجھے بڑی

مشکل سے ملی تھی۔ اس لیے میں نے بڑی محنت سے کام کیا اور جمنا داس اختر تو محنتی ہونے کے لیے مشہور ہیں۔ چنانچہ مالک رام جی کا کام نہ کرنا ہمیں کھلتا نہیں تھا۔ دھرم ویر کی ہمدردیاں دین دیال بھاٹیہ کے ساتھ تھیں اور دین دیال بھی ہر مشکل میں ان کے آڑے آجاتے تھے، خبروں کے شعبے کے انچارج چونکہ دین دیال ہی تھے اس لیے ''دھرم ویر'' سیاں بنے کوتوال اب ڈر کاہے کا کے اصول پر عمل کرنے لگے تھے۔ اس سلسلے میں ایک بار ان سے ایک ایسی کوتاہی سرزد ہوئی جس کے باعث اخبار قبل از وقت ہی مر گیا۔ ان دنوں وہ رات کی ڈیوٹی پر تھے۔ اخبار کی پہلی سرخی عام طور پر اس طرح قائم کی جاتی تھی کہ کسی بڑے لیڈر کے بیان کا اہم حصہ واوین میں دے کر آگے یہ لکھ دیا جاتا کہ فلاں لیڈر کا تازہ بیان۔ اس رات گاندھی جی کے بیان کو نمایاں کیا جانا تھا۔ کاتب سے ان کی تحریر پڑھی نہ گئی تو اس نے پوچھا۔ ''یہ کیا لکھا ہے؟ دھرم ویر نے ترنگ میں کہہ دیا'' اب لکھ دے مہاتما گاندھی کی تازہ بکواس۔'' بیگانہ، عاقبت کاتب نے یہی لکھ دیا اور سرخی اسی طرح چھپ گئی۔ بعد میں اخبار کے پہلے صفحے پر کئی دن تک معافی نامہ چھپتا رہا۔ لیکن لوگ یہ سمجھتے رہے کہ ہندو سبھائی اخبار ہے اس لیے اس نے گاندھی جی کی توہین عمداً ہی کی ہو گی۔

اخبار کی کامیابی کے امکانات پہلے بھی کچھ زیادہ روشن نہیں تھے لیکن اس حادثے نے تو اس کی کمر ہی توڑ دی۔

ادبی حلقوں کے ساتھ میرا ربط ضبط بڑھ رہا تھا۔ احسان دانش نے میرا تعارف مولانا تاجور سے، جنہیں بعد میں شمس العلما، کا خطاب ملا، کرایا۔ غالباً تیسری یا چوتھی ملاقات میں مولانا نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ان کے ادبی جریدے ''شاہکار'' کی ادارت سنبھال لوں۔ یہ پیش کش میرے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھی اور میں نے اسے شکر گزاری کے ساتھ قبول کر لیا۔

''شاہکار'' میں میری تنخواہ صرف تیس روپے تھی لیکن دفتر میں میرے لیے باقاعدہ حاضری ضروری نہیں تھی۔ میری ذمہ داری صرف اتنی تھی کہ پرچہ مرتب کر کے اسے بروقت شائع کر دوں۔ ''شاہکار'' کے بیشتر مضمون نگار ایسے تھے جن کی تحریروں پر نظر ثانی کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ خانہ پری کے لیے ہر وقت ابو محمد امام الدین رام نگری کے مضمون موجود رہتے تھے جو آٹھ آنے فی صفحہ کے حساب سے چھپتے تھے۔ ان دونوں حضرات کے بھیجے ہوئے بیشتر مضامین ہندی جرائد سے ترجمہ شدہ ہوتے تھے۔ ان کی طرف سے یہ اجازت بھی تھی کہ یہ مضامین کسی اور نام سے شائع کیے جا سکتے ہیں۔ اگر کسی ماہ مضامین کی قلت ہوتی تو ان حضرات کے متعدد مضامین مختلف ناموں سے شائع کر دیے جاتے۔ جن ناموں سے مضامین چھپتے وہ زیادہ تر فرضی ہوتے لیکن کئی بار ایسا بھی ہوا کہ مولانا تاجور نے کسی کو نوازنا چاہا تو مضمون اس کے نام پر شائع کر دیا۔ ادارتی نوٹ مختصر کے عنوان سے مولانا خود لکھا کرتے تھے لیکن مجھے ہدایت تھی کہ اگر بروقت یہ مجھے نہ ملیں تو میں خود ہی لکھ دیا کروں۔

مولانا وضع لے کے آدمی تھے، اور ظاہر ہے، کہ ایسا آدمی دوستوں کے ساتھ دشمن بھی بناتا ہے اور دشمن

دوستوں سے زیادہ با اصول اور سرگرم ہوتے ہیں۔ ان کے سب سے بڑے حریف حفیظ جالندھری تھے، اور ان دونوں میں ہمیشہ چپقلش رہتی۔ لاہور کے تقریباً سبھی ادیب اور شاعر ان میں سے کسی ایک کے دوست اور دوسرے کے دشمن تھے۔ میں ان معدودے چند لوگوں میں سے تھا جن کے ان دونوں کے ساتھ دوستانہ مراسم رہے، یاد پڑتا ہے کہ جب میں نے ''شاہکار'' کی ملازمت اختیار کی تو اس کے بعد پہلی ہی ملاقات میں حفیظ نے پوچھا تھا ''تم وہاں بیٹھ کر میری برائی کرتے ہوگے؟'' جواب میں میں نے کہا تھا۔ ''کیا کبھی میں نے تمھارے سامنے تاجور کی برائی کی ہے؟'' میرے اس جواب نے انہیں مطمئن کر دیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ میں نے یہ اصول بنائے رکھا کہ ان کی باہمی چپقلش سے الگ رہ کر دونوں ہی کے ساتھ اپنے نیاز مندانہ تعلقات قائم رکھوں۔

فلمی جرائد میں یہ عام رواج ہے کہ افسانے اور نظمیں وغیرہ ادبی جرائد سے بے تکلف نقل کر لی جاتی ہیں۔ ''جگت لکشمی'' میں بھی یہی ہوتا تھا اور ادیبوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ الٹا خوش ہوتے تھے کہ انہیں مزید شہرت مل رہی ہے۔ کرشن چندر میرے دوست تھے ان کا ہر افسانہ میں ''جگت لکشمی'' میں نقل کر دیا کرتا تھا۔ ایک بار انہوں نے قبر کے عنوان سے افسانہ لکھا، میں نے اس افسانے کو سچی کہانی کے نام سے شائع کر دیا اور کچھ ضمنی عنوان بھی قائم کر دیئے۔ جس روز ''جگت لکشمی'' کا یہ شمارہ شائع ہوا اس کے دوسرے تیسرے دن کرشن چندر اور کنھیا لال کپور سے ملاقات ہوئی تو کپور بُری طرح برہم تھے۔ ہوا یہ تھا کہ کرشن چندر نے کہانی میں ان کے ہی نہیں بلکہ ان کے گاؤں کا نام بھی لکھ دیا تھا۔ یہ کہانی سچی کہانی کے نام سے شائع ہوئی تو پروفیسر صاحب کی ان کے رشتہ داروں اور جاننے والوں میں کافی رسوائی ہوئی۔ بہرحال کپور کا غصہ دیرپا نہیں تھا، اور وہ جلد ہی راضی ہو گئے۔ کہنے لگے، کہ جب میں نے یہ پرچہ دیکھا تو پہلے جی میں آئی کہ اس کی تمام کاپیاں خرید کر جلا ڈالوں۔ لیکن پھر سوچا کہ اس سے ''جگت لکشمی'' کو الٹا فائدہ پہنچے گا، مقدمے کی سوجھی تو خیال آیا کہ اور رسوائی ہوگی تمہیں پیٹ اس لیے نہیں سکتا کہ مجھ سے طاقتور ہو، لہٰذا معاف ہی کیے دیتا ہوں۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک مرتبہ کرشن چندر نے موپساں کے ایک افسانے کی مجھ سے بڑی تعریف کی تھی۔ اس کا پلاٹ کچھ اس قسم کا تھا کہ مہاجرین کا ایک قافلہ سرحد عبور کرنا چاہتا ہے۔ لیکن سرحد پر جو افسر متعین ہے، وہ قافلے کو سرحد پار کرانے کی قیمت طلب کرتا ہے۔ قیمت یہ کہ قافلے کی ایک لڑکی اپنی عزت اسے دے دے۔ قافلے والے ایثار اور قربانی کے نام پر لڑکی کو ایسا کرنے پر آمادہ کر لیتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی سرحد پار ہو جاتی ہے، وہ اس ''آبرو باختہ'' لڑکی سے حقارت کا سلوک شروع کر دیتے ہیں۔ میں اور کرشن چند کئی دن تک اس افسانے کا ذکر کرتے رہے۔ پھر بات آئی گئی ہوگئی، لیکن ایک دن کرشن چندر نے مجھے اپنا تازہ افسانہ سنایا جس کا عنوان غالباً ''پنڈارے'' تھا۔ اس کے اور موپساں کے افسانے کے پلاٹ میں نمایاں مشابہت تھی۔

دیوندر ستیارتھی اس سلسلے میں ایک بار بے قصور ہی مارے گئے۔ ان کی یہ دیرینہ عادت ہے کہ وہ دوستوں کی بات چیت میں سے افسانے کا پلاٹ ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس کی تشکیل کے معاملے میں

بھی جہاں کہیں سے ممکن ہو استفادہ کرنے سے گریز نہیں کرتے، ان کی اس عادت کے پیش نظر کنھیا لال کپور، ہنس راج رہبر اور پرکاش پنڈت نے ان کے خلاف ایک ایسی سازش کی جس نے انہیں بری طرح رسوا کیا۔

ایک دن علی الصبح ستیارتھی، کنھیا لال کپور کے گھر پہنچے تو کپور نے چائے وغیرہ سے ان کی خاص طور پر تواضع کی اور چائے نوشی کے دوران میں برسبیل تذکرہ یہ بھی کہا کہ رات ان کے ذہن میں ایک پلاٹ آیا ہے اگر وہ افسانہ نگار ہوتے تو ضرور افسانہ لکھتے۔ ستیارتھی کے اصرار پر انہوں نے بتایا کہ پلاٹ کچھ اس قسم کا ہے کہ ایک کوچوان کا نوجوان لڑکا مر جاتا ہے وہ غم کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کسی ہمدرد کی تلاش میں ہے جو اسے نہیں ملتا، ستیارتھی یہ سن کر پھڑک اٹھے اور افسانہ لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ وہاں سے اٹھ کر ستیارتھی، پرکاش پنڈت سے ملے۔ اس نے بھی ان کی خوب آؤ بھگت کی اور سرسری طور پر پوچھا کہ کیا کوئی نیا افسانہ لکھ رہے ہو۔ ستیارتھی نے پلاٹ کا ذکر کیا تو پرکاش پنڈت کہنے لگے کہ پلاٹ تو خوب ہے، اسے آگے بڑھانا بھی کچھ مشکل نہیں مثلاً یہ کہ کوچوان اپنے بیٹے کی موت کا ذکر اپنے تانگے کی سواریوں سے کرنا چاہتا ہے لیکن وہ اس بات پر توجہ نہیں دیتیں۔ سوال افسانے کے اختتام کا رہ جاتا ہے، یعنی یہ کہ کوچوان اپنا غم کسے سناتا ہے اور اس کا ہمدرد کون بنتا ہے، ظاہر ہے کہ افسانہ تم لکھ رہے ہو میں نہیں، اس لیے اختتام تمہیں کو ڈھونڈنا ہوگا۔

شام کو ستیارتھی نے کنھیا لال کپور اور پرکاش پنڈت سے حاصل کردہ مواد ہنس راج رہبر کو سنایا اور اختتام پر بحث ہونے لگی۔ رہبر دریائے فکر میں ڈوب گئے اور پھر یکا یک پکارے کہ موتی انہیں مل گیا ہے۔ کوچوان اپنا غم گھوڑے کے کان میں کہتا ہے۔ ستیارتھی پھڑک اٹھے اب افسانہ مکمل ہو گیا اور صرف اسے لفظوں کا جامہ پہنانا باقی تھا جو ان کے لیے چنداں دشوار نہیں تھا۔

افسانہ لکھ کر ستیارتھی نے مجلس ارباب علم میں سنایا، جہاں لکھنے والوں کی بری طرح گت بنتی تھی۔ انہوں نے افسانہ ختم کیا ہی تھا کہ چاروں طرف سے ان پر چوری کا الزام لگنے لگا۔ ستیارتھی نے قدرتی طور پر زور سے احتجاج کیا، لیکن اعتراض کرنے والوں نے ثابت کر دیا کہ جس افسانے کو انہوں نے اپنا کہہ کر سنایا ہے وہ دراصل چیخوف کی تصنیف ہے۔ ستیارتھی سمجھ گئے کہ انکے دوستوں نے انکے ساتھ زیادتی کی ہے' وہ چور نہ سہی لیکن چوری کا مال برآمد تو انہی کی جھولی سے ہوا تھا۔

جلسہ گاہ سے باہر نکلے تو ستیارتھی کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ اپنا غصہ کس پر اتاریں؟ کپور مزاح ہی نہیں بلکہ بڑی بھلی تنقید بھی لکھتے تھے۔ ویسے بھی وہ کارآمد تھے۔ لہٰذا انہیں معافی دے دی گئی۔ پرکاش پنڈت کی افادیت کچھ زیادہ نہ سہی لیکن وہ منہ پھٹ بہت تھے۔ ایک کی دو سناتے لہٰذا ان کے معاملے میں بھی درگزر ہی سے کام لیا گیا۔ اب لے دے کے ہنس راج رہبر رہ جاتا تھا، نزلہ برعضو ضعیف می ریزد کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے ستیارتھی نے انہی کے گھر کا رخ کیا۔ رہبر کے وہ اڑھائی روپے کے مقروض تھے۔ غالباً اس سے کمیونسٹ پارٹی کا لٹریچر خریدتے رہے تھے۔ جاتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اڑھائی روپے کا یہ قرض ادا کر دیا اور اس طرح اپنی

مساویانہ حیثیت قائم کرنے کے بعد اپنا سارا غصہ ان پر جھاڑ کر واپس آگئے۔

ستیارتھی اور دوسرے افسانہ نگاروں میں چپقلش ہوتی رہتی تھی۔ منٹو اور اپندر ناتھ اشک نے ستیارتھی کے خلاف افسانے لکھے اور ستیارتھی نے ان کے خلاف۔ اس میں صرف معاصرانہ چشمک ہی کو دخل نہیں تھا بلکہ اس میں ایک دوسرے کی عادت سے نفرت بھی شامل تھی، ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔

منٹو اپنی بیوی کے ساتھ مکتبہ اردو میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اتفاق سے میں اور دیوندر ستیارتھی بھی وہاں پہنچ گئے، منٹو کی گفتگو بہت دلچسپ ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ کافی دیر تک بات چیت ہوتی رہی، میں اس کے حسن نگارش کا مداح تھا' اس لیے بولنے کا زیادہ موقع میں نے اسی کو دیا۔ اگرچہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ گفتگو یک طرفہ تھی۔ ادھر ستیارتھی کی ساری توجہ مسز منٹو پر مرکوز تھی۔ وہ اسے ہر زاویے سے دیکھ رہے تھے اور رابطہ، ہمکلامی قائم کرنے میں کوشاں تھے۔ اسے ان کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ ہوں ہاں کر کے ہی ٹالتی رہی۔

منٹو کی بے باکی کے قصے بہت مشہور ہیں اور ان کے بعض نوجوان مداح تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر کوئی لڑکی انہیں بھائی کہہ کر مخاطب کر لیتی تو وہ فوراً ہی اس کی چولی کا نمبر پوچھ لیتے، لیکن ستیارتھی کا رویہ انہیں سخت ناگوار ہوا، بعد میں مجھ سے اس کی ایٹی کیٹ سے ناواقفیت کی شکایت کرتے رہے اور میری خوش اطواری کی بڑی تعریف کی۔

ستیارتھی کے خلاف لطیفے گھڑنے میں ادیب واقعی ریاض کرتے تھے۔ ایک بار جب انہوں نے داڑھی منڈوادی تو یہ مشہور کر دیا گیا کہ داڑھی ستیارتھی نے منڈوائی نہیں بلکہ ان کی فراڈیت سے نالاں کسی شخص نے مونڈ ڈالی ہے۔ ایک صاحب تو اس موضوع پر افسانہ بھی لکھنا چاہتے تھے لیکن اپنی کاہلی کے سبب اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔

لکھنے والوں کو اکثر اپنی صلاحیتوں کا مبالغہ آمیز احساس ہوتا ہے اور وہ اس واہمے میں مبتلا ہوتے ہیں کہ دنیا نے ان کی ایذا رسانی کے لیے کوئی سازش کر رکھی ہے۔ جو ناکام ادیب غیر مسلم ہوتے ہیں، انہیں اپنی ناکامی میں مسلمانوں کی سازش نظر آتی ہے۔ مسلمان ادیب اپنی ناکامی کا باعث فرقہ پرستی تو قرار نہیں دے سکتے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کچھ کم ستائی زمانہ ہوتے ہیں۔ جو شاعر اور ادیب ادبی مراکز سے دور ہوتے ہیں انہیں اکثر یہ شکایت لاحق رہتی ہے کہ مرکز والے ان کے خلاف مصروف سازش ہیں اور انہیں ابھرنے کا موقع نہیں دیتے۔ جیسے جیسے دوسروں کی خوئے ایذا رسانی پر عقیدہ پختہ ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اپنی عظمت کا احساس بھی قوی تر ہوتا جاتا ہے۔

مزاح گو احمق پھپھوندوی، جو اپنے سنجیدہ کلام میں احمد تخلص کرتے تھے، پنجابیوں کی صوبہ پرستی سے بہت نالاں تھے اور خلوص دل سے یہ سمجھتے تھے کہ اقبال کی غیر معمولی شہرت پنجابیوں کی صوبہ پرستی ہی کا کرشمہ ہے۔ ایک مرتبہ وہ ''شاہکار'' کے دفتر تشریف لائے تو مکتبہ اردو لاہور سے بہت نالاں تھے جو ان کے خیال میں

صرف پنجابی اہل قلم کی تصانیف ہی شائع کرتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ بات حقائق کے منافی ہے کیونکہ مکتبہ، اردو نے بہار اور یو، پی کے کئی اہل قلم کی کتابیں شائع کی تھیں اور جوش ملیح آبادی کا تو اس نے پورا اسیٹ شائع کیا تھا جس میں ان کی ابتدائی تصنیف ''روح ادب'' بھی شامل تھی۔ گفتگو چونکہ احمق صاحب اور مولانا میں ہو رہی تھی، اس لیے میں خاموش رہا، لیکن شام کو جب مکتبہ کے مالک چودھری برکت علی سے ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں میں نے احمق صاحب کی برہمی کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کی۔ پتہ چلا کہ ان کی نظموں کا مجموعہ اشاعت کے لیے موصول ہوا تھا جو انہیں لوٹا دیا گیا۔ اس میں صوبائی تعصب کو کوئی دخل نہیں تھا بلکہ چودھری صاحب جو مجلس احرار سے تعلق رکھتے تھے ذاتی طور پر احمق صاحب کے مداح بھی تھے، لیکن ایک پبلشر کی حیثیت سے وہ یہ جانتے تھے کہ احمق صاحب کا کلام مشاعروں اور کانگرس کے جلسوں میں داد تو وصول کر سکتا ہے چھپ کر بک نہیں سکتا اور پبلشر کسی کتاب کو کارِ خیر سمجھ کر شائع نہیں کرتا۔

بہر حال جہاں تک ہندو شاعروں کے احساس مظلومی کا تعلق ہے، یہ رائیگاں نہیں گیا۔ ملک تقسیم ہوا تو ہندوستان میں اُردو کی حالت ابتر ہوگئی۔ مظلوم ہندو شاعروں نے اب یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ ہندوستان میں اُردو کی پسپائی کا سبب یہ ہے کہ مسلمان اہل قلم ان کے کمال کو تسلیم نہیں کرتے۔ بطور تلافی ان کی پذیرائی شروع ہوئی اور سلسلہ یہاں تک پہنچا کہ عرش ملسیانی اور جگن ناتھ آزاد کو صرف شاعر ہی نہیں بلکہ بڑا شاعر تسلیم کر لیا گیا۔ کہتے ہیں

خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما در آں باشد

میری ان کی ملاقات کی ابتدا نوک جھونک سے ہوئی۔ مجھے ان دنوں نزلہ اکثر رہتا تھا۔ کسی نے مجھے بہکا دیا کہ دائمی نزلے کا تیر بہدف علاج کسی مشہور ڈاکٹر نے یہ بتایا ہے کہ آدمی سر پر پگڑی باندھنے لگے۔ میں نے اس نسخے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہی دنوں عرب ہوٹل میں میری آمد و رفت شروع ہوئی، دوسرا تیسرا دن تھا کہ حسرت صاحب نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا کر کہا ''جوتشی جی! ذرا میرا ہاتھ تو دیکھ دیجئے۔'' میں نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور چند منٹ غور سے دیکھنے کے بعد جواب دیا ''حسرت صاحب میں مجبور ہوں، آپ نے تو کثرت استعمال سے اپنے ہاتھ کی لکیریں ہی مٹا ڈالی ہیں''۔ عرب ہوٹل کے قلندر غالب کے طرفدار سہی لیکن سخن فہم بھی تھے۔ میرے فقرے پر اس زور کے قہقہے پڑے کہ چھت ہل گئی۔ خود حسرت صاحب نے بھی بات کا مزہ لیا اور اس کے بعد ان کی میری اچھی خاصی دوستی ہوگئی۔

عبد المجید بھٹی کا دفتر عرب ہوٹل کے پاس ہی تھا۔ پہلے وہ بچوں کی نظمیں لکھا کرتے تھے، ان دنوں بالغانہ نظمیں لکھنے لگے تھے۔ وہ عرب ہوٹل میں بھی بیٹھتے تھے اور کبھی کبھی لاؤ لشکر کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ مادی طور پر خوشحال نہیں تو ہم سب کے مقابلے میں آسودہ تر ضرور تھے۔ دوستوں کی دعوتیں کرنے میں فیاض تھے اور بہت مرنجاں مرنج اور خلیق واقع ہوئے تھے، شاید ان کے ضبط کا امتحان لینا مقصود تھا۔ کچھ لوگ ان پر موقع بے

موقع فقرے کستے رہتے تھے لیکن ان کی پیشانی پر بل نہیں آتا تھا اور ہر فقرہ وہ خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتے تھے۔ شروع شروع میں وہ جواب نہیں دیتے تھے پھر ہنسی مذاق میں دوسروں کا ساتھ بھی دینے لگے۔

عرب ہوٹل کے حاضر باشوں میں ایک انتہائی دلچسپ شخصیت باری علیگ کی تھی جو خود کو اشترا کی ادیب لکھتے تھے۔ اصلی نام غالباً عبد الباری تھا۔ اشترا کی بنے تو عبدیت پرسے ان کا ایمان اٹھ گیا اور صرف باری رہ گئے۔ ''کمپنی کی حکومت'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو کئی بار چھپی۔ کچھ کتابچے بھی انہوں نے لکھے تھے اور مختلف اخباروں میں بھی کام کرتے رہے تھے۔ بڑے ہی آزاد خیال اور قلندر صفت آدمی تھے۔ جب وہ ''شہباز'' میں کام کرتے تھے تو کچھ دوستوں نے کہا کہ اگر وہ پینٹ اتار کر ''شہباز'' کے دفتر سے عرب ہوٹل تک ہو آئیں تو ایک شاندار دعوت ہوگی۔ باری واقعی تیار ہو گئے اور جو کہا تھا کر گزرے۔ اس کا طریقہ انہوں نے یہ اختیار کیا کہ چلتے چلتے سینہ کوبی کرتے جاتے تھے اور یا علی یا علی کے نعرے بھی لگاتے جاتے تھے۔ راہگیروں نے مجذوب سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور وہ شرط جیت گئے۔

سیاسی بحث میں قلندروں کے درمیان تلخی پیدا ہوتے کبھی نہیں دیکھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ وہ اپنے محدود دائرے سے باہر کی ہر چیز کو غیر حقیقی سمجھتے تھے۔ اگر کبھی کوئی ناواقف آداب قلندری محفل میں آ دھمکتا اور کسی بات پر مشتعل ہو اٹھتا تو رنگ محفل دیکھ کر اس کی طبیعت از خود اعتدال میں آ جاتی تھی۔ احسان دانش کے ایک شاگرد نے موچی دروازے کے پاس ''منزل'' کے نام سے ایک ریسٹوران کھول رکھا تھا۔ کبھی کبھی قلندروں کا قافلہ ادھر بھی جا نکلتا۔ ایک دن محفل وہاں بجی ہوئی تھی اور حسب معمول دنیا کی ہر چیز کا مذاق اڑایا جا رہا تھا کہ یکا یک ایک نوجوان پاس کی میز سے اٹھا اور خالی کرسی پر بیٹھ کر جوتوں سمیت اپنے دونوں پاؤں قلندروں والی میز پر دے مارے۔ وہ خاکسار تحریک میں نیا نیا شامل ہوا تھا اور یہ دیکھ کر اسے بڑا اشتعال آیا تھا کہ یہ لوگ سیاسی راہنماؤں کا ذکر اس بے حرمتی سے کر رہے ہیں۔ چھوٹتے ہی کہنے لگا ''تم کفر بک رہے ہو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔'' اس سے پوچھا گیا کہ آخر اسے یہ یقین کیوں ہے کہ وہ قاتل ہی ہوگا، مقتول نہیں۔ تو بولا'' میں سچا مسلمان ہوں اگر قتل ہوا بھی تو جنت میں جاؤں گا۔'' اس مرحلے پر میری رگ ظرافت پھڑ کی اور ملتجیانہ انداز میں اس سے کہنے لگا۔ ''صاحب اس عمر میں جنت میں نہ جانا، جنتی کہیں آپ کو غلمان نہ بنالیں۔'' اس فقرے پر قلندروں کا جو حال ہوا وہ تو ظاہر ہے لیکن اس نوجوان کا ردعمل بھی مزید اشتعال کی بجائے عجوب سی ہنسی میں ظاہر ہوا۔ کوئی تین یا چار ہفتے کے بعد مجھے انار کلی میں ملا تو بالکل بدلا ہوا تھا۔ بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور راز دارانہ انداز میں کہنے لگا ''مفتی صاحب میں نے وہ سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ اب میں شراب پیتا ہوں، گانا سنتا ہوں۔ یہ میں نے بار ہا دیکھا ہے کہ انتہا پسند طبائع جب ایک انتہا پسندانہ روش کو خیر باد کہتی ہیں تو فوراً ہی وہ دوسری انتہا پر پہنچ جاتی ہیں۔ کیا انسان بنیادی طور پر کبھی بدلتا ہی نہیں؟''

مادی اعتبار سے کامیاب ترین شاعر حفیظ جالندھری تھے وہ ''شاہنامہ اسلام'' لکھ کر معززین کی صف

میں شامل ہو گئے تھے، اور اپنی کوٹھی بھی بنالی تھی۔ لیکن اپنی اس کامیابی پر غرہ کرتے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ دوستوں سے دوستوں ہی کی طرح ملتے اور اپنے معزز ہونے کا احساس زائل کرنے کے لیے اکثر ضلع جگت پر بھی اتر آتے۔ شعر بھی وہ بدستور محنت سے کہتے تھے، اور ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا'' کے مقولے پر عمل پیرا نہیں تھے۔

قلندر ان سے بہر حال نالاں تھے اور اکثر یہی سمجھا جاتا تھا کہ ان کی کامیابی میں صرف ان کی خوش گلوئی کو دخل ہے۔ اس عام غلط فہمی سے جس شاعر کو فائدہ پہنچا وہ احسان دانش تھے۔ احسان دانش خوش گلو تھے، بیحد محنتی تھے اور فقیرانہ وضع رکھتے تھے۔ کافی دنوں تک وہ محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے رہے تھے اور خود کو مزدور شاعر لکھتے تھے۔ خوش گلوئی کے سوا باقی تمام باتوں میں وہ حفیظ جالندھری کی ضد تھے۔ اس طرح وہ ان تمام لوگوں کے لیے جو ناکامی کو مستحسن اور کامیابی کو ایک طرح کا جرم سمجھتے تھے، ہیرو بن گئے اور مشاعروں میں انہیں حفیظ کے مقابلے میں انتقاماً داد دی جانے لگی، حفیظ کے پرانے رقیب مولانا تاجور بھی احسان دانش کی مدد کو آگے بڑھے اور میزان میں بھی انہیں احسان کا پلڑا بھاری نظر آنے لگا۔

ایک مرتبہ دوپہر کے وقت میں اپنے گھر لیٹا ہوا تھا کہ کرشن اشر نے آ کر کہا کہ نیچے اختر شیرانی آپ کا انتظار کر رہے ہیں' نیچے گیا تو تانگے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے آؤ چلیں۔ میں نے کہا اوپر جا کر کپڑے بدل آؤں۔ کہنے لگے نہیں ایسے ہی چلو۔ میں ان کی بات کو کم ہی ٹالتا تھا، تانگے میں بیٹھ گیا۔ جب تانگہ آدھ گھنٹے کے قریب چلتا رہا تو میں نے پوچھا کہ آخر کہاں جانا ہے؟ تانگہ رکواتے کیوں نہیں؟ بولے پیسے جو نہیں۔ میں نے کہا۔ اختر صاحب جب میں نے کپڑے بدلنے کی بات کہی تھی تو مطلب یہی تھا کہ کچھ پیسے لے لوں۔ آپ کے انکار سے میں سمجھا کہ ضرورت نہیں۔ بہر حال تانگہ اس وقت انارکلی میں سے گزر رہا تھا۔ وہاں میرے ایک عزیز کی دوکان تھی میں نے اس سے پندرہ روپے ادھار لیے۔ تھوڑے ہی فاصلہ پر ''ملاپ'' کا دفتر تھا۔ اچانک اختر کی نظر زبیر پر پڑ گئی، زبیر انہیں اپنے دفتر لے گئے اور جب وہ واپس آئے تو ان کی جیب میں دس روپے کا نوٹ تھا لیکن شام تک یہ سب روپے خرچ ہو چکے تھے، جو بھی ملا اختر نے اس کی دعوت کر ڈالی۔

اختر بلانوش بھی تھے آوارہ گرد بھی، لیکن طبعاً انتہائی شریف تھے۔ میں نے ان کی زبان سے کسی خاتون کے لیے نازیبا کلمہ کبھی نہیں سنا اور ان کے عشق کی داستانیں بھی اکثر قیاسی ہیں۔ سلمیٰ، عذرا، ریحانہ ایک شاعر کے ذہنی ہیولے تھے۔ بہت ممکن ہے کہ ان کا پرتو اختر نے کہیں دیکھ لیا ہو لیکن وہ پوری طرح مادی طور پر متشکل کبھی نہیں ہوئے۔ اختر، تصوف کی شاعری کے سخت خلاف تھے، اور ایک مرتبہ ان کے مجموعے میں سے میں نے تصوف کا ایک شعر ڈھونڈ نکالا تھا تو مجھ سے سخت برہم ہوئے تھے لیکن محبت کی جسمانیت کے وہ ذرا قائل نہیں تھے ان کی شاعری سے محبت کا جو پہلو ابھرتا ہے وہ اس کی الوہیت کا ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت وہ نظم ہے جو انہوں نے ''ایک شاعرہ کی شادی پر'' لکھی ہے۔ اس نظم میں شکایت یہ نہیں ہے کہ وہ اختر کی بجائے کسی اور کی ہوگئی بلکہ انہیں غم اس بات کا ہے کہ شاعرہ ایسی مظہر شخصیت جسمانی محبت میں آلودہ ہوگئی۔

ظلمت حرص و ہوس حور کو بہکا ہی گئی
تیرے بستر پہ بھی آخر کو شکن آ ہی گئی

میں نے اختر کو اچھی بری ہر جگہ دیکھا ہے۔ طوائف کے کوٹھے پر بھی میں نے انہیں کبھی ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہوتے نہیں دیکھا۔ اگر بہت زیادہ پیے ہوتے تو اس کا ہاتھ سینے سے لگا کر رونا شروع کر دیتے۔ ایسے موقعوں پر یہ مصرعہ اکثر ان کے ورد زبان ہوتا تھا۔

کیسے خانہ خراب ہیں ہم لوگ

میں شاعروں کے ساتھ بالعموم شراب نہیں پیتا تھا۔ اختر شیرانی کے ساتھ تو ایک دو بار شریک جام ہوا بھی۔ لیکن قریبی دوستی اور انتہائی موانست کے باوجود عدم کے ساتھ مے نوشی میں شرکت میں نے کبھی نہیں کی۔ شراب دیکھتے ہی ان پر ایک ایسی وارفتگی طاری ہو جاتی تھی کہ وہ ہر حزم و احتیاط کو بالائے طاق رکھ دیتے تھے۔ میری اپنی زندگی جس نہج پر بسر ہو رہی تھی اس میں تھوڑا بہت رکھ رکھاؤ ضروری تھا اور کھل کھیلنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اپنے اور ان کے درمیان ایک محدود سا فاصلہ میں نے ہمیشہ رکھا۔ انہوں نے بھی اس علم کے باوجود کہ میں زاہد خشک نہیں ہوں مجھے اپنے ساتھ پینے کے لیے کبھی مجبور نہیں کیا۔

ایک مرتبہ شراب کے لیے مضطرب تھے اور حصول کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ میری جیب میں پیسے نہیں تھے۔ لیکن گھر پر شراب کی نصف بوتل موجود تھی۔ میں انہیں یہ کہہ کر اپنے ساتھ لے گیا کہ میرے وعدے کو نصف سمجھنا۔ گھر پر مہمان آئے ہوئے ہیں۔ اس لیے شراب لے کر دروازے سے میں باہر نہیں نکل سکتا، کھڑکی سے نیچے گرا دوں گا۔ اگر تم اچک لینے میں کامیاب ہو گئے تو تمہاری ورنہ دھرتی کی، یہ حادثہ پیش آئے تو شور نہ مچانا اور چپ چاپ چلے آنا۔ عدم خلوص سے وعدہ کر کے میرے ساتھ ہو لیے لیکن جیسے ہی میرا ہاتھ باہر نکلتا ہوا نظر آیا وہ بے قابو ہو گئے اور زور سے چلائے "نقل صاحب ذرا احتیاط سے، بوتل ٹوٹ گئی تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ ان کی پکار گھر والوں نے بھی سن لی۔ پردہ فاش ہو چکا تھا۔ اب احتیاط غیر ضروری تھی میں نے کہا "عدم صاحب اب وعدہ نصف نہیں رہا میں آپ کے لیے بوتل نیچے لے کر آ رہا ہوں۔

مولانا ظفر علی خاں کے زور قلم کے دوست دشمن سبھی مداح تھے۔ انہیں نظم اور نثر دونوں پر کامل دسترس حاصل تھی اور معرکہ آرائی میں ادیبوں اور صحافیوں کا متحدہ محاذ بھی ان کے مقابلے میں ناکام رہتا تھا۔ غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک نے جب "زمیندار" سے الگ ہو کر "انقلاب" نکالا اور ان دونوں اخباروں میں معرکہ آرائی شروع ہوئی تو جہاں "انقلاب" کی طرف سے دونوں مدیروں کے علاوہ لاہور کے ادیبوں کا مشہور طائفہ نیاز مندان لاہور بھی تیر اندازی میں مصروف تھا۔ وہاں "زمیندار" کی جوابی کارروائی تنہا ظفر علی خاں ہی کرتے تھے۔ لیکن دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ معرکہ میں پلڑا اکیلے ظفر علی خاں کا بھاری تھا۔ اس معرکے کے دوران میں جب ظفر علی خاں نے یہ کہا تھا کہ ان کا اکیلا "نقل"، "انقلاب" کی ساری پتنگوں سے لڑے گا تو یہ صرف تعلی نہیں تھی، لیکن

ظفر علی خاں کا قلم صرف صحافیوں حریفوں کی پتنگوں سے نہیں لڑا، وہ سیاست کے میدان میں بھی ہر کسی سے لڑے، پنجاب ہی نہیں ہندوستان بھر میں ایسی کوئی سیاسی پارٹی یا شخصیت نہیں تھی جو ان کے وار سے محفوظ رہی ہو، عجیب اتفاق یہ ہے کہ انہی کے قلم سے ان سیاسی پارٹیوں اور شخصیتوں کی مدح بھی رقم ہوئی۔ ان کا قلم کسی سیاسی منصوبہ بندی کے تحت نہیں بلکہ جذبات کے وقتی جوش کے بل پر چلتا تھا۔ خوش ہوئے تو تعریف کر دی خفا ہوئے تو ہجو لکھ ڈالی۔ چراغ حسن حسرت نے اپنی مزاحیہ تصنیف "پنجاب کا جغرافیہ" میں ظفر علی خاں کو ایک ایسے دریا سے تشبیہ دی تھی جو اپنا ساحل متواتر بدلتا رہتا ہے۔ جس دریا میں مسلسل طغیانی رہتی ہو اس سے اور امید بھی کیا ہو سکتی تھی۔

ترقی پسند ادب کا غلغلہ لاہور میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے فوراً بعد شروع ہو گیا تھا جو 1936ء میں لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس حلقے کے، جو نیاز مندان لاہور کے نام سے مشہور تھا، ایک ممتاز رکن پروفیسر محمد دین تاثیر ترقی پسند ادب کی تحریک کے اولین داعیوں میں سے تھے۔ تحریک کا پہلا منشور جو لندن سے شائع ہوا اس پر سجاد ظہیر اور ان کے چار پانچ دوسرے رفقاء کے ساتھ تاثیر کے دستخط بھی تھے۔ جو ان دنوں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے ہوئے تھے، منشور پر ان کے دستخط دیکھ کر نیاز مندان لاہور کے ادبی حلقے کے کچھ پرانے رکن اور کچھ نئے وابستگان "جو نیت امام کی وہی ہماری" کا نعرہ بلند کر کے ترقی پسند ادب کا کلمہ پڑھنے لگے۔ نظریے کے بلند آہنگ مبلغ چراغ حسن حسرت تھے۔ جواب اسلام کے ساتھ ساتھ ترقی پسندی کے مفسر بھی بن گئے تھے۔ یہ وہی چراغ حسن حسرت تھے جن پر ن۔ م۔ راشد نے "اشتراکی مسخرے" کے عنوان سے بعد میں اپنی نظم لکھی۔

ترقی پسند مصنفین پنجاب کے باہر کافی معتوب تھے، اور انہیں کمیونسٹ سمجھ کر حکومت ان کے درپے آزار بھی رہتی تھی۔ لیکن پنجاب میں یہ عجیب بات تھی کہ ترقی پسند ادب کے سرگرم حامی صرف یہی نہیں کہ سرکار کے معتوب نہیں ہوئے بلکہ اس تحریک میں امتیاز ان کے دنیاوی فروغ کا باعث بن گیا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی سیکرٹری شپ کو تو سرکاری ملازمت کے حصول کا زینہ سمجھا جانے لگا۔ انجمن کے پہلے سیکرٹری سومناتھ چپ تھے جو انگلستان سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آئے تھے۔ سیکرٹری بننے کے کچھ ہی دن بعد انہیں بہت اچھی ملازمت مل گئی ان کے جانشین کرشن چندر بنے جن کی دوستی کا مجھے شرف حاصل تھا۔ کچھ ہی مدت بعد وہ بھی آنکھوں میں آنسو بھر کر تشریف لائے اور یہ دردناک خبر سنائی کہ انہوں نے سرکاری ملازمت قبول کر لی ہے۔ یا خود ان کے اپنے الفاظ میں خود کو فروخت کر دیا ہے۔ وہ غالباً اس امید میں آئے تھے کہ میں ان سے اظہار ہمدردی کروں گا اور بہت ممکن ہے کہ گالیاں بھی بکنے لگوں لیکن جب میں نے مبارکباد پیش کی تو انہیں یک گونہ صدمہ ہوا۔ وہ اپنے جذبۂ شہادت کی تسکین چاہتے تھے۔ میں نے اپنی حماقت سے انہیں اس لذت سے محروم کر دیا۔

کرشن چندر مجھ پر واقعی مہربان تھے۔ وہ خود سلیقے کی زندگی بسر کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ میں بھی

سلیقے کی زندگی بسر کروں۔ اپنے لباس کے بارے میں وہ کافی محتاط تھے اور مراسم قائم کرنے اور انہیں نباہنے کے آداب بھی انہیں آتے تھے۔ مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ کامیابی کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اچھا لباس اور رہنے کے لیے معقول جگہ، جہاں دوستوں کی مدارت کی جا سکے۔ ان دنوں ان کے ہیرو ملک راج آنند تھے جن کی کچھ کتابیں یورپ میں چھپ چکی تھیں ایک بار وہ آئے تو میں، کرشن چندر اور نریندر ناتھ سیٹھ ان سے ملنے کے لیے سوم ناتھ چِب کی کوٹھی پر گئے۔ ملاقات کا وقت کرشن چندر نے طے کیا تھا۔ لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو نہ کوٹھی پر ملک راج آنند تھے اور نہ صاحب خانہ۔ ہم تینوں انتظار کرتے رہے اور وہ کافی دیر بعد آئے۔ اس دوران میں اور نریندر ناتھ نے کئی بار کرشن چندر سے جو خود بھی کافی برہم ہو رہے تھے کہا کہ ہم مزید انتظار نہ کریں لیکن کرشن چندر نے ہمیں روکے ہی رکھا۔

کنھیا لال کپور، کرشن چندر کا اکثر مذاق اڑایا کرتے تھے کہ یہ کمیونسٹ ہونے کا مدعی ہے لیکن جو کریم استعمال کرتا ہے، اس پر بورژوا لکھا ہوتا ہے۔ ایک اعتبار سے یہ زیادتی بھی تھی کیونکہ کرشن چندر ان دنوں بورژوا زندگی ہرگز بسر نہیں کر رہے تھے اور ان کا قیام ہندو ہوٹل میں تھا جس میں کم استطاعت کے لوگ ہی رہتے تھے اور اچھا لباس بھی وہ غالباً ان دنوں اپنے افلاس کو چھپانے یا اپنے لیے ترقی کی راہیں نکالنے کے لیے ہی استعمال کرتے تھے۔

نریندر ناتھ سیٹھ کو کرشن چندر کافی ستاتے تھے اور اس کا طریقہ انہوں نے یہ ڈھونڈا تھا کہ اسے اپنی محیر العقول کامیابیوں کے قصے، جن میں جنسی فتوحات بھی شامل تھیں، سناتے رہتے تھے، میں سیٹھ کو بار بار سمجھاتا کہ وہ ان دیو مالائی قصوں سے اتنا مرعوب اور افسردہ خاطر نہ ہو لیکن اس غریب پر ان کا وار چل ہی جاتا تھا۔

ایک دن کرشن چندر نے بتایا کہ اس پر ایک اور افتاد پڑی ہے۔ ان کی شادی ہو رہی تھی جو ان کے والدین نے طے کی تھی۔ اس مرتبہ کرشن چندر کے چہرے پر واقعی نورِ شہادت برس رہا تھا لیکن میری شقاوتِ قلبی نے اس بار بھی مجھے اظہارِ ہمدردی سے باز رکھا بلکہ میں اسے تسلی دینے لگا کہ جب تحریک کا قائد سجاد ظہیر برادری میں شادی کر سکتا ہے تو اسے اس معاملے میں اپنے ماں باپ کی اطاعت سے انکار کیوں ہو؟

کرشن چندر اور اپندر ناتھ اشک کی آمد اس بات کا اعلان تھی کہ اب ادب کے میدان میں قلندری کا دور ختم ہوا۔ دوسرے ادیبوں کے برعکس جو لاابالی تھے، اور ادبی کام کو کاروباری زیان سمجھ کر کرتے تھے۔ یہ دونوں حصول کامیابی کے واضح پروگرام کے تحت ہر قدم ناپ تول کر اٹھاتے تھے۔ کرشن چندر اس معاملے میں زیادہ زیرک تھے۔ وہ ہر جریدے کے مدیر کی ناز برداری کرتے اور کسی نہ کسی حیلے سے اپنے حق میں کچھ لکھوا لیتے جب ان کی کوئی تحریر کہیں شائع ہوتی تو وہ اپنے دوستوں سے کہتے کہ وہ اس کی تعریف میں مدیر کو خط لکھیں۔ ''ادب لطیف'' کی ادارت ان دنوں میرزا ادیب کے سپرد تھی جو بڑے ہی شریف اور مظلوم صورت آدمی تھے اور ان کی شرافت سے فائدہ اٹھا کر دوست اکثر ان کا مذاق اڑاتے رہتے تھے۔ ایک بار وہ، میں، کرشن چندر اور مرحوم

چوہدری برکت علی ''ادب لطیف'' کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ ''صحرانورد کے خطوط'' کا نیا ایڈیشن چھپنے والا تھا اور اس کے دست کور کا ڈیزائن بن کر آیا تھا جس پر آرٹسٹ نے ایک جن کی تصویر بنائی تھی۔ چوہدری صاحب نے یہ ڈیزائن دکھایا تو میری رگ ظرافت پھڑکی اور میں نے میرزا ادیب سے مخاطب ہو کر کہا۔ بھئی میرزا ڈیزائن تو خوب ہے لیکن آرٹسٹ نے تمہاری تصویر ٹھیک نہیں بنائی۔ میرزا ادیب قدرتی طور پر برہم ہوئے لیکن چوہدری برکت علی اور کرشن چندر کے رویے میں نمایاں فرق پڑا۔ جہاں چوہدری برکت علی نے میرے فقرے کو لطیفہ سمجھ کر لطف لیا وہاں کرشن چندر نے اس لمحہ غنیمت سے فائدہ اٹھا کر مرزا ادیب کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ میرزا ادیب نے میری زیادتی کا انتقام یہ لیا کہ ایم اسلم کو میرے خلاف بھڑکا دیا کہ جہاں بیٹھتا ہوں، ان کے خلاف فقرے بازی کرتا ہوں۔ اسلم صاحب نے اس کی شکایت مولانا تاجور سے کی، تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے ایم۔ اسلم سے کیا کد ہے؟ میری ایم۔ اسلم سے نہ اس وقت تک ملاقات ہوئی تھی نہ اس کے بعد ہوئی، اس لیے کد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرے انکار پر مولانا نے مشورہ دیا کہ میں ایم۔ اسلم تک یہ بات پہنچا دوں لیکن دوران گفتگو چونکہ مجھے مخبر کا پتہ چل چکا تھا اس لیے میں نے ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں پہلے ہی میرزا سے زیادتی کر چکا تھا۔ انہیں جھوٹا ثابت کر کے مزید زیادتی کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

حلقہ نیاز مندان لاہور کے اراکین جو پنجاب کی ادبی زندگی میں اب کافی موثر تھے کرشن چندر کی دوستی کا ہدف خصوصی تھے اور ''ادبی دنیا'' کے مدیر صلاح الدین احمد کے دربار میں تو وہ روزانہ حاضری دیتے تھے۔ مولانا کی بھی ان پر خصوصی نوازش تھی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ''ادبی دنیا'' میں ان کا کوئی افسانہ شائع ہوا ہو اور مولانا نے اس پر طویل تعریفی نوٹ کا اضافہ نہ کیا ہو۔ ''شاہکار'' کے لیے افسانہ دیتے وقت مجھ سے بھی انہوں نے یہی کہا تھا کہ میں اس پر ایک تعریفی نوٹ لکھ دوں اور ان کا یہ مطالبہ میں نے بخوشی پورا کر دیا تھا۔ ان دنوں کرشن چندر افسانے بھی اچھے لکھتے تھے۔ فارمولائی افسانے لکھنا انہوں نے بعد میں شروع کیا۔

ہم لوگ کمیونسٹوں کا اس بات پر بڑا مذاق اڑایا کرتے تھے کہ وہ بات بات پر مارکس اور لینن کا حوالہ دیتے ہیں اور اپنے ذہن سے کام لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اپنے مزید ساتھی پیدا کرنے کے لیے ہم نے پیپلز کلب کے نام سے ایک کلب قائم کی۔ جس کی واحد سرگرمی یہ تھی کہ وہاں دن رات سیاسی بحثیں ہوتی رہتی تھیں۔ ایک دو ٹریڈ یونینیں بھی ہم نے بنا ڈالیں۔ کرشن چندر ان سب سرگرمیوں میں شریک تھے لیکن کھل کر بات کرنے سے وہ اکثر پہلو بچاتے تھے۔ کمیونسٹوں سے ان کا میل جول رفتہ رفتہ شروع ہوا۔ اب ماضی کے واقعات پر نظر ڈالنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ انہوں نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کیا تھا اگر وہ شروع ہی میں کمیونسٹ پارٹی سے جا ملتے تو شاید ان کی اتنی پذیرائی نہ ہوتی۔ وہ محدود بغاوت کی راہ پر چل کر اپنی قدر و قیمت بڑھانا چاہتے تھے۔

میرا جی کا عالم یہ تھا کہ:

نرالی وضع ہے، سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کونسی بستی کے یا رب رہنے والے ہیں

ایک انہوں نے اپنی ہیئت کذائی ہی مجنونانہ بنا رکھی تھی، اس پر نظمیں وہ ایسی لکھتے تھے جو معدودے چند لوگوں کی سمجھ ہی میں آسکتیں۔ کسی ایڈیٹر کو نظم بھیجتے وقت وہ خط لکھتے تو اس پر یہ ضرور لکھ دیتے "یہ خط ہے نظم نہیں" "حیرت ہے کہ ان کی نظم جتنی پُر پیچ ہوتی تھی ان کی نثر اتنی ہی سادہ"۔ "ادبی دنیا" میں جس کے وہ نائب مدیر تھے انہوں نے مختلف یورپی ادیبوں اور شاعروں پر جو مضامین لکھے انہیں معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی سمجھ سکتا تھا۔ ان سے ان کے ذہنی بلوغ کا پتہ چلتا تھا اور ان کی وسعت معلومات کا بھی۔ ان کے گرد اچھا لکھنے والے شاعروں کا ایک باقاعدہ حلقہ پیدا ہو گیا تھا جو نظم میں ان کا تتبع کرتے تھے، انہی نوجوانوں نے ان کی راہنمائی میں حلقہ ارباب ذوق کی بنیاد رکھی تھی۔ ان دنوں انجمن ترقی پسند مصنفین حلقے کو اپنا حریف نہیں سمجھتی تھی اور ترقی پسند ادیب اس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ حلقے کے سازشی خط و خال ترقی پسندوں کو بہت دن بعد نظر آئے جب انہوں نے میراجی کے خلاف باقاعدہ جہاد شروع کیا۔

میراجی کے ایک شاگرد مبارک احمد ہے، جن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ اطوار میں بھی میراجی سے تھوڑی بہت مشابہت رکھتے ہیں، تقسیم سے چند ہی ماہ قبل میری ملاقات ہوئی۔ میں نے "ادب لطیف" کی ادارت سنبھالی ہی تھی کہ وہ اپنی ایک نظم لے کر پہنچ گئے۔ میں نے نظم دیکھ کر سرسری سے لہجے میں کہا کہ نظم چھپ جائے گی، لیکن ان کے چہرے پر بے یقینی کے آثار تھے جیسے وہ سمجھتے ہوں کہ میں انہیں ٹرخا رہا ہوں۔ میں نے وہ نظم شائع ہی نہیں کی بلکہ شمارے کی ابتدا اسی نظم سے کی۔ نظم دیکھ کر وہ پھر آئے۔ میں سمجھا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں لیکن یہ بات نہیں تھی۔ ان کے خیال میں میں نے ان کی نظم سمجھے بغیر ہی شائع کر دی تھی، اگر سمجھ لیتا تو اسے ہرگز شائع نہیں کرتا کیونکہ اپنے مفہوم کے لحاظ سے یہ بڑی ہی قابل اعتراض تھی۔ اس نظم کو لے کر وہ میرے کئی پیشرؤں کے پاس آئے تھے اور سب نے اسے خطرناک اور ناقابل اشاعت سمجھ کر لوٹا دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر میں نے اسے شائع کر دیا تھا تو اس میں میری بے سمجھی کو ہی دخل ہو سکتا تھا۔

میں نے کہا مبارک صاحب اس نظم کو میں سمجھ گیا ہوں لیکن غالباً اپنی نظم کا مفہوم پورے طور پر خود آپ نہیں سمجھے اور میرے پیشرؤں نے بھی غالباً اسے مسترد اسی لیے کیا کہ آپ اس کا مفہوم انہیں قبل از وقت بتا دیتے ہوں گے۔ آپ کی دانست میں اس نظم کا موضوع استلذاذ بالید ہے اور بہت ممکن ہے کہ جب آپ نظم لکھنے بیٹھے ہوں تو آپ کی نظم کا نقطہ آغاز یہی ہو لیکن تخلیقی عمل کی گرفت میں آ کر آپ کہیں سے کہیں پہنچ گئے اور جب یہ نظم مکمل ہوئی تو اپنے موضوع سے بہت اونچی اٹھ چکی تھی۔

جنگ کے طفیل ادیبوں اور شاعروں کے لیے روزگار کے دروازے کھل گئے تھے۔ فیض احمد فیض، چراغ حسن حسرت اور دوسرے کئی ادیب فوج میں ملازم ہو گئے۔ آل انڈیا ریڈیو میں بہت سے ادیبوں کو پہلے ہی

ملازمت مل چکی تھی۔ اب جو باقی تھے وہ بھی اس میں کھپ گئے۔ باقاعدہ تعلیم کی کمی حفیظ کے لیے سدِ راہ تھی لیکن انھوں نے اپنی تگ و دو سے اس مشکل پر قابو پا لیا۔ حکومت ہند نے سانگ پبلسٹی کے نام سے شاعری اور موسیقی کے ذریعہ جنگی پرچار کا محکمہ قائم کیا تو اس کی ڈائریکٹری انھی کے حصے میں آئی۔ آدمی زیرک تھے اور اپنی محدودیتیں ان کی نظر میں تھیں۔ لہٰذا اپنے نائب کے طور پر انھوں نے پنڈت ہری چند اختر کا انتخاب کیا جو تعلیم یافتہ بھی تھے اور سرکاری ملازمت کے طویل تجربے کے باعث دفتری امور سے بھی بخوبی واقف تھے۔

یہ محکمہ مشاعرے بھی کراتا تھا اور گانے والیوں کے لیے شاعروں سے جنگ کی حمایت میں گیت بھی لکھواتا تھا۔ اس تقرر سے پہلے اکثر و بیشتر شاعر حفیظ کے سخت خلاف تھے جس میں ان کے مزاج کی کسی خامی سے کہیں زیادہ ان کی غیر معمولی کامیابی کو دخل تھا لیکن جیسے ہی وہ سانگ پارٹی کے ڈائریکٹر بنے، شاعروں کو ان کی ذات اور ان کے کلام میں ہر قسم کے محاسن نظر آنے لگے۔ یہ بات حفیظ کے حق میں جاتی ہے کہ انھوں نے کسی شاعر کے خلاف بغض سے کام نہیں لیا، اور مشاعروں میں شرکت اور گیت نویسی کے سلسلے میں جس شاعر کو جو فائدہ پہنچا سکتے تھے، اس سے انھیں نے دریغ نہیں کیا۔ مجھ سے وہ پہلے ہی کی طرح تپاک اور گرم جوشی سے ملتے رہے، بلکہ انھیں یہ شکایت بھی تھی کہ اتنے قریبی تعلقات کے باوجود میں ان کی مقتدر حیثیت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا۔ ایک دن ترنگ میں آئے تو کہنے لگے: ''معل! مجھ سے چوہے تک فائدہ اٹھا رہے ہیں لیکن تُو کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا۔'' میں نے جواب میں کہا: ''میں چوہا نہیں ہوں۔''

تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوا تو ساحر شعر و ادب کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے۔ وہ مرنجاں مرنج اور خوش اطوار تھے اور مادی طور پر صرف یہی نہیں کہ ضرورت مند نہیں تھے بلکہ دوسروں پر تھوڑا بہت خرچ بھی کر سکتے تھے۔ اس لیے انھیں شعر و ادب کی محفلوں میں جلد ہی پذیرائی حاصل ہو گئی۔ ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے لیے وہ ایثار بھی کافی کرتے تھے۔ خود بے چارہ اخبار اسٹریٹ کے گھٹیا چائے خانوں میں چائے پیتے اور دوسروں کی مال روڈ کے ریستورانوں میں تواضع کرتے۔ ''ادب لطیف'' کے ایڈیٹروں کو تنخواہ برائے نام ہی ملا کرتی تھی اور ایک طرح سے یہ عہدہ اعزازی ہی تھا لیکن حصول شہرت کا ''ادب لطیف'' چونکہ ایک اچھا ذریعہ تھا اس لیے ایڈیٹر ڈھونڈنے میں مالکوں کو کوئی خاص مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ ساحر لدھیانوی کچھ نمایاں ہوئے تو یہ عہدہ انھیں سونپ دیا گیا۔ ساحر لدھیانوی کو جو تنخواہ ملتی تھی اس سے کہیں زیادہ جریدے کے مالک چودھری نذیر احمد کی تواضع پر صرف کر دیا کرتے تھے اس بنا پر انھیں ادارتی معاملات میں کافی چھوٹ ملی ہوئی تھی۔ وہ جریدے کو اپنی ذاتی پروپیگنڈے کے لیے استعمال کرتے اور شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ مراسم استوار کرنے کے لیے بھی۔

پروپیگنڈہ کا فن بھی ساحر کو خوب آتا تھا وہ جانتے تھے کہ حصول شہرت کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ اپنے متعلق زیادہ سے زیادہ غلط فہمیاں پھیلائی جائیں۔ ''تلخیاں'' کا پہلا ایڈیشن انھوں نے ڈھائی سو کی تعداد میں چھاپ کر دوستوں میں تقسیم کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد دوسرا ایڈیشن چھاپنا چنداں مشکل نہیں تھا اور پہلے

ایڈیشن کے اتنی جلد ختم ہو جانے کو بڑی آسانی سے کتاب کی بے پناہ مقبولیت کا نام دیا جا سکتا تھا۔

مجاہد بننے کا ان دنوں بھی ادیبوں اور شاعروں کو جنون تھا۔ ساحرؔ بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں تھے لیکن یہ نکتہ بھی ان کی نظر میں تھا کہ:

عاشقی شیوہ رندان بلاکش باشد

رند بلاکش وہ نہیں تھے، اس لیے بہت ہی پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے، ان کی نظم ''چکلے'' جو کسی فلم میں آ کر کافی مشہور ہو گئی ہے، وہ انھوں نے اسی زمانے میں لکھی تھی۔ اس نظم کا ایک مصرعہ تھا:

خدیجہ کی ہم جنس رادھا کی بیٹی

کسی نے ان سے کہا کہ طوائف کو خدیجہ کی ہم جنس کہنے کی بنا پر مسلمان ان سے خفا ہو جائیں گے اور انھیں پیٹیں گے، ساحرؔ نے فوراً ہی یہ مصرعہ اس طرح بدل دیا۔

زلیخا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی

جب کچھ دوستوں نے یہ کہا کہ طوائف کی بیٹی کہنے پر ہندو بھی برہم ہو سکتے ہیں تو ساحر نے کہا ہندو پیٹیں گے نہیں۔

حفیظؔ جالندھری کی شہرت کا انحصار غزل اور ہلکے پھلکے گیتوں پر تھا اور یہ واقعہ ہے کہ ان کے محکمے سانگ پبلسٹی نے جنگ کی حمایت میں جو گیت لکھوائے ان میں بہترین گیت حفیظؔ ہی کا تھا۔

یہ اڑوسن پڑوسن سے مراد کانگرس اور مسلم لیگ تھیں جو دونوں ہی حمایت جنگ کے معاملے میں مین میخ نکال رہی تھیں۔

سانگ پبلسٹی کا ڈائریکٹر بننے کے بعد حفیظؔ کے گرد مداحین کا ہجوم جمع ہوا، تو وہ محسوس کرنے لگے کہ یہ شہرت ان کے لیے کافی نہیں اور انھیں دانشوری کے میدان میں بھی جھنڈے گاڑنے چاہئیں۔ انھوں نے ''آزادی'' کے نام سے ایک نظم لکھی جس میں آزادی کے منفی پہلو بیان کرنے کے بعد تان یہاں توڑی تھی۔

جب تک چوروں، راہزنوں کا ڈر دنیا پر غالب ہے
پہلے مجھ سے بات کرے جو آزادی کا طالب ہے۔

اپنے قصرِ دانشوری کی بنیاد وہ اس نظم اور اس قسم کی ایک آدھ اور نظم مثلاً ''اب خوب ہنسے گا دیوانہ'' پر رکھنا چاہتے تھے لیکن اس معاملے میں کامیابی انھیں نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔

ایک دن ماڈل ٹاؤن میں اُن کا مہمان تھا۔ انھوں نے اپنی نئی نظمیں مجھے سنائیں اور ان میں دانشوری کے جو نکات و رموز تھے ان کی تشریح بھی فرماتے گئے۔ جلد ہی انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ میں متاثر نہیں ہو رہا ہوں۔ اس پر انھوں نے اپنا تازہ گیت ''بس درشن درشن میرا'' ترنم سے پڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے حفیظؔ کو مشاعروں میں بھی سنا ہے اور محدود اور مختصر نشستوں میں بھی، لیکن اس دن ان کی آواز میں کچھ اور ہی جادو تھا اور

ان کا یہ گیت بھی ان کے بہترین گیتوں میں سے ہے۔ مجھ پر وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

شاعری میں ترکِ عشق کے دعاوی کے باوجود اپنی عام زندگی میں ترقی پسند شاعروں کا رویہ غزل کے روایتی عاشق سے چنداں مختلف نہیں تھا۔ یہ ہر خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر آہیں بھرتے اور طبقاتی تضاد کی دہائی دیتے رہنے کے باوجود اونچی سے اونچی حویلی پر اپنے عشق کی کمند پھینکنے پر تیار رہتے۔ اس قسم کے ایک عشق کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ عشق ساحر لدھیانوی، دیوندر ستیارتھی اور ایک نوجوان شاعر اشک نے جس کا پچھلے دنوں بمبئی میں انتقال ہو گیا، امداد باہمی کے اصول پر کیا تھا اور ان کے عشق کی ہدف تھی ایک فارغ البال شاعرہ۔ ستیارتھی کے پاس ان دنوں ایک کیمرہ تھا۔ ہر روز شاعرہ کی نئے نئے زاویوں سے تصویریں کھینچی گئیں۔ ساحر کے پاس کیمرہ نہیں تھا۔ لیکن انھوں نے اپنی پذیرائی کے لیے یہ حربہ ڈھونڈا کہ شاعرہ کے آنریری پبلسٹی ایجنٹ بن گئے۔ وہ اس کی نظموں کے اردو میں منظوم ترجمے کرتے اور مختلف جرائد میں انھیں چھپواتے ہی نہیں بلکہ ان پر تعریفی نوٹ بھی لکھواتے۔

ایک دن آسمان پھٹ پڑا۔ اس وقت تک ساحر اخبار اسٹریٹ میں شورش کاشمیری کے کمرے میں منتقل ہو چکے تھے۔ شورش اکثر خود وہاں موجود نہیں رہتے تھے اس لیے محفل وہیں جم جاتی تھی۔ اس دن میں وہاں پہنچا تو ستیارتھی، ساحر اور اشک شاعرہ پر بُری طرح برس رہے تھے جس نے ''دولت کا سہارا لے کر'' ان ''غریبوں کی محبت کا مذاق اڑایا'' تھا۔ خیریت پوچھی تو پتہ چلا کہ آج جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو شاعرہ نے یہ کہہ کر تصویریں کھینچنے میں آپ حضرات کی جو فلمیں صرف ہوئی ہیں، ان کی قیمت تو مجھ سے لے ہی لیجیے'' انھیں حق الخدمت پیش کر دیا تھا۔

دانشوری کے دعوے سے ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کے انا کی تسکین اس طرح بھی ہوتی تھی کہ ان میں سے بیشتر کچھ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے اور جدید علوم تک، جن پر عبور کیے بغیر دانشوری کا دعویٰ صرف مسخرہ پن ہے، ان کی رسائی یا تو تھی ہی نہیں اور اگر تھی بھی تو برائے نام۔ ان نیم تعلیم یافتہ نوجوانوں کو کمیونسٹ پارٹی نے دانشور کا لقب دیا تو ان کی باچھیں کھل گئیں اور جذبۂ احسان مندی کے تحت وہ اس پارٹی کی ہر بات ماننے پر آمادہ ہو گئے۔

عجیب بات یہ ہے کہ اقبال نے، جنھیں علوم قدیم و جدید پر واقعی عبور حاصل تھا، دانشوری کا دعویٰ کبھی نہیں کیا اور دانشوری کے سب سے بڑے مدعی بنے جوش ملیح آبادی، جن کی تعلیم بس واجبی تھی۔ جن دنوں جوش شالیمار فلم کمپنی میں ملازم تھے، عاشق بٹالوی پونہ گئے۔ اپنے قیام کے دوران میں وہ جوش سے بھی ملے۔ واپسی پر ان سے اپنی ملاقات کا حال بتاتے ہوئے کہنے لگے: جوش صاحب مجھ سے پوچھتے تھے کہ اضافیت کی تھیوری کیا ہے؟ میرے اس استفسار پر کہ اس انتہائی ادق تھیوری کو معلوم کر کے آپ کیا لیں گے۔ انھوں نے بے تکلفی سے کہا کہ میں اسے نظم کرنا چاہتا ہوں۔

کمیونسٹوں کی ذہنی افتاد اور ان کے طور طریقوں کے بارے میں ساحر کی دوستی کے طفیل مجھے کئی بار اہم اور دلچسپ باتیں معلوم ہوئیں۔ میکلوڈ روڈ کی وہ کوٹھی جس میں پابندی اٹھ جانے کے بعد پنجاب کمیونسٹ پارٹی کا دفتر قائم ہوا۔ پہلے کچھ طالب علموں نے مل کر لے رکھی تھی۔ ان میں ساحر بھی شامل تھے۔ میرا خیال ہے کہ ساحر کو چھوڑ کر، جو اپنے حصے کے اخراجات خود ادا کرتے تھے، باقی طالبعلم کمیونسٹوں کے خرچ پر ہی پل رہے تھے۔ بہر حال واقعہ یہ ہے کہ کمیونسٹوں کا اچھا خاصا اڈہ تھا۔ ساحر کی وجہ سے میرا وہاں کافی آنا جانا تھا اور کئی بار تو رات بھی وہیں بسر ہو جاتی تھی۔ ساحر کو اپنے دوستوں کے طور طریقے پسند نہیں تھے اور ان کی حرکتیں وہ مزے لے لے کر مجھے سنایا کرتے۔ ایک بار انہوں نے مجھ سے ایک کتاب کا ذکر کیا جو اس عمارت کے مکین ایک کامریڈ کے پاس تھی اور جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ کمیونسٹ بننے کی دعوت کس کس قسم کے لوگوں کو کس طرح دینی چاہیے۔ مجھے اس کتاب کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا اور ساحر کا ہمیشہ ممنون رہوں گا کہ یہ انہوں نے مجھے حاصل کر دی۔ میں نے کمیونسٹوں کے حق میں اور ان کے خلاف بہت کچھ پڑھا ہے لیکن اس سے زیادہ انکشاف انگیز کتاب میری نظر سے کبھی نہیں گزری۔ کتاب میں نظریاتی مباحث مطلق نہیں تھے۔ صرف یہ بتایا گیا تھا کہ مختلف قسم کے لوگوں کی کمزوریوں اور ان کے احساس شکست خوردگی سے کس طرح فائدہ اٹھایا جائے۔ یہ طریق کار وہی تھا جو جرائم پیشہ ٹولیاں ممبر بھرتی کرنے کے لیے اختیار کرتی ہیں۔

پنجاب کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری اقبال سنگھ سے میری ملاقات ساحر ہی کی وجہ سے ہوئی۔ میں اور ساحر ایک ریستوران میں بیٹھے تھے کہ وہ بھی وہیں آ گئے۔ ساحر نے میرا تعارف کرایا اور جیسا کہ اس کی عادت تھی۔ میری شاعری کی مبالغہ آمیز تعریف کی۔ اقبال سنگھ نے مجھے ہفت روزہ ''قومی جنگ'' میں لکھنے کی دعوت دی تو میں نے معذرت کی اور دبے لفظوں میں یہ بھی بتا دیا کہ میں سیاسی طور پر کمیونسٹ پارٹی سے متفق نہیں ہوں۔ اس پر انہوں نے مجھے تبادلہ خیال کی دعوت دی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ملاقات تفصیل سے ہونی چاہیے اور یہ کہ کیا میں کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں آ سکتا ہوں۔ اقبال سنگھ کا شہرہ ان دنوں یہ تھا کہ ہندوستان میں ایسے صرف آٹھ آدمی ہیں جو کمیونسٹ نظریے کو سمجھتے ہیں اور اقبال سنگھ ان میں سے ایک ہیں۔ بہر حال یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی کشتی مانگے اور میں فرار ہو جاؤں۔ میں نے دوسرے دن کمیونسٹ پارٹی کے دفتر پہنچنے کا وعدہ کر لیا۔

جیسا کہ لکھ چکا ہوں کہ میکلوڈ روڈ پر جس عمارت میں کمیونسٹ پارٹی کا دفتر تھا اس سے میں بخوبی واقف تھا۔ لیکن اوپر جس وقت میں اور ساحر وہاں پہنچے تو نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ دروازے پر ایک دیوہیکل کامریڈ دربان بنا کھڑا تھا۔ اسے یہ مشکل ہی سے یقین آیا کہ مجھ جیسا ہیچ میرز کمیونسٹ پارٹی کے بلند مرتبہ سیکرٹری سے دوستانہ ملاقات کے لیے آ سکتا ہے وہ وہیں کھڑا رہا اور ایک اور کامریڈ کو تصدیق کے لیے اندر بھیجا۔ اندر سے جواب ہاں میں آیا۔ تو میری خوش بختی پر رشک کرتا ہوا وہ مجھے اقبال سنگھ کے کمرے تک پہنچا آیا۔ کمرے کے اندر کا ماحول پر شکوہ تھا۔ اقبال سنگھ کے علاوہ وہاں لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔ اقبال سنگھ بڑی تمکنت سے گوپیوں میں کاہن

بے بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پر واقعی جلال تھا اور وہ اس اقبال سنگھ سے کافی مختلف نظر آتے تھے جس سے گزشتہ روز ریستوران میں میری ملاقات ہوئی تھی۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد انہوں نے مجھ سے اپنے اختلافات بیان کرنے کو کہا تو میں نے ابتدا یہاں سے کی کہ مارکس نے تاریخی عوامل کے متعلق جو پیشگوئیاں کی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں۔ اس صورت میں یہ کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ اسٹالن کے فیصلے صحیح ہوں گے؟ پھر میں نے سوویت خارجہ پالیسی پر کچھ کہنا شروع کیا۔ معاً اقبال سنگھ بولے مثل صاحب! میرا خیال تھا کہ آپ کو اختلاف ہمارے ساتھ ہے لیکن آپ کا اختلاف تو بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں آپ سے کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ میں مصافحہ کر کے وہاں سے اٹھ آیا لیکن اٹھتے اٹھتے اتنا ضرور کہہ آیا کہ میں ہندوستان کمیونسٹ پارٹی کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتا تو اس سے اختلاف کیا رکھوں؟ ساحر کی عالی ظرفی تھی کہ باہر آ کر وہ مجھ سے خفا نہیں ہوئے بلکہ اقبال سنگھ کا مذاق ہی اڑاتے رہے۔

ساحر روگ پالنے والے آدمی نہیں اور کمیونسٹ پارٹی سے ان کی وابستگی بھی تفریحی سطح پر ہی تھی۔ نظریاتی بحث میں میرے ساتھ وہ کبھی نہیں الجھے۔ اگر میرے سامنے کسی کمیونسٹ کو زچ ہوتے دیکھتے تو ایک خیثانہ سی مسرت بھی محسوس کرتے۔ بعد میں یہ ضرور کہتے: مثل صاحب! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن کوئی تمھارے اور تمھاری پارٹی کے ساتھ کیوں آئے؟ تمھارے پاس ہے ہی کیا؟ کمیونسٹ جس ادیب کا ہاتھ پکڑتے ہیں اسے شہرت کی چوٹی پر پہنچا دیتے ہیں۔ یہ ان کی نوازش تھی کہ مجھ سے ان کی دوستی بہر حال قائم رہی۔ انہوں نے میرے خلاف دشنام طرازی میں شرکت نہیں کی اور نجی طور پر اپنے کامریڈوں کے پاس میری تعریف ہی کرتے رہے۔ یہ وہ ضرور چاہتے تھے کہ میں راہ راست پر آ جاؤں۔ کہا کرتے تھے، کمیونسٹ کہتے ہیں ایک بار اپنے دوست سے ہاں کہلوا دو پھر دیکھو ہم اسے کس بلندی پر لے جاتے ہیں۔ لیکن نہ میں نے ہاں کہی اور نہ کمیونسٹوں نے مجھے بلندی پر پہنچانے کا جتن کیا۔

عرب ہوٹل کے بعد ادیبوں کا دوسرا اڈہ نگینہ بیکری تھی۔ نیلا گنبد لاہور میں چائے کی یہ مختصر سی دوکان یوپی کے ایک قوم پرست مسلمان چلا رہے تھے۔ شروع شروع میں یہاں آنے والوں میں زیادہ تر قوم پرست مسلمان ہی تھے لیکن پھر مسلم لیگی بھی آنے لگے اور اس طرح یہ دوکان سیاسی مناظرہ بازی کا اڈہ بن گئی۔ ادیبوں کا اڈہ یہ اس وقت بنی جب چراغ حسن جو عرب ہوٹل کی مجلس کے میر تھے، سرکاری ملازمت میں چلے گئے ان کے جاتے ہی مجلس درہم برہم ہو گئی اور وہاں سے اکھڑ کر نگینہ بیکری میں آ جمی۔

باری علیگ جو پہلے عرب ہوٹل کے نواح میں رہتے تھے، اب پرانی انارکلی میں رہنے لگے تھے اور ان کا مکان نگینہ بیکری سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ خود میں نے بھی انارکلی میں مکان لے لیا تھا۔ عرب ہوٹل یہاں سے کافی دور تھا اس لیے میں نے اور باری علیگ نے نگینہ بیکری میں ہی ڈیرے ڈال دیئے۔ باری علیگ کی کشش مولانا صلاح الدین کو بھی کھینچ لائی تھی، جن کے جریدے "ادبی دنیا" کا دفتر قریب ہی مال روڈ پر تھا۔ مولانا صلاح

الدین کے ہمراہ عاشق بٹالوی اور کچھ دوسرے ادیب بھی آنے لگے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ جو ان دنوں اورینٹل کالج لاہور میں تھے، پہلے ہی وہاں بیٹھا کرتا تھے۔ اس طرح اچھی خاصی محفل جمنے لگی جو ادیب وہاں باقاعدگی سے نہیں بیٹھتے تھے وہ بھی ہفتے میں ایک دوبار ضرور ادھر آنکلتے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ ان دنوں داڑھی رکھتے تھے اور شیروانی پہنتے تھے۔ سیاست میں قوم پرستانہ انداز نظر رکھتے تھے اور ان کے متعلق یہ مشہور تھا کہ مجلس احرار کے بہت قریب ہیں۔ مسلمانوں کی اس روش پر اکثر وہ چوٹ کیا کرتے تھے کہ اپنی ساری کوتاہیوں کا الزام وہ ہندوؤں کے سر ہی ڈال دیتے ہیں۔ ان کا مخصوص نعرہ تھا، "سب گوپی چند نے کیا ہے"

مولانا صلاح الدین بحث میں حصہ شاذ و نادر ہی لیتے تھے صرف زیر لب مسکرا دیتے تھے جیسے کوئی بزرگ نادان بچوں کی حرکتوں پر مسکرا دیتا ہے۔ عاشق حسین بٹالوی البتہ بحث میں سرگرم حصہ لیا کرتے تھے۔ کسی زمانے میں ملک برکت علی کے علاوہ صرف وہی مسلم لیگی تھے۔ سر سکندر حیات کے مخالفوں میں تھے۔ مسلم لیگ کو عروج حاصل ہوا اور سر سکندر اس کے لیڈر بنے تو انہوں نے مسلم لیگ ترقی پسند گروپ قائم کیا اور اس الزام کے ہدف بنے کہ ہندو کانگرس سے روپیہ لے کر وہ مسلم لیگ میں پھوٹ ڈال رہے ہیں۔ یہ پروپیگنڈہ کافی زور شور سے ہوا لیکن ان کے رہن سہن کو دیکھ کر شبہ مشکل ہی سے ہو سکتا تھا کہ کہیں دست غیب موجود ہے۔ ان کا اپنا یہ بیان تھا کہ روپے کی پیش کش انہیں سر سکندر کی طرف سے ہوئی تھی جسے انہوں نے ٹھکرا دیا۔

عاشق حسین بٹالوی سیاست میں ہنگامہ آرا بھی ہوئے اور رسوا بھی ہوئے، لیکن اس سے ان کی دلچسپیاں ضمنی قسم ہی کی تھیں، حقیقی دلچسپی انہیں ادب سے تھی۔ افسانہ نگار بھی تھے اور ناقد بھی۔ کچھ مدت "ادبی دنیا" کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ایک زمانے میں انہوں نے اختر شیرانی کے ساتھ مل کر "رومان" بھی نکالا تھا۔ لیکن کوئی کام باقاعدگی سے کرنے کے قائل نہیں تھے جس میں کچھ دخل اس بات کو بھی تھا کہ روپے پیسے کے معاملے میں کافی بے نیاز تھے۔ ایک مرتبہ مولانا صلاح الدین نے ان کے لیے نصاب مرتب کرنے کا کام ڈھونڈ نکالا جس کے معاوضے میں انہیں کافی روپیہ مل سکتا تھا۔ اسے انہوں نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ مولانا کما کر کھانا میرے بس میں نہیں۔ شادی انہوں نے کی نہیں تھی اور اپنی ذات پر خرچ بھی کافی کفایت شعاری سے کرتے تھے ایسا آدمی محنت مشقت کے چکر میں پڑے تو کیوں؟

باری علیگ ادب اور سیاست دونوں ہی سے نالاں تھے اور کلچر کے تحفظ کی بات پر تو خاص طور پر برہم ہو جاتے تھے۔ ایسے موقعوں پر ان کا مخصوص سا فقرہ ہوتا تھا "بھائی ہمارا کلچر لے لو، روٹی دے دو" کافے ہاؤس میں آنے والوں میں ایک عبداللہ بٹ تھے اور ایک کامریڈ عبداللہ۔ عبداللہ بٹ مادی طور پر خوشحال تھے اور ادب اور سیاست سے الزام کی دلچسپی خون گرم رکھنے کا ایک بہانہ تھی۔ سیاست میں انہوں نے ہر کوچے کی سیر کی لیکن قیام کہیں نہیں کیا۔ کامریڈ عبداللہ ایک خوش شکل نوجوان تھا۔ کمیونسٹ پارٹی سے منسلک تھا اور پارٹی کے ایما پر ہی مسلم لیگ میں شامل ہوا تھا۔ احراریوں نے اسے دلبر ملت کا خطاب دے رکھا تھا۔

عطاالحق قاسمی کی شگفتہ تصانیف

پڑھنے والوں کو جس کے ہر نئے ایڈیشن کا انتظار رہتا ہے

- بارہ سنگھے
- گوروں کے دیس میں
- دھول دھپا
- حبس معمول
- آپ بھی شرمسار ہو
- عطائیے
- شوقِ آوارگی
- مزید گنجے فرشتے
- خندِ مکرر
- دنیا خوبصورت ہے
- دلی دور است
- کالم تمام
- بازیچہء اعمال
- روزنِ دیوار سے

دعا پبلیکیشنز 25/C، لوئر مال، لاہور

ازھر منیر

ازھر منیر جوان جذبوں اور محسوسات کا شاعر ہے وہ جس طرح مناظر کو دیکھتا ہے اُسی طرح اُنھیں کاغذ پر پینٹ (Paint) کرنے کی کوششیں کرتا ہے۔ سادگی اُس کی شاعری کا بنیادی وصف ہے، غزل اور نظم دونوں اصناف میں اُس کی شاعری جذبوں اور اُمنگوں کی شاعری ہے۔ اُس کی نظمیں پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے غزل نہیں بلکہ نظم عورتوں سے باتیں کرنے کا نام ہے۔ تاہم حالاتِ حاضرہ پر بھی اُس کی نظمیں اپنے منفرد آہنگ کی وجہ سے دلپذیر ہوتی ہیں۔

ایک شاعر کا کلام

ازہر منیر

کیا اُسے یاد ہے مری ہم دم؟

O

کیا اسے یاد ہے مری ہم دم؟
وہ سمے وہ وصال کا موسم
وہ سمے جب کسی کی دنیا میں
اس کے عارض کے دیپ جلتے تھے
وہ سمے جب کسی کے پہلو میں
اس بدن کے گلاب کھلتے تھے
وہ سمے جب کسی کی بانہوں میں
اس کا سندر شریر ہوتا تھا
کیا اسے یاد ہے مری ہم دم؟
اس کے دل میں کسی زمانے میں
کوئی ازھر منیر ہوتا تھا

O

برنگ نامہ محبت کا جام آیا ہے
زہے نصیب کہ اس کا سلام آیا ہے

٭

میری ہم راز مجھ کو بتلاؤ

O

میری ہم راز مجھ کو بتلاؤ
اس پری وش کا حال کیسا ہے؟
اس پری وش کا حال کیسا ہے؟
میری ہم راز مجھ کو بتلاؤ

O

میری ہم ساز مجھ کو بتلاؤ
اس کے دن رات کیسے کٹتے ہیں؟
کیسے شامیں سحر میں ڈھلتی ہیں؟
کیسے دن رات میں بدلتے ہیں؟

○

اس کے چہرے پہ دکھ کے سائے ہیں؟
یا ہنسی کے چراغ جلتے ہیں؟
اس کی پائل میں غم کے نغمے ہیں؟
یا خوشی کے رباب بجتے ہیں؟

○

اس کے ہنسنے پہ کیا اسی صورت؟
اس کے ہونٹوں سے پھول جھڑتے ہیں
اور اس کے خرام پر اب بھی
دل غزالوں کے بھی دھڑکتے ہیں؟

○

اس کی آواز اب بھی ویسی ہے؟
جیسے کوئی کلی چٹکتی ہے
آج بھی یاسمین کی خوشبو
اس کے انفاس میں مہکتی ہے؟

○

اور وہ اس کے ہاتھ کی مہندی
اور وہ اس کی آنکھ کا کاجل؟
اور وہ اس کے روپ کی چاندی؟
اور وہ اس کی زلف کے بادل؟

○

اور وہ اس کے ہونٹ کے ساغر؟
اور وہ اس کے قوس سے ابرو؟
اور وہ اس کی دل نشیں باتیں؟
اور وہ اس نگاہ کا جادو؟

○

اس کا احوال اس کی سب باتیں
میری ہم راز مجھ کو بتلاؤ
تم نے جو دیکھا جو اس کی محفل میں
وہ سبھی کچھ مجھے بھی دکھلاؤ

☆

میری ہم راز اُس کو بتلانا

○

(۱)

میری ہم راز ہاں کہو مجھ سے
میری محبوب کی سبھی باتیں
اس ملاقات کا سب افسانہ
حسن محبوب کی سبھی باتیں

○

دیکھ کر تم کو اس کی آنکھوں میں
جیسے دیپک سے جل اٹھے ہوں گے
اور قوس قزح کے سارے رنگ
اس کے چہرے پہ سج گئے ہوں گے

○

جانتی ہو کہ تم ہماری ہو
غم گسار اور رفیق اور دم ساز
واقف حال اور عزیز اور دوست
ہم سخن، ہم مزاج اور ہم راز

○

گر نہ ہوتی ہماری تم جیسی
کوئی دنیا میں مہرباں ساتھی
اس کو میری خبر نہ مل پاتی
مجھ کو اس کی خبر نہ مل پاتی

(۳)

اس نے پوچھا ہے یہ کہ میں اب بھی
اس کو دن رات یاد کرتا ہوں؟
اس کی فرقت میں کیا اسی صورت؟
نظم لکھتا ہوں، گیت بُنتا ہوں؟

○

آہ! اس کو گماں ہوا ہے کیوں؟
میں کبھی اس کو بھول سکتا ہوں
کیا اُسے یہ خبر نہیں، اُس دن؟
میں نہ جیتا ہوں اور نہ مرتا ہوں

○

وہ تو اب بھی اسی طرح میرے
جسم کی سب رگوں میں زندہ ہے
وہ تو سانسوں میں میرے بستی ہے
وہ تو اب میرے خوں میں زندہ ہے

○

میری ہم راز! اُس کو جتلانا
اُس محبت کی آگ روشن ہے
دل کے آتش کدے میں ہاں، اب بھی
اس کی چاہت کی آگ روشن ہے

O

اس سے کہنا کہ ہجر کا دوزخ
مجھ کو تو عمر بھر جلائے گا
اس سے کہنا کہ جس گھڑی ادھر
اس کو بھولے گا، مر ہی جائے گا

میری ہم دم تو جب مری خاطر

O

میری ہم دم تو جب مری خاطر
اس کا سندیس لے کے آتی ہے
میرے کمرے میں جیسے سرما کی
مہرباں دھوپ پھیل جاتی ہے

اُس کی خوشیوں پہ حق نہیں لیکن

O

میری ہم راز، ہاں مری ہم دم!
میری دم ساز، غم گسار من!

ہاں سناؤ کوئی خبر اُس کی
ہاں بتاؤ تو حال یارِ من

○

اس کے رُخ پر سکوت کے بادل
بے بسی کے سحاب ٹھہرے تھے؟
اس کے لب پر ردائے خاموشی
اس کے ہونٹوں پہ چپ کے پہرے تھے؟

○

وہ تو چپ تھی مگر اے میری دوست!
اس کی آنکھیں تو بولتی ہوں گی
اس کی راتوں کے، اس کی صبحوں کے
بھید سارے ہی کھولتی ہوں گی

○

اس کی آنکھیں تو اک کہانی ہیں
اس کی آنکھیں ہیں داستاں جیسی
اس کی آنکھیں تو اک کویتا ہیں
چاندنی جیسی، کہکشاں جیسی

○

اُس کی آنکھوں نے جو کہا تم سے
اس کی نظروں نے جو بتایا ہے
میری ہم راز! مجھ سے کہہ ڈالو
اس کی آنکھوں نے جو سنایا ہے

(۲)

آہ! ان میں الم کے قصے ہیں؟
ان میں افسوس کے فسانے ہیں؟

ان میں حسرت کی داستانیں ہیں؟
ان میں اندوہ کے ترانے ہیں؟

○

میری ہم راز! مجھ کو بتلاؤ
اس کی جاں کا یہ روگ کیسا ہے؟
کونسے غم ہیں اس کی دنیا میں
اس کی آنکھوں میں سوگ کیسا ہے؟

○

اس کی خوشیوں پہ حق نہیں لیکن
اس کے دکھ تو تمام میرے ہیں
اس کے غم، اس کی سب سمسیائیں
رنج و کلفت کے جام میرے ہیں

○

میری ہم راز! اس سے یہ کہنا
مجھ سے اپنے وہ غم نہیں چھینے
اس کی خوشیاں تو چھن گئیں مجھ سے
اپنے درد و الم نہیں چھینے

○

اس سے کہنا کہ اس کے ازھؔر کی
صرف اتنی ہی التجا اس سے
اس کو سکھ میں نہ کر سکی شامل
اس کو دکھ میں شریک رہنے دے

☆☆

نہ دوستوں کے درمیاں' نہ دشمنوں کے درمیاں
گذر رہے ہیں روز و شب منافقوں کے درمیاں

نہ کوئی لفظ عدل تھا' نہ کوئی حرف آشتی
نصاب میں لکھی گئی عبارتوں کے درمیاں

کوئی خبر وصال کی! کوئی سخن ملاپ کا!
فراق کی طویل تر حکایتوں کے درمیاں

کوئی تو سکھ کی بات بھی! کوئی تو چین کی صدا!
کہیں سکوں بھی اے خدا! تلاطموں کے درمیاں

عداوتوں کے درمیاں تھی اک کرن بھی چاہ کی
تھا ایک حرف مہر بھی شکایتوں کے درمیاں

٭

نالے لکھتے رہے' کال کرتے رہے
ہم یونہی عرض احوال کرتے رہے

اس برس تو سنے گا ہماری خدا
ہم یہ امید ہر سال کرتے رہے

جو کبھی خواب میں بھی نہ سرزد ہوئے
ان گناہوں کا اقبال کرتے رہے

ہم پہ اک ایک پل تھا بتانا کٹھن
وہ شمار مہ و سال کرتے رہے

ان کو ازحد ہماری خبر تک نہ تھی
اور ہم حال' بے حال کرتے رہے

٭

پھول سے نکھرے کیوں کملائے
یہ قصے اب کون سنائے؟

رنگ برنگی تصویروں کے
ایک ہی دھوپ نے رنگ اڑائے

جس کو پہرے دار بنائیں
گھر کا مالک وہ بن جائے

رنگ بھلا دیتی ہیں راہیں
روپ کی خوشبو ہوش اڑائے

پل دو پل کی خوشیاں لے کر
پھر کلفت کے سال بتائے

تیری اک فرقت کے دکھ نے
جیون کے دکھ درد بھلائے

٭

وے صورتیں الٰہی

قتیل شفائی

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

گیارہ جولائی کو سوا گیارہ بجے دوپہر میں قتیل شفائی سٹریٹ میں کھڑا تھا۔ اردگرد بہت سے لوگ بکھرے ہوئے تھے۔ سب لوگ اداس تھے۔ قتیل شفائی کا جنازہ ایمبولینس میں رکھا جا چکا تھا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد ایمبولینس کریم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن کے قبرستان کی طرف روانہ ہوگئی اور متعدد سوگوار اپنی اپنی گاڑیوں میں اس کے پیچھے چل پڑے۔

میں کریم بلاک کے قبرستان میں اس کھدی ہوئی قبر کے پاس کھڑا تھا، جس میں قتیل شفائی کے جسد خاکی کو کچھ دیر کے بعد دفن کرنا تھا۔ قتیل سے چالیس پینتالیس سالہ تعلقات کی متحرک تصویریں میرے حافظے میں ابھر رہی تھیں۔

۱۹۵۷ء میں لائلپور (اب فیصل آباد) کے ایک بہت بڑے مشاعرے میں میں نے قتیل کو لاہور کے کچھ شعراء کے ساتھ مشاعرہ گاہ کے دروازے میں داخل ہوتے دیکھا تو فوراً پہچان لیا کیونکہ اخبارات اور رسائل میں ان کی بہت سی تصاویر دیکھ چکا تھا۔

اگلے ہی سال جھنگ کے ایک جواں سال اور انتہائی خوبصورت ترنم سے پڑھنے والے شاعر ساحر صدیقی کا اچانک انتقال ہوگیا تو ہم نے ان کے چھوٹے چھوٹے بے سہارا بچوں کی امداد کے لیے ایک مشاعرہ منعقد کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس سلسلے میں ملک کے بعض نامور شعراء نے بڑا تعاون کیا۔ قتیل شفائی اپنے خرچ پر مشاعرے میں آئے اور مشاعرہ پڑھ کر خاموشی سے واپس چلے گئے اور چائے کے ایک کپ کے بھی روادار نہ ہوئے۔

میں ایم۔اے (اردو) کا طالب علم تھا جب قتیل شفائی کو ڈاکٹر وحید قریشی کے ہاں دیکھا اور ان سے باقاعدہ تعارف ہوا۔ ان دنوں قتیل اور وحید قریشی صاحب کے تعلقات میں بڑی گرم جوشی تھی اور قتیل کی کوششوں سے قریشی صاحب رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری منتخب ہوئے تھے۔ بعد میں خدا جانے کیا ہوا کہ تعلقات بگڑ گئے۔

قتیل سے جب کبھی میری ملاقات ہوئی انہوں نے ہمیشہ بڑی محبت اور شفقت کا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ میری ان سے گاہے بگاہے ملاقاتیں جاری رہیں۔ کبھی ادبی تقریبات میں اور کبھی ان کے گھر پر۔ میں نے ہمیشہ انہیں گرم جوش، بے تکلف اور یار باش پایا۔

۱۹۹۳ء کی بات ہے۔ ایک دن انہوں نے مجھے فون کیا (کبھی کبھی فون پر ان سے بات ہو جاتی تھی) اور مجھ سے میرے ہاں آنے کی خواہش ظاہر کی۔ تھوڑی دیر میں وہ پہنچ گئے۔ ساتھ اپنے شعری مجموعے لائے تھے اور فرمایا کہ میں اپنے کلام کا انتخاب چھاپنا چاہتا ہوں۔ آپ کو ان مجموعوں میں جو کچھ اچھا لگے، اسے نشان زد کردیں۔ میں نے بخوشی یہ کام انجام دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ احمد ندیم قاسمی اور شہزاد احمد سے بھی انہوں نے اپنے کلام کا انتخاب کرایا اور اسی سال یہ مجموعہ شائع ہو گیا۔ اس انتخاب کے ابتدائیے میں انہوں نے لکھا:

"حضرت احمد ندیم قاسمی، محترم خواجہ زکریا اور برادرم شہزاد احمد کا تہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے میری گزارش پر میرے تمام شعری مجموعے سامنے رکھ کر مجھے وہ رہنمائی مہیا کی کہ میرے لیے زیر نظر انتخاب کا ترتیب دینا آسان ہو گیا۔"

۲۰۰۰ء میں جاپان کی دائتو بنکا یونیورسٹی کے چند طالب علم اورینٹل کالج میں اردو کے ایک مختصر کورس کی تکمیل کے لیے آئے۔ ان کے نگران پروفیسر نے خواہش ظاہر کی کہ طلبہ کی آگاہی کے لیے ایک روایتی انداز کا "فرشی" مشاعرہ کرایا جائے۔

میں نے قتیل شفائی سے بھی شرکت کی درخواست کی۔ وہ تشریف لائے مگر جب انہیں زحمت کلام دی گئی تو وہ ایک غزل پڑھتے ہوئے چند مقامات پر اپنے ہی اشعار بھول گئے۔ خیر کسی نہ کسی طرح غزل مکمل کی۔ میں سوچنے لگا بڑھتی عمر اپنے اثرات بہرطور دکھاتی ہے۔

چند ماہ پہلے میں اے جی جوش کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ اچانک قتیل تشریف لائے۔ اس وقت ان کی صحت بالکل ٹھیک تھی۔ بہت دیر ہمارے ساتھ بیٹھے رہے لیکن اس کے بعد انہیں صحت مند حالت میں دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ چند دن کے بعد فالج کا حملہ ہوا اور پھر صحت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔

ایک دن میں اظہر جاوید (مدیر تخلیق) کے ساتھ ان کے ہاں گیا۔ بستر پر دراز تھے مگر بات چیت بخوبی کر سکتے تھے۔ بڑی محبت سے ملے۔ ان کی آنکھیں نم ہو گئیں مگر جلد ہی اس کیفیت سے نکل آئے اور افراد خانہ سے ہماری تواضع کے لیے کہا۔

اور اب میں کریم بلاک کے قبرستان میں کھڑا ہوں۔ میرے ساتھ احمد راہی بھی کھڑے ہیں، تدفین ہو چکی ہے، دعا کے بعد لوگ رخصت ہو رہے ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ۱۹۱۹ء میں ہری پور جیسے دور افتادہ مقام پر پیدا ہونے والا یہ شخص، جس نے مڈل تک تعلیم حاصل کی، زندگی کا آغاز بہت چھوٹی چھوٹی ملازمتوں سے کیا، محض اپنی خداداد صلاحیتوں سے تیس سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے برصغیر کا ایک مشہور شاعر بن چکا تھا۔

پاکستان میں فلم سازی کا آغاز ہوتے ہی اس کے نغمے ہمالہ سے کینا کماری تک گونجنے لگے تھے اور پھر وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس کی مقبولیت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ یکے بعد دیگرے اس شعری مجموعے شائع ہوتے رہے۔ اس کی غزلیں، نظمیں اور گیت پڑھنے اور سننے والوں کو مسحور کرتے چلے گئے۔

اردو ادب کی نصف صدی تک نمایاں خدمت کرنے والا یہ شاعر، یہ نغمہ نگار، یہ مسافر آج دنیا سے رخصت ہو گیا ہے لیکن اس کا کلام ہمیشہ زندہ رہے گا اور اس کی یاد دلاتا رہے گا۔

ٹ

الطاف گوہر

صابر لودھی

لاہور سے ''نئی تحریریں'' کا پہلا شمارہ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔ قیوم نظر نے حلقہ ارباب ذوق کی طرف سے اسے مرتب کیا تھا۔ ریاض احمد اور سید امجد الطاف اس کام میں ان کے معاون تھے۔ اس شمارے میں شامل، زیادہ تر تخلیقات، حلقے کے اجلاسوں میں پڑھی گئی تھیں۔ اس شمارے کی ایک غزل مجھے بہت پسند آئی:

ڈوب گئیں سب یادیں اس کی، رنگ گھلے اور شام ہوئی — دل نے جو بھی بزم سجائی، بکھری اور ناکام ہوئی
نرم نشیلی سانسیں اس کی، جسم مہکتا انگارا — دھیمی دھیمی آنچ لبوں کی، حاصل صبح و شام ہوئی
کتنی طویل اور کتنی کٹھن تھی، رات حیات کی، پھر بھی کٹی — بیت گئی کچھ ان آنکھوں میں اور کچھ صرف جام ہوئی
جسم و جاں میں درد بسا ہے، درد ہی جسم و جان بنا — برسوں رہے ہم جس کوشش میں آخر کام تمام ہوئی

چارہ گرو! اے چارہ گرو! کچھ وحشت جنوں کا حال کہو
آزادی دل تو مدت سے پابند سلام و پیام ہوئی

یہ الطاف گوہر کی غزل تھی اور الطاف گوہر نے کے نام سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔

الطاف گوہر، بحیثیت شاعر، میرا جی کی دریافت تھے۔ الطاف گوہر نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا تھا۔ وہ گوجرانوالہ سے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے لاہور آئے تھے۔ یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے کہ میرا جی نے قیوم نظر سے الطاف گوہر کا تعارف کرایا اور حلقہ ارباب ذوق میں لے جانے لگے۔ الطاف گوہر کو میرا جی کی شاعری کا لہجہ پسند تھا۔ الطاف گوہر کی مندرجہ بالا غزل پر میرا جی کی اس غزل کا رنگ چڑھا ہوا ہے جس کے مجھے اس وقت تین مصرعے یاد ہیں:

میرا جی کا بچپن گزرا پاس کے اک میخانے میں
خوشیاں آئیں، اچھا آئیں، مجھ کو کیا احساس نہیں
دکھ سکھ سارا بھول گیا ہوں غم کے گیت سنانے میں

یہ عجیب دن تھے۔ تمام نامور ادیب، ممتاز شاعر لاہور میں جمع ہو گئے تھے۔ یہ ادب کے نکھرنے کا موسم تھا۔ مال روڈ کے فٹ پاتھ ماہ پاروں کے قدموں سے جگمگاتے تھے۔ باغ جناح میں پھولوں کی قندیلیں روشن تھیں۔ ہوائیں عطر بیز اور فضائیں خواب آور تھیں۔ اہل دل رات رات بھر باغوں کے اس شہر میں سڑکوں پر گھومتے تھے۔ لائبریریاں آباد تھیں۔ لیز یم، چائینز لنچ ہوم، کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس میں زیرک دوستوں کے درمیان گھنٹوں مکالمے چلتے۔ ذہین لوگوں کے لیے سیاست، ادب اور ملازمتوں کے تمام دروازے کھلے تھے۔ بیسویں صدی کے پہلے ربع میں پیدا ہونے والے راویئنز زندگی کے ہر شعبے میں اپنے جوہر آشکار کر رہے تھے لیکن جن راویئنز نے ادب کے گلزار میں قدم رکھا تھا ان میں ن۔ م راشد، آغا بابر، ان کے چھوٹے بھائی اعجاز بٹالوی، ریاض احمد، سجاد حیدر، محمد اجمل مخدوم، وزیر آغا، ضیاء جالندھری، وحید قریشی، الطاف گوہر، سردار انور، امجد الطاف، اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور مظفر علی سید نمایاں تھے۔

ان میں سے الطاف گوہر اس لیے اہم تھے کہ وہ انڈین سول سروس میں شامل ہو کر ادب نوازی کا فریضہ ادا کرنے لگے تھے۔ حلقہ ان کے لیے ذہنی آسودگی کا ذریعہ تھا۔ چنانچہ قیام پاکستان کے فوراً بعد جب ان کی پوسٹنگ کراچی میں ہوئی تو بقول قیوم نظر "حلقہ ارباب ذوق کے کچھ دیوانے جو مرکزی ملازمتوں سے تعلق رکھتے تھے وہاں بھی پہنچ گئے۔ پھر ان کی دیوانگی اپنا رنگ لائی اور کراچی میں حلقہ کی شاخ کی بنیاد رکھی گئی۔ جوانوں میں تابش صدیقی، نوجوانوں میں الطاف گوہر اور بزرگوں میں ممتاز حسن احسن نے شاخ کو ابتدائی مراحل سے کچھ اس طرح گزارا کہ خود مرکز کو رشک آنے لگا۔ نئے جوش نے ان حلقہ بگوشوں کو نت نئی راہیں سجھائیں۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں کراچی شاخ نے نہ صرف نئی تحریریں شائع کرنے کی مرکز سے باصرار اجازت حاصل کی بلکہ اس کی ایک جلد سال کے آخر تک مرتب کر کے طبع بھی کرا دی۔" (نئی تحریریں۔ لاہور پہلا شمارہ۔ جملہ معترضہ)

"نئی تحریریں" شائع کرنے اور حلقہ ارباب ذوق کی کراچی شاخ کو فعال کرنے میں سب سے زیادہ حصہ الطاف گوہر کا تھا کیوں کہ جب وہ کراچی سے تبدیل ہو کر ڈھاکہ گئے اور وہاں ڈپٹی سیکرٹری (ہوم) کا عہدہ سنبھالا تو ڈھاکہ میں بھی حلقے کی شاخ کھول لی اور اس حلقے کا سالانہ جلسہ اس اہتمام سے کیا کہ ادبی حلقوں میں دیر تک اس کا چرچا رہا۔ اس جلسے کا صدارتی خطبہ بھی الطاف گوہر نے پڑھا، اس خطبے کا ایک اقتباس دیکھیے:

> "حلقہ سے میرا تعلق کوئی بارہ تیرہ سال پرانا ہے۔ مجھے اب بھی وہ ابتدائی محفلیں یاد ہیں جو لاہور میں ایبٹ روڈ کے کنارے ایک چھوٹے سے کمرے میں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ اور حاضرین فرش پر اور ادھر ادھر سے جمع کی ہوئی کرسیوں اور میزوں پر، دہلیز اور برآمدے میں رکھی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھ کر اپنے ذوق کی تسکین کی نئی نئی راہیں ڈھونڈا کرتے تھے۔ ان محفلوں میں کالجوں کے استاد، پڑھے لکھے سر پھرے، رسالوں کے مدیر، اپنے جنون میں ڈوبے ہوئے شاعر، بات سے بات نکالنے والے سخن طراز، سب ہی طرح کے لوگ شامل ہوتے تھے..... اس بیرونی حلقے میں ہر مزاج اور

ہر خیال کے لوگ آتے جاتے رہے۔ البتہ اندرونی حلقے تک چند گنے چنے لوگوں کی رسائی تھی۔ اندرونی حلقے کی مرکزی شخصیت میراجی مرحوم تھے۔ اس مرکزی شخصیت کے گرد کئی ایسے نوجوان جمع ہو گئے تھے جنہیں حلقہ سے محبت تھی ...... یہ لوگ ہفتہ بھر اجلاس کی تیاریوں میں صرف کر دیتے۔ مضمون نگار کو لکھا جا رہا ہے۔ شاعر کو یہ تاکید ہو رہی ہے کہ نظم کی کم از کم چھ نقلیں ضرور ساتھ لائے۔ صاحب صدر سے پابندی وقت کے اہم مسئلے پر بات ہو رہی ہے۔ ہر ملنے والے کو اجلاس میں آنے پر اکسایا جا رہا ہے ...... میراجی مرحوم کا ایک اصرار یہ تھا کہ ہر اجلاس ہر اتوار کو ہوگا اور ہر حال میں ہوگا۔ اب اگر ایبٹ روڈ سے نکالے گئے تو وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں آ پہنچے اور ایک دفعہ وہاں کوئی دقت ہوئی تو مال روڈ کے کنارے برسر عام جلسہ ہو رہا ہے ...... حلقہ ارباب ذوق لاہور کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ۱۹۴۷ء کے روح فرسا ہنگاموں میں بھی حلقے کے اجلاس باقاعدگی سے ہوتے رہے ...... مجھے یاد ہے کہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں ایک ہنگامے کی وجہ سے کراچی میں کرفیو نافذ ہو گیا تھا۔ حلقہ کے سیکرٹری عزیز احمد اجلاس کے روز حاضر نہ تھے لہٰذا ان کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سیکرٹری صاحب کرفیو کی پابندی سے ناآشنا حلقے کے اجلاس میں شرکت کے لیے رواں دواں چلے آ رہے تھے کہ پولیس نے انہیں دھر لیا۔ انتظامی کمیٹی نے اس پر بھی انہیں پوری طرح معاف نہ کیا اور یہ کہا گیا کہ سیکرٹری کی حیثیت سے یہ ان کا فرض تھا کہ وہ اپنے لیے اور دوسروں کے لیے کرفیو پاس حاصل کرتے تاکہ اجلاس ٹھیک طور پر منعقد ہو سکتا۔"

(نئی تحریریں، شمارہ نمبر ۳، ص ۲۳۹)

وقت کی گردش تیز ہوئی تو سردار انور نے فارن سروس میں بیرون ملک ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ ایک مشہور روایت ہے کہ حکیم عمر خیام، نظام الملک طوسی اور حسن بن صباح کسی زمانے میں شریک درس تھے اور تینوں نے اپنی اپنی مرضی کا پیشہ اختیار کرنے کی خواہش کی تھی۔ عجب اتفاق ہے کہ تینوں کی تمنائیں پوری ہوئیں۔ ایک حکیم اور شاعر بنا، دوسرا دبیر و وزیر بنا اور تیسرے نے سیاست کی راہ اختیار کی اور فانی دنیا میں بہشت بنا کر قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔ پاکستان میں عمر خیام اور حسن بن صباح کا کردار کس نے ادا کیا، مجھے معلوم نہیں لیکن نظام الملک طوسی بلاشبہ الطاف گوہر تھے۔ جمہوری اور غیر جمہوری حکمرانوں کی وہ ضرورت تھے۔ خاص طور پر فیلڈ مارشل ایوب خان کو اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لیے الطاف گوہر جیسے ذہین و فطین شخص کی ضرورت تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ایوان صدر کی راہداریوں میں شاعر الطاف گوہر ادب کا راستہ بھول گیا۔ خبر بھی نہ ہوئی کہ فیلڈ مارشل کی کتاب "Friends Not Masters" کب ان کے نام سے منسوب کر دی گئی اور کب انہیں شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات کا خالق قرار دے دیا گیا۔ وہ جس خلوص سے حلقہ ارباب ذوق کے انتظامی امور چلا رہے تھے اسی خلوص سے وہ حکومتوں کے معاملات سنبھالتے رہے۔

۱۹۶۶ء میں الطاف گوہر، قیوم نظر سے ملنے گورنمنٹ کالج لاہور میں آئے اور انہیں اپنے ساتھ کالج اوول میں کھینچ لے گئے۔ ایک بینچ پر وہ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے اور جب واپس آئے تو قیوم نظر نے خبر دی کہ الطاف گوہر مجھے نیشنل سنٹر لاہور کا ڈائریکٹر بنوا رہے ہیں۔ الطاف گوہر نے بڑی مشکل سے قیوم نظر کو گھیرا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

''دیکھو پروفیسر! چیونگم کو آپ کب تک چباتے رہیں گے۔ کبھی تو اس کا رس ختم ہوگا...... بس! تدریس بہت ہو چکی، اب قوم کی خدمت کیجئے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے دلوں کو جوڑیئے۔''

قیوم نظر نے نیشنل سنٹر کو عوام کے جذبات کا ترجمان بنا دیا۔ ان کی حوصلہ مندی (یا حکومتی زبان میں بے تدبیری) سے فیلڈ مارشل کے خلاف تقریریں ہونے لگیں اور الطاف گوہر کو پریشانی لاحق ہوئی لیکن انہوں نے قیوم نظر کو کچھ نہیں کہا۔ حلقہ نے آزادی رائے کی جو تربیت انہیں دی تھی وہ ان کے کام آتی رہی۔

الطاف گوہر ریٹائر ہوئے تو ان کے سینے میں بڑے راز تھے جنہیں وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ ان کی حوصلہ مندی تھی۔ انہوں نے زندگی بھر کرپشن نہیں کی۔ بس اپنا فرض نبھایا۔ آمروں کو بارہا مشورہ بھی دیا کہ وہ عوام کے نمائندوں سے مذاکرات کریں لیکن یہ پاکستان کی بدقسمتی تھی کہ ان کے مشوروں پر عمل نہیں ہوا۔ ان کے طویل کالم اس بات کا ثبوت ہیں۔

انجم رومانی

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

ایم ایس سی میتھ میں گولڈ میڈل حاصل کرنے والے انجم رومانی ساری عمر ریاضی اور فلکیات کا مضمون پڑھاتے رہے اور بالآخر ۱۳ اپریل کو رب فلک سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!
۴ فروری ۱۹۲۰ کو کپور تھلہ میں جنم لینے والے فضل الدین انجم رومانی نے اپنا نام انجم کپور تھلوی کیوں نہ رکھا اور انجم رومانی کیوں رکھا، محققین اس کی کئی توجیہات کر سکتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ انجم صاحب کا رومان سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا سوائے اختر شیرانی کے رومان کے بلکہ انہوں نے تو اپنی غزل میں بھی انتظار حسین والا تغزل در نہیں آنے دیا جس کے باعث ٹی ہاؤس کے ایک ہی ٹیبل پر بیٹھنے والے انجم رومانی اور ناصر کاظمی کی راہیں الگ ہوئیں اور پھر الگ ہوتی چلی گئیں۔ اپنی نسل میں سے قیوم نظر، شہرت بخاری، انتظار حسین، ضیا جالندھری، اعجاز بٹالوی، الطاف گوہر، احمد راہی اور حنیف رامے سے ان کی قربت رہی، دوسری نسل میں عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، احمد حسن حامد، گلزار وفا چوہدری اور کشور ناہید ان کے زیادہ قریب تھے اور تیسری نسل میں سے علی اکبر عباس، سراج منیر اور ڈاکٹر تحسین فراقی کا نام لیا جا سکتا ہے جن کا انجم صاحب سے مسلسل اور متواتر ربط رہا اور جن میں سے موخر الذکر یعنی ڈاکٹر تحسین فراقی کی سعی مشکور سے انکا پہلا مجموعۂ کلام ''کوئے ملامت'' ۱۹۸۳ء میں چھپا۔

چاہئے تو یہ تھا کہ یہ مجموعہ غزل ۱۹۴۳ء میں اس وقت ہی چھپ جاتا جب یہ ترتیب کے آخری مراحل میں داخل ہو چکا تھا لیکن اگر ایسا ہو جاتا تو پھر انہیں انجم رومانی کون کہتا۔ انجم رومانی تو نام ہی اس شخصیت کا تھا جو Perfectionist ہونے کے ناطے ہر کام کو مکمل صورت میں دیکھنا چاہتے تھے چنانچہ جب کبھی ان کا مجموعہ چھپنے کا مرحلہ قریب آیا یہ ''ذرا ٹھہر جایئے'' کہہ کر آگے نکل گئے۔ اسی تکیہ کلام کی بنا پر بعض ساتھیوں نے انکا نام ''استاد بریک'' رکھ چھوڑا تھا۔ یہ نام اگرچہ سننے والے پر منفی اثرات مرتب کرتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بریک کے بغیر کوئی گاڑی بھی نہیں چل سکتی اور وہ لوگ جو انہیں اس خطاب سے یاد کرتے تھے، اپنی تیز رفتاری کے باعث اپنی

زندگی میں ہی حادثات کا شکار ہو کر آؤٹ آف پرنٹ ہو گئے۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ انجم صاحب نے اپنا مجموعہ اس کی اشاعت سے ۴۲ سال پہلے یعنی ۱۹۴۳ء میں ترتیب دے دیا تھا۔ لیکن یہ شائع ہوا ۱۹۸۳ء میں ٹھیک چالیس سال بعد، اس بات کو ادبی انداز میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ مجموعہ نبوت کی عمر پوری کر کے، ادب کے غار حرا سے نکلا، پھر اسی اصول پر چلتے ہوئے اسلام آباد میں اس کی تقریب بھی تاخیر سے ہوئی۔ جس کا اندازہ آپ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ ''ادبی پرواز'' کی مجلس عاملہ کا پہلا اجلاس سید ضمیر کی صدارت میں ہوا۔ دوسرا اجلاس حاجی ضمیر جعفری کی صدارت میں ہوا اور جب تقریب ہوئی اس وقت تک ضمیر جعفری صاحب الحاج بن چکے تھے۔ سید ضمیر جعفری نے ان کے مجموعے کے بارے میں کہا ''کوئے ملامت نے اردو شاعری کے داغ ندامت دھو دیئے ہیں۔'' میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ انجم صاحب کو شہرت کی خواہش نہیں رہی ہو گی لیکن یہ دعویٰ ضرور کر سکتا ہوں کہ شہرت انکا مسئلہ کبھی نہیں رہی۔ ایک مرتبہ انہیں راولپنڈی ٹی وی کے کل پاکستان مشاعرے میں شرکت کرنا تھی لیکن روانگی سے ایک روز قبل داڑھ میں درد نکل آیا۔ درد اس قدر بھی شدید نہ تھا کہ آدمی ٹی وی کا مشاعرہ چھوڑ دے اور مشاعرہ بھی وہ جو کل پاکستان ہو لیکن انجم صاحب اپنی حد درجہ محتاط طبیعت کے باعث گھر بیٹھ گئے۔ حالانکہ ان کی جگہ کوئی سمجھدار شاعر ہوتا تو داڑھ کا درد تو کیا دل کے درد پر بھی ہاتھ رکھ لیتا اور مشاعرے میں آ پہنچتا، اور اگر خدانخواستہ گھر والے اس کی حالت کے پیش نظر اور خواہش کے برعکس اسے مشاعرے میں جانے سے روک دیتے تو اتنا ضرور کرتا کہ اخبار میں چھوٹی سی خبر ہی لگوا دیتا لیکن انجم صاحب نے چپکے سے ٹکٹ واپس بھیج دی اور شہرت کے اس نادر موقع کو ضائع کر دیا۔ واضح رہے کہ اہل قلم کانفرنس میں شرکت سے لے کر قومی اور عالمی مشاعروں میں شرکت تک کئی مواقع انجم صاحب نے اسی طرح ضائع کئے۔

آج کل شاعروں کی دو قسمیں معروف ہیں۔ ایک وہ جو خود تو بہت کم لکھتے ہیں مگر ان کے بارے میں بہت زیادہ لکھا جاتا ہے۔ دوسرے وہ جو خود بہت لکھتے ہیں مگر ان کے بارے میں بہت کم لکھا جاتا ہے۔ انجم صاحب کا تعلق شاعروں کی دوسری قسم سے تھا اور کی وجہ ان کی طبیعت کی سادگی اور درویشی کے علاوہ کچھ نہیں تھی۔

یوں بھی کچھ لوگ انہیں لوٹ کے لے جاتے ہیں
کچھ طبیعت بھی فقیروں کی غنی ہوتی ہے

انجم صاحب اپنی زندگی خود گزارنے کے عادی تھے۔ انہوں نے تو اپنی زندگی کسی اور کو گزارنے دی اور نہ ہی خود کسی اور کی زندگی گزاری۔ کس وقت اٹھنا ہے، کس وقت سونا ہے، کتنے بجے ناشتہ کرنا ہے، کس چیز کا ناشتہ کرنا ہے، چائے میں پتی کتنی ہونی چاہئے، چینی کتنی ہونی چاہئے اور اس کا ٹمپریچر کیا ہونا چاہئے یہ سب کچھ انہوں نے طے کر رکھا تھا اور اس سے انحراف کو بدعت سمجھتے تھے۔ اہل قلم کانفرنس میں شرکت کے لئے روانہ ہوئے تو پینٹ کی جیب میں سیب اور چھوٹا سا چاقو رکھ لیا۔ عرض کیا کہ اس کی کیا ضرورت؟ آپ اسلام آباد جا رہے ہیں۔

بائی ایئر جا رہے ہیں، راستے میں ہر چیز بروقت مل سکتی ہے۔ کہنے لگے کیا پتہ میرے سیب کھانے کا وقت عین اس وقت آ جائے جب ارد گرد کچھ نہ ہو۔ سیب کھانے کا وقت ان کے لئے گویا قضا کا وقت تھا جس کا ٹلنا یا ٹالنا ان کے لئے ممکن نہ تھا اور صرف سیب پر ہی کیا موقوف انہوں نے ہر کام کا وقت مقرر کر رکھا تھا۔ وہ وقت کو ادھر ادھر ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ وقت بھی انہیں ادھر ادھر ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ انجم صاحب نے مکان بنوایا تو واپڈا کے اہلکاروں نے رشوت کے بغیر میٹر لگانے سے انکار کر دیا۔ اب جس شخص نے ساری عمر میٹر میں شاعری کی ہو وہ بجلی کے میٹر کے لئے بے اصولی کیسے روا رکھ سکتا تھا۔ اسی حالت میں کچھ ماہ گزر گئے اور بچوں کے سالانہ امتحان سر پر آ گئے۔ بچے پہلے تو تیل کا لیمپ جلا کر پڑھتے رہے مگر جب انہیں یقین ہو گیا کہ ساری عمر لیمپ میں ہی کٹے گی تو انکا بیٹا سرود انجم ابو کی بجائے چپکے سے ابو کے ایک دوست کے پاس جا پہنچا جو اس وقت واپڈا میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ سو جناب صلاح الدین کی بروقت مداخلت کے باعث بجلی لگ گئی لیکن اگر انجم صاحب کو پتہ چل جاتا تو شاید وہ اس سفارش کی کبھی اجازت نہ دیتے کہ سفارش ماننا یا کرنا دونوں ان کے منصب سے خارج تھے۔ اسی اصول پرستی کی وجہ سے اس سفارشی معاشرے میں اکثر حضرات ان سے ناراض بھی ہو جاتے لیکن آپ اس معاملے میں اس قدر محتاط تھے کہ جن دنوں امتحانی پرچے بنا رہے ہوتے یا چیک کر رہے ہوتے کئی کئی دن تک گھر سے باہر نہ نکلتے کہ کہیں کوئی سفارشی نہ ٹکر جائے۔ دیانت اور امانت کی یہ مثال آج کے دور میں خال خال ہی پائی جاتی ہے کیونکہ اس قسم کی دیانت میں نقصان کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا ہاں یہ ضرور ہے کہ معاشرے کے ایک ذمہ دار فرد کی حیثیت سے ضمیر ضرور مطمئن رہتا ہے اور ایک شاعر کے لئے اس سے بڑی اور نعمت کیا ہو سکتی ہے۔

انجم صاحب ایک استاد شاعر ہی نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں بھی استاد تھے۔ ان سے پڑھنے والوں کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچتی ہے، مگر ان کو پڑھنے والوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جنہیں ہم نہیں جانتے لیکن جنہیں ان کے ضرب المثل بنے اشعار زبانی یاد ہیں۔ ایسے ہی چند اشعار پیش ہیں جو انہی دنوں میں نے ادبی اور غیر ادبی لوگوں سے سنے:

پتھر بھی فقیروں کے سرہانے کے نہیں ہم　　سب کچھ ہیں پہ انسان ٹھکانے کے نہیں ہم
اک ذات ہے اپنی کہ فقط پیش نظر ہے　　ہر چند مکیں آئینہ خانے کے نہیں ہم

ہے واقعہ کچھ اور روایت کچھ اور ہے　　یاروں کو یعنی ہم سے شکایت کچھ اور ہے
سمجھی گئی جو بات ہماری غلط تو کیا　　یاں ترجمہ کچھ اور ہے آیت کچھ اور ہے

استادِ سخن ڈاکٹر بیدل حیدری

(فن و شخصیت ایک جائزہ)

ارشد جاوید

غالب یکتا نے کیا خوب کہا تھا۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

موت برحق اور امر مسلمہ ہے۔ اس سے کسی کو مفر نہیں۔ مگر بعض ایسی ناگہانی اموات ہوتے ہیں کہ جن کی جدائی کا زخم مدتوں مندمل ہونے میں نہیں آتا۔ استادِ سخن ڈاکٹر بیدل حیدری مرحوم کا شمار بھی ایسی معتبر ادبی شخصیات میں ہوتا ہے۔ ۵ مارچ ۲۰۰۴ء کو اُن کا آخری خط میرے نام آیا اور ۷ مارچ کو کبیر والہ سے احباب نے فون پر مطلع کیا کہ ڈاکٹر صاحب حرکت قلب بند ہونے سے اس جہان فانی سے کوچ فرما گئے ہیں۔

بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں جدید تر معتبر اردو غزل کی روایت میں جہاں اردو کو کبیر والہ ایسے جنوبی پنجاب کے دور افتادہ قصبہ میں رہ کر آبرو غزل میں انہوں نے اضافہ کیا۔ یہ شعری معجزہ انہی کے فن کا خاصہ ہے۔ 1997/98 کو لاہور میں منعقدہ اپنی سالگرہ کے موقع پر برصغیر کے نامور شاعر و ادیب حضرت احمد ندیم قاسمی کے اعزاز میں منعقدہ ادبی تقریب جس میں ملک بھر کے صاحب علم شاعر و ادیب حضرات مدعو تھے' جناب ڈاکٹر بیدل حیدری کو اپنے ساتھ اسٹیج پر جگہ دی۔

ڈاکٹر بیدل حیدری جناب سید حیدر دہلوی کے شاگرد تھے۔ جنہیں برصغیر کے پہلے رباعی کے صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ ان کے دیگر شاگردوں میں جناب تابش دہلوی کا شمار ہوتا ہے جو آج کل کراچی میں قیام پذیر ہیں۔ ڈاکٹر بیدل حیدری نے یوں تو کئی ایک شاگرد موجودہ شعری منظر نامے کے سپرد کیے۔ جن میں سے ڈاکٹر پروفیسر جناب اختر شمار کو اپنے دادا استاد حیدر دہلوی پر پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کا بھی اعزاز حاصل ہے' اس کے علاوہ جناب شوکت مہدی، اطہر ناسک' ناصر بشیر اور شکیل سروش نے ان سے باقاعدہ شعری

استفادہ کیا۔

راقم کو ان سے 1995 سے یاد اللہ کا اعزاز حاصل ہے۔ میں وہ خوش بخت ہوں۔ جن کے اعزاز میں انہوں نے متعدد پُر وقار ادبی تقاریب کا اہتمام کیا۔ بلکہ میرے شعری مجموعے ''محبت وحشتوں کا سلسلہ ہے'' میں ان کی رائے نہایت اہم اور معتبر ہے۔

اس آٹھ سالہ فکری وقلبی رفاقت کا اہم ثبوت یہ ہے کہ تقریباً 135 کے قریب خطوط انہوں نے مجھے تحریر کیے جو مستقبل میں ان پر کام کرنے والے شخص کے کام آسکتے ہیں۔ ڈاکٹر بیدل حیدری مرحوم جن کا اصل نام عبدالرحمٰن تھا اور غازی آباد ہندوستان سے اُن کا تعلق تھا ترقی پسند نظریات کے حامل تھے۔ میرے ان کے قرب کی شعری وفکری ہم آہنگی بھی غالباً اسی سبب سے تھی۔ مرحوم پیشے کے اعتبار سے طبیب تھے۔ اور ایف ایس۔ سی میں گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔ اور L S M F بھی تھے۔ انہوں نے شاعری کو اور نظریاتی سیاست کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا۔ انہوں نے معاشی اور مادی دور میں اپنے فن ونظریات سے جو تعلق انتہائی نامساعد حالات میں رہ کر قائم رکھا تھا' اس کی نظیر موجودہ حالات میں کہیں اور ممکن نظر نہیں آتی۔ انہیں یہ اعزاز بھی حاصل تھا، کہ شاعری کے اپنے اُسلوب میں ان کا شعر برصغیر میں شعر کہنے والوں میں اپنی الگ پہچان رکھتا تھا۔

حضرت احمد ندیم قاسمی ان کے خاص قدر دانوں میں شمار ہوتے تھے''فنون'' ایسے علمی ادبی مسلمہ جریدے میں ایک ان کی غزلیں اہتمام سے شائع ہوتی تھیں۔

انہوں نے تین شعری مجموعے''پشت پہ گھر'' ''اوراق گل'' اور وفات سے چند روز قبل شائع ہونے والا شعری مجموعہ'' ان کہی'' شامل ہے۔

ڈاکٹر بیدل حیدری کے اعتراف سخن کا اور کیا ثبوت ہوگا کہ جناب فیض احمد فیض' حبیب جالب' اور احمد فراز جیسی بلند پایہ ادبی شخصیتیں بھی کبیر [illegible] میں ان کے خستہ مکان کی ٹوٹی پھوٹی چار پائی کی پائینتی پر آکر بیٹھتی رہی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جنوبی پنجاب میں جناب ظہور نظر مرحوم کے علاوہ یہ اعزاز کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔ ایک افسوس ناک پہلو شعر کے جدید تر منظر نامے کو سمجھنے والے شعرا کی نذر ضرور کرنا چاہوں گا کہ شعر کی جدید تر روایت کو نبھانے والے شاعر کو آج تک کسی ''ادبی ایوارڈ'' سے نہیں نوازا گیا۔ کسی اہم مشاعرے میں الیکٹرانک میڈیا میں مدعو نہ کیا گیا۔ اور ان کے جنا[illegible] میں شرکت کی توفیق بھی کسی بڑی ادبی شخصیت کو نہ ہو سکی۔ حتیٰ کہ کسی بڑی ادبی تنظیم نے کوئی تعزیتی ریفرنس [illegible] نہ کیا۔ ان کے کمال سخن کے معجزوں میں یہ غزل اصل میں ان کی پہچان کی موجب بنی۔ [illegible] ان کے ہر دو شعری مجموعوں کے فلیپ پر درج ہے۔

[illegible]وک چہروں پہ لیے چاند سے پیارے بچے
بیچتے پھرتے ہیں گلیوں میں غبارے بچے
ان ہواؤں سے تو بارود کی بُو آتی ہے

ان ہواؤں میں تو مر جائیں گے سارے بچے

بارش اُتری تو میں سیلاب کی آغوش میں تھا
پانی اترا تو درختوں سے اُتارے بچے

کیا بھروسہ ہے سمندر کا خدا خیر کرے
سیپیاں چننے گئے ہیں مرے سارے بچے

ہوگا چرخ ستم گر کا کلیجہ ٹھنڈا
مر گئے پیاس سے دریا کے کنارے بچے
یہ ضروری ہے انہیں کل کی ضمانت دی جائے
ورنہ سڑکوں پہ نکل آئیں گے سارے بچے

سارے مظلوموں سے ناطہ ہے ہمارا بیدل
سارے مظلوموں کے بچے ہیں ہمارے بچے

یہ شعر ساخت اور فکر کے اعتبار سے ملاحظہ فرمائیں کمال فن ہے۔

میں نے اتنا سفر تمام کیا
جتنا زنجیر پانے کام کیا

ایسا شعری تیور جناب ڈاکٹر بیدل حیدری کے ہاں ہی نمو پا سکتا ہے۔

گرمی لگی تو خود سے الگ ہو کے سو گئے
سردی لگی تو خود کو دوبارہ پہن لیا

بھونچال میں کفن کی ضرورت نہیں پڑی
ہر لاش نے مکان کا ملبہ پہن لیا

بیدل لباس زیست بڑا دیدہ زیب تھا
اور ہم نے اس لباس کو اُلٹا پہن لیا

آخر میں ان کا یہ شعر اُن کے فن کی سچائی کا ثبوت ہے۔

ان کہی کو کہی بنانا ہے
اعتبار سخن بڑھانا ہے

بیدل حیدری مدتوں شعری منظر نامے میں یاد رکھے جائیں گے۔

عارف عبدالمتین-ایک مکمل ''امبرسری'' شاعر!

عطاء الحق قاسمی

عارف عبدالمتین سے میرے کئی رشتے تھے، پہلا رشتہ پاکستانی ہونے کا اور دوسرا ''امبرسری'' ہونے کا۔ اگر کسی کو ''امبرسری'' ہونے کے مطلب کا پتہ نہیں تو وہ اے حمید سے پوچھے، وہ ان کی تشفی کر دیں گے۔ میرا تعلق بھی ''امبرسر'' کے مڈل کلاس کشمیری گھرانے سے ہے اور عارف عبدالمتین بھی ''پکے پیڈے'' امرتسری کشمیری تھے'' دال بتا'' مچھلی ساگ اور ''گونگلو'' کھانے والے امرتسر میں زیادہ تعداد کشمیر سے ہجرت کر کے آنے والوں کی تھی اور اس شہر میں کشمیری ثقافت ہی Dominate کرتی تھی۔ امرتسر کا جو مکین، کشمیری نہیں تھا، اسے اعزازی کشمیری سمجھا جاتا تھا، جیسے ہمارے شہزاد احمد ''اعزازی کشمیری'' ہیں۔

یہ منتخب روزگار شہر اپنے دامن میں کیا کچھ نہیں سمیٹے ہوئے تھا۔ یہ برصغیر کے نامی گرامی پہلوانوں کا مسکن تھا۔ بیشتر جید علماء کا شہر تھا اور یہی وہ شہر تھا جہاں آج کے اردو ادب کے بڑے بڑے نام نشو ونما پا رہے تھے۔ پاکستان بنا تو ہماری بہت سی صنعتیں اور بہت سے خام مال کے ماخذ انڈیا ہی میں رہ گئے، مگر ایک اثاثہ ایسا تھا جو سب کا سب ہمیں مل گیا۔ اس اثاثے میں سعادت حسن منٹو، صوفی تبسم، آغا شورش کاشمیری، سیف الدین سیف، ظہیر کاشمیری، احمد راہی، اے حمید، مظفر علی سید، شہزاد احمد، علامہ عرشی امرتسری، قیوم نظر، احمد مشتاق، علامہ مشرقی، چوہدری افضل حق، حکیم موسیٰ امرتسری، صلاح الدین ندیم، حافظ امرتسری اور دیگر متعدد اہل قلم اور اہل علم کے علاوہ شہسوار خطابت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور رستم زماں گاماں پہلوان بھی شامل تھے۔ عارف عبدالمتین بھی امرتسر کے اس ادبی قبیلے کے نامور فرد تھے تاہم ان کے امرتسری ہونے میں ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی۔

آپ پوچھیں گے وہ ایک آنچ کی کسر کیا تھی؟ تو بات یہ ہے کہ امرتسری تہذیب یافتہ اور ادب آداب کا قائل ہونے کے باوجود منہ پھٹ بھی ہوتا ہے، بوقت ضرورت قلم ہاتھ سے پرے رکھ کر مار کٹائی بھی کر سکتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں ''لوٹا بم'' امرتسریوں کی ہی ایجاد تھا۔ یہ ''لوٹا بم'' صرف مٹی کا لوٹا تھا جس کے سٹاک امرتسریوں نے اپنے مکانوں کی چھتوں پر جمع کر رکھے تھے، جب شر پسند عناصر ان کے گھروں پر حملہ آور ہوتے تو

وہ ان پر لوٹوں کی بارش کر دیتے، مٹی کا لوٹا ان کے سر پر یا گلی میں گر کر پھٹتا تو خوفناک دھماکہ ہوتا جس کی وجہ سے سارے علاقے میں "لوٹا بم" مشہور ہو گیا۔ مگر عارف عبدالمتین ایک صلح جو، خاموش طبع اور نہایت صابر قسم کے امرتسری تھے۔ میں نے اشتعال انگیز حالات میں بھی انہیں غصے میں نہیں دیکھا اور اگر کبھی دیکھا بھی تو ان کی آواز کا والیم اتنا ہی رہتا تھا جتنا عام حالات میں ہوتا تھا!

عارف عبدالمتین اپنے نظریات میں راسخ تھے لیکن اختلاف کرتے وقت احترام کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ وہ اپنی بات دلیل سے منواتے تھے حالانکہ بطور امرتسری اس کی انہیں چنداں ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں عارف صاحب ایسے مہذب، بااخلاق اور شریف النفس انسان کم کم دیکھے ہیں۔ فی زمانہ ادیبوں کے ایک حلقے میں صفات کچھ زیادہ قابل ستائش نہیں ہیں۔ ان دنوں تو ایک گروہ غزلیں نظمیں بھی قلم کی بجائے گنڈاسے سے لکھتا اور گنڈاسے کے زور پر انہیں ادب کا حصہ تسلیم کراتا ہے۔

جہاں تک عارف صاحب کی شاعری اور ان کی تنقید نگاری کا تعلق ہے، یہ نقادوں کا کام ہے کہ وہ اس حوالے سے عارف صاحب کی حق تلفی نہ ہونے دیں کیونکہ میں پوری دیانتداری سے سمجھتا ہوں کہ اردو ادب کی تاریخ میں عارف صاحب کا کام نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

میری ان سے آخری ملاقات نیویارک کی ایک شعری نشست میں ہوئی۔ ان کا فرمانبردار بیٹا نوروز انہیں اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ عارف صاحب بظاہر بہت بیمار لگتے تھے، خصوصاً ان کی آواز پہلے سے بھی زیادہ نحیف ہو گئی تھی لیکن یہ دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ ان کا تخلیقی جوہر پوری طرح برسرِعمل تھا بلکہ میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ مجھے ان کی اس دور کی شاعری پر ان کی زندگی کی بہترین شاعری کا گمان گزرا۔

اور اب ایک ماہ قبل عمران نقوی نے مجھے اطلاع دی کہ عارف صاحب انتقال کر گئے ہیں۔ مجھے ایم اے او کالج میں بطور کولیگ ان کے ساتھ گزرے ہوئے وہ سارے ماہ و سال یاد آ گئے جو میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ چشتیہ ہائی سکول کے صحن میں، جب میں ان کے بے شمار عقیدت مندوں کے ساتھ ان کا آخری دیدار کر رہا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ جو شخص میرے سامنے سفید کفن اوڑھے سویا ہوا ہے، اس نے برس ہا برس تک موت کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ آخر وقت تک اس سے پنجہ آزمائی کرتا رہا ہے۔ تب میں نے اپنے وہ الفاظ واپس لے لئے جس میں میں نے کہا تھا کہ عارف صاحب کے امرتسری ہونے میں ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی۔ یقیناً ایسا نہیں تھا۔ یہ بہادر شخص تو پورے کا پورا امرتسری تھا!

اسلم کولسری کے شعری مجموعے

نخل جاں	نیند
کاش	جیون
ویرانہ	برسات
پنچھی	عنبر

اپنا گریباں چاک

اپنا گریباں چاک

(ڈاکٹر جاوید اقبال بنام انور محمود خالد!)

مورخہ ۱۶ اپریل ۲۰۰۴ء

محترمی جناب ڈاکٹر صاحب السلام علیکم

آپ کا خط بمعہ آپ کی ریڈیائی تقریر اور ''اپنا گریبان چاک'' پر مشفق خواجہ صاحب کے طویل خط کی فوٹو کاپی موصول ہو گئے۔ میری طرف سے شکریہ قبول فرمایئے۔ آپ کے لئے اپنے دو مقالوں کی فوٹو کاپیاں بنوا رکھی ہیں۔ تیسرا مقالہ (تاریخ مجھ سے بات کر) عطاء الحق قاسمی کے ''معاصر'' میں شائع ہو چکا ہے۔ شاید آپ کی نظروں سے گزرا ہو۔ فراغت ہوئی تو قرۃ العین طاہرہ پر ڈراما لکھوں گا۔ کچھ اور منصوبے بھی ہیں۔ ملاقات پر بات ہو گی۔ فی الحال تو زندہ رود اور اپنے ڈراموں، افسانوں اور مقالوں کے مجموعوں کو اکٹھا کر کے جہان جاوید ترتیب دے رہا ہوں۔ دونوں کتابیں دو ایک ماہ میں شائع ہو جائیں گی۔

مشفق خواجہ صاحب کا تبصرہ اپنی نوعیت کا ہے۔ اپنا گریبان چاک تو میری طرف سے ایک طرح کا ''شکوہ'' تھا۔ مگر انہوں نے ''شکوہ'' کی خامیوں یا خوبیوں پر اکتفا کرنے کی بجائے ''جواب شکوہ'' لکھ ڈالا۔ یعنی تمہارا ''شکوہ'' بجا نہیں۔ تم نے محمدؐ سے وفا نہیں کی۔ اس لئے ہم تمہارے نہیں ہیں۔ یہ تبصرہ نما خط نہیں بلکہ ''تبصرہ نصیحت نما'' ہے۔

خیر اندیش

جاوید اقبال

اپنا گریبان چاک

ڈاکٹر انور محمود خالد

جسٹس (ریٹائرڈ) ڈاکٹر جاوید اقبال اپنی خودنوشت سوانح حیات: ''اپنا گریبان چاک'' کے ''پیش لفظ'' میں لکھتے ہیں:

''میرے والد علامہ محمد اقبال، ایک عظیم شاعر، فلسفی اور تصورِ پاکستان کے خالق سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے فرزند ہونے کی حیثیت سے زندگی کے مختلف ادوار میں میرا ردِعمل مختلف رہا ہے۔ بچپن میں باپ کے حوالے سے پہچانا گیا تو میں نے برا نہیں منایا، کیونکہ مجھے علم ہی نہ تھا کہ وہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں؟ جوان ہوا تو تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا۔ یہ میرے پدرم سلطان بود کی بنا پر فخر کا مقام تھا۔ زندگی میں اچھا/ برا اپنا مقام پیدا کیا، تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا، تو مجھے بہت برا لگا۔ یہ میری ''انا'' کی نشوونما میں مداخلت تھی۔ اب بوڑھا ہو چکا ہوں، تب بھی باپ کے حوالے سے میری شناخت ہوتی ہے۔ عجیب اتفاق ہے، میرے والد کے پرستاروں نے مجھے بڑا ہونے نہیں دیا۔ ہمیشہ چھوٹا سا بچہ ہی سمجھا گیا۔ یعنی تن آور درخت کے سائے تلے ایک ننھا سا پودا پروان چڑھتا ہے۔ وہ دراز قد ہو جائے، اپنی صورت نکال لے، تب بھی پودا ہی رہتا ہے اور بڑے درخت کے حوالے ہی سے پہچانا جاتا ہے۔

بہر حال میں نے کن حیلوں سے ایک بہت بڑے درخت کے سائے سے نکل کر اپنا مقام پیدا کرنے کی کوشش کی۔ تگ و دو کے اس عالم میں کیا میں اس سائے سے نکل کر اپنا سایہ بنا سکا؟ میں کس حد تک کامیاب ہوا اور کس حد تک ناکام؟ فقط یہی میری داستانِ حیات ہے۔''

اپنی خودنوشت سوانح حیات ''اپنا گریبان چاک'' پر ڈاکٹر جاوید اقبال کے یہ تعارفی جملے بہترین تبصرہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فرزندِ اقبال ۔۔۔۔ جاوید اقبال کا نفسیاتی المیہ یہ ہے کہ انہوں نے قدم قدم پر اپنا موازنہ اپنے والدِ گرامی سے کیا ہے اور ہر جگہ خود کو ان کے مقابلے میں چھوٹا محسوس کیا ہے حالانکہ جس طرح کسی باپ کے

لئے یہ حقیقت باعث شرم نہیں ہوتی کہ اس کا بیٹا زندگی کی دوڑ میں اس سے آگے نکل گیا ہے، اسی طرح کسی بیٹے کو بھی یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ اس کا باپ علمی و ادبی دنیا میں اتنا بلند مقام ہے کہ وہ چاہے بھی تو ان بلندیوں کو نہیں چھو سکتا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے دنیاوی اعتبار سے وہ سب کچھ بڑی آسانی سے حاصل کیا ہے جو ان کے نامور والد نے قدرے طویل جدوجہد کے نتیجہ میں اور نا مساعد حالات کے باوجود، حاصل کیا اور وہ کچھ بھی، جو ان کے فقیر منش والدِ گرامی خواہش و حسرت کے باوجود حاصل نہیں کر سکے۔ باپ ہی کی طرح جاوید اقبال نے فلسفہ میں ایم۔ اے کیا۔ بارایٹ لا کیا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی۔ پروفیسر بنے۔ وکیل بنے۔ کتابیں لکھیں۔ مقالے لکھے۔ سیاست میں حصہ لیا۔۔۔ قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی اور اپنے علمی خطبات کے ذریعے اپنی قابلیت کا سکہ بٹھایا۔ شہرت کمائی، عزت کمائی، دولت کمائی اور رزق حلال کے ذریعے، قابلِ اطمینان، آبرومندانہ، آسودہ زندگی گزاری۔ بلکہ ڈاکٹر جاوید اقبال نے دنیاوی ترقی میں باپ سے کئی قدم آگے بھی بڑھ گئے کیونکہ علامہ اقبال نہ جج بن سکے تھے اور نہ چیف جسٹس، لیکن ڈاکٹر جاوید اقبال پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدہ جلیلہ پر بھی فائز ہوئے اور سپریم کورٹ آف پاکستان کے واجب الاحترام جج بھی بنے۔۔ سرخاب کے یہ دو پر واقعی بیٹے کی ٹوپی میں، زائد ہیں جب کہ باپ کا طرۂ دستار ان سے محروم رہا۔ جاوید اقبال چاہیں تو اس امتیاز پر فخر کر سکتے ہیں کیونکہ یہاں (صرف یہاں) ان کا سایہ، باپ کے سائے سے آگے نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کیا یہ موازنہ پدر و پسر درست ہے؟۔۔۔ غالباً نہیں۔۔۔ کیونکہ علامہ اقبال، اس لیے علامہ اقبال نہیں بنے کہ وہ ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی اور بارایٹ لاء تھے یا اس وجہ سے کہ وہ ایک قابل وکیل تھے۔ یا اس وجہ سے کہ وہ ملکی سیاست میں حصہ لے کے مصور پاکستان بنے۔ علامہ اقبال کو امتِ مسلمہ نے اس شہرہ آفاق شاعری کی وجہ سے سر آنکھوں پر بٹھایا جو حیات و کائنات کے اسرار کی نقاب کشائی کرتی ہے اور جس نے ایک نازک موڑ پر ہندی مسلمانوں کی کشتی کو بے یقینی کے گرداب سے نکال کر ساحلِ مراد سے ہمکنار کیا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی کتاب کے ''پیش لفظ'' میں علامہ اقبال کے ایک خط کا اقتباس بھی درج کیا ہے جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ ان کی زندگی میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں جو دوسروں کے لیے سبق آموز ہو سکے۔ البتہ خیالات کے تدریجی انقلاب کے بارے میں وہ اپنے دل و دماغ کی سرگذشت خود قلم بند کرنا چاہتے تھے جس کی انھیں فرصت نہ ملی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال اس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ انھیں عمر کے اس حصے میں اپنی گذشتہ زندگی پر ناقدانہ نظر ڈالنے کی فرصت حاصل ہوئی اور انہوں نے اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں، حسرتوں اور تمناؤں، کردہ اور ناکردہ لغزشوں کا پورا ریکارڈ، اپنے زمانے کے سامنے رکھ دیا ہے۔

''اپنا گریبان چاک'' کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے مصنف نے اپنی سرگذشتِ حیات سناتے وقت کہیں بھی لاف زنی، دروغ گوئی، خبطِ عظمت کی نمائش اور اخفا سے کام نہیں لیا۔ ہمارے راہرو راہِ محبت

(جاوید اقبال) کے راستے میں بھی دو چار نہیں، کئی سخت مقامات آئے لیکن ان پر آفرین ہے کہ اظہار صداقت میں ان کے قدم کہیں نہیں لڑکھڑائے اور وہ ایک باوقار، صاف گو اور مضبوط اعصاب کے مالک انسان کی طرح ان مراحل کو مردانہ وار طے کر گئے۔

کتاب کے سب سے اہم مقامات وہ ہیں جہاں ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے خاندانی حالات بیان کیے ہیں۔ یہاں انھیں یہ بتاتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ ان کے ددھیال اور ننھیال، دونوں کا تعلق نچلے متوسط طبقے سے تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنی والدہ اور اپنے والد کی جو لفظی تصویریں کھینچی ہیں، وہ سچی اور حقیقی ہونے کی وجہ سے بڑی دلکش ہیں، حالانکہ جب ان کی والدہ نے وفات پائی تو ان (جاوید اقبال) کی عمر گیارہ برس تھی اور جب ان کی والد فوت ہوئے تو وہ چودہ برس کے کم سن نوجوان تھے۔ یوں انھیں عالم ہوش وحواس میں اپنی والدہ کے ساتھ صرف چھ سال اور والد کے ساتھ صرف نو سال گزرنے کا موقع ملا۔۔۔ لیکن جاوید اقبال کے حافظے کی داد دینا پڑتی ہے کہ انھیں کم سنی اور طفلانہ لاپروائی کے باوجود اس زمانے کی زندگی کی تمام جزئیات یاد ہیں اور وہ انہوں نے مزے لے لے کر سنائی ہیں۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے گارڈین چوہدری محمد حسین اور اپنی اتالیق (گورنس) مسز ڈورس احمد کا ذکر بھی بڑی عقیدت، احترام اور محبت سے کیا ہے۔ دونوں نے علامہ اقبال کی وفات کے بعد نوجوان جاوید اقبال اور ان کی کم سن بہن منیرہ کی پرورش، نگہداشت، تعلیم اور شادی وغیرہ کے مراحل طے کرنے میں، جس شفقت، خلوص اور احساسِ ذمے داری کا ثبوت دیا اور جس طرح ان کے مالی معاملات کی دیانتدارانہ حفاظت کی اور دونوں بہن بھائیوں کی زندگی میں اپنے قدموں پر کھڑا ہونے میں قدم قدم پر سہارا دیا، اس کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال نے بے مثال صاف گوئی، احسان شناسی، شرافت اور انسان دوستی کا مظاہرہ کیا ہے۔

''اپنا گریبان چاک'' اس اعتبار سے بھی دورِ حاضر کی خودنوشت سوانح عمریوں میں ایک اعلیٰ مقام کی حامل قرار پائے گی کہ یہ ایک بڑے باپ کے نامور بیٹے کے دل ودماغ کی انتہائی دلچسپ سرگذشت ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی ۷۷ سالہ بظاہر کامیاب زندگی کے ان تمام گوشوں کو منور کیا ہے جن کا تعلق عدالت، سیاست اور ادب سے تھا اور جن میں ان کی عطا، کہیں کم ہے اور کہیں زیادہ۔۔۔ لیکن غیر اہم کوئی بھی نہیں۔ پہلے ''زندہ رود'' کے نام سے انہوں نے اپنے والد، علامہ اقبال کی ضخیم سوانح عمری لکھی تھی اور وہ اپنے موضوع پر بہترین کتاب تھی۔ اب ''اپنا گریبان چاک'' کے عنوان سے انہوں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات لکھی ہے اور یہ بھی اپنے موضوع پر بہترین کتاب ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر ''اپنا گریباں چاک'' نہ لکھی جاتی تو ہم ڈاکٹر جاوید اقبال کی شخصیت وکردار کے کئی دلآویز پہلوؤں سے بے خبر رہتے۔

☙

اپنا گریبان چاک

مشفق خواجہ کا خط انور محمود خالد کے نام

ڈاکٹر انور محمود خالد

۳ ڈی۔ ۲۶/۹

ناظم آباد۔ کراچی ۷۴۶۰۰

۱۰ مارچ ۲۰۰۴

محترمی و مکرمی۔ سلام مسنون

یہ جان کے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے ریڈیو سے اردو آپ بیتیوں پر ایک سلسلہ تقاریر شروع کیا ہے۔ آپ نے اردو اور انگریزی کی بے شمار آپ بیتیاں دیکھی ہیں اور اس موضوع پر عالمانہ نظر رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ جب یہ سلسلہ تقاریر مکمل ہوگا تو آپ نظر ثانی کر کے اسے کتابی صورت میں شائع کریں گے۔ نظر ثانی کی بات اس لیے لکھ رہا ہوں کہ ریڈیو کی کچھ محدودات ہوتی ہیں، اس وجہ سے موضوع کے ساتھ اس طرح انصاف نہیں کیا جا سکتا جس طرح کسی علمی و ادبی جریدے کے لیے مضمون لکھتے وقت سارے پہلوؤں کو سامنے رکھ کر بحث کی جاتی ہے۔

آپ نے "اپنا گریبان چاک" پر اپنی تقریر کی جو نقل بھیجی ہے، میں اسے پڑھ کر محظوظ ہوا۔ آپ نے ریڈیو کی محدودات کا بھی خیال رکھا ہے اور موضوع کا حق ادا کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ تاہم اس شذرے کو تنقیدی مقالات کی صف میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کتاب کے بہت سے پہلو ایسے ہیں کہ اگر آپ ان پر بحث کرتے تو قاری کو کتاب کے عیوب و محاسن کے سمجھنے میں آسانی ہوتی۔

مجھے اس کتاب کے چھپنے کی اطلاع (شائع ہونے کی نہیں) ڈاکٹر داؤد رہبر سے ملی تھی۔ اعجاز بٹالوی کے پاس اس کا ایک قبل از اشاعت نسخہ تھا جو انھیں مصنف نے اس خیال سے دیا تھا کہ وہ اس پر ایک نظر ڈال کر اطمینان کر لیں کہ اس میں کوئی بات قابل اعتراض تو نہیں۔ وہ امریکہ گئے تو کتاب ساتھ لے گئے اور واپس آتے

وقت کتاب ڈاکٹر داؤد رہبر کو پیش کر دی۔ جب ڈاکٹر رہبر نے اس کے طبع ہونے کا ذکر کیا تو جی چاہا فوراً اس سے استفادہ کروں۔ لاہور ایک دوست کو فون کیا تو انھوں نے بتایا کہ چھپنے کی حد تک بات درست ہے البتہ اشاعت میں کچھ وقت لگے گا کیوں کہ تصویروں کے انتخاب کا مسئلہ قدرے پیچیدہ ہو گیا ہے۔ میں بڑی بے تابی سے انتظار کرتا رہا۔ جب یہ شائع ہوئی تو میں نے اسے بلا تاخیر حاصل کیا۔ آپ ہی کی طرح مجھے بھی آپ بیتیوں سے دلچسپی ہے، اور پھر یہ تو علامہ اقبال کے فرزند کی آپ بیتی تھی، اس لیے میں نے اسے بڑے اشتیاق سے پڑھا۔

بلا شبہ یہ ایک دلچسپ کتاب ہے، اپنے مواد اور اسلوب تحریر دونوں کے اعتبار سے۔ اس کا بنیادی وصف Readability ہے۔ کتاب پہلے ہی صفحہ سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور جوں جوں کتاب آگے بڑھتی ہے، یہ گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ میں نے یہ خوبی بہت کم کتابوں میں پائی ہے۔

اس کتاب کی ایک خوبی ایسی بھی ہے، جو اردو زبان کی کسی کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ یہ کتاب صرف لفظوں ہی میں نہیں لکھی گئی، تصویروں میں بھی بیان کی گئی ہے۔ مصنف نے جتنا کچھ لفظوں میں کہا ہے، اس سے کہیں زیادہ تصویروں کی زبانی بیان کر دیا ہے۔ خصوصاً ان بے نام-------------------------

افسوس صد افسوس کہ پچھلے ہفتے ان کا انتقال ہو گیا۔ کیسا نفیس انسان ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔ مجھے ان سے نیاز مندی کا شرف حاصل تھا۔ کراچی آتے اور اگر وقت ہوتا تو کسی ہوٹل میں ملاقات کے لیے وقت نکالتے۔ اکثر یہ ملاقات حمید نسیم مرحوم کے ساتھ ہوتی۔ ایک دو مرتبہ مشتاق احمد یوسفی صاحب بھی شریک محفل ہوئے۔ میں لاہور جاتا تو ان سے ملاقات کی کوشش کرتا۔ آخری ملاقات اکتوبر ۲۰۰۲ء میں ڈاکٹر اور مگ زیب عالم گیر کے دولت خانے پر ہوئی جہاں ڈاکٹر صاحب نے بہت سے کرم فرماؤں کو جمع کر رکھا تھا۔ اعجاز صاحب بیماری کے باوجود اس محفل میں موجود تھے۔ کیا خبر تھی کہ یہ آخری ملاقات ہے۔

چہروں کی زبانی جو انگلستان میں مصنف کے سلسلہ روز و شب کے رفیق تھے۔ (یہاں آپ لفظ ''روز'' کو غیر ضروری قرار دے کر حذف کر سکتے ہیں)۔

کتاب کا ایک نمایاں وصف مصنف کی بے باکی ہے۔ ''بے باکی'' کے ساتھ ایک اور لفظ بھی استعمال ہوتا ہے ''حق گوئی''۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ کتاب حق گوئی و بے باکی کا عمدہ نمونہ ہے کیوں کہ آپ بیتی میں حق کا منبع لکھنے والے کی ذات ہوتی ہے، اس لیے حق بھی ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ لکھنے والا پیش کرتا ہے۔ لیکن بے باکی یہ ہے کہ لکھنے والا ایسی باتیں بھی لکھ دے جو کوئی دوسرا کہنے کی جرأت نہ کر سکے۔ جرأت کی یہ کمی عموماً اپنے آپ کو پارسا بنا کر پیش کرنے کا نتیجہ ہوتی ہے یا پھر لکھنے والا معاشرتی و اخلاقی دباؤ کے تحت جرأت اظہار سے محروم ہو جاتا ہے۔ ''اپنا گریباں چاک'' ایک بے باک بلکہ بہادر انسان کی آپ بیتی ہے جو اپنے بارے میں ہر بات کہنے کی جرأت رکھتا ہے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''کیمبرج کے 'ڈیریڈیول' لڑکوں نے بھی صحیح طور پر 'کیمبرج مین' کا اسٹیٹس کوالی فائی کرنے کے لیے چند قواعد بنا رکھے تھے۔ مثلاً پراکٹرز اور اس کے تیز رفتار بل ڈاگز کے ہاتوں سے بچ نکلنا، رات کے دو بجے کالج کا لوہے کا گیٹ پھلانگ کر بغیر پکڑے جانے کے اپنے کمرے تک پہنچنا اور سب سے اہم لڑکیوں کے کالج کے اندر بغیر پکڑے گئے پوری رات گزارنے میں کامیاب ہونا۔ اپنے پانچ سالہ کیمبرج کے قیام میں میں ان تین میں سے دو قواعد کو الی فائی کرنے میں کامیاب رہا۔ وہ کون سے دو قواعد تھے؟ یہ ایک پہیلی ہے جسے کوئی بوجھے تو جانیں''۔ (ص ۷۶)

دیکھیے کتنے خوب صورت پیرائے میں مصنف نے بتا دیا ہے کہ وہ لڑکیوں کے کالج میں بغیر گرفت میں آئے، پوری پوری راتیں گزارتے رہے ہیں۔ موصوف نے'' کیمبرج مین'' کا اسٹیٹس کوالی فائی کرنے کے لیے جو تین قاعدے بتائے ہیں، ان میں سے پہلے دو تو ایک ہی قاعدے کے دو اجزا ہیں، لہٰذا تین نہیں، اصل میں دو قاعدے ہی ہیں جنھیں کوالی فائی کرنے میں وہ کامیاب رہے۔

بے باکی کے اظہار کی ایک مثال وہ بھی ہے جب ڈاکٹر صاحب نے اپنے عظیم والد کے انتقال پر اطمینان کا سانس لیا، بلکہ خوش ہوئے اور ان کی عائد کردہ پابندیوں کو توڑ کر آسودگی حاصل کی۔

لکھتے ہیں:

''والد کی وفات کے بعد میں ان کے نافذ کردہ ڈسپلن سے آزاد ہو گیا۔ جن باتوں سے انھوں نے منع کر رکھا تھا، میں نے بڑی رغبت سے ان میں سے ہر ایک کو اپنایا۔ صحیح و غلط میں غلط اور نیکی و بدی میں بدی کا رستہ منتخب کرنا بہتر سمجھا۔ اگر سرِ شام گھر میں موجود رہنے کا حکم تھا تو میں آدھی رات سے پہلے گھر میں قدم نہ رکھتا۔ اگر سینما دیکھنا منع تھا تو ہر روز دو دو بلکہ تین تین شو دیکھتا۔ روز مرہ کے باورچی خانے کے حساب لکھتے وقت پیسوں میں گھپلا کرتا۔ رنگ برنگی ریشمی قمیصیں، مہنگے ولایتی بوٹ اور یورپی انداز کے سلے ہوئے سوٹ، نکٹائیاں، اوورکوٹ، دستانے اور فلٹ ہیٹ زیب تن کرتا .... اس زمانے میں مال روڈ پر کر پارام اچھی قمیصیں سینے میں مشہور تھا.......... مال روڈ پر ہی لاہور کے مشہور ریسٹورنٹ اور ہوٹل واقع تھے۔ اسٹینڈرڈ، اسٹیفلو، میٹرو، فلیٹیز، نیڈوز وغیرہ بھی مے نوشی، یورپی طرز کے رقص و سرود اور رات کے کھانے کے لیے معروف جگہیں تھیں''۔ (ص ۷۴۔ ۷۶)

یہ اس جاوید اقبال کا حال ہے جس کے لیے اقبال نے یہ دعا کی تھی:

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

علامہ اقبال کی دعا قبول ہوئی مگر صرف کپڑوں کی حد تک۔ عزیز موصوف نے کیسے کیسے بے داغ لباس زیب تن کیے! انھیں جاوید اقبال کو علامہ نے نصیحت بھی کی تھی۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

جاوید اقبال نے اس نصیحت پر لفظاً و معناً عمل کیا۔ پہلے یہیں لاہور میں اور پھر انگلستان جا کر۔ علامہ لفظ ''عشق'' کو جن وسیع اور بلند معنوں میں استعمال کرتے ہیں، جاوید اقبال کو ان سے سروکار نہیں تھا، ان کے ہاں یہ لفظ ان معنوں میں مستعمل رہا جن معنوں میں حالی کے اس شعر میں آیا ہے:

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا، اس کو بٹھا کے چھوڑا

علامہ نے انھیں یہ نصیحت بھی کی تھی:

میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مے لالہ فام پید اکر

غرض ـــ مے لالہ فام پیدا کرنا خاصا پیچیدہ اور مشکل کام تھا جسے مال روڈ لاہور کے ہوٹلوں نے خاصا آسان کر دکھایا۔

ان جملہ ہائے معترضہ کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی والد کی وفات کے بعد فرزند ارجمند کی آزادہ روی کی۔ لاہور میں پھر انگلستان میں بھی انھیں حسن بازار سے لے کر حسن بزم خاص تک سے محظوظ ہونے کے مواقع ملے اور بالآخر ہر طرح کے بازاروں سے گزرنے کے بعد یہ نظریہ قائم کیا:

''ایسا شخص جس نے گناہ نہ کیا ہو یا بدی کا راستہ اختیار نہ کیا ہو یا جو فرشتہ سیرت ہو، عموماً بے وقوف ہوتا ہے''۔ (ص ۵۰)

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر جاوید اقبال کی دانش مندی یا دانش وری بے بنیاد نہیں ہے۔ اسی دانش مندی نے اس زمانے میں بھی جب وہ انصاف کی کرسی پر اور ہاتھوں میں انصاف کا ترازو لیے ہوئے بیٹھے تھے، ان کو اس قسم کے نظریات پر ثابت قدم رکھا:

''جنرل ضیاء الحق کے دور میں پی سی او کے تحت .... جن جج صاحبان نے اصولاً حلف نہ اٹھایا، وہ بھی اپنی جگہ درست تھے اور جنھوں نے آمر کے حکم پر حلف اٹھا لیا، وہ بھی غلط نہ تھے۔'' (ص ۲۱۶)

اسی کو کہتے ہیں: رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کی بے باکی یعنی جرأت اظہار کے سلسلے میں ان بیانات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جو انگریزی تمدن میں گم ہو جانے (ص ۷۷) ہم جنس پرست لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان گھومتے (ص ۸۰) اور ساری ساری رات رقص کرنے (ص ۸۲) سے متعلق ہیں۔ بے باکی کی انتہا وہاں نظر آتی ہے جہاں وہ حسینوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنے خیالات کی تائید میں اپنے والدِ محترم کے اشعار پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں:

''لڑکیاں جو کیمبرج میں میری واقف بنیں، ان میں سے بیشتر کا تعلق مصوری، مجسمہ سازی یا ساز سنگیت ہی سے تھا۔ ان میں بعض تو بے حد خوب صورت تھیں، گویا ہاتھ لگانے سے ان کے میلے ہو جانے کا امکان تھا۔ مگر بقول علامہ اقبال:

چوں نظر قرار گیرد بہ نگار خوب روئے
تپد آں زماں دل من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم، ز ستارہ آفتابے
سر منزلے نہ دارم کہ بمیرم از قرارے
(ص ۸۳)

علامہ اقبال نے جو بات ایک وسیع تناظر میں کہی تھی، جاوید اقبال نے اسے ''نگار بازی'' تک محدود کر کے ''ریش بابا'' سے بھی کھیلنے کی جسارت کی ہے اور یہ ہے کہ پہلے شعر کا ترجمہ کرتے ہوئے بھی اپنے مزاج و مذاق کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ فرماتے ہیں: ''میری نگاہ جب کسی ماہ جبین کے حسن پر پڑتی ہے تو اسی لمحے میرا دل اس سے بھی خوب تر کسی حسینہ کے لیے دیوانہ وار خواہش کرنے لگتا ہے''۔ (ص ۸۳-۸۴)۔ اگر علامہ اقبال کو معلوم ہوتا کہ ان کے خوب سے خوب تر کی تلاش کے فلسفے کو محض ہوس پرستی سمجھا جائے گا اور سمجھنے والے بھی ان کے فرزند ارجمند ہوں گے تو وہ شاید شاعری ترک کر دیتے۔

مینڈک کی ٹانگیں (ص ۱۲۳) اور بعد ازاں سالم مینڈک کھانے والے (ص ۱۲۹) کی بے باکی کا ایک ثبوت اس وقت بھی ملتا ہے جب وہ بڑے خوب صورت پیرائے میں امریکی جمہوریت پر طنز کرتے ہیں:

''۔۔۔۔۔ ایک خاتون لفٹ میں داخل ہوئیں جنھوں نے نہایت بیش قیمت فرکوٹ (پوستین) زیب تن کر رکھا تھا۔ فرکوٹ، شاید اتفاقاً یا دیدہ دانستہ طور پر سامنے سے سرک گیا۔ وہ مادر زاد برہنہ تھیں۔ صرف جوتے پہن رکھے تھے۔ میرے دل سے فوراً نکلا: اصل جمہوریت تو امریکہ ہی میں ہے''۔ (ص ۱۳۱)

اسی بے باکی کا نتیجہ ہے کہ کتاب میں کئی جگہ ڈاکٹر صاحب نے اظہار افسوس کیا ہے کہ انھیں فرزند اقبال یعنی میوزیم پیس سمجھا جاتا ہے جب کہ وہ اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ دیباچے میں لکھتے ہیں:

''بچپن میں باپ کے حوالے سے پہچانا گیا تو میں نے برا نہیں منایا کیوں کہ مجھے علم ہی نہ تھا کہ وہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ جوان ہوا تو تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا۔ یہ میرے لیے پدرم سلطان بود کی بنا پر فخر کا مقام تھا۔ زندگی میں اچھا برا اپنا مقام پیدا کیا، تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا تو مجھے بہت برا لگا۔ یہ میری انا کی نشوونما میں مداخلت تھی۔ اب بوڑھا ہو چکا ہوں، تب بھی باپ کے حوالے سے میری شناخت ہوتی ہے۔ عجیب اتفاق ہے، میرے والد کے پرستاروں نے مجھے بڑا ہونے نہیں دیا۔ ہمیشہ چھوٹا سا بچہ ہی سمجھا گیا''۔ (ص ۸)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''مجھے علامہ اقبال کے حوالے سے میوزیم پیس کی طرح پاکستان کے اکثر حکمران بیرونی مہمان شخصیات سے متعارف کراتے رہے ہیں''۔ (ص ۱۹۳)

ایک مرتبہ مجید نظامی نے ڈاکٹر جاوید اقبال کی موجودگی میں ایک جلسے میں یہ کہا:

''یہ حقیقت ہے کہ جاوید اقبال کو علامہ اقبال کے گھر پیدا ہونے پر بڑا غصہ ہے۔ نیز وہ علامہ اقبال سے آگے نکل جانے کی خاطر ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں''۔ (ص ۲۶۶)

اس الزام کا جواب دیتے ہوئے جاوید اقبال فرماتے ہیں:

''مجھے علامہ اقبال کے گھر پیدا ہونے یا ان کے فرزند ہونے پر غصہ نہیں، البتہ علامہ اقبال کے ان پرستاروں پر غصہ ضرور آتا ہے جو ان کے افکار کی نفی کرتے ہوئے مجھے صرف فرزند اقبال کی حیثیت سے جاننا چاہتے ہیں، اور اس فریم سے میرا باہر نکلنا انھیں ناگوار گزرتا ہے۔ میں جب کبھی ملک سے باہر لیکچروں کے لیے بلوایا جاتا ہوں تو میری شناخت جاوید اقبال کے طور پر ہوتی ہے۔ مگر میں اسے اپنی بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ اپنے ملک کے اندر میری حیثیت 'فرزندِ اقبال' کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جب ۱۹۷۷ء میں وفاقی حکومت نے ہمارے گھر جاوید منزل کو اقبال میوزیم بنانے کی خاطر خرید لیا تو میرے دو معصوم بچوں نے مجھ سے سوال کیا کہ ابو، اب ہمارا کیا بنے گا۔ میں نے انھیں کہا کہ تم دونوں کو علیحدہ علیحدہ بوتلوں میں بند کر کے یہاں سجا دیا جائے گا۔ کہنے لگے: اور آپ کہاں جائیں گے۔ میں نے جواب دیا: بیٹا میں تو پہلے ہی بوتل میں بند ہوں''۔ (ص ۲۶۶)

گستاخی معاف، جاوید اقبال کی شناخت ملک میں اور بیرون ملک یکساں ہے۔ یعنی وہ فرزندِ اقبال ہی کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں اور انھیں زندگی میں جو کچھ ملا، وہ مالی آسودگی ہو یا عہدے، وہ اعزازی ڈگریاں ہوں یا غیر ملکی اسفار کے پے در پے موقع، یہ ان کی ذاتی کوشش کا نہیں، فرزندِ اقبال ہونے کا نتیجہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے تعلیم کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں، لیکن یہ ڈگریاں ہزاروں نہیں، لاکھوں افراد حاصل کرتے ہیں، لیکن ان کو وہ مرتبہ، وہ حیثیت اور مقام نہیں ملتا جو جاوید اقبال کو ملا۔ جاوید اقبال نے علم و ادب کی دنیا میں یا کسی دوسرے فن کے حوالے سے کوئی ایسا کارنامہ بھی انجام نہیں دیا جو بے مثال ہو تو پھر اپنی الگ پہچان اور الگ شناخت پر اصرار کیوں؟

ڈاکٹر صاحب کے علمی و ادبی کاموں میں جو کام کی حد تک اہمیت رکھتا ہے، وہ اقبال کی سوانح عمری ''زندہ رود'' ہے۔ بلاشبہ اقبالیات میں اس کا درجہ بلند ہے اور اس کے مصنف کی حیثیت سے انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہاں بھی ان کی شناخت اقبال ہی کے حوالے سے ہوگی۔ اور مطالب کتاب کے استناد کی وجہ بھی یہی ہوگی کہ لکھنے والا فرزندِ اقبال ہے۔

''اپنا گریباں چاک'' کیا اختتامی حصے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''میں اپنی کوتاہیوں سے بخوبی آگاہ ہوں۔ میں نہ اچھا مصور بن سکا، نہ اچھا ادیب، نہ اچھا سیاست دان، نہ اچھا وکیل، نہ اچھا جج، نہ اچھا شوہر، نہ اچھا باپ۔ میری زندگی میں آسودگی میری اپنی محنت کا ثمر نہیں بلکہ میری رفیقۂ حیات کی مشقت کا نتیجہ ہے''۔ (ص ۳۸۳)

اگر اس بیان کو روایتی انکسار کی بجائے ڈاکٹر صاحب کی حقیقت پسندی کا نتیجہ سمجھا جائے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ جہاں آپ کو بہت کچھ اہلیہ محترمہ کے ذریعے ملا ہے، وہیں شناخت کے طور پر جو دولت بیدار والد محترم کے حوالے سے ملی ہے، اسے بھی صبر و شکر کے ساتھ قبول کر لینا چاہیے۔

اصل قصہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے خود ہی اپنی شناخت بنانے کی کوشش نہیں کی، اس نیک کام کے انجام دینے کا موقع انھیں زیرِ نظر کتاب میں ملا تھا لیکن اس کتاب پر بھی جاوید اقبال سے زیادہ علامہ اقبال چھائے ہوئے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ کتاب کا نام بھی ان کے ایک شعر سے اخذ کیا گیا ہے اور کتاب میں جا بجا انھیں کے اشعار سے فضا ہموار کی گئی ہے۔ اگر اس کتاب میں سے علامہ اقبال کو حذف کر دیا جائے تو باقی جو کچھ بچے گا وہ جاوید اقبال کی نامکمل داستانِ حیات ہوگی۔ ''اپنا گریباں چاک'' پر اقبال کا سایہ اس حد تک ہے کہ مجھے اندیشہ ہے، آگے چل کر یہ کتاب یونی ورسٹیوں کے اقبالیات کے نصاب میں شامل ہو جائے گی۔ بعض چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں، اس اصول کے تحت اقبال کو بھی اس کتاب کے ذریعے پہچاننے میں مدد ملے گی۔

مجید نظامی کے دوسرے الزام (جاوید اقبال، علامہ اقبال کے آگے نکل جانے کی خاطر ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں) کے جواب میں جاوید اقبال فرماتے ہیں:

''اب رہ گئی بات علامہ اقبال سے آگے نکل جانے کی، یہ تو کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہونی چاہیے۔ یہی ترغیب تو ہمیں علامہ اقبال دیتے ہیں۔ کسی صاحبِ فکر سے آگے بڑھ جانے سے مراد اس کی تحقیر کرنا نہیں بلکہ اس کی توقیر برقرار رکھتے ہوئے اس کے بتائے ہوئے رستے سے نئی راہیں تلاش کرنا دراصل فکری تسلسل کو آگے بڑھانا ہے۔ علامہ اقبال سے آگے بڑھنے کی سعی کو روکنے کا مطلب یہی ہوگا کہ ہم فکرِ اقبال کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں اور ان کے بعد کسی بھی صورت میں فکری تسلسل کو آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ یہ سوچ علامہ اقبال کی تعلیمات کے برعکس ہے اور اس پر صرف ان کے نادان مریدوں کا ہی اتفاق ہو سکتا ہے۔ (ص ۶۸۔۲۶۷)

اس بحث سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ علامہ اقبال سے آگے نکلنے کی کوشش کرنا یا آگے نکل جانا کوئی غلط بات نہیں ہے۔ لیکن مجید نظامی نے الزام تراشی کرتے ہوئے یہ نہیں بتایا کہ جاوید اقبال نے کب، کہاں اور کس طرح علامہ اقبال سے آگے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے اور جاوید اقبال نے اس الزام کو تسلیم کرتے ہوئے بھی ہاتھ پاؤں مارنے کی کوئی وجہ بتائی ہے اور نہ اپنی کوشش میں کامیاب ہونے کا کوئی ثبوت دیا ہے۔ کسی صاحبِ فکر سے کوئی صاحبِ فکر ہی آگے بڑھ سکتا ہے۔ افسوس کہ ہم جاوید اقبال کے کسی فکری کام سے بے خبر ہیں۔ یہ

آپ بیتی ہمارے سامنے ہے لیکن یہ کوئی فکری کام نہیں بلکہ بے فکری کا نتیجہ ہے یعنی آرام کے زمانے میں لکھی گئی ہے۔ اب لے دے کے ایک ہی معاملہ ایسا رہ جاتا ہے جس میں جاوید اقبال، علامہ اقبال سے آگے نکل گئے۔ اقبال خواہش کے باوجود جج نہ بن سکے، اور جاوید اقبال کو بلا طلب ججی مل گئی۔ مگر یہاں بھی جاوید اقبال خود اقبال ہی کی وجہ سے آگے نکلے کیوں کہ اگر وہ فرزند اقبال نہ ہوتے تو جج بھی نہ ہوتے۔

یہاں ایک لطیفہ یاد آرہا ہے۔ "جاوید نامہ" کے مشہور مترجم رفیق خاور نے ایک مرتبہ ایک محفل میں کہا: "میری فکر وہاں سے شروع ہوتی ہے، جہاں علامہ اقبال کی فکر ختم ہوتی ہے"۔ ان سے گزارش کی گئی: "آپ اپنی فکر کا کوئی ایسا نمونہ بتائیے جو علامہ اقبال کی فکر سے آگے کا ہو"۔ جواب دیا: "دونوں کا کلام سامنے رکھ کر یہ نمونہ آپ خود تلاش کیجئے"۔

ڈاکٹر انور محمود خالد صاحب! اب یہ تحقیق آپ کے ذمے رہی۔ آپ یہ بتائیے کہ جاوید اقبال کی فکر کب، کہاں اور کیسے علامہ اقبال کی فکر سے آگے نکلی ہے۔

"اپنا گریبان چاک" کا وہ حصہ جس میں مصنف نے عدالتی زندگی کے اپنے تجربات و مشاہدات بیان کیے ہیں، بے مثال ہے۔ انھوں نے ہماری عدلیہ اور اس کے بعض ارکان کی جو عبرت ناک تصویر کشی کی ہے، وہ ہماری قومی زندگی کے زوال کا لازوال مرقع ہے پچھلے پچاس برسوں میں ایسی مرقع کشی کسی صاحب قلم نے نہیں کی۔ کاش جاوید اقبال اس داستان کو کچھ اور دراز کرتے!

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اردو ٹھیک ٹھاک لکھی ہے، لیکن کہیں کہیں زبان و بیان کی غلطیاں ناگوار حد تک موجود ہیں۔ ایک تو وہ بار بار "برا منانا" لکھتے ہیں۔ (مثلاً ص ۸، ص ۱۴۷) یہ کوئی تہوار نہیں ہے جو منایا جائے۔ یہ ماننے کا محل ہے۔ یعنی "برا ماننا" درست ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے:

"کوٹھی کا داخلہ لکڑی کے چھپر کھٹ والے بڑے برآمدے کے ذریعے تھا"۔ (ص ۱۵) معلوم نہیں مصنف کے ذہن میں چھپر کھٹ کا کیا مفہوم ہے۔ چھپر کٹ تو اس پلنگ کو کہتے ہیں جس پر چھت اور پوشش ہو یا پھر چھتری والے دلھن کے پلنگ کو کہتے ہیں۔ ایک جگہ تو غضب کر دیا ہے۔ علامہ اقبال کے جنازے کے بارے میں لکھتے ہیں: "اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ سے جنازہ خراماں خراماں چلتے ہوئے ....۔ (ص ۴۲)۔ اگر مصنف کو 'خراماں خراماں' کے معنی معلوم ہوتے تو وہ ایسا ہرگز نہ لکھتے۔ یہ الفاظ محبوب کی خوش رفتاری اور اٹھلا کر چلنے کے لیے آتے ہیں۔ ایسی ہی مضحکہ خیز مثال وہاں ملتی ہے جہاں یہ بتانا مقصود تھا کہ یہاں کوئی دل لگا کر کام نہیں کرتا۔ فرماتے ہیں: "یہاں کوئی بھی شخص دل لگی سے کام نہیں کرتا"۔ (ص ۱۸۹) اسی طرح "من حیث الگروپ" (ص ۵۶) "چڑھ مڑھ ترین" (ص ۱۷) جیسی تراکیب سے خوش مذاقی کا ثبوت نہیں ملتا۔ "غلاف اڑھا دیا" کی جگہ "غلاف اوڑھ دیا" (ص ۱۴۸) اسی قبیل کا انداز بیان ہے۔

املا کی اغلاط بھی کثرت سے ہیں۔ (کتابت یا کمپوزنگ کی غلطیوں سے مختلف)۔ صوفی کی غلط جمع

(صوفیا، ص ۱۳۔ صحیح صوفیہ) سے قطع نظر اس قسم کی بوالعجبیاں بھی ملتی ہیں: برخواست (ص ۶۳) بجائے برخاست، مذاحیہ برائے مزاحیہ، معرکتہ الآرا (ص ۱۶۷) بجائے معرکہ آرا، دوشاہے (ص ۲۴۵) بجائے: دوشنبہ، جگ کا نام، ذق پہنچے (ص ۲۶۹) بجائے زک پہنچے۔ حامی بھری (ص ۱۶۷) بجائے ہامی بھری۔

اب ایک دو لطیفے بھی ملاحظہ فرمایئے۔ کتاب کے آخر (ص ۲۶۶) میں لکھا ہے کہ مزار اقبال پر جانے سے گریز کرتے ہیں۔ مگر جب موصوف نے بھٹو کے مقابلے پر الیکشن میں حصہ لیا تو سب سے پہلے مزار اقبال پر حاضری دی اور الیکشن میں حصہ لینے کے سلسلے میں اپنے موقف کی وضاحت کی۔ یہ مزار پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟

ڈاکٹر جاوید اقبال نے قرۃ العین حیدر کی دوستی پر فخر تو کیا ہے مگر ساتھ ہی انھیں یہ طعنہ بھی دیا ہے کہ وہ ہندی کلچر کو پسند کرتی ہیں۔ دو جملے بڑے عجیب و غریب ساتھ ساتھ لکھے ہیں۔ ''جوانی بغیر شادی کے گزار دی۔ میری ان کے ساتھ معصومانہ بے تکلفی تھی''۔ (ص ۷۹) سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دو جملوں کو ساتھ ساتھ لکھنے کا مطلب کیا ہے۔ بہر حال ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ بلا تشبیہ عرض ہے۔ ایک بہت بڑے شاعر کا بیٹا ایک بہت بڑی ادیبہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ مشترک دوستوں نے ان کی ملاقات کرائی۔ ملاقات کے بعد خاتون نے انکار کر دیا۔ وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے کہا: ''ان صاحب زادے کا تلفظ تو ان کے ابا جی کے تلفظ سے بھی زیادہ خراب ہے''۔

آخری بات۔۔۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے دیباچے میں لکھا ہے: ''اردو ادب میں اپنے سوانح حیات خود تحریر کرنے کا رواج نہیں ہے، اس لیے ادب کی اس صنف کی طرف اتنی توجہ نہیں دی گئی''۔ (ص ۵) جس زبان میں تین سو سے زیادہ آپ بیتیاں موجود ہوں اور درجنوں اہم شخصیات نے اپنے مفصل حالات قلم بند کیے ہوں ،اس کے بارے میں ایسی سرسری رائے دینا مناسب نہ تھا۔

معذرت خواہ ہوں کہ لکھنے پر آیا تو لکھتا ہی چلا گیا، یہ بھی نہ سوچا کہ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔

خیر اندیش

بخدمت گرامی

ڈاکٹر انور محمود خالد صاحب

فیصل آباد

ٹیلی پلے

ایک تھا لڑکا، ایک تھی لڑکی
(ٹیلی پلے)

عطاء الحق قاسمی

پہلا منظر

(اندرون شہر کا ایک بازار' چار پانچ دکانیں ساتھ ساتھ ہیں جن میں پہلی دکان کلچوں کی، دوسری ریوڑیاں بنانے کی، تیسری حلوائی کی اور چوتھی پرچون کی دکان ہے۔ کیمرہ ان دکانوں میں حفظان صحت کے اصولوں کے منافی مناظر پر فوکس کرتا ہوا آخر میں پرچون کی دکان پر بیٹھے گل شیر کو دکھاتا ہے۔ کلچوں کی دکان پر ایک لڑکا بہت بڑی پرات یا پتیلے میں پاؤں سے آٹا گوندھ رہا ہے (اسے فوکس کیا جائے)۔ دوسری طرف تندور ہے جہاں کلچے لگائے جا رہے ہیں اور مالک گدی پر بیٹھا گاہکوں کو کلچے دے رہا ہے۔ ریوڑیوں کی دکان پر ایک دیوار پر کنڈے کے ساتھ ٹنگے ریوڑیوں کے مصالحے کے ساتھ، بنیان اور دھوتی میں ملبوس ایک نوجوان ''ہاتھا پائی'' میں مشغول ہے اور ساتھ ساتھ پسینہ اور ناک بھی پونچھتا جا رہا ہے (اسے فوکس کیا جائے)۔ مالک تھوک کے بیوپاریوں کو تیار شدہ ریوڑیاں کنڈے پر تول کر دے رہا ہے۔ حلوائی کی دکان پر حلوائی لسی بنا رہا ہے۔ ایک کھلا کونڈا اسکے سامنے ہے اور باقی کونڈے کسی کپڑے سے ڈھکے بغیر اسکے پیچھے دھرے ہیں، جن پر چوہے دوڑ رہے ہیں (بیٹری والے مصنوعی چوہوں سے کام لیا جا سکتا ہے)۔ فوڈ انسپکٹر حامد بیگ ان دکانوں کے سامنے سے گذرتا، یہ سب مناظر دیکھتا اور دکان کے مالکوں سے خوش دلی سے سلام دعا لیتا، گل شیر کی دکان پر آتا ہے۔ گل شیر کی عمر 35 سال ہے۔ اس نے داڑھی رکھی ہوئی ہے۔ کاندھے پر رومال اور سر پر دستار ہے۔)

حامد بیگ: السلام علیکم شیر خان! راحت جان فخر پاکستان!

گل شیر: او مارا حامد بیگ آیا۔ مارا فوڈ انسپکٹر آیا بولو تمہاری کیا خدمت کرے؟

حامد بیگ: گل شیر تو ہمارا یار ہے۔ تم سے کیا خدمت لینی ہے۔ خدمت کے لیے بڑے بڑے ریستوران جو ہیں۔ وہ خدمت کے لیے کافی ہیں۔ ویسے تمہیں ایک بات بتاؤں لوگ ان ریستورانوں میں کھانا بنتا دیکھ لیں تو وہاں کھانا چھوڑ دیں۔

گل شیر: اور یہ جو کلچے والا ہے جس کا لڑکا پاؤں سے آٹا گوندھتا ہے۔ اور حلوائی جس کے دہی کے کونڈوں پر چوہے دوڑتے ہیں اور.........

حامد بیگ: گل شیر مجھے کیا بتاتے ہو۔ یہ سب کچھ دیکھنا میری ڈیوٹی میں شامل ہے۔ عام لوگ بھی یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور پھر بھی مزے لے لے کر کھا جاتے ہیں۔

گل شیر: حامد بیگ، تم بھی تو یہ سب کچھ کھاتے ہو

حامد بیگ: (ہنستے ہوئے) مجھے تو یہ چیزیں نذرانے کے طور پر ملتی ہیں اور گل شیر تمہیں پتہ ہے، نذرانہ تو نذرانہ ہی ہوتا ہے، اس سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا۔

گل شیر: اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ مرد کو چار شادیاں ضرور کرنا چاہیے۔

حامد بیگ: (حیرانی کے عالم میں) گل شیر، تم بھی حد کرتے ہو اس ساری گفتگو میں چار شادیوں کا جواز کہاں سے آ گیا؟

گل شیر: دیکھو حامد بیگ (اپنا ایک ہاتھ پھیلاتے ہوئے)۔ میرا ہاتھ دیکھ رہے ہو (انگوٹھا دکھاتے ہوئے) یہ کیا ہے؟

حامد بیگ: یہ انگوٹھا ہے۔

گل شیر: انگوٹھا مذکر ہے کہ مؤنث!

حامد بیگ: مذکر ہے

گل شیر: (اپنی ایک اُنگلی دکھاتے ہوئے) یہ کیا ہے!

حامد بیگ: اُنگلی ہے۔

گل شیر: مذکر ہے کہ مؤنث ہے!

حامد بیگ: مؤنث ہے۔

گل شیر: تو معاملہ پھر صاف ہوا ناں! (دوسرے ہاتھ کی انگشت شہادت انگوٹھے پر رکھتے ہوئے) یہ قدرت کا اشارہ ہے۔ ایک مذکر ہے، اس کے ساتھ چار مؤنث ہیں۔ ایک مذکر چار مؤنث۔ انگریزی میں مذکر مؤنث کو کیا بولتے ہو۔

حامد بیگ: میل، فی میل

گل شیر: ہاں میل، فی میل، ہمارے ہاتھ میں ایک میل اور چار فی میل ہیں۔ ہر مرد کو چار شادیاں کرنا چاہئیں۔ اگر ایک مرد کے لیے ایک عورت ہوتی تو ہاتھ میں بھی ایک انگوٹھا اور ایک انگلی ہی ہوتی۔ ایک انگوٹھے اور چار انگلیوں کا مطلب، ایک مرد، چار بیویاں ہیں۔ اب بولو!

حامد بیگ: (ہنستے ہوئے) واہ بھئی گل شیر! کیا بات ہے تمہاری دلیل کی، اب میں اسکا کیا جواب دوں؟

گل شیر: جواب تمہارے پاس کوئی ہو تو دو ناں اور دیکھو ساری بیویوں کی عمریں بھی اس ایک ہاتھ میں بتادی گئی ہیں (پھر ہاتھ پھیلاتا ہے اور سب سے لمبی درمیان والی اُنگلی سامنے لاتا ہے)۔ یہ پہلی بیوی سب سے بڑی (پھر چھنگلی کے ساتھ والی اُنگلی نمایاں کرتا ہے)۔ یہ دوسری بیوی۔ اس سے چھوٹی! (پھر انگشت شہادت کھڑی کرتا ہے)۔ یہ تیسری بیوی۔ اس سے بھی چھوٹی (اور آخر میں چھنگلی نمایاں کرتا ہے اور ایسا کرتے وقت اسکے لہجے میں لذت نمایاں ہوتی ہے) اور آخر میں یہ چوتھی بیوی چھوٹی سی سولہ سال کی۔ (حامد بیگ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے) یہ کیا سر پکڑ کر بیٹھ گئے ہو۔ سر اُٹھا کر بات کرو دلیل کا جواب دلیل سے دو حامد بیگ!

حامد بیگ: (ہنستے ہوئے) میں دلیل کا کیا جواب دوں۔ تمہاری بات کے مطابق دلیل مونث ہے۔ جواب مذکر ہے۔ تو کیا اب میں دلیل کی شادی جواب سے کرادوں!
لیکن مجھے ایک بات تو بتاؤ، ہم تو بات کر رہے تھے کھانوں کی جو حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق تیار نہیں ہوتے، تم نے اس میں سے چار شادیوں کا جواز تلاش کر لیا۔ مجھے بتاؤ ان کھانوں کا چار شادیوں سے کیا تعلق ہے؟

گل شیر: ہاں، یہ تم نے صحیح سوال کیا۔ یہ بتاؤ جن کھانوں کا ہم ذکر کر رہے تھے، یہ صحت کے لیے کیسے ہیں؟

حامد بیگ: مُضر ہیں۔

گل شیر: اور انکا ذائقہ کیسا ہے؟

حامد بیگ: ذائقہ تو بہت اچھا ہے

گل شیر: تو بس بات ختم۔ چار شادیاں بھی صحت کیلئے مُضر ہیں اور ذائقہ! واہ: واہ: سُبحان اللہ: اب بتاؤ چار شادیوں کا مُضر صحت لذیذ کھانوں سے کوئی تعلق ہے کہ نہیں۔ دونوں مضر صحت ہیں، دونوں لذیذ ہیں۔ تم گل شیر کو پاگل سمجھتے ہو۔ گل شیر خان دلیل کے بغیر کوئی بات نہیں کرتا۔
(حامد بیگ ہنستا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا ہے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہتا ہے)

حامد بیگ: گل شیر خان، تم بڑی چیز ہو خصوصاً تمہاری دلیلوں کا تو جواب نہیں۔ میں اب چلتا ہوں، یہ میرا اگرائی کا وقت ہے:

گل شیر: میری طرح کھو حرام مال اکٹھا کرنے کا وقت ہے۔ شہر میں جتنے لوگ ناقص غذا اور کھانے پینے کی

دکانوں پر صفائی کا صحیح انتظام نہ ہونے کی وجہ سے بیمار ہوتے ہیں یا مرتے ہیں' ان سب کے ذمہ دار تم ہو۔

حامد بیگ اس پر قہقہہ لگاتا ہے

حامد بیگ: صرف میں ذمہ دار ہوں لوگوں کے بیمار ہونے کا لوگوں کے مرنے کا، صرف میں؟ اور مسلسل قہقہے لگاتا ہے

دوسرا منظر

(فائیو اسٹار ہوٹل۔ کیمرہ اس کی لابی وغیرہ دکھاتا ہوا اس کے ایک ہال پر آتا ہے جہاں عورتوں کے حقوق پر سیمینار ہو رہا ہے۔ اسٹیج پر تین بہت ماڈرن قسم کی خواتین بیٹھی ہیں، درمیان میں سیمینار کے صدر ملک عبدالروف ہیں وہ بہت نفیس سوٹ میں ملبوس ہیں اور پائپ پیتے ہوئے خواتین کی تقریروں کے نوٹس لے رہے ہیں۔ ان کے برابر میں بیٹھی خوش رنگ خاتون مس سائرہ مسکراہٹوں اور ناز و ادا سے مسلسل ملک عبدالروف کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں مشغول ہے۔ اسٹیج کے پیچھے ایک بڑا بینر ہے جس پر WOMEN LIBERATION MOVEMENT کے الفاظ درج ہیں)

ایک خاتون مقرر: Mr. President آخر میں I SPECIALLY WANT TO EMPHASIZE ON ONE POINT اور وہ یہ کہ پاکستانی عورت کو کبھی اس کا father، کبھی اس کا brother اور کبھی اس کا husband مختلف طریقوں سے rule کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہم نے عورت کو اس slavery سے liberate کرانا ہے اور ہاں! عورت کوئی commodity نہیں ہے کہ مرد جتنی تعداد میں چاہے اس کا ذخیرہ کر لے۔ ہماری یہ ڈیمانڈ اوپر تک پہنچا دیں کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا جرم قرار دیا جائے اور اس کی کم سے کم سزا پانچ سال قید ہو!

سائرہ: I THINK THIS DEMAND IS VERY STUPID. اب دیکھیں نا اگر کسی شادی شدہ مرد کو کسی سے محبت ہو جائے اور وہ کسی سے شادی کرنا چاہے تو یہ محبت کرنے کی سزا پانچ سال قید ہوئی نا۔

(ملک رؤف ہاں میں سر ہلاتا ہے)

آپ اس کی باتوں کو زیادہ Importance نہ دیں۔ بڑی بختی ہے Social activist اور دیکھیں ذرا کتنا outdated فیشن کیا ہوا ہے اور اگر اس نے چہرے پر اتنا foundation نہ ملا ہوتو پھر آپ اس کی اصل شکل دیکھیے گا۔

ملک: جی بالکل میں تو سمجھتا ہوں اتنے اہم سیمینار میں ایسی بے تکی بات ہونی ہی نہیں چاہیے تھی۔ (اور پھر سر

گوشی کے سے انداز میں) آپ سے ملنے کے بعد تو اس مطالبے کی حمایت کرنا گویا خود کو 5 سال کے لیے جیل کروانا ہے۔

(دونوں بھرپور طریقے سے مسکراتے ہیں۔ ملک مخصوص انداز میں ناک پر ہاتھ رکھ کر سر کو جھٹکا دیتے ہوئے خوفناک انداز میں ''شوں'' کی آواز نکالتا ہے سائرہ اس اچانک ''حملے'' سے گھبرا جاتی ہے)

میزبان: اور اب میں آج کے سیمینار کے صدر ملک عبدالرؤف صاحب سے گذارش کروں گی کہ وہ اسٹیج پر تشریف لائیں

ملک: (اپنی نائی درست کرتا ہوا ڈائس پر آتا ہے۔ اور حسب سابق شوں کی آواز نکالتا ہے)

ملک: مس نازلی، مس رخسانہ Respectable elegant ladies (مسکراتے ہوئے) اگر چہ اتنی خوبصورت خواتین کی موجودگی میں ایک سے زیادہ شادیوں کے خلاف تقریر کرنا کسی مرد کے شایان شان نہیں۔

(خواتین قہقہہ لگاتی ہیں)

لیکن چونکہ میں عورتوں کے حقوق کیلئے ساری عمر لڑتا آیا ہوں۔ اس لیے دل پر جبر کر کے آپ کے مطالبے کی نہ صرف حمایت کرتا ہوں بلکہ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں ہر فورم سے اس کے حق میں آواز اٹھاؤں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ پابندی بالخصوص lower income classes پر لگانی چاہیے جو مشکل سے ایک بیوی کا خرچ اُٹھا پاتے ہیں لیکن ہر وقت دوسری کی تاک میں رہتے ہیں۔

آج کے مرد کو یہ بات بخوبی معلوم ہونی چاہیے کہ عورت کو economic protection کے علاوہ بھی بہت کچھ چاہیے۔ اُسے چاہیے آزادی، Liberty جیسی یہاں پر موجود خواتین کو میسر ہے تاکہ عورت زیادہ سے زیادہ social activities میں حصہ لے سکے، Society کا useful حصہ بن سکے۔ میں صرف باتیں نہیں کرتا۔ مجھ سے جس عورت نے بھی، جس وقت جب جب آزادی مانگی ہے۔ میں نے اُسے آزاد کر دیا ہے۔ کبھی کوئی Problem کھڑی نہیں کی اس کی آزادی میں وہ اس لیے کہ میں Oxford سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں، میں نے انگریزوں کے ساتھ زندگی گزاری ہے اور کئی انگریز لڑکیوں کے ساتھ رہا ہوں...... میرا مطلب ہے گوریاں میری کلاس فیلو رہی ہیں۔ میں نے انہیں observe کیا ہے، اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں west سے inspiration لینے کی ضرورت ہے۔ اور جب تک میرے دم میں دم ہے۔ میں اس مقصد کے لیے کام کرتا رہوں گا۔

(تالیاں بجتی ہیں)

Respectable Ladies اتنے خوبصورت چہروں کو دیکھتے ہوئے مجھے گمان ہوتا ہے کہ جیسے میں Paris کی کسی آرٹ گیلری میں کھڑا ہوں۔ ان حسین و جمیل چہروں کے درمیان زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کیلئے میں نے آج خاصی لمبی چوڑی تقریر کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ (خواتین مسکراتی ہیں)

لیکن کمر کی درد کی وجہ سے میری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکے گی۔ درد کمر کی گولیاں بھی میں گھر بھول آیا ہوں۔ مجھ پر تو کسی شاعر کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

ایک دکھ ہو تو کوئی اس کا مداوا بھی کرے

درد دل، درد جگر، درد کمر تینوں ہیں۔ لہٰذا اجازت چاہتا ہوں۔ God bless you.

(اس تقریر کے دوران سائرہ نمایاں طور پر ملک کے ہر جملے پر ریسپانس کرتی ہے، ملک بھی معنی خیز جملے سائرہ کی طرف دیکھتے ہوئے ادا کرتا ہے۔ تقریر کے بعد ملک رؤف کو خواتین گھیرے میں لے لیتی ہیں۔ وہ ان سے گپ شپ کرتا ہے)

تیسرا منظر

(گل شیر کی دکان (حامد بیگ تھڑے پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے۔ دکان کے بالمقابل گھر کی اوپری منزل کا دریچہ وقفے وقفے سے کھلتا ہے۔ جس میں سے رضیہ شرارت بھرے انداز سے جھانکتی ہے۔ گل شیر بھی انکھیوں سے اسے دیکھتا ہے۔ حامد بیگ بھی اس سارے عمل کو محسوس کرتا ہے۔ گل شیر ایک گاہک کو سودا تول کر دے رہا ہے)

گاہک: گل بھائی اماں کہہ رہی تھیں کہ پچھلے ہفتے آپ سے جو مونگی کی دال خریدی تھی نا، اُس میں اتنے بڑے بڑے روڑے تھے (ہاتھ سے سائز بتاتا ہے)

گل شیر: روڑے۔۔۔۔۔ گل شیر کی دکان کے مال میں کھوٹ۔۔۔ (ہنستے ہوئے حامد بیگ سے) ویسے باؤ حامد بیگ ہمارے مال میں کھوٹ بھی نکلا ہے تو مہنگے آئیٹم کا۔

حامد بیگ: مہنگا آئیٹم

گل شیر: او روڑے۔۔۔۔۔۔ دو سیمنٹ اور ریت کے ساتھ ملا کر مکسچر مشین میں ڈالو تو مکان کا لینٹر ڈلوایا جاسکتا ہے۔ (گاہک کو متوجہ ہو کر)۔ باقی تو سارا سودا اصلی اور خالص تھا نا؟

گاہک: کہاں خالص تھا۔ کپڑوں کو کلف لگانے کے لیے اراروٹ خریدی تھی۔ ذرا برابر اثر نہیں ہوا۔

گل شیر: میری جان کپڑوں کو کلف لگا کر کیا کرنا ہے۔ یہاں جس کے پاس پیسہ ہے اس کی گردن میں کلف لگی ہوئی ہے۔ کیوں بیگ صاحب؟

بیگ: یار گل شیر تمہاری دلیلیں سمجھ سے باہر ہیں۔

(گاہک چلا جاتا ہے)

گل شیر: یہ معرفت کی باتیں ہیں آپ کی سمجھ میں ابھی نہیں آئیں گی اس کے لیے۔۔۔

(کھڑاک کی آواز گل شیر کی توجہ کھڑکی کی جانب مبذول کرواتی ہے جہاں رضیہ کھڑی جھانک رہی ہے)

اس کے لیے کھڑی کھلی ہونی ضروری ہے۔

بیگ: کھڑکی؟

گل شیر: میرا مطلب ہے دماغ کی کھڑکیاں کھلی ہوں گی تو بات سمجھ میں آئے گی نا۔۔۔۔ باؤ حامد، تمہارے پاس کنگھا ہوگا؟

بیگ: یار پرچون کی دکان تم چلاتے ہو اور اُلٹا مجھ سے سودا مانگ رہے ہو۔ اور ویسے بھی اب یہ اچانک درمیان میں کنگھے کا ذکر کہاں سے آگیا۔

گل شیر: اوہو۔ یہ وقت فلسفے پر بحث کرنے کا نہیں ہے کھڑکی بند بھی ہو سکتی ہے۔

(بیگ گل شیر کی آنکھوں کا تعاقب کرتے ہوئے کھڑکی کی طرف دیکھتا ہے لیکن اس وقت تک کھڑکی بند ہو چکی ہوتی ہے گل شیر کی excitement ختم ہو جاتی ہے۔ بیگ گردن ہلاتا ہے جیسے اُس نے فوری بات سمجھ لی۔ شرارت بھرے انداز میں گل شیر کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو وہ کھسیانا ہو کر دکان میں پڑے سامان کو درست کرنے لگتا ہے)

بیگ: یار گل شیر: میں بہت عرصے سے تمہاری باتوں پر غور کرتا چلا آ رہا ہوں اور تم سے متفق ہوں کہ مرد کو چار شادیاں ہی کرنی چاہئیں۔

گل شیر: (دلچسپی کا اظہار کیے بغیر اپنے کام میں مگن) اچھا۔

بیگ: لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ تم دوسروں کو چار شادیوں کا مشورہ دیتے ہو لیکن خود تم نے ابھی تک ایک شادی بھی نہیں کی۔ (گل شیر بہت دلچسپی سے بیگ کی طرف دیکھتا ہے) ویسے اگر تم کہو تو میں ایک جگہ تمہاری شادی کی بات چلاؤں۔

(گل شیر جھپٹ کر بیگ کے گوڈوں کو ہاتھ لگاتا ہے)

گل شیر: تمہاری بڑی مہربانی ہوگی حامد باؤ۔ میرے ہونے والے بچے بھی تمہیں دعائیں دیں گے۔ میں بھی لوگوں سے التجا کرتے وقت کہہ سکوں گا کہ بھائی خوف خدا کرو میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔

بیگ: نہیں یار مہربانی کی کیا بات ہے۔ یہ تو نیکی کا کام ہے۔ یہ جو سامنے والا گھر ہے نا ''شیخ الحدید کا۔۔۔۔ یار وہی شیخ ظہور اسٹیل ورکس والے۔

(گل کے چہرے پر احمقانہ شرمیلا پن نمایاں ہوتا ہے۔ کھڑکی دوبارہ کھلتی ہے)

گل شیر: مشرقی لڑکے خود اپنے منہ سے ہاں کہتے ہوئے اچھے تو نہیں لگتے نا۔

بیگ: یار بات تو مکمل ہو لینے دو۔۔۔۔۔ شیخ صاحب کے گھر کی پچھلی طرف جو گلی ہے وہاں ایک بیوہ

عورت کی رہائش ہے۔۔۔۔ بڑی دُکھ بھری داستان ہے بے چاری کی۔ دو بچیاں ہیں اور سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہیں۔ یوں تمہیں بیٹھے بیٹھائے "صاحب" اولاد بیوہ مل جائے گی۔

(آخری جملے پر کیمرہ رضیہ پہ جاتا ہے۔ وہ پوری قوت سے ایک رقعہ پتھر میں لپیٹ کر پھینکتی ہے جو سیدھا بیگ کے سر پر جا لگتا ہے۔ بیگ درد کے مارے اپنا سر پکڑ لیتا ہے۔ گل شیر لپک کر آگے بڑھتا ہے اور یوں ظاہر کرتا ہے جیسے محلے کے بچوں نے شرارت کی ہے اور نہایت صفائی سے رقعہ پتھر سے علیحدہ کر لیتا ہے۔ اس دوران وہ چیختا بھی رہتا ہے)

گل شیر: بڑے ہی نامراد بچے ہیں۔ بڑے چھوٹے کا لحاظ ہی نہیں۔ تم دوبارہ نظر تو آؤ ذرا گلی میں خدا قسم تمہیں میں آٹے کے کنستر میں بند کر دوں گا۔ (ساتھ ساتھ وہ رقعہ آہستگی سے کھولتا ہے اور پھر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد کھڑکی کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگتا ہے۔ رضیہ بھی مسکراتی ہے)

چوتھا منظر

(ملک رؤف کی خوبصورت عالیشان کوٹھی پورچ میں دو خاصی مہنگی کاریں کھڑی ہیں اور وہ لان میں اپنی بیگم رخسانہ (عمر تیس سال) کے ساتھ بیٹھا ہے)

رؤف: رخسانہ صاحبہ آج آپ کچھ ضرورت سے زیادہ خوبصورت نہیں لگ رہیں!

رخسانہ: (جلے کٹے انداز میں) مجھے تمہاری ضرورت کا پوری طرح اندازہ نہیں ہو پاتا، اس لئے تمہیں کبھی کم کبھی زیادہ خوبصورت لگتی ہوں۔

(رؤف سر کو جھٹکا دے کر ناک پر ہاتھ رکھتے ہوئے شوں کی آواز نکالتا ہے) ایسے موقعوں پر تمہارا جواب یہی ہوتا ہے جو تم نے دیا ہے مجھے ایک بات بتاؤ۔

رؤف: پوچھو رخسانہ ملک:

رخسانہ: یہ تمہاری شادی کو کچھ زیادہ عرصہ تو نہیں ہو گیا۔

رؤف: اسے ایک سال ہی تو ہوا ہے۔

رخسانہ: کیا یہ تمہارے لئے کافی لمبا عرصہ نہیں ہے۔ یہ بتاؤ نئی شادی کب کر رہے ہو!

رؤف: تمہیں پتہ ہے رخسانہ میں ایک سے زیادہ شادی کے خلاف ہوں میں نے ہمیشہ عورتوں کے رائٹس کے لئے کوشش کی ہے۔ تم اور میں ایک ہی آرگنائزیشن کے بینر تلے تو وومین رائٹس کے لئے سٹرگل کرتے رہے ہیں۔ تم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ میں نے تم سے پہلی والی بیوی کو کیوں چھوڑا تھا۔ بلکہ تمہی نے تو کہا تھا کہ اتنی نئی سوشل عورت کے ساتھ تمہارا گذارہ کیسے ہوتا ہے۔ AND YOU

WERE SO KIND کہ تم نے اس عورت سے نجات دلانے کے لئے ایک موقع پر خود شادی کی پروپوزل دی تھی (رخسانہ کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں (نوکر کارڈلیس فون ہاتھ سے پکڑے آتا ہے)

نوکر: صاحب جی آپ کا فون ہے!

(دوسری طرف سائرہ ہے)

رؤف: ہیلو سائرہ ہاؤ آر یو!

سائرہ: DON'T YOU ASK THIS QUESTION TO ME. YOU KNOW I AM DYING FOR YOU ویسے ایک شاعر کا شعر بہت ہی اچھا ہے کچھ اس ادا سے آپ نے پوچھا مرا مزاج۔ کہنا پڑا کہ شکر ہے پروردگار کا۔

رؤف: I AM FLATTERED. IT MEANS کہ آپ کو شاعری سے بھی خاصا لگاؤ ہے۔

سائرہ: بہت زیادہ۔ فراز صاحب تو میرے گھر بھی آتے ہیںHE IS MY FAVOURITE

رؤف: (کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے) اللہ نہ کرے۔

سائرہ: WHAT HAPPENED ?

رؤف: NOTHING تم یہ بتاؤ ہم مل کب رہے ہیں۔

سائرہ: کتنے عرصے کے لئے

رؤف: (فلمی انداز میں) ہم جنم جنم کے ساتھی ہیں مرتے دم تک ایک دوسرے کا ساتھ نبھائیں گے، پریا تم مجھے وچن دو کہ میرا ساتھ نہیں چھوڑو گی۔

سائرہ: (ہنستے ہوئے) بس کرو، بس کرو، مجھے سمجھ نہیں آتی میں نے تمہارے بغیر اتنا عرصہ کیسے گذارا۔ BUT I FEEL PITY FOR YOUR WIFE. WHAT'S HER NAME, RUKHSANA, YES SHE IS A NICE GIRL کیا تمہیں رخسانہ کو چھوڑتے ہوئے افسوس نہیں ہوگا؟

رؤف: تم جانتی ہو تمہاری طرح میں بھی عورتوں کی آزادی کا قائل ہوں، میں اسے نہیں چھوڑوں گا ہاں وہ اگر مجھے چھوڑنا چاہے تو میں اس کے رستے میں رکاوٹ نہیں ہوں گا۔

سائرہ: پھر کب؟

(ملک شوں کی آواز نکالتا ہے)

پانچواں منظر

(ملک رؤف اور سائرہ کی شادی ہو رہی ہے۔ ایک کمرے میں ملک کے 3-4 دوست جمع ہیں اور سائرہ

کی کچھ سہیلیاں اور دونوں کے والدین۔ نیز مولوی صاحب موجود ہیں)

چھٹا منظر

(گل شیر کا مکان۔ صبح کا وقت دروازے پر بیل ہوتی ہے۔ وہ دروازہ کھولتا ہے۔ سامنے رضیہ ہے جس کے ہاتھ میں زردے کی پلیٹ ہے۔ رضیہ کو اچانک سامنے پا کر نظریں نیچی کر لیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی پردہ دار خواتین کی طرح منہ دوسری طرف پھیر لیتا ہے)

رضیہ: گل شیر! میں تمہارے لئے زردہ پکا کر لائی ہوں۔ زردہ تمہیں پسند ہے نا۔

گل شیر: (جھینپتے ہوئے) ہاں پسند ہے لیکن رضیہ میں نے کتنی دفعہ کہا ہے تم یہاں نہ آیا کرو، میں یہاں اکیلا رہتا ہوں، کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا؟

رضیہ: یہ بات ایسے نہ کہو، یوں کہو ہائے چندا اگر کسی نے دیکھ لیا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ یہ تم کیا عورتوں جیسی باتیں کرتے ہو، تم مرد ہو، مردوں کی طرح بات کرو! اور ہاں اگر تم اکیلے رہتے ہو تو کیا ہم پر احسان کرتے ہو۔ (گل شیر اسی طرح نظریں نیچی کئے منہ دوسری طرف پھیرے کھڑا ہے)

گل شیر: ٹھیک ہے ٹھیک ہے، یہ پلیٹ مجھے دے دو۔ اب جاؤ۔

رضیہ: (اندر داخل ہو جاتی ہے) نہیں جاتی، جاؤ کرلو جو کرتا ہے۔

گل شیر: (گھبراہٹ کے عالم میں) رضیہ خدا کا واسطہ ہے اب تم جاؤ، کل تم سے بات کروں گا (رضیہ اس کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے)

رضیہ: وعدہ؟

گل شیر: ہاں وعدہ۔

رضیہ: تم منہ میری طرف پھیرو تو تمہیں پتہ چلے کہ وعدہ کیسے کیا جاتا ہے۔

گل شیر: (رخ اس کی طرف کرتا ہے اور اس کا نرم و نازک ہاتھ دیکھ کر اس پر کپکی طاری ہو جاتی ہے۔ اس پر رضیہ مسکراتی ہوئی واپس چلی جاتی ہے۔ رضیہ نے ہاف سلیو قمیص پہنی ہے کہ اس کے ہاتھ کی خوبصورتی کیمرہ دکھا سکے۔ رضیہ کے جانے کے بعد گل شیر اپنی نشست پر بیٹھ جاتا ہے اور تصور میں رضیہ کو دیکھنے لگتا ہے۔ یہ حصہ ارپیٹ کروائیں۔ گل شیر پر سوز کی کیفیت طاری ہے۔ پھر وہ اس کیفیت سے نکلتا اور آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر پنجابی پشتو ملے جلے لہجے میں خود کو مخاطب کرتا ہے۔

گل شیر: او گل شیر خانا، (در فتے منہ تیرا اور پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے)

ساتواں منظر

(ایک گھریلو مکس پارٹی میں ملک رؤف مختلف خواتین سے گپ شپ کرتا نظر آتا ہے۔ نازلی اس کی طرف آتی ہے۔ اور گلا کھنکھار کر ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہے۔ ملک excuse me کہہ کر باقی خواتین سے علیحدہ ہو جاتا ہے)

نازلی: Wonderful, you are such a charmer بہت خوبصورت باتیں کرتے ہیں۔

ملک: مس نازلی جب آپ جیسے خوبصورت چہرے نظروں کے سامنے ہوں تو پھر خوبصورت باتیں کرنے کو تو خود ہی دل چاہتا ہے۔

نازلی: (شرارت بھرے انداز میں) ویسے کیا آپ خواتین کی محفل میں ہمیشہ اسی طرح چہکتے ہیں۔ (ملک مخصوص انداز میں ہنکارہ بھرتا ہے)۔ (چونک کر) یہ کیا ہوا؟

ملک: آپ تو ڈر گئیں۔ Cassendra کو تو میرا یہ اسٹائل بہت پسند تھا۔

نازلی: Cassendra? Who is she?

ملک: Once I was under Cassendras spell

Cassendra میری بیوی تھی کسی زمانے میں۔ بہت خوبصورت تھی مگر Blonde تھی۔ اور آپ کو تو پتا ہے کہ Blonde لڑکیاں بیک وقت خوبصورت اور بے وقوف ہوتی ہیں۔

(دونوں ہنسنے لگتے ہیں)

نازلی: کیا Cassendra بھی دوسرے Blondes کی طرح تھی۔ I mean بیوقوف تھی؟

ملک: ہاں بالکل۔ تبھی تو مجھ سے شادی پر آمادہ ہو گئی تھی۔

(نازلی پھر ہنسنے لگی)

نازلی: آپ بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔

ملک: آپ ہنس رہی ہیں۔ (فلمی جذباتی انداز اپناتے ہوئے) آپ کو کسی کے جذبات سے کیا مطلب۔

نازلی: (ہنسی پر بمشکل قابو پاتے ہوئے) اوہ سوری آپ بتائیں پلیز Cassendra سے علیحدگی کیوں ہو گئی آپ کی۔

ملک: اُسے اپنا فیملی بزنس سنبھالنا تھا۔ اُس کے والد Scotland میں بڑے گوشت کی دکان کرتے تھے۔ آپ یوں سمجھیں کہ جمعیت القریش کے صدر تھے۔ وہ تو جب Mad Cow Disease یعنی پاگل گائے کی وبا پھیلی تو ان کا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ Cassendra کا اصرار تھا کہ وہ Scotland میں اپنے والد کا ہاتھ بٹانا چاہتی ہے۔ بس ہم دونوں کی راہیں الگ ہو گئیں۔

سائرہ: اُف مجھے تو Scotland کا landscape بہت fascinate کرتا ہے۔ وہاں کے تو دیہات بھی کتنے خوبصورت ہیں۔ Natural beauty inspires me.

ملک: لگتا ہے Wordsworth کی شاعری کو بہت پسند کرتی ہیں آپ۔

نازلی: (چونک کر) آپ نے کس طرح اندازہ لگایا۔

ملک: آپ کے ذوق سے۔ آپ جیسی elegant خاتون کا taste بھی تو آپ کی طرح دلکش ہوگا۔

نازلی: (جھینپ کر) Thanks for the compliment پتا ہے کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے کہ کاش میں کسی feudal lord کی بیوی ہوتی گاؤں کی کھلی صاف ستھری فضا میں سانس لیتی، خالص غذا کھاتی، بڑی ساری حویلی میں رہتی اور اگر کبھی کبھی شاپنگ کرنے کا موڈ ہوتا تو شہر آجاتی، جہاں ڈیفنس میں میری شاندار کوٹھی ہوتی اور۔۔۔۔۔۔۔

ملک: بس بس بس مس نازلی میں سمجھ گیا آپ کی بات۔ صبح کے ناشتے میں دیسی گھی کے پراٹھے، مکھن، باداموں والا دودھ، کھانے میں ساگ، مکئی زردہ۔ ہاتھ میں حویلی کی چابیوں کا گچھا اور گز بھر لمبی سنہری گُت۔ (قہقہہ لگا کر) اور جامنی رنگ کا سلکی کرتا، سرخ رنگ کا لاچا (دونوں ہنسنے لگتے ہیں)

نازلی: اُف توبہ ہے آپ نے تو میرے سارے romance کو ستیاناس کر دیا۔

ملک: (سنجیدگی کے ساتھ) اور جو آپ نے میرے ساتھ کیا ہے نازلی Believe me, I feel like crazy about you

آٹھواں منظر

(گل شیر کی دکان۔ حامد بیگ آتا ہے۔ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں۔ شیو بھی بڑھا ہوا ہے۔ ٹائی کھلی ہے اور وہ انتہائی پریشان لگ رہا ہے)

گل شیر: آؤ میرے فوڈ انسپکٹر (حامد بیگ ایک نظر اس پر ڈالتا ہے) مگر یہ کیا آج تم بہت پریشان لگ رہے ہو

بیگ: گل شیر تم نے میری زندگی برباد کر دی ہے۔

گل شیر: میں نے؟

بیگ: اور کس نے؟ تمہاری باتوں میں آ کر بہت عرصہ پہلے دوسری شادی کر لی تھی اور اسے خفیہ رکھا تھا۔ اب میری بیوی کے علاوہ میرے گھر والوں کو بھی پتہ چل گیا ہے اور میری جان عذاب میں آئی ہوئی ہے۔ دونوں طرف سے چھتر کھانے پڑتے ہیں۔ اور خرچے۔۔۔۔ خرچے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ رشوت

لیتے لیتے میری کمر دوہری ہوگئی ہے مگر خرچے ہیں کہ پورے ہونے میں نہیں آتے۔

(ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد گل شیر کے نزدیک ہو کر سرگوشی کے انداز میں کہتا ہے) اور یقین کر آدھی آمدن تو مچھلی والے کا بل چکانے میں صرف ہو جاتی ہے۔ (دونوں گلا کھنکار کر علیحدہ ہو جاتے ہیں)

گل شیر: ویسے تمہارے مسئلے کا ایک حل ہے میرے پاس۔

بیگ: جلدی بتاؤ یار کوئی نسخہ۔ مچھلی کھا کھا کر اب تو خواب میں بھی رہو مچھلی نظر آتی ہے۔

گل شیر: اوہو۔ میں اُس مسئلے کا حل نہیں بتا رہا، دوسرے مسئلے کی بات کر رہا ہوں۔ ۔۔ یہ جو روز روز کے جھگڑے ہیں تمہاری بیویوں کے درمیان، یہ ختم ہو سکتے ہیں۔

بیگ: اچھا وہ کسطرح؟

گل شیر: وہ اس طرح کہ اب تم تیسری شادی کر لو۔

بیگ: کیا بکواس کر رہے ہو گل شیر۔ پہلے ہی تمہاری باتوں میں آ کر میں نے دوسری شادی کرنے کی غلطی کی۔ جس کا نتیجہ اب بھگت رہا ہوں اور تم کہتے ہو کہ تیسری شادی کر لوں یہ ناممکن ہے۔

گل شیر: میں نے پہلے بھی تم سے کہا تھا باؤ حامد بیگ، یہ معرفت کی باتیں ہیں، حکمت کی باتیں ہیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ تم اس طرح کرو کہ اپنے ہاتھ کی صرف دو انگلیوں کو بند کر لو، دو کھلی چھوڑ دو اور مکا بنانے کی کوشش کرو۔ (بیگ اسی طرح ہی کرتا ہے اور یوں اس کی کھلی ہوئی دو انگلیاں مختلف سمت میں مڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ جھلا جاتا ہے)

بیگ: کیا بکواس ہے گل شیر۔ مجھ سے نہیں ہوتا یہ تماشا کھل کر بتاؤ تم کہنا کیا چاہ رہے ہو۔

گل: باؤ حامد تم نے اگر میرے مشورہ پر پوری طرح عمل کیا ہوتا تو تمہیں دوبارہ بات سمجھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ ہاتھ میں انگلیاں چار ہوتی ہیں۔ اور اُنگلی ہے مؤنث۔ اور پھر تم یہ بھی جانتے ہو کہ مکا بنانے کے لیے چاروں اُنگلیاں بند ہوں اور اوپر انگوٹھا ہو تو کُسن بنتا ہے ورنہ نہیں۔ اب بات سمجھ میں آئی یا نہیں۔

حامد: اوہو ہو ہو۔۔۔۔ اس نقطے پر تو میں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔۔۔۔ یعنی اب یہ ضروری ہے کہ میں دو بیویوں کے ساتھ خوشگوار ازدواجی زندگی گزارنے کیلئے دو مزید شادیاں کروں۔

گل: ہاں ۔۔۔۔ اب سمجھ میں آئی ہے تمہیں بات اور اگر شادی نہیں کرو گے تو ساری زندگی اسی طرح اُجڑے اُجڑے پھرتے رہو گے اور پاپ سنگروں کی طرح ہاتھوں کی انگلیاں نچاتے رہو گے۔

(گل دو اُنگلیاں بند کر کے "hip hip" کرنے کے سے انداز میں اُنگلیاں نچاتا ہے۔ حامد گہری سوچ میں ڈوبا ہوا مکینکی انداز میں اسی طرح انگلیاں نچاتا ہوا کبھی مٹھی مضبوطی سے بھینچ کر، آہستہ آہستہ چلا جاتا ہے۔ گل اُسے جاتا ہوا دیکھتا ہے اور پھر جب وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو آہ بھر کر خواہش

اور طلب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ رضیہ کے گھر کی کھڑکی کی طرف دیکھنے لگتا ہے)

نواں منظر

مونتاژ۔

(ملک اپنے مخصوص انداز میں شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ مختلف سیمینارز میں تقریر کر رہا ہے۔ خواتین اس کی تقریر پر مسکراتے ہوئے تالیاں بجا رہی ہیں۔ ملک کو لڑکیوں کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ اس کے گھر کے shots بھی دکھائے جاتے ہیں جہاں وہ مختلف خواتین کو اپنی art collection، کتابیں اور antiques دکھا کر متاثر کر رہا ہے اور سنجیدہ انداز میں ان پر اپنا علم ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ساتھ ہی اگلا شاٹ جس میں ملک مختلف لڑکیوں سے شادی کے لئے نکاح خواں کے ساتھ بیٹھا ہے)

دسواں منظر

(گل شیر کے گھر کا منظر۔ ایک سادہ چارپائی جس کے ساتھ ہی مٹی کا گھڑا پڑا ہے۔ دیوار پر سلطان راہی کی فلم کا پوسٹر جس میں ہیروئن بھی نمایاں طور پر نظر آ رہی ہے۔ بیک گراؤنڈ میں فلمی گانا چل رہا ہے۔ 'ماہی آوے گا میں پھلاں نال دھرتی سجاواں گی۔ گل شیر مٹی کے گھڑے سے پانی پیتا ہے اور چارپائی پر لیٹ جاتا ہے۔ گانے کے بول جب "چلاں گی پکھیاں" تک پہنچتے ہیں تو گل شیر مسکراتے ہوئے دستی پنکھا جھلنے لگتا ہے۔ اور چہرے پر مسکراہٹ کے ساتھ ہی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اور غنودگی کے عالم میں اپنے باپ کو خواب میں دیکھتا ہے)

باپ: اوئے شیر گل مت ماری گئی ہے تیری۔ کیا بُرائی تھی گل لالہ میں۔ کتنا بڑا کپڑے کا کاروبار تھا اس کے باپ کا۔ دُر جان خانم کا باپ بھی اپنی بیٹی کا رشتہ دیتا تھا۔ اور تو کسی اور کے خیال میں خراب ہو رہا ہے۔

گل شیر: ابا تجھے تو پتہ ہے میں نے رشتے سے کیوں انکار کیا تھا۔ میرے پاس اتنے پیسے کہاں تھے کہ ان کے مطالبے پورے کر سکتا۔ اور پری گل لالہ اور دُر جان بچپن میں میرے ساتھ کھیلتے ہوئے روونڈ مار جاتی تھیں۔ اگر یہ شادی کے بعد بھی روونڈ مار دیتی۔

باپ: کیا ہو گیا ہے تیری عقل کو؟ تجھے کھیل کود اور شادی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟ دل چاہتا ہے تیری پسلیوں میں تنکہ ماروں۔

گل شیر: تو جو بھی کہہ ابا۔ لیکن میں تو رضیہ کے ساتھ ہی شادی کروں گا۔

باپ: کون ہے یہ رضیہ؟

گل شیر: ابا وہ۔۔۔۔ وہ میری دُکان کے سامنے گھر ہے اس کا، ایمان سے بڑا خیال رکھتی ہے۔ ابھی تو شادی بھی نہیں ہوئی اور وہ گڑ والے چاول بنا کر بھیجتی رہتی ہے۔

باپ: بے شرما۔ باپ کے سامنے عشق کی داستانیں سُنا رہا ہے۔ اللہ بخشے تیرا دادا جب تک زندہ تھا میں نے کبھی اس کے سامنے تیری جلالی ماں کا نام نہیں لیا تھا اور تو میرے سامنے رضیہ رضیہ کی مالا جپ رہا ہے۔ ٹھہر جا ذرا۔۔۔ ابھی اُتارتا ہوں تیرے عشق کا بھوت۔ لے اب نام رضیہ کا۔ (جوتا اُتار کر گل شیر کی پٹائی شروع کر دیتا ہے اور گل شیر 'رضیہ' کی چیخ مار کر اٹھ بیٹھتا ہے اور لمبے لمبے سانس لینے لگتا ہے)

گیارہواں منظر

(اعلیٰ ریسٹورنٹ میں نازلی اور سائرہ سمیت ملک کی ۳ اور بیویاں سونیا' زرقا بھی موجود ہیں۔ اُن کے سامنے جوسز کے گلاس ہیں اور وہ سِپ کرتے ہوئے آپس میں گفتگو کر رہی ہیں)

سائرہ: Isn't it awful کہ کس طرح چالاک شخص نے ہمیں جھوٹ اور فراڈ کے ساتھ اپنے جال میں پھنسایا ہے۔

نازلی: I can't believe کہ کوئی اس حد تک گر سکتا ہے۔

زوبی: میں تو اسی لیے مردوں سے نفرت کرتی تھی۔

سونیا: میں بھی بلکہ میں تو social activitst بھی اسی لیے بنی تھی تاکہ عورتوں کو مردوں کے چنگل سے آزاد کروا سکوں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ In that process میں خود ملک رؤف جیسے خبیث مرد کے شکنجے میں آ جاؤں گی۔

سائرہ: میں اب سوچتی ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا مجھے اس شخص میں کیا charm نظر آیا۔

نازلی: exactly میں بھی یہی سوچتی ہوں۔ میں نے پہلی دفعہ اس کی تقریر سُنی تو اس میں کہہ رہا تھا کہ اتنی خوبصورت خواتین دیکھ کر مجھے پیرس کی آرٹ گیلری یاد آ رہی ہے۔ دوسری میں فلارنس کی آرٹ گیلری، تیسری تقریر میں لندن کی۔۔۔ uff . He is such a liar.

سونیا: اور ہر دفعہ he has to cut short his speech because اُس کی کمر میں درد ہوتا ہے اور وہ کمر درد کی گولیاں بھی لانا بھول جاتا ہے۔

روبی: آئی تھنک کہ اب ہمیں مل کر اس شخص سے بدلہ لینا چاہیے اور اس کے لیے میرے دماغ میں ایک اسکیم ہے۔

خواتین: کیا؟؟؟

بارھواں منظر

(ملک رؤف کی کوٹھی کا بیرونی شاٹ جہاں 50-60 عورتیں احتجاج کر رہی ہیں۔ اُن کے ہاتھوں میں پوسٹر اور کتبے اُٹھا رکھے ہیں۔ جن پر لکھا ہے کہ "عورتوں کے نام پر سیاست کرنے والے منافق ملک رؤف ملک رؤف اگلی شادی کب کر گے۔ اور اس طرح کے دیگر جملے درج ہیں۔ خواتین ملک رؤف باہر نکلو کے نعرے لگا رہی ہیں۔ شور سن کر ملک رؤف باہر نکلتا ہے اور یوں ظاہر کرتا ہے۔ جیسے وہ ان کے مطالبات پر ہمدرادنہ غور کر رہا ہے)

ملک: خاموش ہو جایئے اور مجھے میری بات کہنے کا موقعہ دیجئے۔

سائرہ: کہیے ملک صاحب ہم آپ کی ہی بات سننے آئے ہیں۔

زرقا: لیکن بات شروع کرنے سے پہلے ذرا یہ بتا دیجئے کہ اتنی ساری حسین خواتین دیکھ کر آج آپ کو کون سی آرٹ گیلری یاد آرہی ہے۔ وینس کی یا نیویارک کی یا کسی اور جگہ کی۔ (خواتین قہقہے لگاتی ہیں۔ ملک رؤف کے ماتھے پر پسینے کے قطرے اور وہ گھبرا جاتا ہے اور پھر وہ اس پوسٹر کی طرف اشارہ کرتا ہے جس پر درج ہوتا ہے۔ ملک رؤف اگلی شادی کب کرو گے)

ملک: میں آپ کی تمام باتوں کا اعتراضات کا جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن یہ ایک سراسر ذاتی سوال ہے کہ میں اگلی شادی کب کروں گا۔ یہ پوچھنے کا حق کسی کو نہیں ہے۔

سونیا: ہم صرف یہ پوچھنے آئے ہیں ملک صاحب کہ آپ کو یہ ڈرامے رچانے کی ضرورت کیا تھی۔

ملک: یہ ڈرامے کیا میں نے اکیلے رچائے تھے؟ کیا آپ خواتین بھی ایک سے زائد شادی کے خلاف compaign نہیں چلاتیں۔ لیکن پھر بھی آپ نے میرے ساتھ شادی کا فیصلہ کیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔ میں نے کسی کو مجبور نہیں کیا۔

سائرہ: ہم مانتے ہیں کہ اس میں کچھ قصور ہمارا بھی ہے لیکن ہم سے یہ غلطی آپ کی جھوٹ اور فراڈ پر مبنی گفتگو کے دھوکے میں آ کر ہوئی۔ Now you will have to pay for that ہاں۔

ملک: دیکھئے میری خواہش تھی کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ لمبی چوڑی گفتگو کرتا لیکن۔۔۔۔ (اُس کی چاروں بیویاں یک زبان ہو کر۔)

بیویاں: آپ کی کمر میں درد ہے اور کمر کی درد کی گولی بھی آپ کے پاس نہیں۔
سائرہ: فکر نہ کیجئے آپ کے کمر درد کا بہت اچھا علاج ڈھونڈا ہے ہم نے (ملک تھوک نگلتا ہے۔ خواتین اس پر ٹوٹ پڑتی ہیں اور وہ اپنے بچاؤ کی کوشش کرتا ہے۔)

آخری منظر

(گل شیر اور رضیہ کی شادی کا منظر گل شیر نے منہ پر رومال رکھا ہوا ہے اور بوسکی کا سوٹ پہن رکھا ہے اور آنکھوں پر سیاہ چشموں والی عینک ہے۔ ساتھ ہی حامد بیگ اس کے کان میں کھسر پھسر کر رہا ہے۔ 30-35 لوگوں کا اجتماع ہے۔ اور سادگی کا عنصر نمایاں ہے۔ نکاح خواں رجسٹر تھامے داخل ہوتا ہے)

نکاح خواں: لو بھئی گل شیر مبارک ہو۔ دلہن کے دستخط بھی ہو گئے ہیں۔ شادی مبارک ہو۔ (مبارک ہو کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ ایک نوجوان اٹھ کر لوگوں میں بد تقسیم کرنے لگتا ہے۔ نکاح خواں اور حامد بیگ گلے لگا کر گل شیر کو مبارک باد دیتے ہیں۔ گل شیر بیگ کے کان میں کہتا ہے)
گل شیر: باؤ حامد بیگ جب پہلی بار تم اپنی دلہن کے پاس گئے تھے تو کیا بات کی تھی۔
بیگ: اُس وقت بندے کو بات چیت کا ہوش تو نہیں ہوتا، لیکن ویسے میں نے سب سے پہلے تو تمہاری بھابھی کو شادی کی مبارک باد دی تھی۔
گل شیر: اس کا مطلب ہے کہ میں سب سے پہلے رضیہ کو کہوں کہ بھابھی جی شادی مبارک ہو۔
بیگ: اوہ بیوقوف، رضیہ تیری بیوی ہے، بھابھی تھوڑا ہی۔ (گل شیر سر پر ہاتھ مارتا ہے۔ اور ہنستا ہے)
گل شیر: اوہو۔ وہ بس ''ایکسائٹمنٹ' اتنی ہو رہی تھی کہ خیال ہی نہیں آیا کیا بک رہا ہوں۔
بیگ: ویسے گل شیر ایک بات تو بتا۔ تم اپنا ''مکا'' کب لہراؤ گے؟
(بیگ آنکھ مارتا ہے اور ایک ایک انگلی بند کر کے چار گنتا ہے)۔ میرا مطلب ہے باقی تین شادیاں کب کرو گے؟
گل شیر: نا باؤ حامد میں تو بس کفار کا غازی ہوں۔
بیگ: (کچھ نہ سمجھنے کے سے انداز میں) کفار کا غازی؟؟؟ او کفار کا نہیں گفتار کا غازی۔
گلشیر: وہی نا حامد باؤ۔ میں بس گفتار کا غازی ہوں۔ جو بات کرتا ہوں ضروری تو نہیں اس کو پورا کرنے کا حوصلہ اور ہمت بھی ہو مجھ میں۔
بیگ: کیا مطلب اوئے پھر دوسروں کو شادیوں کا مشورہ دے کر کیوں پھنساتا ہے؟
گل شیر: تم لوگ بھی غلط سمجھتے رہے ہو۔ ایک چیز ہوتی ہے کسی چیز کا جائز ہونا اور ایک ہوتی ہے فرض ہونا۔ میں

نے کب کہا ہے کہ چار شادیاں فرض ہیں۔ بھائی حامد بیگ دعا کرو کسی کو دوسری شادی کی ضرورت پیش نہ آئے اور یہ میرا ہاتھ دیکھ رہے ہو نا۔ (ہاتھ پھیلاتا ہے)۔ جب ہم ہاتھ کھولتے ہیں تو دیکھو یہ انگوٹھا الگ نظر آنے لگتا ہے اور چار انگلیاں اس سے الگ ہو جاتی ہیں کیا فائدہ چار کا اگر ان میں سے ایک بھی ساتھ نہ رہے۔ (حامد بیگ، گل شیر کے گلے میں بازو حمائل کرتا ہے اور دونوں ہنسنے لگتے ہیں)

ختم

طنز و مزاح

سوانح حیات حکیم خانہ خراب چمکار آبادی

محمد ناصر خان

ایک زبر سے ________ پیش لفظ

آج میری تحقیق وتنقید کا محور جناب حکیم خانہ خراب چمکار آبادی ہیں اور ان کا ''دیوان خانہ خراب''۔ میری تحقیق سے پہلے اس قدیم نسخے پر صاحب ذوق جھینگر اور ادب کی عاشق زار دیمک محترمہ اپنی برادری خاصی ایڈیٹنگ کر چکی تھیں۔

شعر

بڑی مشکلوں سے بچایا اسے
خرابوں سے میں ڈھونڈلایا اسے

دوسری اہم بات بھی محل نظر رہے کہ اس مضمون کے تمام حوالے مستند تذکرات، دونوک سوانح حیات اوران سنسرڈ بے لاگ حالات شعرائے قصہ پارینہ قسم کی کتابوں سے نقل کئے گئے ہیں۔ اس لئے دیگر برادر نقادین کرام اور اعتراض برائے اعتراض کے مقلدین عظام اور صاحبان حل وعقد محتاط رہیں کہ جملہ حقوق برائے تنقید مزید میرے ہی حق میں محفوظ و مامون ہیں۔

نام

تذکرہ گمنام شعراء میں جسے آپ کے ہمعصر حکیم ستیاناس عطائی نے تالیف کیا، آپ کے بہت سے نام درج کئے ہیں۔ سب سے مضبوط روایت نارزن صدیقی کی ہے جو بدیسی شاعر تھے اور شاعری کی اعلےٰ تعلیم کے سلسلے میں ہندوستان کی خاک چھانتے پھرے۔ صادق آباد میں آکر صدیقی کے لقب سے ملقب ہوئے۔ آپ نے حکیم صاحب کا صحیح اور سالم نام ''بدتمیز خان'' لکھا ہے۔ نارزن صدیقی کی تحریر کا حوالہ مندرجہ ذیل ہے۔

Mr. Bad Tameez Khan hailed from some alien land, possibly Herat and due to poverty he settled in Chamkarabad in India

مزید کئی تذکرہ نویسوں اور مختلف معاصرین نے بھی اپنی سیدھی چھلانگیں لگائی ہیں ایک صاحب نے آپ کا نام نامی اسم گرامی "بے تمیز خاں" لکھا ہے حالانکہ "بے" اور "بد" کے درمیان فرق کی ایک عمیق خلیج حائل ہے۔ دوسرے ایک صاحب نے قلم تراشا ہے۔

اصل نام تیجو خان تھا مگر پیار سے لوگ انہیں تیجو چکار اور پھر تیجو چمار کہنے پر اتر آئی۔ (سوانح تیجو چمار جلد ہفتم صفحہ دیمک چاٹ گئی۔)

راقم الحروف نے آپ کی اصلیت و نام نسق کے بارے میں بجتیری دوڑ دھوپ کی چنانچہ راقم کی تحقیق کے نتیجے میں یہ بات وثوق کی حدود خطرناک کو چھوتی ہے آپ کا اصلی اور خالص دیسی نام تھا۔ خان تمیز گل آپ چچا اور دادے کی طرف سے ہی نجیب الطرفین تھے۔

ان کے نام کی تصدیق کے لئے انہی کا ایک شعر آپ کی نذر ہے۔

دلدل پھنسا ہے یار کا دلدل میں گل کا گل
چل مل کے ہم نکالیں اسے اے تمیز گل

قطع نظر نام کے اشارے کے اس شعر میں حروف کی تکرار یعنی "د، ل، ک" ۔ نے مسحور کن موسیقیت اجاگر کردی ہے۔ (پروفیسر خواجہ یزدانی نے اس شعر کو کسی اور ہی گل سے منسوب کیا ہے جو سراسر غلط ہے، لغو ہے اور بدنیتی پر محمول کیا جاسکتا ہے)

پیدائش

صدی کے وسط میں، مئی کی کسی تاریخ کو بدھ کے روز آپ اپنے ماں باپ کے گھر پیدا ہوئے اور پیدائش کے تین سو چونسٹھویں دن منحنی غزلیں رو رو کر باقاعدہ اپنی شاعری کی داغ بیل ڈال دی۔ بعد میں خانہ خراب کے تخلص سے ملقّب ہو کر اپنی زندگی میں خوب نام کمایا۔ کسی شاعر نے آپکی تاریخ پیدائش کہی۔

کیا بات پوچھتے ہو خانہ خراب کی

اس میں بدھ کا روز بنتا ہے مگر مہینہ جون کا نکلتا ہے۔ سال بے وزن ہے۔

تعلیم

شاعری کا سکول لیونگ سرٹیفکیٹ بطن مادر پرائمری سکول کوکھ آباد سے ملا۔ فردر ایجوکیشن کے لئے آپ کو بے پرکی بھیج دیا گیا بعد میں آخری ڈگری کشور ہندوستان کی سب سے بڑی شاعر گھڑ یونیورسٹی لاہور سے

بتھیائی۔ شاعری کے ساتھ حکمت بھی کرنے لگے۔ لوگ انہیں اپنا مرض بتاتے آپ انہیں شعر سناتے۔ چنانچہ بقول مصنف ''مجمع الحمقا''

''بعد از قطعِ تحصیلات از اساتید دینوی آن والا جناب دکان طب فروشی را آغاز کردند و این دکان که بر سر گوشہ گورستانے بود، برائے حکیم خانہ خراب خیلے سودمند گردید، چہ، ہر مریضے کہ پیشِ ایشان برائے معالجہ می آمد، ایشان بہ شعر ہائے زود اثر اورا نوازند و او از مرض ہائے خفی و جلی دینوی نجات داد و راست بہ دنیائے راحت و آرام جاویدی فرستادند۔

مجمع الحمقا، جلد پنجم اس بیان سے حکمت کے ضمن میں آپکی فضیلت اور بزرگی پہ بڑی روشنی پڑتی ہے۔ اسی طرح ''زبدۃ الحکماء'' میں الشیخ ابن الجعلی نوس نے آپکی حکمت کو بہت سراہا ہے بلکہ اس نے تو آپ کو حکیم العلت کا درجہ عطا کر دیا۔

معلوم ہوتا ہے آپکی عمر کا خطیر حصہ جڑی بوٹیئی حکمت میں ہی صرف ہوا کیونکہ مفتی روشن دین حلوائی نے اپنی مشہور، مقبول مگر نایاب کتاب ''ایک برقی، ہزار لندو'' میں آپ سے دکان حکمت پر اپنی ملاقات حسرت آیات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے

''دروغ برگردن روادی و چناب، آخر در۔ (سال منا ہوا ہے) بہ دو چکار آباد رسیدم۔ ایشان بہ دکان طب نشستہ بودند، چہار زانو نزدیک رفتہ، سلامی عرض کردم۔ بالب ہائے آویختہ ہیندی جواب دارند۔ ذر رفتے منہ۔ بندہ خیلے متحیر شدم''

ایک برقی ہزار لندو حصہ دوم صفحہ ا

شادی اور اولاد

نصیب حاسداں، روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے شادی بھی کی۔ حکیم خانہ خراب کی شادی خانہ آبادی کس تاریخ کو انجام پائی کچھ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کیونکہ نکاح نامہ کو

بُز خورد، بُز را قصاب بُرد

البتہ ایک چینی سوانح نگار شین شوں شائی شک نے جاپانی مورخ اونگا بونگا کے حوالے سے یوں نقل کیا ہے۔

"His wife was too much social. Social activities involved her so much that one day, and forever she forgot the track back to her home. This made our great poet weep and weep under the moonlit sky of old past days. Then he married a second blonde

لیکن دوسری سوانحِ عمر یوں سے پتہ لگتا ہے کہ ایک محتاط اندازے کے مطابق آپکی جائز اور

دوسری اولاد کا شمار انگلیوں کی پوروں پر ہو سکنا کارے وارد ہے۔ معدودے چند شعرا کرام سے صرف نظر کر کے اکثریت نسلاً بعد نسلٍ حکیم خانہ خراب کی اولادِ معنوی سمجھے جاتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

وفات

آپ ایک کم سو برس کے تھے کہ دوسری بیوی کے خلاف جنگ میں کام آئے۔ آپکے سر سینہ اور بازوؤں پر چمٹکنیوں کے تین نشانات پائے گئے۔ پوسٹ مارٹم کے سے ڈاکٹروں نے ایک چمٹا آپ کے پیٹ سے اور بیلن کے ٹکڑے کھوپڑی سے برآمد کئے۔

آپکی وفات پر پورے ہند سندھ میں رات کے وقت خموشی اور تموشی چھائی رہی اور اکثر دیپ گل کر دئے گئے آپ کے سفرِ آخرت کی تاریخ یہ نکلی۔

خس کم جہاں پاک

خانہ خراب مرد بیباک

مُرد زمرگ حسرت ناک

پروفیسر ڈاکٹر شالی نے اپنی کتاب ____ لبوگا کے ____ میں حکیم خانہ خراب کو شہید لکھا ہے۔ چینی اور مصری علماء کا بھی یہی خیال ہے مگر شگفتہ کالا باغوی نے اپنی کتاب "تحقیق فتاویٰ" میں اسے حرام موت قرار دیا ہے۔

کتابیں

آپ نے لے دے کے کل چار کتابیں تصنیف کیں۔

(i) قصہ چہار درویش پاریہ — پنج قصص فارسی نثر

(ii) تحفۃ الخواتین — عربی نظم — یہ کتاب عورتوں کی جملہ خصوصیتوں سے متعلق ہے۔

(iii) دنیا گھر وے پاگلاں دا — چند کو غزلیں اور نظمیں

(iv) دیوان خانہ خراب — کتابی کیڑے چٹ کر گئے۔ جلد محفوظ ہے مگر اس پر مکھیوں کی کارستانیوں کے اتنے نشانات پائے گئے کہ نام تک سوائے راقم کے کوئی مائی کا لعل نہیں پڑھ سکتا اور من آنم کہ من دانم

خصوصیات کلام

شاعری میں ابتدا شاعر کے پیدا ہونے سے ہوتی ہے، پھر خیال جنم لیتا ہے جو "ناموجود" سے ذہن

کے افق پر بجلی کے ''کھمبے'' کی طرح نمودار ہوتا ہے۔ مگر جسے شاعری کی روح اپنے احساسی اور جذباتی مدار میں کھینچ لیتی ہے اور عکیمانہ چھان پھٹک کرتے ہوئے کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ چنانچہ آخر آخر میں ابتدائی خیال شعری آہنگ سے مملو ہو کر ایک ایسے نئے روپ میں سامنے آتا ہے۔ جو شاعر کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہی واردات حکیم خانہ خراب پر بھی گزری مگر ستم ظریفی کہ نواب میرزا دودھ پانی پتی نے اپنی کتاب ''تنقید بر کلام یا وہ گویاں'' میں یہ لکھ دیا کہ

''شاعری حکیم صاحب کی کھالی کا سودا نہیں''

لیکن اس کے باوجود بہت سے پیشہ ور نقاد آپ کے مداح اور تذکرہ نویس آپکے معترف گزرے ہیں۔ مولا نازکام کھانسوی اور نزلہ بخاری نے تو آپ کو آسمان شاعری کا مدار ستارہ قرار دیا ہے اور ابن لا ٹیلہ جنہوں نے اردو شعرا کا ''تذکرۃ الشعرا البندی'' لکھا، آپکی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے۔

لا ریب فیہ الحکیم الخانہ الخراب الھندی شاعر عظیم وقدیم وکان نادرۃ الدھر۔ الشعر البندی جلد اول

''نادر'' سے کنایہ ''نادر جہاں'' کی طرف بھی ہے اور ''نادر افغانان'' بھی۔ جائے پیدائش ملاحظہ ہو کیونکہ آپکے نادر شعر نادر خانی زرت وخیز یعنی قتل وغارت سے متصف بھی تو ہیں۔

آپ کے دیوان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ خارجہ اثرات اور اندرونی کیفیات سے متاثر ہو کر نکلنے ہوئے شعر پورے دیوان پر بھاری ہیں۔ حتیٰ کہ ہمارے عہد کے شعراء میں حکیم خانہ خراب ایک امتیازی حثیت کے حامل نظر آتے ہیں ان کی شاعری کا مواد غم ذات اور غم دوراں سے عبارت ہے اور پھر آپ کا ذوق جمالیات، جمالیات کی تمام حدیں پھلانگتا نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی
فرشتے نے بھر لی چٹکی جنت میں حور کی

اور کہ

عشق وہ کھیل نہیں ہے جسے لمڈے کھیلیں
سر کھل جاتے ہیں ضربات کے پڑتے پڑتے

رقیب روسیاہ اور ظالم سماج کی چیرہ دستیوں کی طرف لطیف اشارہ ہے۔

اور اس شعر میں تو رمزیت کا فن انتہا کو چھو چکا ہے۔ وسعت اور گہرائی ملاحظہ ہو۔

جب سے تجھ کو دیکھ لیا ہے　　　　اپنا خانہ خراب کیا ہے۔

تشبیہات شاعری کا عجز ہوتی ہیں۔ حکیم خانہ خراب کے زیر استعمال استعارات میں جدت، تشبیہات میں ندرت اور کلام میں شوخی بیاں اور نئے نئے مضامین باندھنے میں آپکو مضبوط ''وٹی ہوئی'' رسی حاصل ہے۔

تیری زلفیں گھوڑے کی دُم

گاہے پنکھا، گاہے خر دُم

آپکے شعروں کی ہیئت مترنم اور متنوع بحور سے مزین ہوتی ہیں۔ لیرکس کی سی سادگی، آسانی اور روانی ملاحظہ ہو۔

گورے گورے گالوں پہ کالا تل ایسے

رکھا ہو کوئلہ، ملائی پہ جیسے

کوئلے اور تل کی مثال، ملائی اور گال کی رعایت عجب سماں باندھ گئی۔

آپ اپنا تخلص مقطع میں یوں کھپا دیا کرتے تھے کہ تخلص تخلص نہیں برسبیل تذکرہ معانی سے پُر لفظ بن جاتا تھا۔ مشتے از خروارے چند مقطعے ملاحظہ ہوں۔

تیری بلی کا ہو بھلا جس نے

کر گئی آج آکے خانہ خراب

ایک دوسری جگہ فرمایا

ساس سسر ہوں کہ سالیاں سالے

ان کے دم سے ہوا ہے خانہ خراب

اب اس شعر کی صداقت بآنگ دہل فریاد کر رہی ہے۔

صنم تو ایک طرف ہے، مریض کا بھی یہاں

ہمارے ذوق طبابت سے پورا خانہ خراب

اس میں تھوڑا سا ابتذال در آیا ہے مگر صداقت سے مفر نہیں۔ اب تجسیم اور تجرید کے عوامل سے گزرتے ہوئے کلام میں بیان کی گروداری صورتوں سے لطف لیجئے۔

فراق تیرے میں ہم جو روتے رہے

یاس و حرمان و غم، ڈبوتے رہے

مذاق کے صوتی اثر سے کیا کمال کام لیا ہے۔!! آگے کہتے ہیں۔

ہجر میں ترے کیا کہیں کیونکر

دل نے رو رو کر کیا ہے خانہ کراب

کافی چھان بین کے بعد یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچی کہ حکیم خانہ خراب کو موسیقی سے بھی خدا واسطے کا لگاؤ تھا۔ آپکی بیشتر غزلوں کے ٹکڑے قوالی میں لگا لگا کر قوال آپکی مترنم بحور سے محفلوں میں چار چاند لگاتے رہے۔ حروف کی تکرار سے موسیقی پیدا کرنے میں آپکو یدِ طولا حاصل تھا۔ مثال سے نمایاں کرتا ہوں۔

کس سے کہیں کیا پایا ہے
دل دے کر دکھ دیکھا ہے

نغمی بھور میں آپ کی غزلیں سبز مرچیں ہیں، جتنی چھوٹی اتنی تیکھی۔ پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے جیسے ایک خوش اندام حسینہ ندی کنارے گھاس کے فرش مخملیں پر محوِ خواب ہو اور کوئی شریر و چنچل سکھی دھیرے دھیرے اس قتالہ کے تلوے سے گلاب کی نازک پتیاں چھو کر گدگدا رہی ہو۔

دل کی دنیا دل کی دنیا — لٹ گئی لٹ گئی لٹ گئی آہ
میں گبرو اور تو البیلی — تو بھی رانی میں بھی شاہ
لوگ اسے سب کہتے ہیں — خانہ خراب عشقی اللہ

بڑے لوگ ایک جیسا یا ملتا جلتا بھی سوچ سکتے ہیں۔ یہی تو ان کی بڑائی ہے جو انہیں چھوٹوں سے ممیز کرتی ہے۔ دیکھئے بندہ ابی طالب، اسداللہ الغالب نے کہا یا جگر مراد آبادی کا شعر ہے تحقیق نہیں ہو سکی۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی — دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

آپ نے فرمایا:

نیلی آنکھوں کا ہو بھلا ان نے — دل جگر کا کیا ہے خانہ خراب

تینوں شاعروں نے جگر باندھا ہے اور کیا باندھا ہے
حافظ نے شیراز میں کیا کہا تھا۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای — باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

حمد میں آپ نے عرض فرمایا ہے۔

بھیج کر دنیا میں معشوقوں کو اے رب جلیل
مجھ سے کہتا ہے کہ پٹی باندھ رکھ آنکھوں پہ تو

پشتون شاعر نے کہا۔

استر گے خو دے ھسے راباندے راز اولے
لکہ ستاد پلار رو میراث چہ ما خوڑ لے پی

آپ کا ارشاد ہے۔

یوں دیکھتے ہیں آپ تو عشاق کی طرف
گویا وہ مال آپ کا کھائے ہوئے سے ہیں

''ہوئے سے ہیں'' نے شعر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ ملاحظہ کیا آپ نے؟ حکیم خانہ خراب کے اختتامیہ شعروں میں حواس جاگتے ہیں۔ یہ شعر نظر کو، دل کو، فکر کو چھو کر گزرتے ہیں۔ حواس کی اس نبت گار میں

پورے منظر نامے، واردات قلبی اور ذاتی فکر عود کر آئی ہے۔ ان کے اشعار میں مین شاوزم کی کلبلاہٹ بھی ہے، دکھ کا گداز بھی اور کائناتی آلام کی جھلک بھی۔

حرف آخر

حکیم خانہ خراب کی فکری معصومیت، مزاج کی جبلی اداسی، الفاظ کا خوش رنگ چناؤ، مترنم بحریں، مضمون کا ارتکاز اور ادائیگی کا اختصار وہ خوبیاں ہیں جو ان کے قاری کو تھوڑا سا چونکا کر دیوان کو بار بار پڑھنے پر آمادہ کریں گی۔

☆

"بارے کرکٹ کا کچھ بیاں ہو جائے"

یاور عباس

کرکٹ ایسی لا علاج بیماری ہے جو دنیا کے ہر اس حصے میں پائی جاتی ہے' جہاں انگریز حکومت کر چکے ہیں۔ حکومت تو خیر انگریز امریکہ پر بھی کر چکے ہیں لیکن امریکہ اس بیماری سے بال بال بچا۔ اس سے پہلے کہ انگریز وہاں پر رواج قائم کر سکیں' امریکیوں نے خود انگریزی حکومت ہی کا رواج ختم کر دیا۔ اگر امریکیوں نے اپنی آزادی کی لڑائی کچھ دن اور اتھار کھی ہوتی تو وہ ضرور اس مہلک بیماری میں مبتلا ہو جاتے۔ اور پھر نہ تو وہ آسانی سے آزادی حاصل کر پاتے اور نہ ہی ریڈ انڈین قوم کا اس مستعدی سے خاتمہ کرنے کے لیے ان کے پاس وقت ہوتا۔ جارج واشنگٹن کی بڑائی اور سوجھ بوجھ کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس نے کرکٹ کے خطروں کو بھانپ لیا' ورنہ آج صدر امریکہ کی تقریر میں وہ لذت نہ ہوتی کہ جو انہوں نے کہا' برطانوی وزیر اعظم نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ انگریز نے جو بڑی دور کی سوجھتا ہے' اپنے ایشیائی جاسوس وہاں بھیج رکھے ہیں اور انہوں نے اس بیماری کے جراثیم وہاں پھیلانے شروع کر دیے ہیں۔ اور شاید وہ دن دور نہیں جب امریکی بھی ہماری طرح اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے پانچ پانچ روز تک لگاتار صبح سے شام تک ٹیلی ویژن کے سامنے دیدے پھوڑتے رہیں گے۔

بڑی تحقیق اور جستجو کے بعد ہم اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ کرکٹ ایک سامراجی سازش ہے اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ کرکٹ کی ایجاد اس وقت ہوئی جب انگریزی سامراج اپنے عروج پر تھا تو یہ تاثر اور مضبوط ہو جاتا ہے۔

ایک تو سامراجیت میں خود ایک قسم کا پاگل پن ہوتا ہے جو سامراجیوں کو عجیب عجیب حرکتیں کرنے پر مجبور کرتا ہے' پھر سامراجی ان حرکتوں کو اپنی رعایا میں بھی رائج کر دیتے ہیں تاکہ سامراج کے ختم ہونے کے بعد بھی کچھ ایسے رشتے قائم رہیں جنہیں توڑنا آسان نہ ہو اور کرکٹ کا رشتہ انہیں رشتوں میں سے ایک ہے۔

دنیا سے نے انگریزوں کی حکومت اٹھ جانے کے بعد دنیا کے مختلف حصوں میں آپ دیکھیں گے کہ

جہاں کبھی دن پہلے انگریزی حکومت تھی' وہاں بعض علاقوں کو چھوڑ ہر جگہ اب بہت سے انگریزی رواج یا تو مٹا دیے گئے ہیں یا مٹائے جا رہے ہیں۔ مثلاً آزاد عدالتیں' آزاد پریس' آزاد پارلیمنٹ' آزاد ذہن' لیکن کرکٹ ایک ایسا رواج ہے جس کا مٹانا تو درکنار جسے اور فروغ دیا جا رہا ہے۔ بلکہ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جیسے جیسے معاشرہ بگڑتا ہے' ویسے ویسے کرکٹ سدھرتی ہے۔ انگریز معاشرے کی صحت کا قائل کن ثبوت اگر کوئی ہو سکتا ہے تو یہی کہ انگریز کرکٹ میں پٹ رہا ہے۔

البتہ یہ ماننا پڑے گا کہ کرکٹ صحیح معنوں میں انگریزی کھیل ہے۔ ایسا عجیب الخلقت' ایسا محیرالعقول کھیل صرف انگریز ہی ایجاد کر سکتا تھا۔ کسی نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ بنی نوع انسان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک انسان اور دوسرے انگریز اور انگریز کی یہ ایجاد یعنی کرکٹ اس حقیقت کا بین ثبوت ہے۔ ذرا سوچیے انگلستان ایک سرد ملک ہے جہاں دھوپ موسم کے مطابق نہیں بلکہ کبھی کبھی شوقیہ۔ جب اس کی مرضی ہو ذرا سی دیر کے لیے نکل آتی ہے۔ اور جہاں بارش کو چھوٹ مل گئی ہے کہ جب اس کا جی چاہے' ہو جائے بلکہ جب اس کا جی نہیں چاہتا' تب بھی خواہ مخواہ ہوتی رہتی ہے۔ تو اب ایسے ملک میں جس کے موسم کا کوئی ٹھکانا نہیں' ایسے کھیل کی ایجاد جس کا دارومدار۔ سو فی صدی موسم پر ہے' واقعی انگریز ہی کا کارنامہ ہو سکتا ہے۔ اب دیکھیے نہ تقریباً ہر کھیل بارش میں بھی کھیلا جا سکتا ہے۔ فٹ بال۔ گلی ڈنڈا۔ رگبی۔ کبڈی۔ یہاں تک کہ ٹینس کے لیے بھی اوپر تنبو تان کر کچھ نہ کچھ انتظام کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کرکٹ ذرا بارش ہوئی اور کھلاڑی دوڑ کر ڈربے کے اندر۔ بلکہ کبھی کبھی تو بارش ہوئے بغیر ہی محض بادل گھر آتے ہی کرکٹ کے سورما گھیری آئی باوری۔ نا ہیں کھیلت بالما کا مہار الاپتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

پھر موسم کے علاوہ ایک ایسے ملک میں جہاں وقت بہت قیمتی بتایا جاتا ہے۔ ایک ایسا کھیل جس میں وقت زیادہ سے زیادہ ضائع کیا جا سکتا ہے' کیا کوئی معمولی قوم ایجاد کر سکتی۔

گھنٹے دو گھنٹے کی بات ہو تو کھیل کود کے قصہ تمام کریں۔ جی نہیں کم سے کم ایک پورا دن۔ نہیں تو تین دن۔ لیکن صحیح معنوں میں پانچ دن جسے اصل کرکٹ کہا جائے۔ یعنی ٹیسٹ کرکٹ گویا امتحانی کرکٹ۔ جس میں کھیلنے والوں سے زیادہ دیکھنے والوں کا امتحان لیا جاتا ہے کہ کھیلنے والوں کو تو اجرت بھی ملتی ہے اور انعام و اکرام بھی۔ لیکن دیکھنے والا بیچارہ پانچ روز کی متواتر مشقت جھیلنے کے بعد خالی ہاتھ ہی نہیں بلکہ خالی الذہن ہو کر اٹھتا ہے۔

خیر وقت' موسم' موقع' محل' سب سے قطع نظر صرف کھیل کو لے لیجیے کوئی سا بھی کھیل خواہ وہ دو آدمیوں کے درمیان ہو جیسے ٹینس یا کشتی۔ خواہ دو سے زیادہ کے درمیان جیسے ہاکی' کبڈی' اس میں سب کھلاڑی ایک ساتھ حصہ لیتے ہیں۔ لیکن کرکٹ میں گیارہ کھلاڑی چار طرف اور دو کھلاڑی بیچ میں۔ باقی نو کھلاڑی۔ سائبان میں بیٹھے ہوئے ہماری اور آپ کی طرح تماشہ دیکھتے ہیں۔ اور جتنی زیادہ دیر بیٹھے ہوئے تماشہ دیکھتے ہیں'

اتنی ہی اُن کی ٹیم اچھی گردانی جاتی ہے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ بیٹھ کر تماشہ دیکھنے والی ٹیم کو کھیلنے والی ٹیم کہا جاتا ہے۔ اور دوڑ دھوپ کرنے والی ٹیم دوڑ دھوپ کرتی رہتی ہے۔ اس تمام سعی لاحاصل کا انجام کبھی کبھی قدرت کی طرف سے پیدا ہو جاتا ہے۔ آسمانوں سے قہرِ الٰہی نازل ہوتا ہے۔ اور آن کی آن میں پورے کھیل پر پانی پھر جاتا ہے۔

اب آیئے ایک طائرانہ نظر اس کھیل کی اصطلاحوں پر بھی ڈال لیں۔

''چھوٹی ٹانگ۔'' چین کا آدمی''۔ ''لمبی ٹانگ''۔'' بیچ میں احمق'' اب آپ ہی بتائے کہ ''شارٹ لیگ'' ،'' چائنا مین''۔ لانگ لیگ'' اور'' سیلی مڈ۔ آن'' یا سلی مڈ۔ آف کا اپنی زبان میں اور کیا ترجمہ ہو سکتا ہے انگریزوں کی زبان میں تو خیر اس قسم کے جملے اور ترکیبیں ان کے انوکھے پن کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ لیکن جب کرکٹ کو کسی دوسرے دیس کی زبان میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اچھے اچھے اہل زبان منہ کھول کر رہ جاتے ہیں۔ اور اگر وہ انگریزی زبان کا سہارا نہ لیں تو کرکٹ کے کسی میچ کا آنکھوں دیکھا حال کچھ اس روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے کہ

''انڈیا کے کپتان نے اب اپنی ٹیم کو سمیٹ کر انگلینڈ کے بلے باز کے ارد گرد جمع کر لیا ہے۔ پورا زور اب بلے باز کو ڈرانے اور دھمکانے پر دیا جا رہا ہے۔ کپتان نے اب خود ہی گیند پھینکنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بلے باز کے بازو میں چار پھسلنیں ہیں۔ اور اس کے بالکل نزدیک ایک واہیات نقطہ۔

کپتان نے اپنی چھوٹی ٹانگ کو اور چھوٹا کر لیا ہے۔ اور لمبی ٹانگ بالکل نکال دی ہے ایک بیچ میں احمق کو دائیں طرف اور دوسرے بیچ میں احمق کو بائیں طرف جما دیا ہے۔ کپتان گیند پھینکنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ اور ہر قسم کی گیند پھینک سکتے ہیں۔

میچ کا فیصلہ انہیں چند گیندوں میں ہو سکتا ہے۔ دیکھیے وہ کس گیند سے شروع کرتے ہیں۔ ان کی یہ پہلی گیند چھلاوا ہوگی۔ یا چھچھوندر۔ ٹانگ توڑ ہوگی۔ یا چین کا آدمی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ گیند پھوکا ؤ کپتان کوشش کرے گا کہ بلے باز کو کچھ ایسا جھانسہ دے کہ وہ بیچ میں ٹانگ اڑا کر ختم ہو جائے۔

اس طرح ختم ہونے کو۔ کرکٹ کی اصطلاح میں ڈنڈی آگے ٹانگ۔ یا لیگ بی فور وکٹ کہا جاتا ہے۔ جس کا مخفف ہے۔ ایل۔ بی۔ ڈبلیو۔ لیکن اس کا فیصلہ چونکہ بڑی حد تک ایمپائر کی صوابدید پر ہوتا ہے کہ اگر کھلاڑی کے ٹانگیں نہ ہوتیں تو کیا گیند ڈنڈی پر جا کر لگتا۔ اور گیند کی متلون مزاجی اور انسانی جسم کی ساخت دونوں کے پیش نظر ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ آسان نہیں' اس لیے ایمپائر کی آسانی کے لیے اس موقع پر گیند پھینکنے والا اور اس کے قریبی ساتھی آنکھیں اور منہ پھاڑ کر دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کر کے غریب ایمپائر پر شبخون مارنے کے انداز میں ایک فلک شگاف نعرہ لگاتے ہیں جس کے مفہوم کی وضاحت کچھ یوں ہو سکتی ہے کہ اے اندھے' کاہل ایمپائر دیکھ کیا رہا ہے؟ بولتا کیوں نہیں؟ بلے باز۔ ہے؟۔ یا گیا؟۔

اب اگر بلے باز کا طرفدار ہوا تو امپائر بت بنا کھڑا رہتا ہے۔ یا گردن ہلا کے۔ ''اونہوں'' کہہ دیتا ہے۔ یا اگر بلے باز کے جانی دشمنوں کی وحشت ناک دھمکیوں سے خوفزدہ ہو گیا تو اپنی شہادت کی انگلی پچاس ڈگری کے زاویے پر بلند کر دے گا جس کے بعد باؤلر اور اس کے ساتھی جامے سے باہر ہو کر ایسی ایسی حرکتیں کریں گے جو بیک وقت حیا سوز بھی ہوتی ہیں اور ناقابل فہم بھی' مثلاً دونوں ہاتھ جو ہاؤ ہو کے شور کے ساتھ ہوا میں بلند تھے دوسرے ساتھی کے دونوں ہاتھوں سے جا کر ٹکرائیں گے۔ بولر کے بالوں میں جلدی جلدی مالش کریں گے یا اگر وہ گنجا ہے تو اس کی چندیا کا بوسہ لیں گے یا اگر وہ اپنے کارنامے پر اس قدر جذباتی ہو گیا ہے کہ زمین پر چھکڑ مارے ہاتھ ہوا میں بلند کیے ہوئے ہونق بنا بیٹھا ہے تو اس کو زدوکوب کریں گے یا اس کو دھکیل کر اس کے ساتھ زمین پر لوٹ جائیں گے۔ ادھر بلے باز بیچارہ بلا بغل میں دبائے جھینپتا ہوا سائبان کا رخ کرتا ہے اور تماشے سے تماشہ بین بن جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ امپائر اور کھلاڑیوں کے درمیان اختلاف رائے سنگین صورت اختیار کرتا ہے۔ اور بین الاقوامی جنگ کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے ایک واقعے کو تاریخ میں شکور رعنا مائیک گیٹنگ معرکہ کہا جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ کرکٹ ایک سیدھا سادھا شریفانہ کھیل سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ کرکٹ۔ ''شرافت'' کا مترادف بن گیا تھا۔ کہ اگر کوئی شخص کوئی غیر شریفانہ حرکت کرے تو محاورہ تھا کہ This is not cricket ''یہ کرکٹ نہیں''۔ لیکن واہ رے ہندوستان، اور (چھٹ بھیا) پاکستان کہ ان دونوں کی جدت طرازی اور تخلیقی اپج کے طفیل کرکٹ میں ایک نیا اور تہلکہ انگیز عنصر شامل ہو گیا جس نے اس کھیل کو ایک ایسی شوخی' ایک ایسی غیر متیقنت عطا کر دی جو کھیل کی جان ہوتی ہے۔ اب یہ کھیل کھلاڑیوں اور امپائروں کے قبضہ قدرت سے نکل کر صحیح معنوں میں ایسے غیر جانبدار عناصر کے کنٹرول میں آ گیا ہے جنہیں کسی ایک ٹیم کی ہار جیت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ اس طرح مقابلوں اور میچوں میں خواہ مخواہ کی جدوجہد سے کھیل کو چھٹکارا ملا اور میچ کا نتیجہ امپائروں کے فیصلوں اور کھلاڑیوں کی کاوشوں کے شکنجے سے آزاد ہو گیا۔ اسے کھیل کی اصطلاح میں میچ فکسنگ (match fixing) کا نام دیا گیا۔ جس میں اس ہمہ جہت کھیل کے مختلف پہلوؤں اور ان گنت امکانات پر لاکھوں اور کروڑوں کے وارے نیارے ہونے لگے۔ اس طرح ترغیب دلانے کی ہماری مخصوص اور دیرینہ روایات کو ایک اور نیک کام کے لیے پروان چڑھایا گیا۔ یہ رواج ایسا بڑھا کہ ہندوستان جنت نشان اور مملکت خداداد پاکستان سے پھیل کر تقریباً تمام ہی ملکوں کی کرکٹ ٹیموں میں اسے اپنا لیا گیا۔ صرف انگلستان ایک حد تک اس رواج سے محروم رہا۔ تو شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ انگلستان کی ٹیم کو ہارنے کی ترغیب دلانے کے لیے رشوت درکار نہیں۔

کرکٹ کی گوناگوں خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی اُجاگر ہوئی ہے کہ اس سے گمراہ اور دولتمند دوشیزاؤں کو راہ راست پر لانے اور انہیں مشرف بہ اسلام کرنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔ اس طرح گویا ایک ہی سڑک میں دنیا اور عاقبت دونوں کی درستی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

کرکٹ کی افادیت کا ایک پہلو اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اداکاری' ڈاکہ زنی اور صحافت کے علاوہ اب کرکٹ بھی لیڈری کا زینہ بن گئی ہے۔ سابق کرکٹر اگر دماغ کا کمزور ہو (جو کوئی ایسی انہونی بات نہیں) تو لیڈری اور نیتا گیری کا پیشہ اختیار کر لیتا ہے اور کرکٹ کے استعارے۔ بڑے اعتماد کے ساتھ۔ اپنی مہم کو آگے بڑھانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ مثلاً

''اے میرے پیارے ہم وطنو۔ میں اُن لوگوں میں سے نہیں جو دشمن کی گوگلی کو سنبھال نہ سکیں۔ اے میرے معصوم سننے والو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرے پاس بیشتر مسئلوں کا حل موجود ہے۔ میری لیگ بریک کے سامنے کسی کے قدم نہیں جم سکتے۔ میرے پیارے بھولے بھالے ووٹرو۔ مجھے تم اپنا کپتان بناؤ۔ میں نئی گیند کی طرح سپاٹ بھی اور پرانی گیند کی طرح کھردرا بھی ہوں۔ (میں نے) اچھے اچھوں کے چھکے چھڑائے ہیں۔ مجھے گرفت میں لانا آسان کام نہیں۔ میں ہاتھ میں آ کر بھی' ہاتھ سے نکل جاتا ہوں۔ اے میری عوام (جی ہاں وہ عام کو اکثر مؤنث باندھتا ہے)

اے میری عوام۔ تمہاری دل موہ لینے والی سادگی اور بھولے پن کو دیکھ کر کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے کہ جیسے تم کو بنایا گیا ہے میرے لیے۔ یہ انتخابی مقابلہ میرا مفادی میچ ہے۔ اس لیے میرے ہم پیشہ جان ایف کینیڈی کے الفاظ میں یہ نہ پوچھو کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ یہ پوچھو کہ تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو۔ میرے سادہ و معصوم سننے والو خدائے بزرگ و برتر جو بڑا مسبب الاسباب ہے۔ اس سے میری یہ دعا ہے کہ وہ تمہاری سادگی اور معصومیت دو چند کرے۔ اور مجھے ووٹ دینے کی ترغیب دے۔ میرے ساتھ مل کر با آواز بلند کہو۔ ''کرکٹان زندہ باد'

اس کے بعد بھی اگر عوام پر اثر نہ ہو تو یہ ان کی محرومی بلکہ کفرانِ نعمت ہوگا۔

کرکٹ نے استعارے۔ لیڈر بازی کے علاوہ۔ دوسرے مشغلوں میں بھی بڑے کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ کے ملک میں لاتعداد شہری لا مکان ہوں' کھانے کے لیے دو وقت کو روٹی مہیا نہ ہو' پینے کے لیے صاف پانی نہ میسر ہو۔ بجلی کئی کئی گھنٹے غائب رہتی ہو۔ امیروں کے یہاں چلتی رہے اور غریبوں پر گرتی رہے۔ صحت عامہ کا تصور ناپید ہو جائے۔ شہروں میں سڑکوں کی جگہ گڈھے اور نہروں کی جگہ گندے نالے نظر آئیں۔ ماحول جب بھانت بھانت کی غلاظتوں اور زہر آلودگیوں سے سانس لینا دشوار کر دے۔ اور عوام حکمرانوں کی بدعنوانیوں' چالبازیوں اور رشوت خوریوں سے تنگ آ چکے ہیں تو ایسا دھماکہ خیز چھکا ماریے کہ عوام اچھل پڑیں۔ اور پڑوسی ملک بھی' جو ان تمام طرۂ امتیاز خصوصیتوں میں آپ سے کسی طرح کم نہ ہو۔ جواب میں ایسا جوہری باؤنسر پھینکے کہ عوام کے سر پر سے ہو کر گزر جائے۔ پھر جو زبانی کرکٹ میچ شروع ہوگا' اس میں ایسی ایسی گوگلیاں' ایسے ایسی چائینا مین ایسے ایسے باؤنسر اور ایسی ایسی قلابازیاں دیکھنے میں آئیں گی کہ دنیا والے عش عش کرتے رہ جائیں اور عوام اپنی کلفتیں بھول کر اپنی پٹیاں یا کمر بند کسے ہوئے۔ تالیاں پیٹتے رہیں۔ اور ایک وقت کے کھانے

پر اکتفا کرتے رہیں۔ جن کے پاس ایک وقت کا کھانا بھی نہ ہو وہ ایشور یا اللہ جو بھی ان کا بیلی ہو اس کا نام لے کر ہو جائیں تاکہ جو کیاب ذرائع ابھی تک دونوں فریق توپوں۔ ٹینکوں۔ لڑاکا ہوائی جہازوں۔ بمباروں اور اپنے اپنے محب وطن فوجی افسروں کی پرورش اور فلاح بہبود پر صرف کر رہے تھے وہ اب آزادی کے ساتھ اور جی کھول کر جوہری دھماکوں اور جوہری بموں کی ساخت و پرداخت پر بھی صرف کر سکیں۔ رہی وہ مد فاضل جسے عوام کہا جاتا ہے تو ان کے خالی پیٹ میں تعصب کی غذا ڈال کر انہیں قائل کر لیا جائے کہ یہ زیرِ زمین آزمائشی دھماکے ان کی سلامتی کے لیے ہیں۔ جن کے بعد ایک زبردست جوہری ٹیسٹ میچ ہوگا جس میں سچ مچ کے دھماکے زیر زمین نہیں بلکہ بروئے زمین ہوں گے۔ اور پھر ہمیشہ کے لیے خاموش بولر۔ بلے باز۔ تماشائی۔ ان کے دور دور کے رشتہ دار دوست احباب جنہیں اس ٹیسٹ میچ میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کے مکان۔ ان کی کھیتیاں۔ ان کے جنگلات۔ ان کے جانور۔ ان کے مویشی۔ ان کی تاریخی عمارتیں۔ ان کے آثار قدیمہ۔ ان کے مندر۔ ان کی مسجدیں سب جھلس کر نشٹ ہو جائیں گی۔ ایک ہی سٹروک میں ہمارے سارے جھگڑے طے ہو جائیں گے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ جس کا عربی مترادف ہے انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ٿ

تبصرۂ کتب

نام کتاب: ہوا کے تعاقب میں
مصنف: شوکت مہدی
تبصرہ نگار: سلیم اختر

شوکت مہدی کا پہلا شعری مجموعہ ''دھوپ بنی دیوار'' 1992ء میں شائع ہوا۔ وہ اس وقت نئے نئے راولپنڈی آئے تھے مگر انھوں نے بہت جلد راولپنڈی/اسلام آباد کے حلقوں میں اپنی شناخت کروالی۔ وہ آئے دن اپنی شاعری اور فن سے وابستگی کی بدولت ادبی رسالوں اور اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں میں نمایاں رہنے لگے، شروع میں مختلف ادبی تنظیموں سے وابستہ ہو گئے بعد ازاں حلقۂ احباب وسعت اختیار کر گیا تو کچھ شاعر دوستوں سے ملکر ایک ادبی تنظیم ''ادراک'' بنائی جس کے زیر اہتمام کئی ماہانہ ادبی اجلاس اور مشاعرے منعقد کرواتے رہتے ہیں۔

''ہوا کے تعاقب میں'' ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو حال ہی میں شائع ہوا اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن بھی آچکا ہے۔ دیباچہ افتخار عارف نے تحریر کیا ہے جبکہ پیش لفظ عدیم ہاشمی کا تحریر کردہ ہے۔ ادبی حلقوں میں اس شعری مجموعے کو بے حد سراہا گیا اور خوب پذیرائی ملی۔

شوکت مہدی غزل گو شاعر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ وہ غزل کے مزاج دان ہونے کے ساتھ ساتھ غزل کی رمز و ایمائیت سے پوری طرح آشنا ہیں۔ انہوں نے شاعری کا آغاز روایتی غزل گوئی سے کیا مگر اپنی شناخت ایک روایت پرست کے طور پر نہیں کرائی اور روایت سے جدت کی طرف سفر کیا۔ جدت کی عمارت تعمیر کرنے کے لیے انہوں نے روایت کی اینٹیں استعمال ضرور کی ہیں مگر اپنی طرز فکر اور نظریاتی شعور کو منفرد انداز سے اجاگر کیا ہے۔ ماضی کے تجربات سے ہی ہم بہتر اور روشن مستقبل کی تعمیر کر سکتے ہیں۔

'ہوا کے تعاقب میں'' کی شاعری بڑی متاثر کن ہے جس میں پہلے سے زیادہ سنجیدگی اور پختگی ہے۔ دیباچے میں اس عہد کے نابغۂ روزگار افتخار عارف لکھتے ہیں ''مجھ سے اگر کوئی نئی غزل کے اشعار منتخب کرنے کی فرمائش کرے تو میں شوکت مہدی کے دونوں مجموعوں سے انتخاب کیے بغیر نہیں رہ سکوں گا اور ان کی تعداد کم نہیں ہو گی۔ شوکت مہدی کی غزل کی زبان کے حوالے سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کے وہ ذرا مختلف اور جداگانہ مزاج رکھتی

تے۔ بظاہر کھردرے، غریب اور نامانوس لفظوں کے استعمال سے شوکت مہدی بالکل نہیں گھبراتے۔"

اچھا شعر ہی پڑھنے والے کے دل پر اثر ڈالتا ہے اور اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ صاحبان ذوق ہشعر کو سمجھنے والے شوکت مہدی کے کئی شعروں پر رکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کی غزل کے اشعار کی بنت خوبصورت اور خیال میں ایک مقناطیسی قوت ہے جو پڑھنے والے کو اپنی طرف کھینچتی ہے مثلاً دیکھئے۔ ایسا شعر کیسے زندہ نہیں رہ سکے گا۔

پیش آ سکے گا، کیسے کوئی حادثہ مجھے
ماں نے کیا ہوا ہے سپرد خدا مجھے

فن سچائی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ایک سچا فنکار ہی اپنے فن میں نکھار پیدا کر کے اسے زندگی عطا کر سکتا ہے۔ شوکت مہدی کی زندگی میں بھی ہمارے ہاں کئی شعراء اور ادیبوں کی طرح تلخیاں، محرومیاں اور بے شمار اتار چڑھاؤ ہیں۔ قدیم یونانی فلاسفروں کے مطابق " آرٹ صرف ٹریجیڈی کی فارم پر تخلیق ہوتا ہے۔ حالات کی ستم ظریفیوں سے گزر کر فن تخلیق کرنا بھی فن میں نکھار پیدا کرتا ہے۔"

شوکت مہدی نے بھی حالات کی ستم ظریفی کے باوجود منزل کی جانب ثابت قدمی سے سفر جاری رکھا اور اپنے تخلیقی عمل کی آبیاری کرتے رہے۔ انسانی مزاج ہے کہ اس کو دکھ اور تکلیف کا احساس اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب وہ یہ سب کچھ برداشت کر چکا ہوتا ہے اور اس کے زخموں کے نشان بھی بھر چکے ہوتے ہیں تو ایک لاوہ اٹھتا ہے کہ یہ سب کچھ میں نے کیونکر برداشت کیا۔ اس کشمکش کے بعد بھی منزل کی جستجو، آسائش کی آرزو میں اس کو ایک خوبصورت سہانا خواب اور دل کش سراب دکھائی دیتا ہے۔ شوکت مہدی کچھ ایسے ہی خوبصورت اور سرابوں کے ساتھ ساتھ سفر کر کے اپنی کامیابی کی جانب مجنونانہ تسلسل سے آگے بڑھتے ہیں مثلاً یہ اشعار دیکھئے:

خوابوں کی بنیاد پہ زندہ رہتا ہے
دل میں اک ایسا باشندہ رہتا ہے
ایک امید فروزاں رکھتی ہے ہر شب
ایک چراغ سدا تابندہ رہتا ہے
وقت کی رو کو ٹھہرنا نہیں آتا مہدی
کوئی ریلا ہو بہر طور گذر جاتا ہے

شاعر کی شخصیت کے اظہار میں وہ تمام چیزیں شامل ہوتی ہیں جن سے اس شخص کی شخصیت کے تعمیری عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔ جب تک کوئی حقیقت سے آشنا ہو کر فن تخلیق نہیں کرتا وہ اچھا تخلیق کار نہیں بن سکتا۔

شوکت مہدی کی شاعری حقیقت کے قریب تر ہے۔ اگرچہ حقیقت پسندی اور سچائی میں مٹھاس کم اور تلخی زیادہ ہوتی ہے مگر اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں کہ بالآخر فتح سچ کی ہوتی ہے۔ مصنوعی پن دیر تک نہیں چلتا۔

اس حوالے سے دیکھا جائے تو ''ہوا کے تعاقب میں'' کی شاعری میں تکلف اور تصنع نہیں بلکہ صدق بیانی اور صاف گوئی ہے اور یہ ان کی شخصیت کا پرتو ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ریزہ ریزہ ہو کے کتنی دور تک بکھرا ہوں میں
دکھ تو ہوتا تھا کہ تیرے ہاتھ سے ٹوٹا ہوں میں

جھوک انسان کو فٹ پاتھ پہ لے آتی ہے
دل کئی ٹکڑوں میں بٹتا ہے بکھر جاتا ہے

میں وہ تھل کا پیڑ ہوں جو چلچلاتی دھوپ میں
اپنے اوپر موسموں کی سختیاں سہتا رہا!!!

شوکت مہدی کی شاعری محض جذبات و احساسات کی رو میں بہنے والی شاعری نہیں بلکہ ان کے ہاں انقلاب معاشرہ کے لیے مثبت جذبات اور نظریات بھی ہیں اور اجتماعی شعور بھی۔ شوکت مہدی نے سنجیدہ، اہم متحرک اور زندگی کے قریب ترین پہلوؤں سے وابستہ موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور ان موضوعات کی توضیح اپنی شاعری میں بڑے قرینے سے کی ہے۔ انکی غزل میں سنجیدگی اور دھیما پن غزل میں خوبصورتی پیدا کرتا ہے۔

غزل کے موضوعات میں جوں جوں وسعت پیدا ہوتی گئی تو اظہار کے تقاضے بھی وسیع تر ہوتے گئے۔ شوکت مہدی نے جذباتیت اور شاعرانہ مبالغہ آرائی سے ہٹ کر گرد و پیش میں وقوع پذیر ہونے والے حالات و واقعات کا گہرا مشاہدہ کیا ہے اور اپنی شاعری میں شامل کیا ہے۔ یہی وہ حساسیت ہے جس نے انہیں جدید اسلوب سے قریب تر کر دیا ہے۔ جن شعراء کے ہاں جذبہ، خیال میں تازگی ہو اور رنگ دلکش متعارف کرانے پر قدرت ہو وہی منفرد شناخت کے حامل ہوتے ہیں اور ان کی شاعری ادبی دنیا میں ان کے لیے اہم مقام متعین کرتی ہے۔ شوکت مہدی کی شاعری میں منفرد رنگ ہے جو ان کی غزل کا آئینہ دار ہے۔ علاوہ ازیں شوکت مہدی کے ہاں دھوپ کا احساس شدت سے ہے جس کا استعمال بھی کثرت سے کیا گیا ہے جس طرح میر کے درد و غم، پروین شاکر کے ہاں خوشبو اور نصیر احمد ناصر کے جدائی۔

وہی زمیں، وہی آسمان خدا بھی وہی
یہ ہم نے دیکھ لیا گھوم کر جہانوں میں

جو دشمنی ہے تو پھر دشمنوں سی بات بھی کر
خدا سے مانگ دعا میری زندگانی کی

دھوپ تا دیر کی ہے تم اگر آئے بھی سہی
ایک پل چھاؤں کی مانند گزر جاتا ہے

میں دھوپ کے حصار میں ہوں اور اے خدا
یہ چاہتا ہوں دھوپ نگر سے گزار دے
تاریک در و بام کو کر دیتے ہیں روشن
یہ چاند سے چہرے جو دمکتے ہیں شبوں میں

غزل کا ایک اہم وصف تغزل ہے جو غزل کی جان سمجھا جاتا ہے شوکت مہدی کی غزل میں اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ تغزل کا عنصر شامل ہے البتہ کہیں کہیں سادگی طبع نے تغزل اور رومانیت کو زیادہ ابھرنے نہیں دیا تاہم اکثر مقامات پر ان کی غزلیں تغزل کی عمدہ مثال ہیں۔ انہوں نے اپنی غزل کے دامن میں جو مضامین شامل کیے ہیں ان میں معاملات حسن و عشق، ہجر و وصال، رقیب، گل و بلبل، لب و رخسار، گلشن و بہار وغیرہ ہیں جو ہمارے کلاسیکی ادب کا سرمایہ ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ جدید موضوعات ان کی غزل کا حصہ ہیں۔

موجود ہوں خوشبو کی طرح گل بدنوں میں
میں اور مرے تذکرے ہوتے ہیں گھروں میں

سنا ہے شہر نگاراں کے خوبصورت لوگ
چمن بکف ہیں مگر قید ہیں مکانوں میں
سنبھل سنبھل کر جو زینہ زینہ اتر رہی تھی
حیات افروز مرحلوں سے گزر رہی تھی
میں دھڑکنوں میں گلاب صورت مہک رہا تھا
اور ایک تتلی مرے تعاقب میں مر رہی تھی

شوکت مہدی انسانیت سے پیار کرنے والے ہیں۔ وہ سماج میں پائے جانے والے ظلم و جبر اور استحصال کے رویوں سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں، گرد و نواح کی منافقت، بے ثباتی اور غیر یقینی کیفیات کو اندر سے محسوس کرتے ہیں اور اسکے بہاؤ میں بہتے نہیں بلکہ اپنی شاعری میں ان کیفیات کی تصویر بنا کر ابھارتے ہیں۔ وہ معاشرے کے ان کرداروں کے دکھ بھی محسوس کرتے ہیں جو ان کی طرح استحصال کا شکار ہیں۔
ان کے اشعار پڑھ کر قاری محسوس کرتا ہے کہ یہ اس کا اپنا دکھ ہے جس کا اظہار ہر حساس شخص کسی نہ کسی حوالے سے ایک دوسرے سے کرتا رہتا ہے وہ ان رویوں کو نہایت سادگی کے ساتھ منظر عام پر لاتے ہیں۔

جو ایک عمر سے محفوظ تھا نگیں مرے پاس
ضرورت آن پڑی ہے تو اب نہیں مرے پاس

چوٹھ نہ دیکھ، دیکھ مری پا شکستگی
پوشاک جسم پر ہے مگر تار تار ہے
فریاد کی بھی داد رسی اس کا کام ہے
منصف تنک مزاج ہے اور شہر یار ہے

شوکت مہدی کے ہاں انسانی رویوں کی ترجمانی اس طرح بھی ہے کہ کسی دوست سے جب کوئی دکھ پہنچتا ہے تو اس کا اظہار بھی وہ دبے انداز سے کرتے ہیں۔ گلہ بھی صرف اپنی ذات سے کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر جب کہیں سے کوئی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا میسر آتا ہے تو اس کا اظہار کرتے وقت بھی کنجوسی نہیں کرتے یہ اشعار دیکھئے:

میرا احساس لگاتا ہے کچو کے مجھکو
زندگی مجھ سے تیرا قرض چکانے کا نہیں
یہ نیا گھاؤ ہے اک دوست کا تحفہ میری
ضرب کاری ہے نیا زخم دکھانے کا نہیں
بلا کی دھوپ میں پلکوں کی سائبانی کی
ہمارے حال پہ اس نے یہ مہربانی کی

علاوہ ازیں اس شعری مجموعے میں غزلوں کے علاوہ کچھ اہم دوستوں پر لکھی گئی نظمیں بھی شامل ہیں ان کی شاعری کے حوالے سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جوں جوں ان کی شاعری منظر عام پر آئے گی اور پڑھی جائے گی ان کی شاعری کے کئی در وا ہوں گے۔

نام کتاب: دائرے میں در کھلا
مصنف: شہناز امتیاز
تبصرہ نگار: اعزاز احمد آذر

خلیل جبران نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "جب دو عورتیں بولتی ہیں تو وہ کچھ ظاہر نہیں کرتیں لیکن جب ایک عورت بولتی ہے تو وہ پوری زندگی کا اظہار کر دیتی ہے"
یہ بات کس قدر مبنی بر حقیقت اور کتنی گہری ہے، اس کوٹیشن کو بار بار پڑھتے جایئے اسکی پرتیں کھلتی چلی جائیں گی۔ فکر و خیال کے نئے در وا ہوتے چلے جائیں گے اور آپ ایک جہان معنی میں کھو جائیں گے۔

شہناز امتیاز کا مجموعہ کلام ''دائرے میں در کھلا'' پڑھتے ہوئے مجھے بار بار خلیل جبران کے یہی الفاظ یاد آتے رہے۔ میں اس مجموعہ کلام کے لفظوں، مصرعوں اور شعروں کے دائرے میں گھومتا رہا اور معنی کے در کھولنے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ عورت بولتی رہی۔ میں اسکے اظہار کو دیکھتا رہا۔

پاکستانی لوگوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ جب تک پاکستان میں ہوتے ہیں امریکہ جانے، امریکہ دیکھنے اور امریکہ میں رہ جانے کے لیے تڑپتے اور بہت سے تو یہ حسرت دل میں لیے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو امریکہ چلے جاتے ہیں' وہاں رہنے لگ جاتے ہیں وہ پاکستان کی محبتوں اور ناسٹلجیا کی اذیتوں میں زندگی گذار دیتے ہیں۔ دراصل امریکہ کی محبت مادی ضرورتوں کا دباؤ اور جبر ہے جبکہ پاکستان سے وابستگی روح کے اندر برپا چاہتوں کے تموج کا نام ہے۔ مگر ضرورتوں کے جبر اور چاہتوں کے تموج کے مابین ایک حد فاصل قائم کرنا اور خط امتیاز کھینچنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں

شہناز امتیاز کا ایک قطعہ ہے:۔

محبتیں جب بھی بلاتی ہیں
ہم اسی وقت دوڑے آتے ہیں
دے کے گلشن کو خونِ دل اپنا
اپنے صحرا کو لوٹ جاتے ہیں

دراصل ہم مجبور محض لوگ ہیں۔ ضرورتوں اور خواہشوں کا قیدی ہونا کسی کو بھی اچھا نہیں لگتا مگر لوگ ضرورتوں اور خواہشوں کے قیدی بن جاتے ہیں۔ یہ قیدی ہونا بھی کوئی ایسا اہم نہیں رہ جاتا اگر خیال وفکر آزاد ہوں' سوچ قیدی نہ ہو۔ مگر ہمارا المیہ تو یہ ہے کہ ہم بے چہرہ نہیں بلکہ دوہرے چہرے والے معاشرے کے لوگ ہیں۔ یہاں لوگ جیب میں جگنو رکھ کر سینوں کو منور ظاہر کرتے ہیں۔ وہ بہت بے تکلف دوست سر عام ایک دوسرے کی بہن کی گالی دے لیتے ہیں مگر اس کا رشتہ نہیں مانگ سکتے۔ پارلیمنٹ کے گوشوارے میں کروڑوں روپے کے اثاثے اپنے قلم سے لکھتے ہیں مگر 35 ہزار روپے تنخواہ کے لیے مرے جاتے ہیں۔.......... یہ سب قید کے، ذات کی قید کے مختلف انداز ہیں۔ شاید کسی ایسی ہی صورت احوال سے شہناز امتیاز نے کہا تھا:۔

قید جو شخص آپنے آپ میں ہے
ہائے اس کو رہا کرے گا کون

یہاں میں ایک بات واضح کر دوں کہ زیر نظر کتاب ''دائرے میں در کھلا'' کے حوالے سے میں کوئی ایسا دعوےٰ نہیں کر رہا کہ یہ اس صدی کا کوئی آخری شعری مجموعہ ہے۔ یہ میرا منصب بھی نہیں ہے لیکن یہ بات بہر حال قابل توجہ ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے کئی جگہوں پر آپ کو رکنا پڑے گا۔ کچھ شعر ایسے بھی ملیں گے جو آپ کو انگلی سے پکڑ کر اپنے ساتھ ساتھ لے چلیں گے۔ لیکن ایک کانٹا بھی بار بار دل میں چبھتا رہا کہ ''عراقی حوالے سے امریکی

فیصلے پر نظر ثانی نوتی بلیئر سے نہ کروائی جاتی' .... میں جناب علی موج رامپوری، جناب رحمان صدیقی، فیاض الدین صاحب اور جناب تابش خانزادہ کو نہیں جانتا ہوں۔ مگر شہناز نے لکھا ہے کہ "مرے دل کی بات کو آپ تک پہنچانے کے لیے ان مہربانوں نے بہت ساتھ دیا ہے۔ .... کاش ان ساتھ دینے والوں نے کچھ توجہ بھی دی ہوتی۔ اس فہرست میں عطاالحق قاسمی کا نام شامل نہیں ہے اور یہی وہ بات ہے جس پر میں انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ انہوں نے کتاب کے ابتدائیہ میں بہت صحیح کہا ہے کہ شہناز کی شاعری میں Diction اور Content بالکل تر و تازہ ہیں۔ میں اسی پس منظر میں شہناز کے ایک شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں مگر آپ اس کے لیے پہلے ٹوٹی بکھرتی قدریں، دو رخے چہرے، خواب ہوتے ہوئے انسانی رشتے اور بنجر ہوتی ہوئی دلوں کی کھیتیاں اپنے ذہن میں رکھیے تاکہ وہ شعر اپنی پوری معنویت اور بھرپور جمالیات کے ساتھ تحسین پاسکے۔ شہناز نے کہا کہ

شہناز درمیان کا پُل ٹوٹ بھی گیا
ہم فیصلے ہی کرتے رہے آر پار کے

نام کتاب: نیا پیراہن
مصنف: گفتار خیالی
تبصرہ نگار: مرتضٰی برلاس

گفتار خیالی کی شاعری کا تانا بانا معاشرتی ناہمواریوں کے بطن سے پیدا ہونیوالے احساس محرومی اور قدروں کی زوال آمادگی سے جنم لینے والی معاشرتی ناہمواریوں سے تیار کیا گیا ہے۔ معاشرتی ناہمواریاں اور قدروں کی شکست و ریخت گویا ایک ہی صورت حال کی دو مختلف لیکن بظاہر مماثل صورتیں ہیں' جن کے ایک دوسرے پر عمل اور رد عمل سے ایک بہت بڑا پیراڈاکس (Paradox) پیدا ہوا ہے۔ یہ پیراڈاکس نہ صرف ہماری سوسائٹی بلکہ عالمی سطح پر ہر معاشرہ کا اتنا بڑا روگ بن گیا ہے کہ تمام ادب خواہ اسکا خمیر کسی بھی زبان اور معاشرہ سے تیار کیا گیا ہو اس صورت حال کے خلاف ایک احتجاج۔ بلکہ بہت شدید احتجاج کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ معاملہ خواہ ایک آدمی اور دوسرے آدمی کے درمیان ہو، ایک معاشرہ اور دوسرے معاشرہ کے مابین ہو یا ایک ملک اور دوسرے ملک کے درمیان ہو یا پھر ایک سیاسی بلاک اور دوسرے سیاسی بلاک کے درمیان، ہر سطح پر مزاحمتی ادب ہی تخلیق ہو رہا ہے۔ یوں فلسطین کا مزاحمتی ادب ہو یا جنوبی افریقہ کا احتجاجی ادب یا گفتار خیالی کی شاعری، دراصل مختلف حوالوں سے ایک ہی صورت حال پر ایک طرح کا رد عمل ہے۔ صرف سطحیں مختلف ہیں۔ فلسطینی ادیب اپنی

قوم کے خلاف اسرائیل کی جارحانہ کارروائیوں اور امریکہ کے منافقانہ رویوں کو موضوع بنا کر اس صورت حال کے خلاف نہ صرف سراپا احتجاج ہے بلکہ سینہ سپر بھی ہے۔ جنوبی افریقہ کا ادیب رنگ و نسل کی تفریق سے پیدا ہونیوالے غیر اخلاقی رویوں کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ اور اس غیر انسانی رویہ کی حمایت کرنیوالی مختلف یورپی حکومتوں کے منافقانہ رویوں کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ گفتار خیالی ایک پاکستانی کی حیثیت میں کسی ایک بڑی صورت حال سے تو نہیں گزرا لیکن آدمی اور آدمی کے درمیان ایسی ہی صورت حال سے روز گزرتا ہے چنانچہ جب وہ کہتا ہے۔۔۔۔

ہر لبادے میں مجھے وہ شخص شاطر ہی لگے
اس کا ایماں کچھ بھی ہو مجھ کو وہ کافر ہی لگے

ہماری ذات سے اب بھی وہی منسوب ہوتے ہیں
جنہیں ہم نے کبھی پہنا نہیں وہ پیراہن ٹھہرے

مجھکو تو غم ہیں میرے بے حد عزیز
تو بتا آنسو مرے کیسے لگے

یہ انعطاف نور بھی کتنا عجیب ہے
دوش فضا پہ حسن مکمل دکھائی دے

نقیب عہد صداقت ہیں اس لیے ہم لوگ
اساس اپنی کسی ظلم پہ نہیں رکھتے

خالی پیٹ کا دکھ چہرے تک آپہنچا
سوتے گھر میں خالی برتن بول اٹھے

میں روشنی کی کرن کو ترسا ہزاروں گرچہ جتن کیے تھے
مٹی نہ ظلمت میرے وطن سے، افق پہ سو آفتاب دیکھے

تو گویا شخصی اور معاشرتی دونوں سطحوں پر وہ قدروں کی شکست و ریخت اور معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کرتا نظر آتا ہے۔ گفتار خیالی یوں اس پیراڈاکس کی ایک سطح پر بیٹھا شعر کہہ رہا ہے اور کبھی گرم وار لہجہ اور کبھی نرم انداز میں سراپا احتجاج ہے۔

گفتار خیالی کی شاعری کا بنیادی استعارہ محرومی ہے۔ یہ استعارہ کبھی فکری آزادی کے تضاد کی صورت میں سامنے آتا ہے اور کبھی آسودگیوں کے فقدان کی صورت میں ابھرتا ہے۔ خوشی کی فصل بو کر غم کی فصل کاٹنا، جبر کی اندھی نگری میں اذن رہائی حاصل نہ ہونا، طوفانوں کے بیچ لا کر سرکش موجوں کی فصل کاٹنا ــــــ یہ سب امیجز اسی ایک استعارہ کی مختلف صورتیں ہیں

زندگی کی روشنی کے استعارے خواب ہیں
دیکھیے تعبیر کیا ہو سکتے پیارے خواب ہیں
وہ جلوے بے تحاشا بانٹتا پھرتا ہے راہوں میں
وہ سورج کا زمیں پر استعارہ ہونے والا ہے
گھٹ کے مرتا جا رہا ہوں سوچ کے زندان میں
ذہن کو ہر موجہ احساس جابر ہی لگے
ابتک تو میرے پاؤں میں سایہ تھا میرے جسم کا
پھر کیسے آفتاب کو روبہ زوال کر دیا
کھولا ہے بیگ اس نے جو فٹ پاتھ پہ مرا
اسنا د، ذوق سائل اور اخبار اس میں تھا
یہی تو کام، کام تھا جس میں کمال کر دیا
ہم نے تجھے تو زندگی رنگیں وحمال کر دیا

گفتار خیالی انسان کی ان عظمتوں کا متلاشی نظر آتا ہے جن کا ذکر اس نے صحیفوں اور اخلاق کی کتابوں میں پڑھا ہے لیکن اپنے اردگرد نگاہ دوڑاتا ہے تو اسے سوائے مایوسی کے اور کچھ نہیں ملتا' تب اسے اپنا وجود بھی بے معنی سا لگتا ہے۔

منجمد خون ہے اس کا تو حرارت دی جائے
یعنی افکار کے سورج کو تمازت دی جائے
یا اتار دو مرے سر سے کلاہ عظمت
یا مجھے فیصلہ کرنے کی اجازت دی جائے

لیکن اس تاریک ماحول میں اسے اپنی انا کی نمو کیلئے روشنی کی ایک کرن بھی دکھائی دیتی ہے اور گفتار خیالی اس کرن کے سہارے زندگی کرنے کے عمل کو جاری رکھنے کا حوصلہ پاتا ہے۔

اوج افکار سے ابھرے گا خودی کا سورج
دشتِ ظلمت کے مکینوں کو بشارت دی جائے

گفتار خیالی کی شاعری میں جذبہ اور فکر کی آمیزش نے گہرے تاثر کو جنم دیا ہے یہ تاثر اسکے اکثر اشعار میں بکھرا ہوا ہے۔ وہ عشق کے عمومی جذبہ سے گریزاں اپنے احساسات کی تپش میں دوسرے انسانوں کو بھی شامل کرتا نظر آتا ہے۔ اسکی ساری شاعری محبوب کے اس روایتی تصور سے پاک ہے جس سے عشق کسی گہری معنویت سے تہی ہے۔

الفاظ میں شعور ہے، اسلوب میں جمال
آئے نہ کس طرح مرے شعروں میں روشنی
زندہ رہا جو عشق کی راہوں میں مر گیا
دیکھی ہے ہم نے پیار کے جذبوں میں روشنی

رہا جو زندہ دہر، میں بقاؤں کے اصول پر
وہ سطح آب پر سہی، مگر حباب کیسے تھا
تمام لوگ خامشی کے زہر سے مرے ہوئے
کہ حیرتیں بھی گم ہوئیں یہ انقلاب کیسے تھا

ارادے بانجھ ہو جائیں، ضرورت بے اثر نکلے
تو میرا مشورہ ہے پھر کوئی ٹھوکر طلب کرنا

گفتار خیالی کی شاعری کا محور و مرکز انسان ہے۔ وہ انسانوں کے درمیاں موجود رشتوں میں در آنیوالی بے استواری کا گلہ بھی کرتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ بلند حوصلوں اور ولولوں کے ساتھ زندہ رہنے اور دوسروں کو زندہ رکھنے کا تہیہ بھی کیے ہوئے ہے۔ وہ اس صبح کی امید میں زندہ ہے جو شب تاریک کے بعد ایک نہ ایک دن ضرور طلوع ہوگی۔ وہ اسی جرات اظہار پر اعتماد بھی کرتا ہے اور خاموشی کے اس طلسم کو توڑنے کی سعی بھی کرتا ہے جو انسانوں پر طاری ہوتا ہے تو بے حسی اور لاتعلقی کی بسیط فضا پیدا کر دیتا ہے۔

بدن سراسر ہوا ہے نیلا، میں لحظہ لحظہ بکھر رہا ہوں
رگوں میں جب زہر درد ہجراں رواں دواں تھا تو تم کہاں تھے
طبیب بن کر جو آگئے ہو، میں نیم جاں تھا تو تم کہاں تھے
تمہاری الفت کی بے حسی پر میں نوحہ خواں تھا تو تم کہاں تھے
تمہارے شہر میں تو جشن مقتل میں بھی ہوتا ہے
ہمارے شہر میں تو رسم یہ جاری نہیں ہوتی
کچھ ایسے جرم ہی منسوب ہم سے ہو گئے ہیں
قبیلہ کا قبیلہ اشتہاری ہو رہا ہے

گفتار خیالی کی شاعری اپنے وطن اور اپنے لوگوں کیلئے دردمندی کا پیغام ہے۔ غور سے دیکھیں اور محسوس کریں تو Political undertones گفتار خیالی کی شاعری کو ایک بلند مقام عطا کرتے ہیں۔ اس کا احساس صرف وہی کر سکے گا جو پاکستان کی سیاسی اور سماجی تاریخ سے واقف ہے۔ نیا پیراہن اس کا دوسرا مجموعہ کلام ہے۔

یہ مجموعہ یقیناً لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچے گا۔

مجھے یقین ہے کہ گفتار خیالی اپنے شعر کے حوالہ سے اپنی وقعت میں روز بروز اضافہ کریگا۔ مثلاً

ہم ہیں سورج ہمارے ساتھ چلو
ہم جہاں ہونگے شب نہیں ہو گی

بیج خوشی کا بو کر ہم تو غم کی فصلیں کاٹتے ہیں
کیا بویا تھا، کیا پایا ہے، اپنی سوچیں کاٹتے ہیں

مدتوں سورج کی گردش پر رہی جسکی نظر
روشنی کے شوق میں آنکھوں سے اندھا ہو گیا

ہر چیز اپنے سائے سے محروم ہو گئی
سورج کو جو زوال بڑی دیر تک رہا

اپنے اپنے سائے سب جسموں کو زہریلے لگے
آفتاب وقت نے کیا حشر برپا کر دیا

چاند کی، تارے کی، جگنو کی، نہ تتلی کی طلب
تیسری دنیا کے بچوں کو ہے روٹی کی طلب

☆

معاصر

ڈاکٹر انور محمود خالد

ادبی مجلّہ ''معاصر'' کا پہلا شمارہ، اکتوبر 1979ء میں عطاالحق قاسمی اور سراج منیر کی مشترکہ ادارت میں لاہور سے شائع ہوا۔ 754 صفحات پر مشتمل، غیر مطبوعہ تحریروں کا حامل یہ مجموعہ نظم ونثر، اردو کی جدید صحافت میں تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوا۔ عطاالحق قاسمی نے پہلے شمارے کے ''حرف آغاز'' میں ہی اپنے ادبی نصب العین کا اعلان کرتے ہوئے واضح کیا کہ ''معاصر کے ان صفحات میں آپ کو کئی لہریں بیک وقت نظر آئیں گی۔ یہ لہریں، پاکستانیت، معاشی و معاشرتی عدل وانصاف اور بین الاقوامی بھائی چارے سے مرکب ہیں۔ ہمارے نزدیک ارد گرد کی سب سے بڑی حقیقت پاکستان کا وجود ہے۔ چنانچہ وہ تمام فلسفے اور تمام نظریے، ہمارے لئے چیلنج ہیں جو اس حقیقت کو ماند کرنے کے لئے سامنے آتے ہیں۔ لہذا ہم اس ضمن میں دائیں اور بائیں کی تفریق کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ پاکستان ہمارا ایمان ہے۔ ہم اسے اور اس کی بنیادی نظریاتی اساس، اسلام کو عزیز رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہمارا اتحاد بھی (لیفٹ اور رائٹ کی تفریق کے بغیر) اُن ادیبوں سے ہے جو اس زمین، اس زمین پر بسنے والے عوام کے عقیدوں اور آدرشوں کو عزیز رکھتے ہیں''۔

''معاصر'' اب تک اپنی زندگی کی 24 بہاریں دیکھ چکا ہے اور پچیسویں برس میں قدم دھر رہا ہے۔ گزشتہ چوبیس برسوں میں مدیر ''معاصر'' نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنے ادبی نصب العین کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ ''معاصر'' کے پہلے شمارے سے لے کر تازہ ترین شمارے تک، جو حال ہی میں شائع ہوا ہے، وہ مسلسل ایسے مقالات، افسانے، نظمیں، غزلیں، مباحث اور انٹرویوز شائع کرتا رہا ہے۔ جن کی بنیادی نظریاتی اساس، پاکستان، اسلام اور عالم اسلام ہے۔ اُس نے دائیں اور بائیں بازو کی تفریق کے بغیر ایسے تمام ادیبوں کا قلمی تعاون حاصل کیا ہے' جو اس نصب العین پر ایمان رکھتے ہیں۔ مثلاً ''معاصر'' کے اولین شمارے میں ہی ہمیں ''محمد حسن عسکری کا تصور روایت'' از سلیم احمد ''اقبال اور سرزمین پاکستان'' از فتح محمد ملک'' اسلامی ادب کے تنقیدی لوازمات'' از پروفیسر فروغ احمد، ''ادب اور مسئلہ خیر وشر'' از روف انجم، اور شخصی آزادی، سماجی ذمہ داری اور اقبال

''از ڈاکٹر سلیم اختر جیسے مقالات ملتے ہیں، جن کے عنوانات سے ہی نفس مضمون کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔
''معاصر'' کے تازہ ترین شمارے میں بھی، جو اکتوبر 2003 تا مارچ 2004ء کی اشاعت ہے، کئی ایسے مقالات شائع ہوئے ہیں، جو مدیر ''معاصر'' کے دعوے کی تائید کرتے ہیں۔ مثلاً تاریخ مجھ سے بات کر'' از جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال، ''پاکستانیت کی دستاویز'' از مسعود مفتی اور ''مولانا روم اور آج کا ادھورا آدمی'' از عطا الحق قاسمی۔

مجلّہ معاصر کی اب تک کی کل اشاعتوں کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے دور میں 9 پرچے شائع ہوئے اور دوسرے دور میں آٹھ پرچے۔ گویا گزشتہ چوبیس برس کے طویل عرصہ میں ''معاصر'' کے کل 17 پرچے چھپے ہیں۔ پہلا دور، اکتوبر 1979ء سے شروع ہوتا ہے اور جولائی 2000ء تک ختم ہوتا ہے۔ دوسرا دور جنوری 2001ء سے اپنا آغاز کرتا ہے اور تا حال جاری ہے جس کا ثبوت معاصر کا تازہ ترین پرچہ ہے جو مارچ 2004ء میں منظر عام پر آیا ہے۔ پہلے دور میں عطا الحق قاسمی کے شریک مدیر، سراج منیر تھے اور اُن کے انتقال کے بعد، امجد اسلام امجد نے عطا الحق قاسمی کا ادارت میں ساتھ دیا۔ یہ شراکت ''معاصر'' کے چھٹے شمارے تک جاری رہی۔ اُس کے بعد سے اب تک، عطا الحق قاسمی کے صاحبزادے، عمر قاسمی، ادارتی امور میں باپ کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔
''معاصر'' اپنے پہلے دور میں خاصے ضخیم شمارے شائع کرتا رہا ہے، اسی لئے اُسکی اشاعتوں میں لمبا وقفہ پڑتا رہا ہے۔ مثلاً شمارہ نمبر ا، کی ضخامت 754 صفحات تھی، شمارہ نمبر 2 گیارہ سو صفحات پر مشتمل تھا۔ شمارہ نمبر 5 صفحات 864 اور شمارہ نمبر 9 '832 صفحات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھا۔ جب سے عمر قاسمی، ادارت میں شریک ہوئے ہیں، معاصر کی اشاعت میں نہ صرف باقاعدگی پیدا ہوگئی ہے بلکہ ضخامت میں بھی اعتدال آ گیا ہے۔ اب ''معاصر'' کا کوئی پرچہ دو سو صفحات سے کم اور چار سو صفحات سے زیادہ کا نہیں ہوتا۔ مجلّہ ''معاصر'' اب سہ ماہی ''معاصر'' انٹرنیشنل کہلاتا ہے اور ہر تین ماہ بعد شائع ہونے کا عزم کئے ہوئے ہے۔ لیکن اگر تین ماہ بعد نہ نکل سکے تو دو اشاعتوں کو یکجا کر کے چھ ماہ بعد شائع ہو جاتا ہے۔ دور ثانی کے آٹھ پرچوں میں پانچ پرچے چھ چھ ماہ کے وقفے سے شائع ہوئے اور صرف تین پرچے، تین تین ماہ کی پابندی پر پورے اُترے ہیں۔

مجلّہ ''معاصر'' بنیادی طور پر ایک ادبی جریدہ ہے۔ اسی لئے اس میں شاعری، افسانہ نگاری، خودنوشت، طنز و مزاح، تحقیق، تنقید، سفرنامہ نگاری، شخصی خاکہ نگاری، انٹرویوز اور کتابوں پر تبصرے وغیرہ اجزائے اعظم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ''معاصر'' کے ہر شمارے میں حمد و نعت و منقبت، نظمیں، غزلیں، افسانے، ناول، سفرنامے، تحقیقی اور تنقیدی مضامین اور نامور ادیبوں سے انٹرویوز تو نظر آئیں گے ہی ان کے علاوہ بھی معاصر کے دامن میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ مثلاً اپنے ہر شمارے میں ''معاصر'' کسی خاص موضوع یا مشہور ادبی شخصیت کے حوالہ سے گوشے وقف کرتا ہے۔ چنانچہ شمارہ اول میں ''اے زمین وطن! ہم گنہگار ہیں'' کے عنوان سے ''سقوط مشرقی پاکستان کے حوالے سے فتح محمد ملک کا مضمون: سن 1971ء کا شہر آشوب''، مسعود مفتی کا رپورتاژ: ''تنکے''، صدیق

سالک کا مضمون ''نفسیاتی جنگ'' اور مجید امجد کی نظم ''ریڈیو پر ایک قیدی''، شامل اشاعت کئے گئے ہیں۔ اسی پرچے میں مشہور مزاح نگار محمد خالد اختر کے لئے بھی ایک گوشہ رکھا گیا ہے جس میں محمد خالد اختر کی شخصیت پر احمد ندیم قاسمی کا خاکہ اور محمد خالد اختر کے فن پر محمد کاظم کے مضمون کے علاوہ محمد خالد اختر کے متعدد خطوط بھی شامل کئے گئے ہیں۔ اسی پرچے میں رینے گینوں (جن کا اسلامی نام شیخ عبدالواحد یحییٰ ہے) کے بارے میں بھی دو مضامین اور خود رینے گینوں کے ایک مضمون کا اردو ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ نوبل انعام یافتہ ادیب گابریل گارشیا مارکیز کے ایک طویل افسانے کا ترجمہ ''چشم براہ'' کے عنوان سے فاروق حسن نے کیا ہے اور ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں رشید ملک کا معاندانہ مضمون ''طلائی تثلیث'' بھی شامل اشاعت ہے۔

مجلّہ ''معاصر'' کے شمارہ نمبر 3 میں نذر ندیم کے عنوان سے احمد ندیم قاسمی کے لئے خصوصی گوشہ وقف ہے جس میں نہ صرف احمد ندیم قاسمی نے اپنے بارے میں خود اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے بلکہ چار دوسرے ادیبوں کے تاثرات بھی شامل کئے گئے ہیں۔ یہاں بھی ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں ساقی فاروقی کا ایک معاندانہ مضمون ''نابالغ شاعری کی ایک مثال'' دیر سے موصول ہونے کے باوجود رسالے کے آخر میں ''انتظاریہ'' کے عنوان کے تحت شائع کیا گیا ہے۔ ''معاصر'' کے شمارہ نمبر 4 میں پروین شاکر کے خصوصی مطالعے کے لئے ایک گوشہ وقف ہے اور شمارہ نمبر 5 میں پورے 80 صفحات مرحومہ پروین شاکر کی یاد میں لکھے گئے مضامین تعزیتی نظموں کے لئے وقف ہیں۔ اسی شمارے میں کشمیر کے بارے میں نظمیں اور وہاں کے ایک سیاسی لیڈر سید علی گیلانی کے حوالے سے بھی ایک مضمون شامل اشاعت ہے۔ ایک خصوصی مطالعہ، منو بھائی کا ہے جن کے متعلق احمد ندیم قاسمی اور عطاالحق قاسمی کے تاثرات شائع کئے گئے ہیں۔ افتخار عارف پر مشتاق احمد یوسفی کا بہترین مضمون بھی اسی شمارے کی زینت ہے۔ شمارہ نمبر آٹھ میں مجید نظامی کا ایک انٹرویو، شامل کیا گیا ہے جس میں ازہر منیر کے سوالوں کے جواب میں مجید نظامی مدیر ''نوائے وقت'' نے اپنے بچپن اور جوانی کے دلچسپ واقعات سنائے ہیں۔ آپ بیتی کے ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر ''نشانِ جگر سوختہ'' کے عنوان سے اب تک چھ قسطیں لا چکے ہیں جو ''معاصر'' کی چھ مسلسل اشاعتوں میں شامل ہوئی ہیں اور انہیں پڑھنے کے بعد ہماری ملاقات ایک اور ہی سلیم اختر سے ہوتی ہے، جو مشہور استاد، نقاد اور افسانہ نگار سلیم اختر سے بالکل مختلف ہے۔

''مجلّہ معاصر'' ادب میں مثبت روایات اور اعلیٰ قدروں کا ترجمان ہونے کا دعوے دار ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ادبی صحیفے نے اپنے بلند پایہ مندرجات سے یہ دعویٰ سچ کر دکھایا ہے۔

تقریبات

عطاء الحق قاسمی کے اعزاز میں لندن میں محفل مشاعرہ

سیما جبار

مارچ ۲۰۰۴ میں جب عطاء الحق قاسمی صاحب لندن تشریف لائے تو ہونسلو (ویسٹ لندن) میں مقیم معروف شاعر اور افسانہ نگار گلشن کھنہ نے انکے اعزاز میں جمعہ ۱۲ مارچ کو اپنی قیام گاہ پر ایک ادبی محفل اور مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ اس محفل خاص میں جن ممتاز اور معروف قلمکاروں نے شرکت فرمائی ان میں بی۔ بی۔ سی لندن کی اردو سروس کے جناب یاور عباس۔ محترمہ حمیدہ عباس۔ اعجاز احمد اعجاز۔ یوسف فاروقی۔ احسان شاہد۔ سیما جبار۔ ڈاکٹر رحیم اللہ شاد۔ سودیش لوتھرا۔ شریمتی کرشنا لوتھرا۔ گلشن کھنہ۔ بابر اور پاکستان سے تشریف لائے معروف شاعر کیپٹن شہزاد نیر کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس ادبی تقریب کے آغاز میں گلشن کھنہ نے جناب عطاء الحق قاسمی صاحب اور تمام شعرائے کرام کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا اور پھر سب کی اتفاق رائے سے بڑے احترام کے ساتھ جناب یاور عباس صاحب کو مسند صدارت پر بٹھایا گیا۔ کرسی صدارت قبول کرتے ہوئے یاور عباس صاحب نے اس ادبی تقریب کی شمع روشن کرتے ہوئے قاسمی صاحب کے اعزاز میں ایک شاندار محفل سجانے پر گلشن کھنہ کو مبارک باد پیش کی پھر تمام شعرائے کرام اور حاضرین جلسہ کو خوش آمدید کہا۔ نظامت کے فرائض معروف شاعر احسان شاہد کے سپرد کیے گئے۔ اس ادبی محفل کے پہلے دور میں اردو شعر و ادب پر گفتگو کی گئی اور اردو غزل کے حوالے سے مدلل بحث بھی ہوئی۔

دوسرے دور میں ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت بھی جناب یاور عباس نے قبول فرمائی اور نظامت کے فرائض احسان شاہد نے بڑی خوش اسلوبی اور ذہانت سے سر انجام دیئے۔ اس مشاعرے میں ڈاکٹر رحیم اللہ شاد۔ گلشن کھنہ۔ سیما جبار۔ بابر۔ احسان شاہد۔ اعجاز احمد اعجاز۔ یوسف فاروقی۔ یاور عباس۔ کیپٹن شہزاد نیر نے اپنا اپنا اردو کلام پیش کر کے حاضرین کو محظوظ کیا۔ اس مشاعرے کی ایک خاص خوبی یہ تھی کہ مسز کرشنا لوتھرا اور بیگم گلشن کھنہ نے ہندی میں کویتائیں پیش کیں جن پر ان دونوں کو خوب داد ملی۔ آخر میں

مہمان خصوصی جناب عطاء الحق قاسمی نے اپنا تازہ، معیاری اور دلکش کلام پیش کر کے حاضرین جلسہ اور تمام شعرائے کرام سے خوب داد حاصل کی۔ یہ یادگار اور تاریخی محفل رات ساڑھے دس بجے ختم ہوئی اور اس پروقار ادبی محفل کے اختتام پر شعرائے کرام اور تمام حاضرین کی خدمت میں محترمہ پرم جیت گھمن نے بڑی محبت اور خلوص کے ساتھ ایک پرلطف عشائیہ پیش کیا۔

ٹ

شعبہ اردو انقرہ یونیورسٹی کی تقریب

''عطاء الحق قاسمی پاکستان کے مقبول و مشہور ادیب اور شاعر ہیں، انہوں نے اپنے مزاحیہ کالموں، سفر ناموں اور شعروں کے وسیلے سے پاکستان کے ملی و قومی تشخص کو بطور خاص اجاگر کیا ہے'' ڈاکٹر سعادت سعید نے یہ الفاظ عطاء الحق قاسمی کے اعزاز میں منعقدہ شعبہ اردو انقرہ یونیورسٹی کی ایک خصوصی تقریب میں کہے۔ انقرہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی سربراہ ڈاکٹر سلمیٰ بینلی کی زیر صدارت منعقد ہونے والی اس تقریب میں عطاء الحق قاسمی کی شخصیت اور فن کے حوالے سے گفتگو ہوئی۔ ڈاکٹر جلال سوئیدان نے عطاء الحق قاسمی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ وہ اردو دوادب کے ایک مایہ ناز مصنف کا استقبال کرتے ہوئے دلی خوشی محسوس کر رہے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی اٹھارہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کا نام اردو دنیا کے لیے نیا نہیں ہے۔ ڈاکٹر سلمیٰ بینلی نے عطاء الحق قاسمی کی شعبہ اردو میں باردگر آمد پر ان کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اس سے قبل ۱۹۹۸ میں بھی اس شعبہ میں منعقدہ ایک سیمینار میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ناروے سے تشریف لائے تھے۔ وہ اس وقت ناروے میں پاکستان کے سفیر تھے۔ ڈاکٹر گلسرین بالی جی اور کئی طالب علموں نے عطاء الحق قاسمی سے ان کے شعر و ادب کے حوالے سے کئی سوال کیے۔ عطاء الحق قاسمی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ انہیں ترکی سے بے پناہ محبت ہے۔ وہ کئی بار پہلے بھی ترکی کا سفر کر چکے ہیں۔ اس شعبے کے اساتذہ اور طالب علموں کا اردو کے حوالے سے تراجم پر مشتمل کام دیکھ کر انہیں بے انتہا مسرت ہوئی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس شعبے سے ہر سال کوئی استاد پاکستان کا دورہ کرے۔ یوں وہ اپنے علم و فن میں مزید مہارت پیدا کر سکے گا۔ یہ دورے ایک دوسرے کا کلچر اور زبان کی افہام و تفہیم میں بھی مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے کہا کہ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ جب تک وہ ناروے میں بطور سفیر متعین رہیں گے ہر سال اس شعبے کا ایک استاد پاکستان کا دورہ کرے گا' چنانچہ انہوں نے اپنی جیب سے ٹکٹ خرچ کر کے ایک ریسرچ سکالر کو پاکستان بھجوانے کا بندوبست کیا تھا۔ چونکہ وہ اس عہدے پر متعین نہیں ہیں تاہم اب بھی وہ کوشش کر کے کوئی نہ کوئی راہ نکال لیں گے جس سے دوروں کا یہ سلسلہ جاری رہ

سکے۔ علاوہ ازیں انہوں نے کہا کہ اگر کوئی طالب علم اپنے طور پر پاکستان کا دورہ کرنا چاہے گا تو وہ پاکستان میں اس کی میزبانی کریں گے۔ اردو سے محبت کرنے والے ترک طالب علم پاکستان سے بھی دلی محبت کرتے ہیں۔

ڈاکٹر جلال سوئیدان نے اطلاع دی کہ انہوں نے حال ہی میں اردو ادب کا ایک انتخاب مرتب کیا ہے۔ اس میں عطاء الحق قاسمی کے ایک سفرنامے کا ایک باب موجود ہے۔ ڈاکٹر سعادت سعید نے بتایا کہ شعبہ اردو کی ایک ریسرچ سکالر آسمان بیلن عطاء الحق قاسمی کے مزاحیہ کالموں کے حوالے سے ایک طویل مضمون تحریر کر رہی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ دنیا میں جہاں جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے' عطاء الحق قاسمی وہاں وہاں مقبول ہیں۔ ان کی تحریریں گہری رمزوں کی حامل ہونے کے باوجود قارئین کے دلوں پر براہ راست اثر کرتی ہیں۔ وہ ان کے شکر گزار ہیں کہ وہ انتہائی مختصر نوٹس پر شعبہ اردو میں تشریف لائے اور انہوں نے اپنے قیمتی خیالات سے شعبے کے اساتذہ اور طالب علموں کو مستفیض فرمایا۔

کراچی میں منعقدہ طنز و مزاح کانفرنس و مشاعرہ کے مقررین مشتاق احمد یوسفی ایس ایچ ہاشمی، عطاء الحق قاسمی، انعام الحق جاوید، ضیاء الحق قاسمی و سامعین

لندن میں جناب عطاء الحق قاسمی کے اعزاز میں ہونے والی ادبی تقریب کا ایک گروپ فوٹو (تصویر میں دائیں سے بائیں پہلی صف میں مسز کرشنا لوتھرا۔ سوویش لوتھرا۔ محترمہ حمیدہ یاور عباس۔ عطاء الحق قاسمی۔ یاور عباس اور سیما جبار۔ (دوسری صف میں کھڑے ہوئے) کیپٹن شہزاد نیر۔ احسان شاہد۔ ڈاکٹر رحیم اللہ شاد۔ اعجاز احمد اعجاز۔ بابر۔ گلشن کھنہ

چیمبر آف کامرس سیالکوٹ کے مشاعرہ میں ڈاکٹر سعید اقبال سعدی اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ ان کے برابر میں عطاء الحق قاسمی اور احمد فراز نظر آ رہے ہیں۔

عارف والا میں کیپٹن عطا محمد خاں کے اعزاز میں منعقدہ مشاعرے کے شرکا۔

نوجوان شاعر ضیاء الرحمن فاروقی کے شعری مجموعے "احساس" کی تقریب رونمائی میں اسٹیج پر صاحبِ کتاب کے ساتھ صاحبِ صدر عطاء الحق قاسمی اور مہمان خصوصی اعزاز احمد آذر تشریف فرما ہیں۔

معروف شاعر ارشد جاوید ایڈووکیٹ کے اعزاز میں منعقدہ تقریب کی صدارت بیدل حیدری (مرحوم) کر رہے ہیں جبکہ تصویر میں منصور ملتانی اور اے۔جی کبیر والا بھی نمایاں ہیں۔

نوجوان شاعر عامر بن علی کی جاپان سے آمد پر ان کے اعزاز میں ادارہ معاصر کی طرف سے عشائیہ دیا گیا۔ تصویر میں عامر بن علی، اصغر ندیم سید، عذیر احمد، عطاء الحق قاسمی، فاطمہ غزال، اسلم کمال، ڈاکٹر سلیم اختر نمایاں ہیں۔

معروف شاعر عذیر احمد نے عمرہ سے واپسی پر

عطاء الحق قاسمی

کے اعزاز میں اپنے گھر پر ظہرانہ دیا جس میں امریکہ سے آئے ہوئے مہمان منی بھائی اور جاوید پیرزادہ بھی شریک ہوئے۔ دیگر شرکاء میں اے جی جوش، اسلم کمال، سعود عثمانی، کیپٹن (ر) عطاء محمد، شفیق مرزا، اشرف جاوید، رؤف ظفر، اصغر ندیم سیّد، امجد اسلام امجد، یونس متین، خالد اقبال یاسر، خالد احمد، زاہد مسعود، عباس نجمی، علی اکبر منصور، وصی شاہ، انور رقد وائی، اور شہزاد احمد کے علاوہ متعدد دوسرے دانشور شریک ہوئے۔
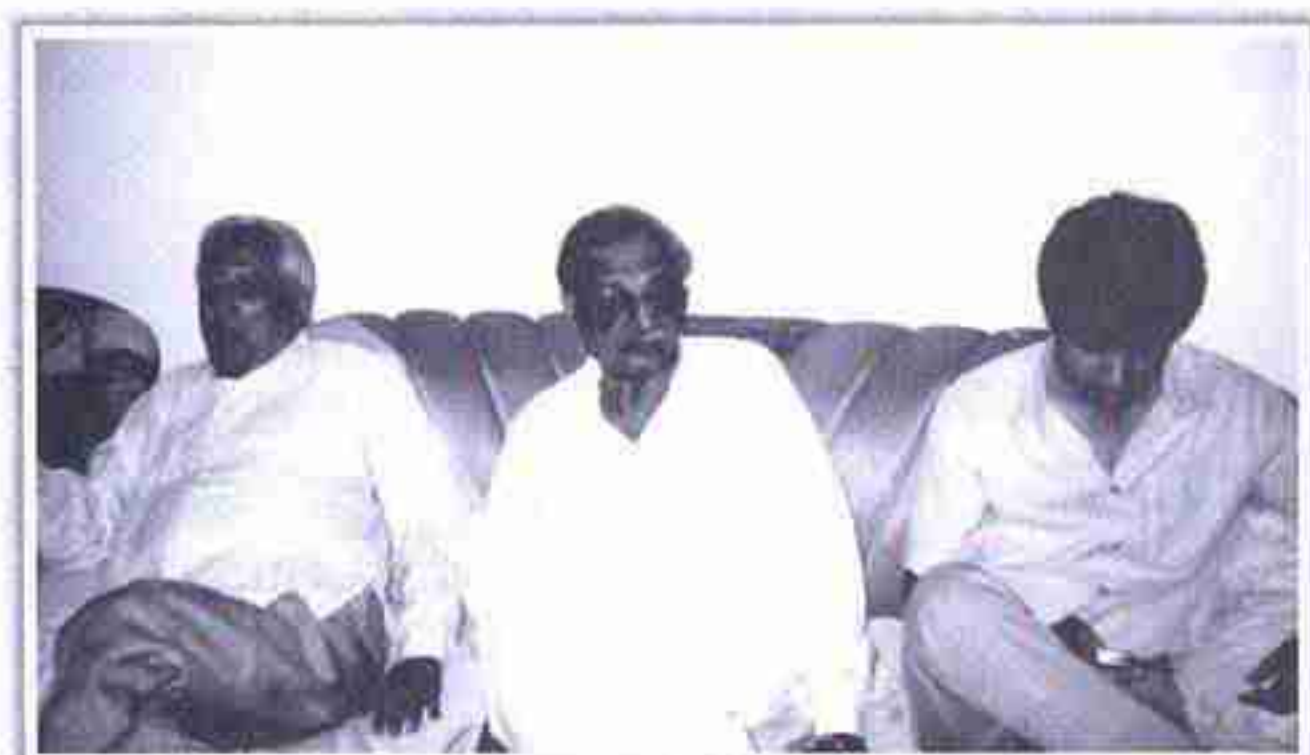
معروف نوجوان مزاح نگار اشفاق احمد ورک نے پنجاب یونیورسٹی سے طنز و مزاح میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی تو ادارہ معاصر نے اُن کے اعزاز میں ایک مختصر سی تقریب کا اہتمام کیا، اس موقع پر ڈاکٹر معین الرحمٰن، ڈاکٹر سلیم اختر، عطاء الحق قاسمی اور ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا نے انھیں گلدستے پیش کیے۔

مکتوبات

مکتوبات

پیارے عطا! السلام علیکم!

پچھلے مہینہ تمہارا خط ملا تھا۔ اس سے پہلے ''معاصر'' کا تازہ شمارہ اور تمہاری تازہ کتاب ''ہنسا منع ہے'' مستجاب صاحب کی معرفت دونوں مل گئے تھے۔ ان کتابوں کو پا کر کتنی خوشی ہوئی اس کا تم اندازہ کر سکتے ہو۔ بہت عرصہ بعد تمہاری حالیہ تحریریں پڑھنے کو ملیں۔ تمہارا فن اب کندن کی طرح نکھر گیا ہے۔ تمہاری تحریروں میں دردمندی اور انسان دوستی کی جولہر اب نہایت واضح طور پر نظر آتی ہے وہ بہت کم مزاح نگاروں کی تحریروں میں دکھائی دیتی ہے۔ میری دلی مبارک باد قبول کرو۔ اب تک تمہاری کتاب کو تین مرتبہ پڑھ چکا ہوں ''معاصر'' کا شمارہ یہاں احباب کے پاس گردش کر رہا ہے۔ ویسے اس کے بھی بعض مضامین پڑھ چکا ہوں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کو ''معاصر'' کا شمارہ مل چکا ہے۔ انہوں نے فون پر بتایا تھا۔

اب میری صحت اچھی نہیں رہتی۔ چلنے پھرنے میں سخت تکلیف رہتی ہے۔ میں نے یہاں knee replacement کی جو سرجری کرائی تھی وہ ناکام ہوگئی۔ تین سال سے اس تکلیف سے گزر رہا ہوں۔ اب اس کے ٹھیک ہونے کے کوئی آثار نہیں دکھائی دیتے۔

مجتبیٰ حسین

دہلی

⊛

محترمی سلام مسنون

معاصر سہ ماہی کے دونوں شمارے جنوری تا جون - جولائی تا ستمبر 2003ء مطالعہ میں ہیں۔ اشفاق احمد کے بارے میں مشتاق احمد یوسفی صاحب نے دلچسپ مضمون تحریر کیا ہے۔ ایسی دلچسپ اور شگفتہ تحریر مشتاق احمد یوسفی ہی لکھ سکتے ہیں۔ کسی نے غلط نہیں کہا کہ ہم عہد یوسفی میں جی رہے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی آپ بیتی ''نشان

جگر سوختہ'' سے ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے بہت سے پوشیدہ گوشے قاری کے لئے معلومات اور دلچسپی کا سبب بنتے ہیں۔ ایسے ادیب اور شاعر اگر اپنے بارے میں لکھیں تو ادب کے قاری کو انہیں اس پہلو سے جان کر خوشی ہوگی البتہ بناوٹ اور خود ستائشی سے پرہیز اور گریز ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں نہ بناوٹ ہے اور خود ستائشی۔

پروفیسر سیف اللہ خالد کی کتاب ''دیباچہ فلیپ اور تنقیدی معیارات'' ڈاکٹر خالد تنویر کا تجرباتی مضمون پسند آیا۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے کتاب یقیناً پڑھنے کے لائق ہوگی۔ آج تک اس طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب سے بے لاگ تنقید کا خانہ خالی ہوتا جا رہا ہے۔ اب کسی فن پارے پر تنقید ہو تبصرہ ہو یا تجزیہ سب تحسین باہمی کے جذبے کے تحت لکھے جا رہے ہیں۔

کراچی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب اب نقاد جیسی چیز یہاں عنقا ہے اور دو چار جو باقی ہیں انہوں نے اپنے آپ کو کتابوں کی رونمائی اور ادبی تقریبات میں مضامین پڑھنے تک محدود کر لیا ہے جس کی وجہ سے یہ اکثر قاری کی تنقید کا نشانہ بلکہ ملامت کا ہدف بنتے ہیں۔ اس سہل پسندی اور تحسین باہمی نے انہیں جو نقصان پہنچایا ہے اور ان کی شخصیت کو مجروح کیا اس کا انہیں اندازہ ہی نہیں۔ ایک ہی مضمون کتاب اور شاعر کا نام اور چند الفاظ کے رد و بدل کے ساتھ پڑھنے اور لکھنے کا عمل جاری ہے۔

اس کے باوجود بزعم خود بقول غالب وہ یہ کہتے نظر آتے ہیں

مگر لکھوائے اس کو خط تو کوئی ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

سنجیدہ شاعر اور ادیب حیران ہے کہ وہ کیا کرے۔ چنانچہ اب زیادہ تر کتابیں بغیر تعارف 'فلیپ' تقریظ' پیش لفظ' دیباچہ کے شائع ہو رہی ہیں اور میرے خیال میں یہ زیادہ بہتر ہے۔

افسانوں میں مسعود مفتی' محمد سعید شیخ' رشید امجد کے افسانے پسند آئے۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

عادل فریدی
کراچی

⭘

برادرم السلام علیکم

''معاصر'' کے دونوں شمارے تاخیر سے موصول ہوئے۔ بے حد شکریہ۔ آپ کی ادبی خدمات زندہ رہیں گی' ہر شمارہ اپنے روایتی مخصوص انداز میں پہنچتا ہے تو بے حد خوشی ہوتی ہے۔ اس مشکل دور میں آپ نے ادب کے سنوارنے نکھارنے اور ہر دلعزیز بنانے میں جو سلیقہ روا رکھا ہے۔ وہ قابل تحسین ہے۔

فقط محسن احسان
پشاور

حضرت (پیار سے لکھا ہے طنزاً یا مزاحاً نہیں) علامہ عطا الحق قاسمی صاحب! السلام علیکم

معاصر کے لئے ایک مضمون، دو نظمیں اور دو غزلیں ملفوف کر رہا ہوں۔ یہ چیزیں نہ صرف تازہ ہیں بلکہ نامسموع بھی۔۔۔ابھی تک کسی کو سنائی بھی نہیں۔ تازہ معاصر میں غزلوں میں حضرت ساقی فاروقی نے ظفر اقبال کی طرز میں بزعم خویش غزل لکھ کر جھک ماری ہے یا زیادہ سے زیادہ قافیہ پیمائی فرمائی ہے۔ یہ ٹھیک ہے میں بھی ظفر اقبال کو کہتا رہتا ہوں کہ بھائی ذرا غزل چھوڑ کر نظم لکھنا شروع کرو اعتدال میں آ جاؤ گے لیکن وہ یار میری اس مخلصانہ بات کو نہیں سمجھتا۔ لیکن اس کے باوجود ظفر اقبال کی زود گوئی میں بھی ایک بات ہوتی ہے۔ اس لئے ساقی فاروقی کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ اپنے انداز کی غزل کہیں تو ان کے حق میں میرا یہ مشورہ زیادہ سود مند ثابت ہوگا۔۔۔باقی آپ نے ایک بار معاصر میں میرا ادھورا خط شائع جو کیا اس پر شمس الرحمن فاروقی ناراض ہو چکے۔ ناراض ہونا بھی کوئی ایسی بات نہیں ان حضرت نے خط و کتابت بھی ترک کر دی۔۔۔وہ عالم فاضل اور اسی طرح فراخدل آدمی ضرور ہیں لیکن ایک تو میری ناقص رائے میں وہ بعض اوقات اپنے علم و فضل کو صحیح طور پر استعمال کرنا فراموش کر دیتے ہیں یا پھر پٹڑی سے اتر جاتے ہیں۔ میں بھی ایسا فضول آدمی ہوں کہ انہیں یہ بات لکھنے سے باز نہیں کرتا۔۔۔حالانکہ میں خاموش بھی ہو سکتا ہوں۔ لیکن اگر ہم کسی پڑھے لکھے آدمی سے بھی کھل کر بات نہیں کر سکتے تو پھر کہاں کر سکتے ہیں۔

آپ نے اطہر رضوی کے تقریب میں بڑی معتدل تقریر فرمائی لیکن طالبان کے ضمن میں اشفاق احمد صاحب اس طرح معتدل نہیں رہے اور پوری کتاب کا ستیا ناس کر دیا۔ میں اشفاق صاحب کو الگ خط لکھ رہا ہوں۔ میں تو خود بھی مذہب کو آسان چیز سمجھتا ہوں اور مثبت بات کرتا ہوں لیکن مسلم امہ جب تک اپنا محاسبہ نہیں کرے گی اپنے دین میں مذہب میں آسانی کس طرح پیدا کر سکتی ہے۔ اپنا محاسبہ آدمی کو مشکل میں نہیں ڈالتا بلکہ اس کی راہ آسان کرتا ہے۔ لیکن ہم اکثر اس حقیقت سے گریز کر جاتے ہیں۔ یعنی اپنا محاسبہ نہ کرنا زندگی کا سب سے بڑا گریز ہوتا ہے۔ اور ہم اس گریز سے بھی باز نہیں آ رہے۔ ''سب ٹھیک ہے'' یا ''سب چلتا ہے'' سے بات نہیں بنتی۔ بلکہ آدمی درمیان میں لٹکا رہتا ہے۔

والسلام مشکور حسین یاد

سمن آباد، لاہور

برادرم قاسمی صاحب' آداب

آپ کا خط ملا۔ یہ آپ کا دوسرا خط ہے' جو مجھے ملا اور میرے لئے دلی راحت کا باعث ہوا۔ آپ نے پہلا خط ۱۹۷۴ء میں مجھے لکھا تھا جب میں گاؤں میں تھا اور میں نے ملازمت کے حصول کے لئے آپ کی مدد چاہی تھی۔ تب آپ نے مجھے اپنے خط میں وہ تاریخی جملہ لکھا جسے میں نے اپنی خودنوشت میں بھی درج کیا ہے۔ اب کے ''معاصر'' کے شماروں میں آپ نے میری غزلیں چھاپ کر مجھے دوبارہ فتح کر لیا۔ میں اب آپ کی سلطنت ہوں۔

''معاصر'' نے بہت جلد ادبی صحافت میں ایک بڑا نام حاصل کر لیا ہے۔ اور یہ سب آپ کے خلوص اور ذہانت کے باعث ہے۔ خداوند کریم آپ کو ہمیشہ صحت مند رکھے اور ہمیشہ خوش و خرم۔

آپ کا' اکبر حمیدی

اسلام آباد

●

گرامی قدر محترم عطاالحق قاسمی صاحب! سلام مسنون

معاصر میں آپ جس طور ادب کو سنگین اور تلخ موضوعات کا مزاج داں بنا رہے ہیں وہ قابل تحسین اور قابل تقلید مثال ہے۔ یہ خصوصیت کسی اور پرچے میں نہیں۔ خدا آپ کو اپنے مقاصد میں کامیاب کرے۔ اگر اس جہاد میں ہم کہیں کام آسکیں تو خوشی ہوگی۔

بہت شکریہ' طاہرہ اقبال

فیصل آباد

●

محترم جناب عطاالحق قاسمی صاحب' السلام علیکم' مزاج بخیر

جناب افتخار عارف صاحب کی معرفت سہ ماہی ''معاصر'' کے دو شمارے موصول ہوئے۔ بے حد شکریہ۔ میرے لئے اس کا ادبی معیار جانچنے کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ یہ عطاالحق قاسمی کی زیرادارت چھپ رہے ہیں۔ بہت خوبصورت اور معیاری طباعت ہے۔ بہت خوشی ہوئی۔

۱۵ نومبر کو لاہور میں ممتاز مفتی کی یاد میں تقریب کے حوالے سے آپ کو خط لکھا ہے۔ مجھے امید ہے آپ شرکت فرما کر عزت افزائی کریں گے۔

عکسی مفتی

اسلام آباد

٭

محترم عطاالحق قاسمی صاحب' السلام علیکم

مزاج گرامی قدر۔ آپ کا ''معاصر'' نظر نواز نہیں ہوا' امید ہے' سہ ماہی ہونے کے بعد اس کی ترتیب' تشکیل' تدوین' تقسیم اور ترسیل میں اضافہ و برکت ہوئی ہوگی' خدا کرے ایسا ہی ہو۔

سب مدیران' اسلم کولسری' عمر قاسمی اور انعام الحق جاوید مبارک باد کے مستحق ہیں کہ وہ اس عہد ساز جریدۂ ادب کو ایک تحریک بنانے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ حوصلہ' برداشت' تسلسل' خلوص' معیار' رواداری' تحمل' بردباری' صبر اور محنت کی ضرورت ہے اور یہ سب کچھ آسان نہیں۔ انبیاء کا شیوہ ہے۔ خدا کرے آپ صحت سے ہوں۔

کرامت بخاری

لاہور

٭

محترم عطاالحق قاسمی صاحب' سلام مسنون

آپ L.A آئے بھی وہ بھی ایسی سرعت سے کہ وقت گزرتے پتہ نہ چل سکا۔ اور ملاقات کی محرومی اختیار سے باہر رہی۔ لیکن آپ کی موجودگی بیشتر ہمارے ہم راہ رہتی ہے۔ ہر اخبار ہر ہفت روزہ میں آپ کی تحریر پڑھ کر اس دوری کا مداوا ہو جاتا ہے۔ اور لگتا یوں ہے جیسے آپ امریکا ہی مقیم ہیں۔

جریدہ ''معاصر'' موصول ہوا۔ اور بطور سوغات ایک گھر سے دوسرے گھر کا سفر کر رہا ہے۔ مضامین' افسانے' نظم' غزل' سبھی ادب کے مشعل بردار ہیں۔ اپنا رپورتاژ ''سرائے'' دیکھ کر مسرت ہوئی کہ اس تحریر نے آپ کے جریدہ میں جگہ پا کر آبرو بخشی۔ ''تراشیدم۔ پرستیدم۔ شکستم۔''

ایک نظم ارسال ہے جو تین حصوں میں ہے۔ خدا کرے آپ کو پسند آئے۔ احباب کی خدمت میں میرا مودبانہ سلام عرض کریں۔ اللہ ہمیشہ آپ پر مہربان رہے۔

ارشاد احمد صدیقی

کیلی فورنیا

٭

محترم جناب عطاالحق قاسمی صاحب السلام علیکم!

امید ہے آپ بمعہ احباب اور اپنے اہل خانہ کے بخیریت ہوں گے۔ معاصر کے بیک وقت دو شماروں کی خبر نے ادبی حلقوں میں ہلچل مچا دی ہے۔ دونوں شمارے اپنی جداگانہ حیثیت لئے ہوئے تھے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ معاصر واقعی آپ کا خواب تھا اللہ آپ کو معاصر کے لئے کام کرنے کی توفیق دے۔ (آمین)

شوکت مہدی

راولپنڈی

◎

برادرم عطاالحق قاسمی صاحب' عزیزی عمر قاسمی صاحب' السلام علیکم۔ مزاج گرامی۔

آج ''ارژنگ'' ملا تو معاصر کے بیک وقت دو شماروں کی اشاعت کی اطلاع ملی۔ دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اللہ آپ کو عمر خضر عطا فرمائے۔ دل کو ایک اطمینان سا ہے کہ معاصر کا مستقبل محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ خدا افق تخلیق کے اس روشن ستارے کو سلامت رکھے۔

ریاض حسین چودھری

سیالکوٹ

◎

''معاصر'' کے زیر اہتمام

ادیبوں کا احتجاج

پاکستان کے اردو اور پنجابی کے نامور ادیبوں' شاعروں' دانشوروں اور صحافیوں نے احمد ندیم قاسی کے اعزاز میں ادبی مجلّہ ''معاصر'' کے زیر اہتمام منعقدہ تقریب میں احمد ندیم قاسی کے خلاف بیورو کریسی کی سازشوں کے خلاف سخت غم و غصہ کا اظہار کیا ہے اور حکومت پنجاب سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اصلاح احوال کے لیے فوری اقدامات کرے۔ بصورت دیگر ادیبوں اور دانشوروں کی طرف سے ملک گیر احتجاجی تحریک شروع کی جائے گی۔ جلسے کی صدارت برصغیر کے ممتاز افسانہ نگار انتظار حسین نے کی اور نظامت کے فرائض عباس نجمی نے انجام دیئے۔ جبکہ اظہار خیال کرنے والوں میں صاحب صدر انتظار حسین کے علاوہ حمید اختر' مجیب الرحمان شامی' مسعود اشعر' فخر زمان' شفقت تنویر مرزا' حسن نثار' امجد اسلام امجد' سرفراز سید اور مدیر معاصر عطاء الحق قاسمی شامل تھے۔ صاحب صدر انتظار حسین نے اپنی تقریر میں ندیم صاحب کو بھرپور خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہم سب نے کسی نہ کسی حوالے سے ندیم صاحب سے استفادہ کیا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ ہم لوگ ان کے سائے میں سانس لے رہے ہیں۔ مگر یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ندیم صاحب کی عمر کو بہانہ بناتے ہوئے انہیں آرام کرنے کا مشورہ دیا جا رہا ہے جبکہ مجلس ترقی ادب کی روایت یہ رہی ہے کہ اس کے ناظم کی تقرری تا حیات ہوتی ہے چنانچہ جناب امتیاز علی اور پروفیسر حمید احمد خان کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ شروع میں علمی ادبی اداروں پر بیورو کریسی کا تسلط نہیں ہوتا تھا' چنانچہ گورننگ باڈی کے ارکان کی جو فہرست ناظم کی طرف سے جاتی تھی' وہی فائنل سمجھی جاتی تھی۔ مگر اس دفعہ تو مجلس کی انتظامیہ کمیٹی کا اجلاس سیکرٹیریٹ میں طلب کیا گیا جو بہت زیادتی کی بات ہے۔ ممتاز ترقی پسند صحافی اور ادیب حمید اختر نے اپنی تقریر میں کہا کہ اس دور میں پریس آزاد نہیں ہوا بلکہ حکومت پریس سے آزاد ہو گئی ہے۔ چنانچہ ادیبوں اور دانشوروں کے احتجاج پر بھی کوئی توجہ نہیں دی جا رہی۔ انہوں نے کہا کہ اگر حکومت نے ہمارے مطالبے پر کان نہ دھرا تو ملک گیر احتجاجی تحریک شروع کی جائے گی۔ روزنامہ پاکستان کے چیف ایڈیٹر اور ممتاز صحافی مجیب الرحمان شامی نے کہا کہ چودھری پرویز الٰہی کے دور میں علم و ادب کی ایک زندہ علامت کے ساتھ یہ سلوک نہیں ہونا چاہیے تھا۔ انہوں نے کہا کہ اس سانحہ کے بعد انہیں زندہ رہتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے۔ مجیب الرحمان شامی نے کہا کہ ندیم

صاحب کے افکار سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی علمی ادبی اور صحافتی خدمات ہمارے عہد میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور اس حوالے سے وہ پاکستان کی سب سے محترم شخصیت ہیں۔ ان کے ساتھ بیوروکریسی کے رویے سے پاکستان کے تمام اہل دانش اور اہل صحافت کی توہین ہوئی ہے۔ اب اس توہین کے خلاف تحریک چلانے کے لیے ندیم صاحب سے مشورے اور ان سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں کہ یہ ان کا نہیں' پاکستان کے تمام ادیبوں' شاعروں' دانشوروں اور صحافیوں کی توہین کا مسئلہ ہے۔ اگر کوئی بچہ اپنے باپ کے سامنے کوئی گستاخی کر بیٹھے تو اسے باپ سے معافی مانگنا پڑتی ہے۔ حکومت پنجاب کو بھی احمد ندیم قاسمی سے معافی مانگنا چاہیے اور ان سے درخواست کرنا چاہیے کہ وہ دوبارہ مجلس ترقی ادب کی نظامت سنبھالیں۔ ورلڈ پنجابی کانگریس کے چیئرمین فخر زمان نے اپنی پرجوش تقریر میں علمی ادبی اور ثقافتی اداروں کو حکومت کے تسلط سے آزاد کرانے کے عزم کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ احمد ندیم قاسمی جیسے عظیم لوگ نسل در نسل اور عہد در عہد لوگوں کو متاثر کرتے ہیں۔ ایسے شخص کے ساتھ بیوروکریسی کا شرمناک سلوک ہم سب کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ فخر زمان نے کہا کہ بدقسمتی سے یہ صورتِ حال ہمیشہ سے پاکستان میں رہی ہے۔ یہ فرانس نہیں کہ ڈیگال کہے کہ سارتر فرانس ہے۔ فخر زمان نے ادیبوں کی کل پاکستان کانفرنس بلانے کی تجویز کی حمایت کی اور کہا کہ وہ اور ان کی تنظیم اس ضمن میں ہر ممکن مدد کریں گے۔ حسن نثار نے اپنی تقریر میں کہا کہ وہ جذباتی انسان ہیں' وہ مطالبات کی تکمیل کی خاطر خودسوزی کیلئے بھی تیار ہیں۔ تقریب کے دوسرے مقررین نے بھی ندیم صاحب کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے ان کے ساتھ برتاؤ کی مذمت کی۔ اس موقع پر قرار دادِ مذمت بھی پیش کی گئی جسے تمام حاضرین نے منظور کیا۔

قراردادِ مذمت

ادارۂ معاصر کے زیر اہتمام لاہور کے ادیبوں شاعروں' دانشوروں کا یہ اجتماع نوکرشاہی کی ادب اور فن کے میدان میں بلاجواز مداخلت اور من مرضی کی اس روایت کی پرزور مذمت کرتا ہے جو برطانوی دور سے شروع ہوئی اور آج تک اس میں کمی آنے کی بجائے مسلسل ناگوار اضافہ ہوتا رہا ہے اور بدقسمتی یہ ہے کہ سول اور فوجی حکمرانوں نے بھی اس حوالے سے نوکرشاہی کو لگام نہیں دی۔

تازہ ترین افسوسناک مثال مجلس ترقی ادب کے معاملات ہیں' جہاں اس ملک کی عزت اور وقار جناب احمد ندیم قاسمی گزشتہ تیس برس سے ادب اور ملک کی سربلندی کے لیے مصروف کار تھے۔ یہ نہ صرف حکومت پنجاب بلکہ پورے پاکستان کے لیے فخر کی بات تھی۔ لیکن نوکرشاہی کو پاکستان کی خیرسگالی نہ کل مقصود تھی نہ آج چنانچہ مجلس ترقی ادب کے کارکنان اور ادب کے لیے جائز حقوق مانگنے کا جرم مطلق العنان نوکرشاہی اور اس کے سرپرست برداشت نہ کر سکے اور کچھ اس وجہ اور کچھ درپردہ وجوہ کی بنا پر جناب احمد

ندیم قاسمی کو ادارے سے لاتعلقی پر مجبور کر دیا گیا۔

ہمارا ایمان ہے کہ یہ صورت حال انتہائی مکروہ اور ثقافت دشمن ہے اس لیے ہم اس کی پرزور مذمت کرتے ہوئے جناب پرویز الٰہی کو صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ:

پڑھا لکھا پنجاب ایسا نہیں ہوتا

اجلاس میں خوبصورت نوجوان شاعر حسن عباسی اور عزیز احمد نے ندیم صاحب کو منظوم خراج عقیدت بھی پیش کیا۔ ذیل میں ان دونوں شعراء کی نظمیں درج کی جا رہی ہیں:

حمید اختر، احمد ندیم قاسمی اور انتظار حسین

مجیب الرحمٰن شامی، فخر زمان اور حسن نثار

محترم جناب احمد ندیم قاسمی کے لیے

تو پیڑ محبت کا تیری چھاؤں گھنیری ہے
ترے پہلو میں آ بیٹھا خوش قسمتی میری ہے

تو سچ کا ہرا موسم تو شہر گلابوں کا
ان مہکی فضاؤں میں خوشبو سبھی تیری ہے
تو آخری تارا ہے ڈر ہے ترے کھونے کا
دریا کا کنارا ہے اور رات اندھیری ہے
اس جبر کی وادی میں یہ کلمۂ حق تیرا
جرأت کسے کہتے ہیں کیا اور دلیری ہے
توقیر تری کر لیں آنکھوں میں تجھے بھر لیں
تو سامنے ہے تو پھر کس بات کی دیری ہے

(حسن عباسی)

خراج عقیدت

ظلمات کی شب میں چاند سا ' احمد ندیم قاسمی
کوئی نہیں ہے دوسرا ' احمد ندیم قاسمی
جیسے بہار آ گئی جیسے کہ پھول کھل گئے
جس بزم میں بھی آ گیا ' احمد ندیم قاسمی
افسانہ ہو یا ہو غزل کالم ہو یا کہ خود نوشت
علم و ہنر کا دیوتا ' احمد ندیم قاسمی
ہم آج کر رہے ہیں جو سچ کی صدا بلند تو
تو نے دیا یہ حوصلہ ' احمد ندیم قاسمی
ہم کو وہی قبول ہے اپنا وہی اصول ہے
جو تو نے کہہ دیا "بجا" ' احمد ندیم قاسمی
تیرے اثر سے عمر بھر وہ پھر نہیں نکل سکا
اک بار جو تجھے ملا ' احمد ندیم قاسمی
نقش قدم پہ آپ کے چلتا رہے عذیر بھی
آج اس کو دیجئے دعا ' احمد ندیم قاسمی

(عذیر احمد)

قرشی
شربت
جامِ شیریں
میرے ڈرنک میں ہیں
صندل، گلاب اور
100% خالص عرقیات
آپ کے ڈرنک میں کیا ہے؟

Registered L No. PC(PB)/29178
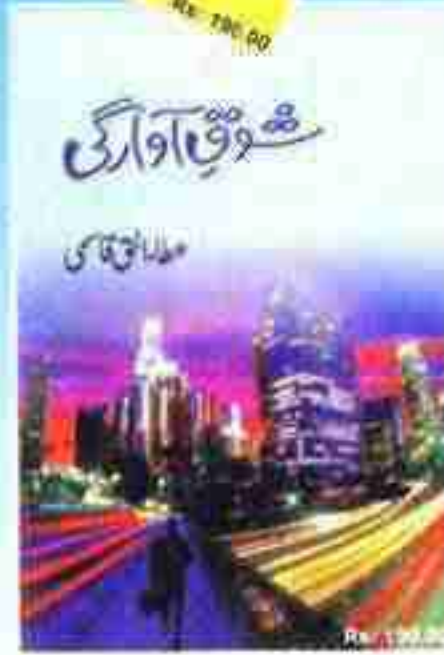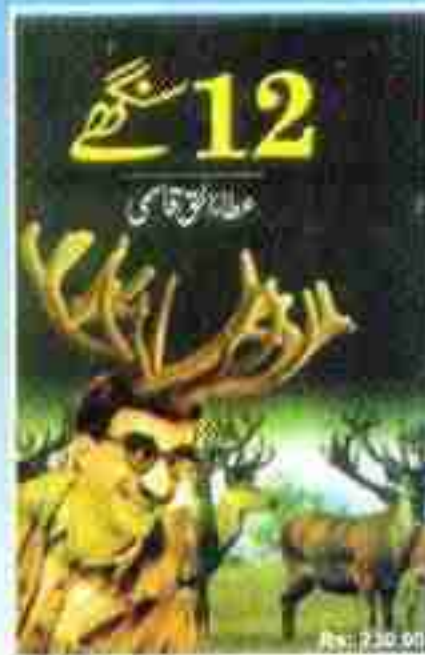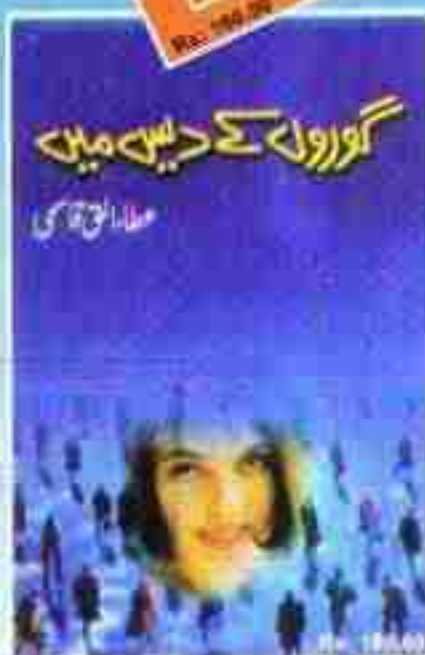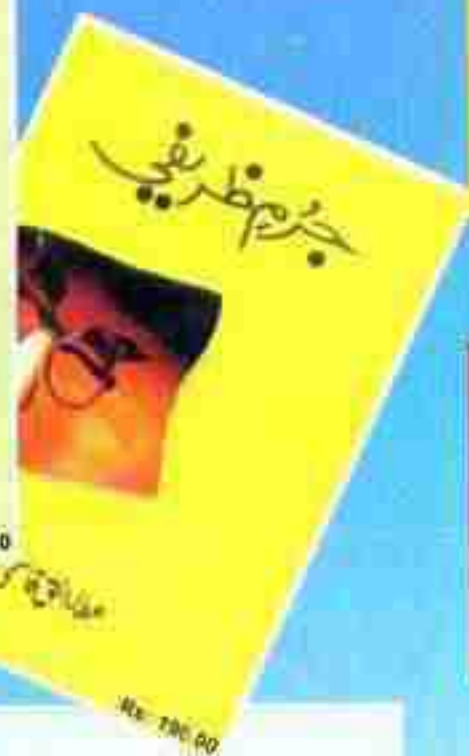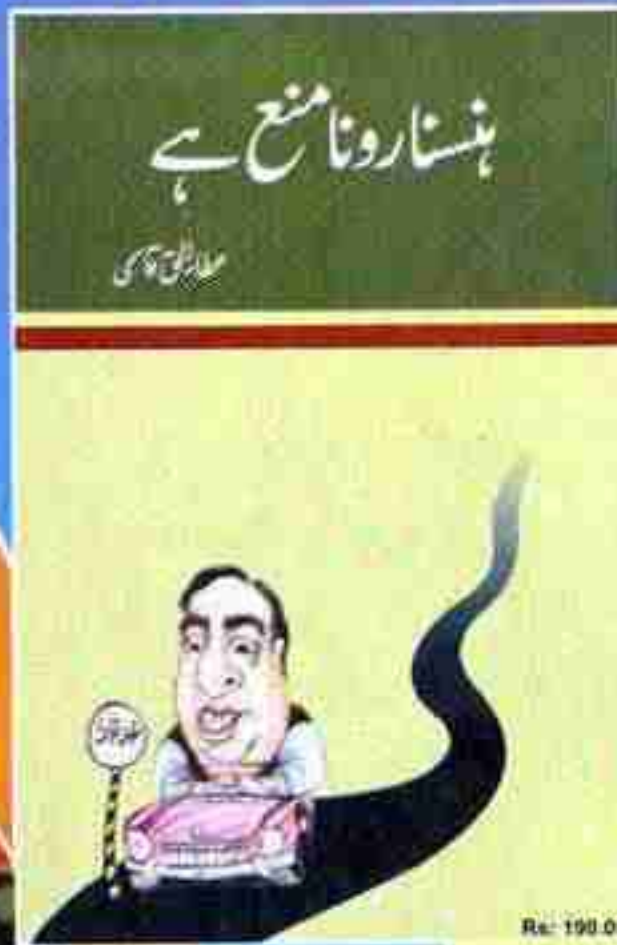
Quarterly Literary Magazine

"MUASIR" International

Lahore-Pakistan. Tel: 92-42-7521122
92-42-7513234-5 Mob: 0300-8470062
E-mail: qasmi@brain.net.pk